WWW.PAKISTANIPOINT.COM
پاکستانی پوائنٹ

چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER APNS CPNE	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگران ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شعاع عمیر
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
اشتہارات ——— خالدہ جیلانی
قانونی مشیر ——— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

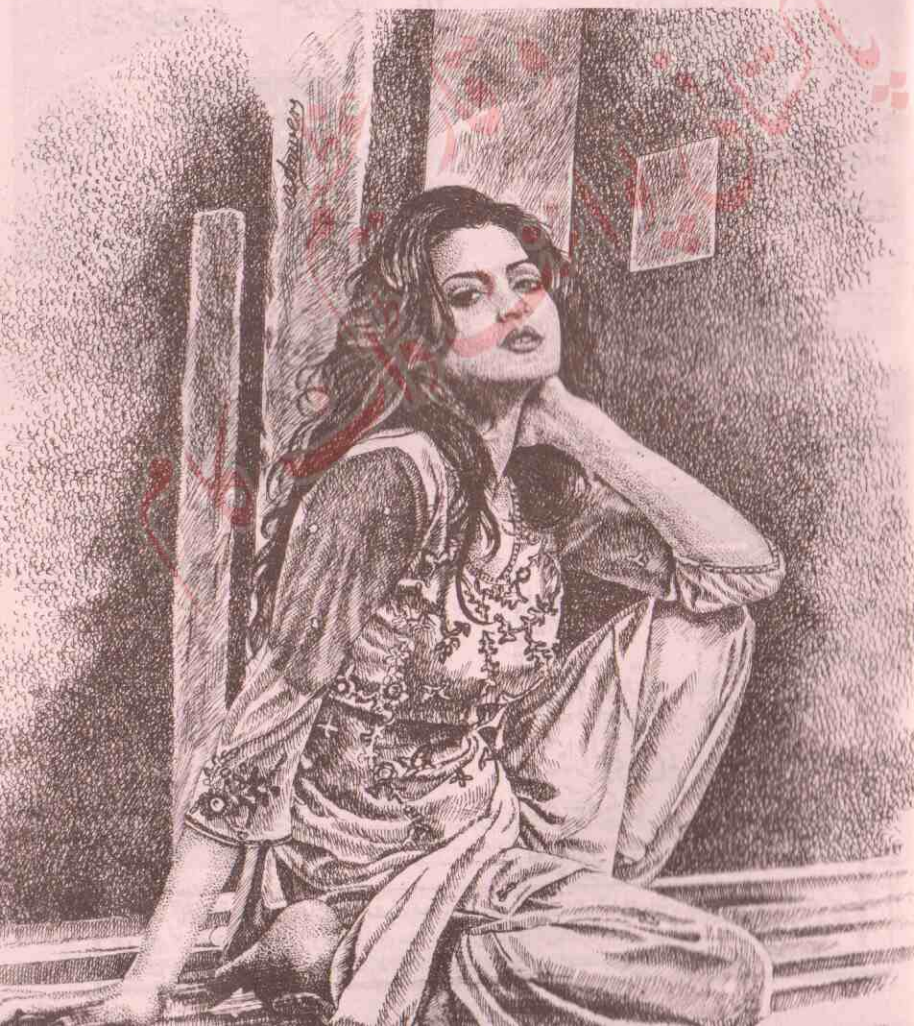

حمد — ضیا تبسّم — 9
نعت — اعجاز رحمانی — 9

بیادِ محمود ریاض

آئینۂ صفت — سمیرا حمید — 10

انٹرویو

یہ رنگ خوشیوں کے — شاہین رشید — 12
میری بھی سنیے — نعمان سمیع — 20
مقابل ہے آئینہ — صفیہ مہر — 24

ناول

میرے ہم نفس، میرے ہم نوا — آسیہ مرزا — 26

مکمل ناول

جُفت ساز — نگہت سیما — 56
کنارِ خواب جو — فرح بخاری — 156

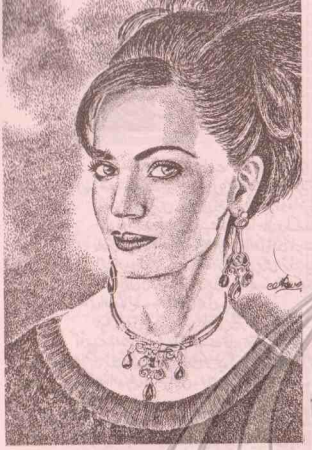

ناولٹ

اے دلِ بے خبر — صدف ریحان گیلانی — 116
پھول کھلنے لگے راہوں — نوشین فیاض — 200

افسانے

دلیوی — نفیسہ سعید — 49
حماقت — ماہم اوزلین — 109
وقت کی چھٹی — منشا محسن علی — 151
اک تارا بیلی سی — عائشہ تنویر — 187
انوکھی شادی — فہمیدہ فرید خان — 223
راہ دشوار سہی — کشف بلوچ — 227

خط وکتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

0317 2266944

کرن کتاب

بیوٹی باکس — ادارہ — 3
صحت — ادارہ — 7
اس ماہ کا مضمون — ادارہ — 9
معاشرتی اور نفسیاتی مسائل — ادارہ — 10
کچن اور آپ — ایس عنبرین آرائیں — 11
کرن کا دسترخوان — خالدہ جیلانی — 13
مجھے یہ شعر پسند ہے — شگفتہ سلیمان — 16
مسکراتی کرنیں — ادارہ — 17
موتی چُنتے ہیں — ادارہ — 18

مستقل سلسلے

کرن کرن خوشبو — شعاع عمیر — 232
یادوں کے دریچے سے — بشریٰ محمود — 235
نامے میرے نام — مدیرہ کرن — 237

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) .... -/850 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ .... -/7000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا .. -/8000 روپے
سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں
subscriptions@khawateendigest.com

جون 2020
جلد 42 شمارہ 3
قیمت 70 روپے

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 01 بلاک W نارتھ ناظم آباد، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

اداریہ

جب سے کرن کا اجرا ہوا ہے اس کا کوئی شمارہ التوا میں نہیں پڑا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ ہم اپریل اور مئی کا شمارہ آپ تک نہ پہنچا سکے۔ یہ شمارہ اپریل، مئی اور جون کا مشترکہ شمارہ ہے۔

ایک نادیدہ وائرس نے پوری دنیا کی معاشی اور معاشرتی زندگی تلپٹ کر کے رکھ دی ہے۔

پہلی بار یہ منظر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک آسمانی وبا کے سامنے کمزور اور طاقت ور یکساں بے بس ہیں۔

پوری دنیا میں کاروبار زندگی معطل ہے اور آبادی کا بہت بڑا حصہ معاشی بحران کی زد میں ہے۔

اس نادیدہ وائرس نے ہماری معاشرتی زندگی پر بھی اثر ڈالا ہے۔ جہاں دوریاں بڑھی ہیں وہاں فاصلے سمٹے بھی ہیں پہلی بار گھر اور گھر والوں کی اہمیت اجاگر ہوئی ہے۔ گھر کے افراد کے درمیان قربت اور یگانگت بڑھی ہے۔ ایک دوسرے کے مسائل اور تکالیف سے آگاہی ہوئی ہے۔

جہاں پوری دنیا میں اس بیماری پر تشویش ظاہر کی جا رہی ہے، وہاں حیرت انگیز طور پر ہماری حکومت مطمئن نظر آتی ہے۔ وزیراعظم کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نزلہ زکام کی طرح عام بیماری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں عوام کی بڑی تعداد نے اس بیماری کو سنجیدگی سے نہیں لیا اور اس کا مظاہرہ اس وقت سامنے آیا جب لاک ڈاؤن میں نرمی ہوئی۔ کیسا کورونا اور کہاں کی احتیاطیں۔ عوام سب کچھ بھلا کر نہ صرف بہت بڑی تعداد میں باہر نکلے بلکہ خواتین تو بچوں کو بھی ساتھ لے آئیں۔

ان حالات میں جبکہ حکومت کوئی بھی ذمہ داری لینے سے گریز کر رہی ہے، ہمیں بہت زیادہ شعور، نظم و ضبط اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ ذرا سی لاپروائی نہ صرف ہمیں بلکہ ہم سے وابستہ افراد کی زندگی کو بھی خطرے میں ڈال سکتی ہے۔

محمود ریاض،

محمود ریاض کو دنیا سے رخصت ہوئے انیس سال بیت گئے۔ انسان دنیا میں آتا ہے۔ کچھ وقت گزارتا ہے چلا جاتا ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی سچائی ہے جس سے کوئی بشر انکار نہیں کر سکتا۔ مگر کچھ لوگ اس طرح جیتے ہیں کہ وہ دنیا سے رخصت ہو جائیں تب بھی ان کے کام ان کو زندہ رکھتے ہیں۔ ان کی یاد دلاتے ہیں۔

محمود ریاض ایسی ہی شخصیت تھے۔ ان کے جلائے چراغ روشن ہیں اور دنیا میں روشنی پھیلانے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔ دنیا سے رخصت ہونے والوں کے لیے بہترین تحفہ دعا ہے۔ محمود ریاض صاحب کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- بیاد محمود ریاض،
- "یہ رنگ خوشبوؤں کے" عید اور مدرز ڈے پر شاہین رشید کا سروے،
- اداکار نعمان سمیع کہتے ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ "صفیہ مہر" کے "مقابل ہے آئینہ"
- "میرے ہم نفس میرے ہم نوا" آسیہ مرزا کا سلسلے وار ناول،
- نگہت سیما کا مکمل ناول "جنت ساز"،
- "کنار خواب جو" فرح بخاری کا مکمل ناول،
- صدف ریحان گیلانی کا ناولٹ "اے دل بے خبر"
- "پھول کھلنے لگے ہیں راہوں میں" نوشین فیاض کا ناولٹ،
- نفیسہ سعید، منشا محسن علی، عائشہ تنویر، ماہم اذلین، فہمیدہ فرید خان اور کشف بلوچ کے افسانے اور مستقل سلسلے، کرن کتاب، ماہ رمضان کے حوالے سے خصوصی مضامین اور مزے دار ریسیپیز کے ساتھ۔

حمد باری تعالیٰ

ربِّ اکبر وہ ہر کسی کا ہے
سو بسو تذکرہ اسی کا ہے

نطق میں بھی گھلے ہیں رنگ اس کے
وہ جو گنجینہ خامشی کا ہے

رزق پتھر میں دے جو کیڑے کو
وہ رازق ہر آدمی کا ہے

ابتلا، رنج و غم میں ہر لمحہ
دھیان اسی کی طرف سبھی کا ہے

حق وہی ہے جو اس نے فرمایا
راستہ اس کا راستی کا ہے

لے کے آدمؑ سے ذات احمدؐ تک
ایک ہی دین ہر نبی کا ہے

ضیا نیر

نعت رسول مقبولؐ

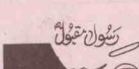

مشعل سیرت سرکار جلا رکھی ہے
شرط ہم نے بھی ہواؤں سے لگا رکھی ہے

زلزلے آئیں گے تو کترا کے گزر جائیں گے
میرے سرکارؐ نے بنیاد وفا رکھی ہے

میں زمانے کے اصولوں کی طرف کیا دیکھوں
سامنے سیرت محبوبؐ خدا رکھی ہے

صرف اور صرف ہے وہ اسم گرامی حضورؐ
آبرو جس نے تری دست دعا رکھی ہے

گرمیٔ حشر سے محشر میں رہے گا محفوظ
جسم پر جس نے شریعت کی قبا رکھی ہے

یہ بھی سرکار دو عالم کا کرم ہے اعجاز
میرے مولا نے مری بات بنا رکھی ہے

اعجاز رحمانی

بیادِ محمود ریاض

آئینہ صفت

سمیرا حمید

بڑے لوگ زمانوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں پھر بڑے زمانوں کے بعد ان کے بڑا ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ اس شخص کا موجود ہونا کسی نعمت کے مستقل ہونے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ کچھ اہم ہونا طے پایا تھا تب ہی تو۔ کچھ شروع ہو کر تکمیل تک لے جانا مقصود ٹھہرا ہے' اس لیے تو یہ انسان دنیا میں لایا گیا ہے۔

وہ انسان جو علم و ادب کی کسی بھی چیز سے منسلک ہو کر بڑا بنا ہو' وہ صرف بڑا نہیں عظیم ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کامیاب ہو کر ایک مکمل ادارہ بن کر سامنے آئے ہوں۔ ایسے ادارے جو کئی سو ہزاروں' بلکہ لاکھوں لوگوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے سوچنے سمجھنے کے انداز کو بدل دیتے ہیں۔ انہیں نئی سوچ اور افق دیتے ہیں۔ مستقبل کی معماری کے لیے کچھ کر سکھاتے ہیں۔ ایسے افراد نایاب ہوتے ہیں جو نئی تاریخیں رقم کرتے ہیں۔ اپنی سوجھ بوجھ' لگن اور جنون سے وہ کر گزرتے ہیں جو پہلے کسی کے گمان میں بھی نہیں ہوتا۔

زہر کا پیالہ پینے کے بعد سقراط نے کہا تھا کہ ''صرف جسم مر رہا ہے۔ سقراط زندہ ہے۔''

محمود ریاض جیسے لوگ بھی ایسے ہی زندہ ہیں۔ ہر چیز کو فنا ہے' لیکن علم قیامت تک رہنے والی چیز ہے۔ دانش مندی کی باتیں' حکمت کے راز کسی زہر سے مرنے والے نہیں ہیں۔ آپ دانش مند ہیں تو زندگی جسم کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔ دانش بانٹ دی ہے تو آپ نے اپنی زندگی تقسیم کر دی ہے۔ آپ زندہ ہیں کسی کتاب میں' سوچ میں' حکمت و تدبر میں۔ ہاں جسم کا سفر رک جاتا ہے' لیکن کوشش کا سفر جاری

رہتا ہے۔ جس انسان نے اپنی زندگی کی سانسوں کو زمین تیار کرنے' اس میں بیج بونے اور ہل جوتنے میں لگایا ہو' اور وہ بیج پودے سے درخت بن کر چھاؤں دینے لگا ہو' وہ انسان اپنی ایک ایک سانس کا حق ادا کر چکا ہوتا ہے۔

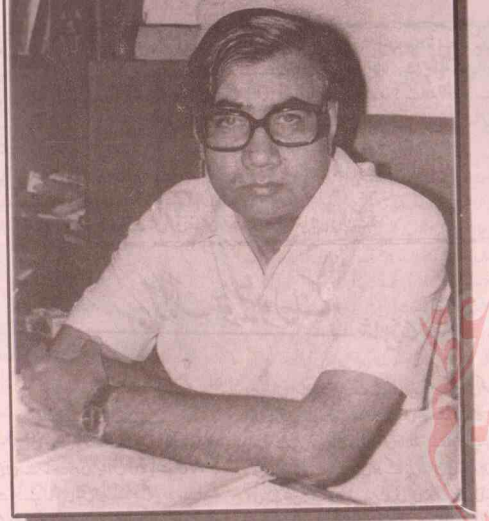

اشفاق احمد کہتے ہیں کہ ''انسان ہل چلا سکتا ہے۔ زمین تیار کر سکتا ہے۔ پانی دے سکتا ہے۔ بوائی کر سکتا ہے لیکن بیج کو پھاڑ کر اس میں سے بوٹا پیدا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ علم علیم مطلق کے پاس ہے اگر اس نے چاہا اور پسند فرمایا تو یہ بوٹا پیدا کرنے کا علم بھی انسان کو عطا کر دے گا۔

یقین جانیں اللہ کو بندے کی کوشش بہت پسند ہے۔ اس کی کوشش' محنت' لگن۔ وہ ایسے بیج پر بوٹا ضرور لگاتا ہے' جس کے پھل پر کسی ایک کا قبضہ نہ ہو۔ جس پر سب کا حق ہو۔ جس کی موجودگی سے سب کو سکھ ملے۔ ٹھنڈی ہوا چلے تو لو کی گرمی کو پچھاڑ دے۔

خواتین ڈائجسٹ کا بیج' محمود ریاض صاحب نے نیک نیتی کی زمین تیار کر کے' کوشش کا ہل چلا کر' خوش امیدی کا پانی دے کر لگایا تھا' اسے اللہ نے تناور درخت بنا دیا ہے۔ اس کی چھاؤں میں آپ' ہم اور سب بیٹھے ہیں۔ ہمارے اُردو ادب کو ہر طرز کی' ہر صنف کی کہانیاں مل رہی ہیں۔ ادیب پھل پھول رہے ہیں۔ قارئین ان لکھاریوں کی کاوشوں پر نازاں ہیں۔

ہم ایسے انسان کے شکر گزار ہیں جو معمار بنے تعمیر نو کے۔

☆☆

سارے دن ہمارے اپنے ہوتے ہیں مگر کسی کے لیے ایک دن مخصوص کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیں اس کا بہت زیادہ احساس ہے۔ اس سے بہت زیادہ پیار ہے۔ مجھے ذاتی طور پر دن منانا بہت اچھا لگتا ہے اور اس دن سے وابستہ اپنے پیاروں کو گفٹ دینا بھی بہت اچھا لگتا ہے۔ اس سال عید، مدرز ڈے اور فادرز ڈے تقریباً ایک ساتھ ہی آ رہے ہیں۔ عید اور مدرز ڈے مئی میں اور فادرز ڈے جون میں۔ اس لیے سوچا کہ اس بارے میں سروے بھی ان ہی دنوں کی مناسبت سے کیا جائے۔ لہٰذا ہمارے سوال کچھ یوں ہیں کہ......

(1) کیا آپ عید کا دن نارمل دن کی طرح گزارتے ہیں یا بہت ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے؟

(2) کیا مدرز ڈے اور فادرز ڈے منانا چاہیے؟ ہاں تو کیوں اور نہیں تو کیوں؟

(3) والدین کے ساتھ گزرے وقت میں کوئی خاص وقت جو شیئر کرنا چاہیں گی / گے؟

یہ رنگ خوشیوں کے

شاہین رشید

دُرِ ثمن بلال (رائٹر)

1- بچپن کی عیدوں کا تو مقابلہ ہی نہیں۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ گزری عیدوں کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ مجھے یاد ہے کہ بچپن میں عید کے موقع پر دوسروں کے مقابلے میں میرے لیے سب سے زیادہ کپڑے بنتے تھے کیونکہ میں اپنی امی کی بہت لاڈلی تھی...... چاند رات ہمیشہ جاگ کر گزارتی تھی کہ کب صبح ہوگی اور کب میں تیار ہو کر سب سے عیدی لوں گی اور عیدی ہمیشہ ابو سے اور بڑے بھائیوں سے بن مانگے ہی مل جاتی تھی۔ گھر میں صرف امی ہی وہ واحد ہستی ہوا کرتی تھیں جن سے میں عیدی مانگ کر اور لڑ جھگڑ کر لیا کرتی تھی اور وہ ہنستے مسکراتے مجھے عیدی دے دیا کرتی تھیں۔ آہ...... وہ عیدیں...... بہت رلاتی ہیں اب۔ امی کے اس دنیا سے جانے کے بعد اب عید کی وہ ایکسائٹمنٹ ہی نہیں رہی۔ ہاں اب شادی کے بعد اپنے تینوں بچوں کی عید کی شاپنگ کے لیے بہت پرجوش ہوتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں کہ بچوں کی عید کی شاپنگ میں کوئی کمی نہ رہے۔

2- دیکھیں مسلمان ہونے کے ناتے الحمدللہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ ماں باپ کو روز پیار سے دیکھ لینے سے حج کا ثواب ملتا ہے۔ ہمارے ہاں ماں باپ کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ ماں باپ کے پیار کے لیے کسی ایک دن کو مخصوص کر لینا ہمارا کلچر نہیں ہے۔ میرے ابو جب بھی مجھ سے ملنے میرے گھر آتے ہیں، میرے لیے وہ دن فادرز ڈے ہوتا ہے۔ امی کو ہم سے بچھڑے بارہ سال ہو گئے ہیں۔ ان کی یاد تو ہر پل آتی ہے لیکن جب مدرز ڈے پر میری بیٹی جو کہ نو برس کی ہے، مجھے اپنے ہاتھوں سے کارڈ بنا کر دیتی ہے، پھول دیتی ہے، مجھے وش کرتی ہے تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ بیٹی کا پیار اور اپنی امی کی جدائی رلا دیتی ہے۔

3- ماں باپ جیسا رشتہ آپ کو دنیا بھر میں نہیں ملتا۔ ان جیسی بے غرض محبت بھلا کسی سے کوئی کیسے کر سکتا ہے۔ امی ابو کے گھر میں جو بھی وقت گزرا، بہترین گزرا۔ میری امی بہت فرینڈلی تھیں۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر بات مجھ سے شیئر کرتی تھیں۔ نہ ان کی دوستیں تھیں نہ وہ محلے میں کسی کے گھر جاتی تھیں۔ اپنی ساری توجہ انہوں نے ہم بچوں پر مرکوز کی ہوئی تھی۔ میری بڑی بہن کی شادی کم عمری میں ہی ہو گئی تھی، اس لیے میں اپنی امی کے بہت قریب رہی۔ امی ہر وقت کبھی میرے کپڑے فیشن کے مطابق سلائی کرتیں، کبھی میرے دوپٹے پر کروشیہ سے لیس بناتیں، کبھی کڑاہی کرتیں تو کبھی شیشے لگاتیں۔ میں لاہور جاتی تو میرے لیے "لبرٹی" سے شاپنگ کرتیں اور ہر چیز میچنگ کی لاتیں۔ خاندان میں کسی کی شادی ہوتی تھی تو میری ساری کزنز کہتیں کہ دیکھو کہ آج ثمن کیا پہن کر آتی ہے۔ میری امی بھی بہت ویل ڈریسنگ کرتی تھیں، خود بھی ٹپ ٹاپ میں رہتی تھیں اور ہم بہن بھائیوں کو بھی ٹپ ٹاپ میں رکھتی تھیں۔ شہزادیوں کی طرح میری امی نے مجھے پالا۔ میں ناول لکھ رہی ہوتی تھی تو میرے لیے چائے بنا کر لاتی تھیں اور میری رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیتیں۔ امی کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک پل بہت یاد آتا ہے۔ جب میں پندرہ سولہ سال کی تھی تو ایک بار میں نے یوں ہی اپنے ابو سے کہہ دیا کہ ابو مجھے پھول بہت پسند ہیں، میرا دل چاہتا ہے کہ ہمارے گھر میں لان ہو، جہاں ڈھیر سارے پھولوں کے پودے ہوں۔ ہر طرف ہریالی ہو۔ ہمارے گھر کے برآمدے میں کافی ساری جگہ خالی پڑی ہوئی تھی...... تو صبح ناشتے کے وقت میں نے یہ بات کی اور ابو میری بات سن کر اپنے شوروم چلے گئے اور ٹھیک دو گھنٹے کے بعد ڈور بیل بجی اور جیسے ہی دروازہ کھولا، گملوں اور پودوں سے لدی ایک وین کھڑی تھی اور ساتھ ہی دو بندے، ایک وین والا دوسرا مالی...... کہ یہ سب کچھ سلیم صاحب نے بھجوائے ہیں۔ ابو کی اتنی محبت دیکھ کر بے ساختہ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ اسی طرح جب میرا پہلا ناول شائع ہوا تو اگلے ہی دن میرے لیے ایک "بک ریک" اور رائٹنگ ٹیبل لے آئے اور پھر گاہے بہ گاہے میرے لیے بکس لے کر آتے رہتے۔ کیا کیا بتاؤں امی ابو کے بارے میں...... بس اللہ میرے ابو کو اور جن کے والدین حیات ہیں، ان کو صحت والی لمبی زندگی عطا کرے، آمین۔

آصف الیاس (آر جے ایف ایم 93 ریڈیو پاکستان، کراچی۔ بھائی جان پروگرام بچوں کی دنیا)

1- عید تو بچپن والی ہی عید سعید ہوتی تھی۔ اب تو عید میں اٹینشن کے بجائے ٹینشن میں رہتے ہیں کیونکہ بچپن میں عیدی لیتے تھے، اب عیدی دیتے ہیں یعنی اب ٹینشن زیادہ ہوتی ہے اور اٹینشن کم ہوتی ہے۔

2- جی بالکل، والدین کے دن منانا چاہئیں اور ایک دن نہیں، ہر دن منانا چاہیے کیونکہ نہ چاہتے ہوئے بھی ہم اتنے مصروف ہوتے جا رہے ہیں کہ ایسے میں ڈنکے کی چوٹ پر یہ دن آ جائے تو ہم لازمی اس دن کو منانے کا اہتمام کریں یعنی اس دن کو منا کر ہم اپنے روٹھے والدین کو منا لیں۔

3- والدین کے ساتھ گزرا ہر لمحہ یادگار ہوتا ہے مگر ہمیں بعد میں اس کی قدر ہوتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں چوتھی

جماعت میں تھا تو میں نے تقریری مقابلے میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اور آتے ہی وہ ٹرافی میں نے امی کو دے دی تھی کہ ماں آپ کی دعا قبول ہو گئی ہے۔ اس کے بعد بے شمار کامیابیاں حاصل کیں۔ مگر ماں نہیں تھی۔ ہر کامیابی ادھوری لگتی ہے۔

میری ہر کامیابی تیرے بن ادھوری ہے
اے ماں! میرے لیے تو آج بھی ضروری ہے

منیٰ طارق۔ آرٹسٹ (رسوائی فیم)

1- عید کا دن بہت ایکسائٹنگ ہوتا ہے۔ ہمارے لیے، ہماری فیملی کے لیے، ہم بہت دن پہلے سے تیاریاں کر رہے ہوتے ہیں۔ مہندی، چوڑیاں، کپڑے تیار کرنا، چاند رات کو کیک اور دوسرے لوازمات لانا، شیر خرما بنانا، مختلف پکوان بنانا۔ عید کے دن فیملی کا لنچ ہوتا ہے ہمارے گھر میں، تو اس کی تیاریاں کرنا، اماں اور میں کھانا پکانے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ ابو بازار سے چیزیں لا رہے ہوتے ہیں اور عید کی صبح سب نماز پڑھ کر آتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے تو عید ہم بہت مزے سے اور اہتمام سے مناتے ہیں۔

2- میرے لیے تو ہر روز مدرز اور فادرز ڈے ہوتا ہے کیونکہ اللہ کی بڑی مہربانی اور اس کا کرم ہے کہ ہمارے سر پر ماں باپ کا سایہ ہے اور یہ وہ دو لوگ ہیں جو ہر وقت ہمارے لیے ہی سوچ رہے ہوتے ہیں۔ ان کو صرف

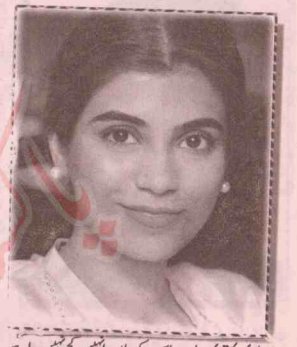

ہماری بہتری چاہیے اس کے علاوہ انہیں کچھ نہیں چاہیے اور جو ایک دن مخصوص ہے اس کو ہم بہت اسپیشل طریقے سے مناتے ہیں۔ ان کو تحفے دے کر اور ان کی پسندیدہ چیزیں دیتے ہیں، مگر میرے لیے ہر دن ان کا دن ہے۔

3- آپ نے کہا کہ گزرا وقت شیئر کروں تو ہر دن یوں تو خاص ہوتا ہے مگر ان کی برتھ ڈے ہو یا اینورسری اہتمام سے مناتے ہیں اور آج کل چونکہ ڈرامہ سیریل ''رسوائی'' چل رہا ہے تو وہ بہت اسپیشل ہوتا ہے میری وجہ سے۔ کیونکہ میں اس میں کام کر رہی ہوں، تو ہم سب کی کوشش ہوتی ہے کہ سب (فیملی) ساتھ بیٹھ کر دیکھیں۔ ایک دوسرے سے باتیں کریں اور شیئر کریں۔ وہ لمحات جب ہم نے یہ ڈرامہ بنایا تھا تو کچھ بہت اسپیشل چیزیں ہوتی ہیں جو والدین کے علاوہ کسی سے شیئر نہیں کر سکتے۔

عندلیب زہرا (رائٹر)

1- مجھے تہوار پسند ہیں کیونکہ ان میں ''زندگی، رشتوں سے محبت'' اور ''حرارت'' ہوتی ہے۔ میں عید کو انجوائے کرتی ہوں۔ اچھا کھانا، اچھا پکانا، مختلف ڈشز تیار کرنا، اچھا ڈریس اپ ہونا، میک اپ کرنا مجھے پسند ہے۔ تہوار ہمارے لیے ہیں تو سو کر کیوں گزاریں۔ کچھ الگ کرنا چاہیے، اپنی خوشیاں خود انجوائے کریں۔ اس کے لیے بہت لوازمات ضروری نہیں، بچوں کو ہی دیکھ لیں۔ آئس کریم کھا کر، غباروں سے کھیل کر انجوائے کرتے ہیں۔ میں عید کے دن اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھتی ہوں۔ امی سے عیدی لے کر مزے کرتی ہوں اور ڈائجسٹ بھی ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ تہوار پر کوئی آپ کو یاد کرے یا آپ کسی کو یاد کریں، یہ علیحدہ ٹاپک ہے مگر عید کو خود انجوائے کرنا سیکھیں، خوش ہونے کے لیے کسی کا انتظار نہ کریں۔

2- والدین کا دن سیلیبریٹ کرنا چاہیے، جو رشتہ ہم کو ہر لمحہ یہ احساس دلائے کہ ہم ان کے لیے کتنے اہم ہیں، کیا ہم ان کے لیے ایک دن بھی نہیں منا سکتے۔ میں مدرز ڈے بہت جوش کے ساتھ مناتی ہوں۔ امی کو پیار کرتی ہوں۔ سرپرائز گفٹ دیتی ہوں، سوئٹ ڈش بناتی ہوں۔ میرے والد کے انتقال کو کافی عرصہ بیت گیا۔ اس وقت فادرز ڈے کا رواج نہیں تھا، مطلب زیادہ نہیں تھا۔ اب فادرز ڈے پہ میں ان کو بہت مس کرتی ہوں۔ آپ سب کو چاہیے کہ اپنے والدین کے ساتھ وقت گزاریں، کچھ زیادہ نہ دیں بس کوئی گفٹ، اچھا بی ہیویر، توجہ دیں۔ آج کل رشتوں کو اچھے بی ہیویر کی ضرورت ہے، بات چیت کی ضرورت ہے تاکہ رشتے قائم رہیں۔

3- میں نے اپنے والدین کے ساتھ گولڈن پریڈ گزارا ہے۔ خوابوں کا دیس...... مجھے امی ابو نے سب کچھ دیا۔ توجہ، محبت، خود اعتمادی، اچھا کھلایا، اچھا پہنایا۔ میری سالگرہ کے ساتھ میری گڑیا کی بھی سالگرہ منائی جاتی تھی۔ اس کے ڈریس بھی امی بناتی تھیں۔ میں اپنی ٹیچر ''مس شاہین'' سے بہت متاثر تھی۔ عید پر ان جیسے ڈریس بنوائی تھی۔ امی سحری کے وقت میری فرمائش پر میرے کپڑوں پر گوٹا کناری لگاتی تھیں اور وہ ڈریس پہن کر میں اپنی ٹیچر کے گھر جاتی تھی۔ میرے ابو میری بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے، جب میں بہ حیثیت رائٹر کے کچھ لکھتی تھی، اگر کبھی کہانی شائع نہ ہو پاتی تو کبھی میرا حوصلہ نہیں توڑتے تھے۔ نہ مجھے ڈانٹتے تھے۔ میں اب ہر نماز کے بعد امی کی صحت کی اور ابو کے لیے جنت کی دعا کرتی ہوں۔

پروفیسر شاداب احمد صدیقی۔ (ڈرامہ نگار+ صداکار+ مضمون نگار ''جنگ''، ''ایکسپریس'')

1- یوم عید ماہ صیام کی تکمیل پر اللہ تعالیٰ سے

انعامات پانے کا دن ہے تو اس سے زیادہ خوشی و مسرت کا موقع کیا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری امت مسلمہ اس دن کو خاص اہتمام سے مناتی ہے۔ اسلامی نقطہ نظر سے تو بہت خوشی ہوتی ہے، مگر پوری دنیا اور خاص طور پر مسلمانوں کے حالات نے افسردہ کر دیا ہے۔ کرونا وائرس نے پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ آنے والی عید خیریت سے گزر جائے۔ (آمین)

2- میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مدرز ڈے اور فادرز ڈے قطعی طور پر نہیں منانا چاہیے کیونکہ یہ مغربی بے حس معاشرے کے قائم کردہ دن ہیں۔ مغرب میں رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے جبکہ اسلام نے والدین کے لیے واضح اصول مرتب کیے ہیں۔ ہمارا مذہب ہمیں پابند کرتا ہے کہ ہم اپنے والدین کو بھرپور توجہ دیں اور ان کا ادب و احترام لازمی کریں، اسی میں ہماری دنیا اور آخرت سنور جائے گی۔ ہمیں روزانہ اپنے والدین کی خدمت کرنی چاہیے۔

3- والدین کے ساتھ گزرا ہر وقت قیمتی اور یادگار ہوتا ہے لیکن میرا ایک یادگار وقت یہ تھا کہ میں روزانہ باقاعدگی سے رات کو اپنی والدہ کی دونوں ٹانگیں دباتا تھا اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہتا تھا کہ قیامت کے دن مجھے پہچان لینا اور میری بخشش کرا دینا۔ وہ مجھے بہت دعائیں دیتی تھیں اور ایسا کرنے کے بعد مجھے بہت سکون ملتا تھا اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اپنے والدہ کے انتقال کے وقت بھی ان کے قریب تھا اور میں نے اپنی بخشش کروالی۔ انہوں نے نزاع کی حالت میں بھی مجھے بہت دعائیں دیں اور کہا کہ تم نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے اور تم زندگی میں بہت بڑے آدمی بنو گے اور آج الحمدللہ میرا ضمیر مطمئن ہے اور مجھے بہت قلبی سکون حاصل ہے۔ اللہ نے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہوا ہے۔ اسی طرح جب میں طالب علم تھا تو میرے والد مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے اور میں بھی بہت دل لگا کر پڑھتا تھا اور وہ جب بھی مجھے پڑھتا ہوا دیکھتے کہتے کہ میرا بیٹا پروفیسر بنے گا اور شاید بلکہ یقیناً یہ ان ہی کی دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ آج میں پروفیسر ہوں الحمدللہ۔ ہمیشہ والدین کو خوش رکھیں اور ان کی دعائیں لیں۔

فرحین ملک۔ (ایف ایم 105+ آرٹسٹ وائس اوور)

1- عید کا دن عام دنوں کی طرح ہی گزرتا ہے مگر مجھے ایکسائٹمنٹ بہت ہوتی ہے اور بہت دل چاہتا ہے، بہت کچھ کرنے کو......اور آج کل جو ہمارے ملک کے حالات ہیں، لگ رہا ہے کہ اس بار کچھ الگ ہی ہوگی اور اس بار ہم عید پر دوسروں کے بارے میں سوچ کر ہی گزاریں گے۔ دوسروں

کے لیے کچھ کرنے کا عزم کریں گے، بہ نسبت کہ ہم اپنے بارے میں سوچیں کہ ہمیں عید پہ کیا کرنا ہے، کیا تیاری کرنی ہے اور اس بار میری کوشش ہوگی کہ میں دوسرے لوگوں کے لیے جتنی تیاریاں کرواسکوں کرواؤں اور اس عید کو یعنی 2020 عیدالفطر کو میں نے دوسروں کے نام کیا ہے۔

2-میرے خیال میں مدرز ڈے اور فادرز ڈے کسی ایک دن نہیں بلکہ روز منانا چاہیے۔اگر میں یہ جواب دیتی تو یہ بہت ہی ڈپلومیٹک جواب ہوجاتا۔تو میرا جواب یہ ہے کہ مدرز ڈے بھی منانا چاہیے اور فادرز ڈے بھی منانا چاہیے اور اس طرح کے سارے دن منانے چاہئیں کیونکہ ہم اپنی اپنی زندگیوں میں اتنے زیادہ مصروف ہوگئے ہیں کہ ہمارے پاس روز اتنا وقت نہیں ہوتا کہ ہم روز ڈیز کو سیلیبریٹ کریں اور کچھ دنوں کی اہمیت کسی ایک دن منائے جانے میں زیادہ ہوتی ہے۔آپ اپنے والدین کے لیے، دوسروں کے والدین کے لیے اپنے فرائض پورے کریں اور روز پورے کریں لیکن ''منائے جانے'' اور ''پورے کرنے'' میں بہت فرق ہوتا ہے۔اس لیے اسپیشل دن کو اسپیشل انداز میں منائیں اور انہیں بتائیں کہ آپ ہمارے لیے کتنے اہم اور کتنے ضروری ہے اور ہماری زندگی میں آپ کی کیا اہمیت ہے۔

3-میں جب دو سال کی تھی تو میری امی کا انتقال ہوگیا تھا اور میری پرورش میرے ابو نے کی اور ان کا ساتھ میری بڑی بہن اور میرے بھائی نے دیا اور میری بڑی بہن کا کچھ ہی عرصہ قبل انتقال ہوا ہے اور اللہ زندگی رکھے میرے بڑے بھائی حیات ہیں۔میرا زیادہ وقت ابو کے ساتھ گزرا۔ میں کسی ایک دن کو بالکل ہائی لائٹ نہیں کرسکتی۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کو نہ صرف اپنے والدین کی قدر کرنی چاہیے بلکہ ان کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت بھی گزارنا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے ابا بہت بیمار ہوگئے تھے اور بستر سے لگ گئے تھے تو ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ جب دعائیں مانگ کر اور امیدیں لگا لگا کر ان کی صحت میں بہتری نہیں آرہی تھی تو میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ جو ان کے لیے بہتر ہے اور جو ہمارے لیے بہتر ہے وہ کردے......تو اس وقت کسی نے مجھ سے کہا کہ ابھی یہ بستر پر ہیں تو تم دعا کررہی ہو یا یہ ٹھیک ہوجائیں یا ان کی مشکل آسان کردے اور ہماری بھی مشکل آسان کردے......لیکن جس دن یہ نہیں ہوں گے اور اللہ نے ان کی مشکل آسان کردی تو اس دن سب سے زیادہ پچھتاوا تمہیں ہوگا کہ اور تم ہی کہو گی کہ وہ بستر پر تھے تو کم سے کم میرے پاس تو تھے۔ میں انہیں روزانہ دیکھ تو لیتی تھی۔تو جس دن میرے ابا کا انتقال ہوا تو اس دن مجھے احساس ہوا کہ ان کا سانسوں کے ساتھ ہمارے ساتھ ہونا، روزانہ ہمیں محبت بھری نظروں سے دیکھنا، ایک بہت بڑی بات تھی اور جب یہ پیاری ہستیاں ہمارے درمیان نہیں ہوتیں تو واقعی ہماری دنیا ویران ہوجاتی ہے اور ہماری زندگی بہت الگ طریقے سے گزرنا شروع ہوجاتی ہے تو والدین جس حالت میں بھی آپ کے پاس ہوں ان کی قدر کریں اور ہمیشہ کریں اور بھرپور محبت کریں۔

طاہر نذیر۔(ڈرامہ رائٹر ''ربا مینوں معاف کریں'')

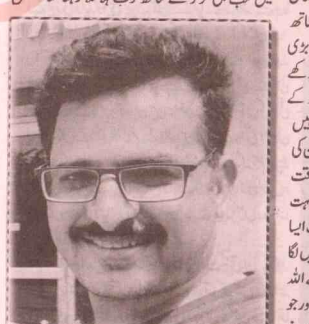

1-عید کا دن ہمیشہ سے ہی اسپیشل طریقے سے گزارتا ہوں۔ بچپن میں عید کے دن کا شدت سے انتظار رہتا تھا کیونکہ گھر کے سب بڑوں سے عیدی لینی ہوتی تھی۔ہم شروع سے ہی جوائنٹ فیملی میں رہے ہیں تو گھر میں سب ہی کزنز کے ساتھ خوب ہلا گلا رہتا تھا لیکن

اب بڑے ہوئے تو عیدیں کچھ روکھی پھیکی سی ہوگئیں۔ چند سال پہلے تک تو عید کا دن سو کر ہی گزرتا تھا لیکن پچھلی چند عیدوں سے اگر نیند آئے بھی تو نہیں سوتا کہ فیملی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزر سکے۔اس لیے کوشش ہوتی ہے کہ کچھ نہ کچھ اسپیشل ضرور ہو، سب پھر سے ایک ساتھ اکٹھے ہوجائیں اور بالکل ویسی ہی عید ہو جیسی بچپن میں ہوا کرتی تھی۔آج کل عید دینی ہوتی ہے تو عید کی نماز کے بعد سب سے پہلے بچوں کو عیدی دیتا ہوں پھر کوکنگ کرتا ہوں۔ ماشاءاللہ سے مجھے کوکنگ کا بہت شوق ہے۔ میرے لیے تو عید کا دن ہمیشہ ہی اسپیشل رہا ہے۔سب سے ملنا، کھانا پینا اور ہلا گلا ......عید کے تینوں دن بس فیملی کے ساتھ گزارتا ہوں۔ ان تین دنوں میں کہیں باہر نہیں جاتے، کسی دوست سے نہیں ملتے، بس گھر اور فیملی۔

2-مجھے لگتا ہے کہ مدرز ڈے اور فادرز ڈے منانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ایک طرح سے اس بزی ہوتی لائف میں اچھا ہی ہے کہ ہم یہ دن مناتے ہیں۔آج کل لائف تیز سے تیز تر ہوتی جارہی ہے اور وقت بھی کم ہی ہوتا ہے تو ان دو دنوں کو منانا چاہیے۔لیکن والدین کے ساتھ گزارنے کے لیے وقت کو دنوں پر محدود نہ کریں۔ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اگر وہاں یہ روایت قائم کردیں کہ والدین کے ساتھ بس یہ ہی دن منانے ہیں تو باقی پورا سال اپنی زندگی میں ان کو مڑ کر پوچھیں بھی نہ تو میری نظر میں یہ والدین کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان دو ہستیوں کی وجہ سے ہی ساری خوشیاں ہیں اور ان ہی کی وجہ سے آج ہم اعلا مقام پر ہیں۔ان کو دو دنوں کے لیے محدود کرنا غلط ہے۔اولاد کو چاہیے ان کے ساتھ وقت گزاریں، گپ شپ کریں اور ان کی قدر کریں کہ آج ہم جو کچھ ہیں، ان ہی کی وجہ سے ہیں۔ ہماری کامیابی ان ہی کی مرہون منت ہے۔

3-والدین کے ساتھ گزرا ہر پل یادگار ہے۔ہم آج بھی والدین کے ساتھ بالکل ویسے ہی ہیں جیسے بچپن میں تھے۔ شرارتیں، ہنسنا، ساتھ کھانا پینا......ویسے تو جاب کی وجہ سے زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتا ہوں لیکن جب چھٹی پر گھر میں ہوتا ہوں تو زیادہ وقت والدین کے ساتھ ہی گزرتا ہے۔ہم آج بھی ناشتا، لنچ اور رات کا کھانا سب ایک ساتھ ہی کھاتے ہیں۔اپنے گھر کی یہ روایت مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔آپ بھی اپنے والدین کے ساتھ وقت گزاریں، محبتیں سمیٹیں، محبتیں لٹائیں اور پرسکون رہیں۔والدین کی خدمت میں بڑی تسکین اور سکون ہے اور یہی زندگی کی خوب صورتی ہے۔

انعم تنویر (آرٹسٹ)

1-عید کا دن تو ویسے ہی ایکسائٹنگ ہوتا ہے۔

کھانے بنتے ہیں مزے مزے کے۔ دوستوں اور رشتے داروں کا آنا جانا رہتا ہے، پھر عیدی بھی ملتی ہے۔ مطلب یہ ساری خوشیاں عید کی خوشیوں کو دوبالا کردیتی ہیں۔

2-میں سمجھتی ہوں کہ مدرز ڈے اور فادرز ڈے منانے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ جس طرح آپ اپنا برتھ ڈے مناتے ہیں اسی طرح ہم اپنے والدین کے دن بھی مناتے ہیں۔ بہت سارے تہوار ہیں جن کے لیے ایک دن مقرر ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ماں باپ کا دن تو روز منانا چاہیے۔ ہر دن کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے اور پھر یہ تو محبت کے اظہار کا ایک طریقہ ہے۔تو ضرور منانے چاہئیں یہ دن۔

3-زیادہ تر تو میں کام میں ہی مصروف رہتی ہوں، ان کے ساتھ بیٹھنے کا اور وقت گزارنے کا زیادہ وقت نہیں ملتا۔ مگر جب بھی وقت ملتا ہے ان ہی کے ساتھ گزارتی ہوں۔ گپ شپ کرتی ہوں، تو

بہت اچھا لگتا ہے، بہت مزا آتا ہے۔ خدا سلامت رکھے سب کے والدین کو اور ہم ان کے دن مناتے رہیں۔

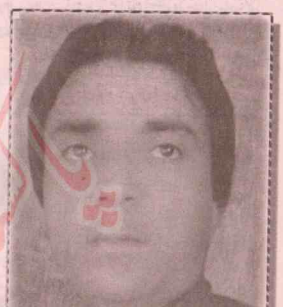

وقاص عمر (کالمسٹ)

1- میرے لیے عید کا دن ایک روحانی مسرت لے کر آتا ہے۔ جس میں سب عزیزوں سے مل بیٹھنے کا موقع ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ عید کا دن صرف ایک دن ہی نہیں، میرے لیے چاندرات سے لے کر عید کے تینوں دن بہت خوشی اور تفریح کے دن ہوتے ہیں۔ میں ایک تنہائی پسند انسان ہوں لیکن عید پر جہاں تک ممکن ہوتا ہے، دوست احباب اور رشتے داروں سے ملنے کی کوشش کرتا ہوں۔

2- جی...... میں اس کی مکمل حمایت کرتا ہوں۔ تمام تر یورپی ایونٹس میں یہ ایونٹس مجھے سب سے زیادہ پسند ہیں کیونکہ ہمارے ماں باپ سب سے زیادہ اس چیز کے حق دار ہیں کہ ان کے لیے کچھ خاص اہتمام کیا جائے کیونکہ یہ وہ ہستیاں ہیں جو اپنی شفقت کے سائے میں لپیٹ کر ہمارے ہر دن کو خاص بناتی ہیں۔

3- امی ابو کے ساتھ گزرا ہر لمحہ یادگار ہے، ان کے ساتھ گزرے وقت کو کسی ایک پیرائے میں بیان کرنا مشکل ہے لیکن سب بچوں کی طرح میرا بچپن کا زمانہ بہت یادگار ہے۔ مجھے یاد ہے کہ اسکول سے چھٹی کرنے کی بالکل بھی اجازت نہیں تھی تو اس وقت امی ابو دونوں "جلاد" کے روپ میں نظر آتے تھے مگر میں امی ابو کے اس وقت کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر ہمیں کسی قابل بنا دیا۔

ثناء فیصل (اینکر نیوز چینل "اب تک")

1- میرا عید کا دن بہت اچھا گزرتا ہے۔ چاند رات کو مہندی لگاتی ہوں اور مہندی کی خاطر پوری رات ہی جاگنا پڑتا ہے۔ گھر والوں کے کپڑے پریس کرنا، شیر خرما بنانا ہوتا ہے۔ کچھ پکوان پکا کر فریز کر دیے جاتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ رمضان المبارک میں عید کی آمد سے پہلے گھر کی صفائی بہت ہوتی ہے۔ عید کے دن عید کی نماز کے بعد جب مرد حضرات گھر آتے ہیں تو ہم سب سسرال میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ بڑا خوب صورت ماحول ہوتا ہے۔ عیدی دی بھی جاتی ہے اور عیدی لی بھی جاتی ہے۔ جو ملک سے باہر ہوتے ہیں ان سے ویڈیو کال پر بات کی جاتی ہے۔ بہت ایکسائٹمنٹ ہوتی ہے، بہت اچھا لگتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد واپسی ہوتی ہے اور پھر میں اپنی امی کے گھر جاتی ہوں۔ وہاں رات کے کھانے کا اہتمام امی نے اور بھابھی نے کیا ہوتا ہے اور پھر لیٹ نائٹ واپسی ہوتی ہے تو اس طرح ہمارا عید کا دن بہت اچھا گزرتا ہے۔ بہت انجوائے کرتے ہیں۔

2- یوں تو سارا سال ہی ان کو یہ احساس دلانا چاہیے کہ آپ ہمارے لیے کتنے اہم ہیں، کتنے قیمتی ہیں مگر پھر بھی میرا خیال ہے کہ ایک دن ان کے لیے ہونا چاہیے، اس لیے کہ جس طرح عید کا دن ہے، جس طرح ہماری سالگرہ کا دن ہوتا ہے اسی طرح والدین کا بھی دن ہونا چاہیے۔ جس میں آپ ان کو فل پروٹوکول دیں۔ گفٹ دیں، کیک کاٹیں اور پورا دن ان کے ساتھ گزاریں۔ تو میری نظر میں مدرز اور فادرز ڈے منانے چاہئیں۔

3- جب والدین حیات ہوتے ہیں تو بڑی تسلی ہوتی ہے کہ آپ کے لیے کوئی دعا کرنے والا ہے اور میں تو یہ کہوں گی کہ میری کامیابی میں میرے والدین اور میری ساس کی دعائیں اور ان کی حوصلہ افزائی شامل ہے۔ اپنے ابو کی تو میں بہت زیادہ لاڈلی ہوں کہ وہ میرے دوستوں کی طرح ہیں بلکہ دوست ہیں۔ میں اپنی ایک ایک بات اپنے ابو سے شیئر کرتی ہوں اور ابو بھی بڑے صبر اور ذوق وشوق کے ساتھ میری باتیں سنتے ہیں۔ امی سے تھوڑی کھٹ پٹ ہو جاتی ہے کہ آپ بھائی سے زیادہ پیار کرتی ہیں، مجھ سے کم کرتی ہیں۔ ان سے شکوہ شکایت چلتے رہتے ہیں اور میری ساس اللہ ان کے درجات بلند کرے، انہوں نے مجھے سپورٹ کیا۔ ان ہی کی وجہ سے میں اعلا تعلیم حاصل کر پائی اور میں نے سچی کہانیاں اور افسانے خواتین ڈائجسٹ اور پاکیزہ ڈائجسٹ میں لکھنا شروع کیے تو ان ہی کی حوصلہ افزائی سے اور میں اس وقت اصفہ کے نام سے لکھا کرتی تھی کیونکہ سب مجھے اصفہ بلاتے تھے اور آج اگر میری اردو اچھی ہے تو اس کا کریڈٹ بھی میں خواتین، شعاع اور کرن کو دینا چاہوں گی۔ ہم چھوٹے چھوٹے تھے تب سے ہمارے گھر میں یہ ڈائجسٹ آتے تھے۔ اس وقت اجازت نہیں تھی پڑھنے کی مگر میں نویں کلاس میں آئی تب مجھے ڈائجسٹ پڑھنے کی اجازت ملی تو میرا ان تینوں ڈائجسٹوں سے بہت پرانا رشتہ ہے۔

مصباح نوشین (ڈرامہ رائٹر+افسانہ نگار)

1- عید کا دن ہمیشہ کی طرح ایکسائٹڈ ہی ہوتا ہے اور عید کا دن بہت مصروف گزرتا ہے۔ ہم سب لوگ گاؤں میں جمع ہوتے ہیں اور سب ہی بہت انجوائے کرتے ہیں۔ عید کے دوسرے دن میری بہن مہرین آجاتی ہے اور ہم مل کر امی کے گھر عید ملنے جاتے ہیں۔ سسرال میں انواع واقسام کے کھانے بنتے ہیں اور ایک دوسرے کی دعوتیں کی جاتی ہیں۔

2- مدرز ڈے اور فادرز ڈے منانا مجھے بہت پسند ہے۔ میرے بچے بھی مجھے اور اپنے پاپا کے لیے کارڈز بنا کے وش کرتے ہیں۔ میں اپنے امی ابو کو لازمی گفٹ دیتی ہوں جو زیادہ تر موسم کی مناسبت سے کپڑوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ والدین جیسا پیارا رشتہ جس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ اللہ سب کے والدین کو صحت کے ساتھ سلامت رکھے، آمین۔ ان سے محبت کا اظہار ہر روز نہ سہی مگر ایک اسپیشل طریقے سے کرنا ہمارا فرض ہے۔ جو کچھ ہمارے والدین ہمارے لیے کرتے ہیں، اولاد تو اپنی ساری عمر میں آدھا بھی نہیں کر سکتی۔

3- میرے پاس تو یادوں کا انبار ہے۔ میری امی ابو دونوں سے ہی بہت دوستی ہے۔ میں آج جو کچھ ہوں، اپنے والدین کی دعاؤں کی بدولت ہوں۔ اللہ پاک ان کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ سلامت رکھے، آمین۔ کوئی ایک واقعہ نہیں ہے، بہت واقعات ہیں۔

☆☆

سرورق کی شخصیت

ماڈل ——— صائمہ انصار

میک اپ ——— روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ——— موسیٰ رضا

اعتذار

اس ماہ ناگزیر وجوہات کی بنا پر نگہت عبداللہ "ہوائیں رخ بدل گئیں" کی قسط نہیں لکھ سکیں۔ اس ماہ ان کی قسط شامل اشاعت نہیں ہے۔ اس لیے قارئین سے معذرت۔ ان شاءاللہ آئندہ ماہ بہنیں "ہوائیں رخ بدل گئیں" کی قسط پڑھ سکیں گی۔

میری بھی سنیئے

نعمان سمیع

شاہین رشید

1 ''میرا نام؟''

☆ ''نعمان سمیع۔''

2 ''دوست احباب بلاتے ہیں؟''

☆ ''نومی، مانی اور شاہ میر اور جس کا جو دل چاہتا ہے بلا لیتا ہے۔''

3 ''کہاں اور کب جنم لیا؟''

☆ ''3 مئی کو کراچی میں جنم لیا۔ اس لحاظ سے میرا ستارہ ٹورس ہے۔''

4 ''گھر میں میرا نمبر؟''

☆ ''میری دو بہنیں ہیں اور میں ہوں۔ میرا نمبر پہلا ہے۔ اس لیے مجھ پر ان کی کچھ ذمہ داریاں ہیں جو مجھے پوری کرتی ہیں۔''

5 ''تعلیمی ڈگریاں؟''

☆ ''ڈگریاں نہیں ہے۔ ڈگری ہے اور میں نے یو کے UK سے ''اے سی سی اے'' کیا ہے اور وہاں ایک آڈٹ کمپنی میں چھ سال جاب بھی کی ہے۔ بہ حیثیت آڈیٹر کے۔''

6 ''شادی؟''

☆ ''ابھی نہیں کی، کچھ کما لوں، کچھ بینک بیلنس بڑھا لوں۔''

7 ''شوبز میں متعارف کرایا؟''

☆ ''کسی نے نہیں۔ اپنی محنت سے آیا۔ پہلے ایک کورس کیا اداکاری میں۔ پھر کئی جگہوں پہ آڈیشنز دیے۔ اللہ نے کامیاب کیا۔ تو آفرز آنی شروع ہوئیں۔''

8 ''پہلا ڈرامہ سیریل؟ شہرت ملی؟''

☆ ''پہلا ڈرامہ سیریل ''دلدل'' تھا اور جس ڈرامے نے مجھے شہرت دی وہ سوپ تھا اور ''ماں صدقے'' اس کا نام تھا اس میں میں نے نومی کا رول کیا تھا۔''

9 ''شوبز کا ماحول؟''

☆ ''اتنا برا نہیں جتنا لوگ کہتے ہیں۔ اور اچھائیاں برائیاں کہاں نہیں ہوتیں۔''

10 ''لمبی نیند سوتا ہوں؟''

☆ ''بالکل، آٹھ یا چھ گھنٹے کی نیند لازمی لیتا ہوں، اس سے طبیعت فریش ہو جاتی ہے۔''

11 ''میری ایک عادت ہے کہ؟''

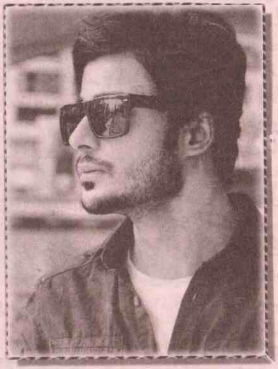

☆ ''جب مجھے کسی بات کی ضد سوار ہو جائے تو پھر میں وہ کر کے ہی رہتا ہوں۔ میرا دھیان اسی طرف لگا رہتا ہے۔ تھوڑا ضدی ہوں۔''

12 ''جب پہلی بار کیمرا فیس کیا تو؟''

☆ ''اف......! تو بہت نروس تھا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کیمرا فیس کروں خوش بھی تھا۔''

13 ''بیماری کو سیریس لیتے ہیں؟''

☆ ''ارے نہیں...... چھوٹی موٹی بیماری کی پروا نہیں کرتا۔ بس ڈرتا ہوں تو بڑی بیماری سے...... اللہ اس سے محفوظ رکھے۔''

14 ''کچن میں میرا حصہ......؟''

☆ ''ارے نہیں...... میری بہنیں میری امی، میرے بہت ناز اٹھاتی ہیں ان کے ہوتے ہوئے کچن کا رخ نہیں کرتا۔''

15 ''اگر شوبز میں کامیاب نہ ہوتا تو؟''

☆ ''تو پھر اپنے والدین کے پاس سعودی عرب میں ہوتا اور جاب کر رہا ہوتا۔''

16 ''کھانے میں میٹھا جو پسند ہے؟''

☆ ''چاکلیٹ...... بہت پسند ہے مجھے۔''

17 ''الارم بجتے ہی بستر چھوڑ دیتا ہوں؟''

☆ ''نہیں...... ٹائم لگتا ہے، بلکہ بعض اوقات کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔''

18 ''سونے سے پہلے کیا کام لازمی کرتا ہوں؟''

☆ ''یا تو نہا کر سوتا ہوں یا پھر منہ ہاتھ پاؤں دھو کر سوتا ہوں۔ تاکہ سارے دن کی دھول مٹی ختم ہو جائے۔''

19 ''بچپن میں کیا چیزیں سنبھال کر رکھتا تھا؟''

☆ ''اپنی تصاویر اور گھر والوں کی اور اپنے ویڈیو گیمز اور یہ چیزیں آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔''

20 ''سوری کر لیتا ہوں؟''

☆ ''اگر میری غلطی ہو تو۔''

21 ''اکثر نقصان اٹھاتا ہوں؟''

☆ ''سچ بول کر...... اگر جھوٹ بولوں تو اتنا نقصان نہ ہو۔ مگر پھر سوچتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ

ہمیشہ سچ کی فتح ہوتی ہے۔"

22 "اپنی کمائی سے اپنے لیے کیا خریدا؟"

☆ "میں نے ایک اچھی سی "کار" خریدی۔"

23 "کیا کھانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں؟"

☆ "اچھا کھانا کھانے کے لیے اور اپنی پسند کا میٹھا کھانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔"

24 "نیند نہیں آتی؟"

☆ "ایسا کچھ نہیں ہے۔ نیند بڑے آرام وسکون کے ساتھ آجاتی ہے۔ یہ نہیں کہوں گا کہ اس کے بنا نیند نہیں آتی یا اس کے بنا نیند نہیں آتی۔ تھکاوٹ ہو، کام کی تسلی ہو تو نیند آرام سے آجاتی ہے۔"

25 "کھانے کی میز پر کیا چیز ہونا ضروری ہے؟"

☆ "میٹھا...... کوئی بھی اچھا پکا ہوا میٹھا۔ ویسے بھی میٹھا کھانا سنت ہے۔"

26 "اپنے گھر میں پسندیدہ جگہ؟"

☆ "میرا اپنا کمرا...... سکون مل جاتا ہے۔ اپنا کمرا بہت بڑی نعمت ہے۔"

27 "کبھی برا وقت گزرا؟"

☆ "کبھی......! بہت بار برے وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ بس اللہ اپنا کرم رکھے۔"

28 "باربی کیوں میں کیا پسند ہے؟"

☆ "گرلڈ چکن...... کسی بھی وقت مل جائے کھالوں گا۔"

29 "ہمیشہ یاد رکھتا ہوں؟"

☆ "بہنوں کی سالگرہ۔ والدین کی شادی کی سالگرہ اور اپنی سالگرہ ہمیشہ یاد رکھتا ہوں اور سیلبریٹ بھی کرتا ہوں۔"

30 "گھر آتے ہی دل چاہتا ہے کہ......؟"

☆ "بس اپنا بیڈ ہو اور میں ہوں۔ آرام کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

31 "اگر جہاز کا فری ٹکٹ ملے تو کہاں جاؤں گا؟"

☆ "میں تو سعودی عرب جاؤں گا۔ گھر والوں سے بھی ملاقات ہوجائے گی اور عمرہ بھی کرلوں گا۔"

32 "تعلیم کس کے لیے زیادہ ضروری ہے؟"

☆ "میرے خیال سے لڑکیوں کے لیے۔ جو لڑکیاں تعلیم ادھوری چھوڑ کر شادی کرلیتی ہیں وہ غلط کرتی ہیں لڑکوں کو تو تعلیم حاصل کرنے ہی چاہیے مگر لڑکیوں کو ضرور حاصل کرنی چاہیے۔"

33 "قسمت سے ملتا ہے یا محنت سے؟"

☆ "دونوں سے...... محنت تو بہت لوگ کرتے ہیں بس قسمت بھی اچھی ہونی چاہیے۔"

34 "بھوک لگے تو......؟"

☆ "شدید بھوک لگنے کی نوبت ہی نہیں آتی، میں ویسے ہی کچھ نہ کچھ کھاتا رہتا ہوں۔"

35 "میری پہلی جاب؟"

☆ "جب لندن میں اعلا تعلیم حاصل کرنے گیا تھا تو اپنی پڑھائی اور گزر اوقات کے لیے جو پہلی جاب میں نے کی تھی وہ "میکڈونلڈ" میں کی تھی اور اس وقت میں صرف اٹھارہ سال کا تھا۔"

36 "کوئی بھی خبر ہو، کس کو جا کر سناتا ہوں؟"

☆ "اگر تو اچھی خبر ہے تو گھر میں جا کر با آواز بلند سب کو سناتا ہوں...... اور اگر خدانخواستہ کوئی بری خبر ہے تو پھر اسے اپنے تک ہی محدود رکھتا ہوں۔"

37 "مجھے فخر ہوا اپنے آپ پر؟"

☆ "جب مجھے ڈگری ملی۔ جب میری پروموشن ہوئی۔ جب مجھے جاب ملی۔ مجھے اپنی ہر کامیابی پر اپنے آپ پر فخر ہوتا ہے۔"

38 "وقت اور زندگی سے کیا سیکھا؟"

☆ "وقت سے یہ سیکھا کہ وہ کسی کا نہیں ہوتا، آتا ہے اور گزر جاتا ہے اور زندگی سے یہ سیکھا کہ اسے صبر کے ساتھ برداشت کے ساتھ اور قرینے کے ساتھ گزاریں تو آپ بہت خوش رہ سکتے ہیں۔"

39 "فلمیں کس طرح کی بننی چاہئیں؟"

☆ "ایسی فلمیں...... جو ہماری ثقافت کو دنیا

کے سامنے پیش کریں نہ کہ دوسروں کے کلچر کی عکاسی کریں...... بننی چاہئیں۔"

40 "بچت کرتا ہوں؟"

☆ "بس کرلیتا ہوں۔ کیش کی صورت میں ہی کرتا ہوں تاکہ بہ وقت ضرورت کام آئے۔"

41 "میرے آن ایئر ڈرامے؟"

☆ "میرا دل میرا دشمن" اور "تیرا یہاں کوئی نہیں"......"

42 "مشورہ کس سے لیتا ہوں اور مانتا کس کی ہوں؟"

☆ "مشورہ گھر والوں سے لیتا ہوں، مگر کرتا وہی ہوں جو میرا دل کہتا ہے اور دل ہمیشہ صحیح مشورہ دیتا ہے۔"

43 "غصہ آتا ہے؟"

☆ "جب صبح جلدی اٹھنا پڑے...... بہت مشکل ہوجاتی ہے۔"

44 "پاکستان میں کیا کمی محسوس ہوتی ہے؟"

☆ "پاکستان میں اچھے لوگوں کی، اچھے حکمرانوں کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ اگر ہمارے ملک کو بھی اچھے اور مخلص لوگ مل جائیں تو ملک بہت ترقی کرے گا۔"

45 "کوئی برا کرے تو؟"

☆ "دل چاہتا ہے اس سے بدلہ لوں۔ مگر پھر کہتا ہوں کہ چلو چھوڑو کیا بدلا لینا۔"

46 "فریش ہوجاتا ہوں جب؟"

☆ "جب میری نیند پوری ہوجاتی ہے۔"

47 "دنیا میں اللہ کا بہترین گفٹ؟"

☆ "آپ کے جو بھی بلڈ ریلیشن لوگ ہیں۔ جیسے ماں باپ، بہن بھائی وغیرہ۔"

48 "میری خواہش ہے کہ؟"

☆ "کہ میں ایک ورسٹائل فنکار بنوں۔ ہر طرح کے رول کروں۔"

49 "کیا کھانا اہتمام کے ساتھ کھاتا ہوں؟"

☆ "گھر سے باہر تو اہتمام کے ساتھ کھاتا ہوں۔ مگر جب گھر پر ہوتا ہوں تو کھانے کا مزا اپنے بیڈ پر ہی آتا ہے۔"

50 "میری فیوچر پلاننگ؟"

☆ "فی الحال کچھ نہیں...... ابھی تو جیسا چل رہا ہے اچھا چل رہا ہے۔ اس سے بہتر وقت کوئی نہیں ہے۔"

☆☆

مقابل ہے آئینہ

صفیہ مہر

ادارہ

س ''اصلی نام کیا ہے؟ گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟''

ج ''میرا نام صفیہ مہر ہے گھر میں سب صفی اور میری نانی پیار سے صفو کہتی تھیں بڑا اچھا لگتا تھا۔''

س ''آئینہ آپ سے کیا کہتا ہے؟''

ج ''آئینہ کہتا ہے، خوب صورت ہو؟ مگر توجہ دو مکمل حسن ہو گا۔''

س ''حسین صورتیں دیکھ کر دل میں کیا خیال آتا ہے؟''

ج ''بڑا اچھا خیال آتا ہے (ہنستے ہوئے) ہم لڑکیوں کو بس یہ ہی خیال آتا ہے کہ اس سے پوچھ نالوں کو یہ کون سی کریم لگاتی ہے۔''

س ''اگر آپ کے پرس کی تلاشی لی جائے تو؟''

ج ''میرے پرس میں پیسے کچھ بندے، ٹاپس، کچھ گھر سے توڑے پھول، دو عدد ٹشو ملیں گے۔''

س ''بھوتوں سے ڈرتی ہیں؟''

ج ''بڑا ڈرتی ہوں، اکیلے میں گھر کے ایک پورشن سے دوسرے میں جاتے ہوئے بھی خوف کھاتی ہوں کہ کہیں بھوت نہ اڑتے پھر رہے ہوں۔''

س ''مہمان کیسے لگتے ہیں؟''

ج ''لیڈیز اچھی لگتی ہیں مگر مہمان مردوں سے بہت عاجز ہوں۔''

س ''کھانے میں کیا پسند ہے؟''

ج ''ماسوائے میٹھے کے باقی سب کھانے پسند ہیں۔''

س ''اگر آپ کو حکومت مل جائے تو کیا کریں گی؟''

ج ''مجھے حکومت ملی تو عورتوں سے کھانا بنانا بند کروا دوں گی، کھانا پکانا خاص کر روٹیاں بنانے سے جان جاتی ہے میری۔''

س ''پسندیدہ شاعر؟''

ج ''اعتبار ساجد، محسن نقوی، احمد فراز۔''

س ''مزاجاً لڑاکا ہیں؟''

ج ''بہت، مگر بلاوجہ نہیں لڑتی، لیکن جب لڑتی ہوں، تو بہت روتی ہوں بعد میں۔''

س ''گھر سے باہر جاتے ہوئے کیا کیا چیزیں ساتھ رکھتی ہیں؟''

ج ''پیسوں سے بھرا کلچ...... اور اوڑھنے کے لیے چادر، اصل میں شاپنگ والی حالت بتائی ہے، کہیں ہم زیادہ نہیں جاتے۔''

س ''کس مزاج کے لوگ پسند ہیں؟''

ج ''سادہ طرز کے لیکن مزاح سے پر...... مجھے سنجیدہ لوگوں سے خار آتی ہے۔ (سب سنجیدہ بہنوں سے معذرت)۔''

س ''اگر لوڈشیڈنگ نہ ہوتی تو؟''

ج ''پھر اتفاق نہ ہوتا، ہم گاؤں والے بجلی جانے کی صورت میں کمروں سے باہر آکر سب گپ شپ لگاتے ہیں۔''

س ''اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کا سب سے بہترین طریقہ، وقت؟''

ج ''جب زندگی ہمیں محرومیاں تھماتی ہے تب اللہ بہت یاد آتا ہے وقت کوئی بھی ہو بہترین ہو جاتا

ہے جب ہم اللہ کو یاد کرتے ہیں۔''

س ''آپ کفایت شعار ہیں یا فضول خرچ؟''

ج ''میں بہت کنجوس ہوں، کتنی بھی کوشش کر لوں، مگر خرچ نہیں کر پاتی۔ کفایت شعاری اگر بچت کا نام ہے تو پھر میں کفایت شعار بھی ہوں۔''

س ''کیا نام شخصیت پر اثر انداز ہوتا ہے؟''

ج ''جی ہاں۔''

س ''وہ کون سے کام جن کو کرتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دنیا کیا کہے گی؟''

ج ''ہم لڑکیاں ویسے بھی کوئی کام کریں تو دنیا سے ضرور خوف کھاتی ہیں، مگر میں زیادہ باتونی ہوں لیکن دنیا کیا کہے گی سوچ کر خاموشی کو زبردستی اوڑھے رکھتی ہوں۔''

س ''آپ کسی سنسان راستے سے گزر رہی ہوں اور کتا پیچھے لگ جائے تو؟''

ج ''بہت زیادہ بھاگوں گی، جب تک گھر نہ آجائے گا تب تک کتا بھی تھک کر پیچھا چھوڑ دے گا۔ (آئیڈیا برا نہیں ہے آپ ضرور آزمائیں)۔''

س ''آپ کی نظر میں محبت کیا ہے؟''

ج ''آگ کا دریا۔''

س ''کن لوگوں کی احسان مند ہیں؟''

ج ''اپنے ماں، باپ اور چھوٹے بھائی آصف کی جس نے میری ہر خواہش پوری کی۔''

س ''اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے؟''

ج ''بہت اتنی کہ آنسو آجاتے ہیں۔ جب میرے ابو اور میرے بھائی میرے ہر کام کو سراہتے ہیں۔''

س ''ڈرامے دیکھتی ہیں؟''

ج ''جی ہاں۔ مگر موبائل پر ڈاؤن لوڈ کر کے پھر ایک ساتھ اقساط دیکھتی ہوں (صبر کی کمی جو ہے)۔''

س ''اگر دوست ناراض ہو جائے تو کیسے مناتی ہوں؟''

ج ''میں دوست بنانے میں بدقسمت ہوں ایک دوست ہے مگر بہت اچھی مجھے برداشت کر جاتی ہے آج تک ناراض نہیں ہوتی اس لیے منانے کا تجربہ نہیں۔''

س ''حقیقی خوشی کس وقت حاصل ہوتی ہے؟''

ج ''اپنوں کو آسودہ دیکھ کر۔''

س ''زندگی سے کیا سبق سیکھا؟''

ج ''کہ سب بلند لوگوں کو مزید بلند کرتے ہیں، ہارنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں کھڑا ہوتا مسلسل ہار کے بعد جب تھک کر ہم اٹھتے ہیں تب جیت مقدر بنتی ہے یہی سبق سیکھا۔''

س ''ستاروں پر یقین رکھتی ہیں؟''

ج ''قطعاً نہیں......''

س ''کوئی آخری بات؟''

ج ''کہ ہم جیسے نیو ٹیلنٹ کو بھی کرن میں جگہ دیں۔''

س ''کوئی ایسی بات جو مسلسل ذہن میں رہتی ہے؟''

ج ''کہ کاش میں تعلیم کے امبر پر کم روشن سہی مگر ستارہ ہوتی اور یہ کہ میں نام پیدا کروں، کسی بھی ہنر کو لے کر۔''

☆☆

قارئین اور ایجنٹ حضرات متوجہ ہوں

موجودہ حالات کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر پرچے کا حصول دشوار ہو گیا ہے اگر آپ کو پرچے کے حصول میں کوئی دشواری ہو یا پرچا نہ مل رہا ہو تو درج ذیل نمبر پر رابطہ کریں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل جائے گا۔

ایجنٹ حضرات بھی پرچے کے سلسلے میں کوئی بھی معلومات یا آرڈر دینے کے لیے اس واٹس ایپ نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

0317-2266944

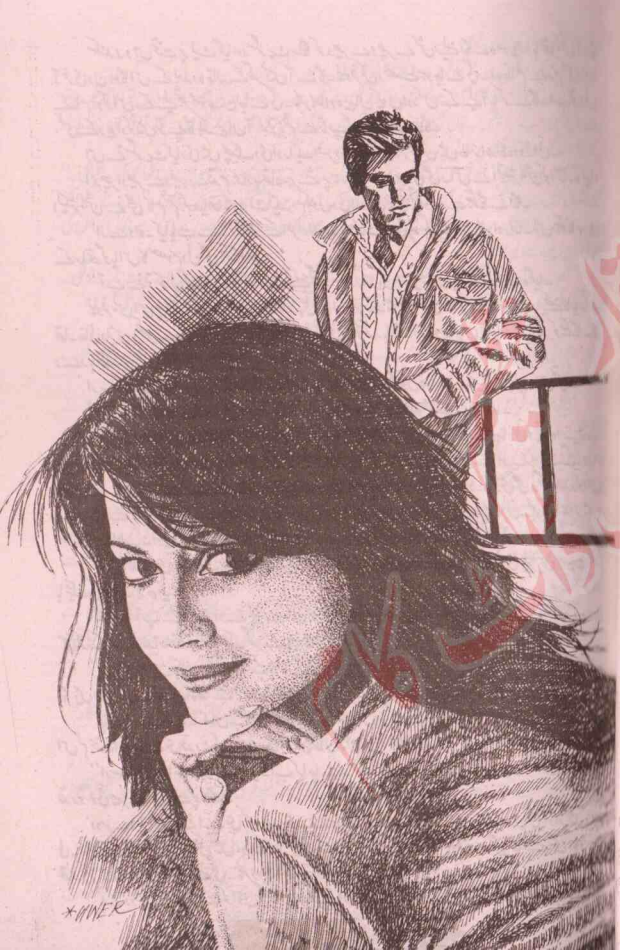

آسیہ مرزا

میرے ہم نفس، میرے ہم نوا

حیات علی کی تین بیٹیاں تھیں۔ یہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔ راحیلہ بیگم کے سگھڑاپے کا منہ بولتا ثبوت۔ اولاد کی تربیت میں کہیں کوئی کسر نہ رکھی تھی۔ نیلوفر تو تھی ہی ماں کی طرح صابر وشاکر اور ارسلہ نے اس کا لقب قانع آپا رکھ دیا تھا۔ اریبہ چھوٹی فرسٹ ائیر کی طالبہ تھی۔ بس پڑھائی اور موبائل گیمز سے دلچسپی تھی مگر اماں کا دردسر تو ارسلہ تھی۔

نیلوفر کی منگنی جہاں ہوئی تھی وہ لوگ بہت لالچی تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی مطالبہ کرتے رہتے تھے۔ ارسلہ کو اس کی خالہ کا بیٹا سکندر پسند کرتا ہے لیکن غربت کی وجہ سے ارسلہ اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔

مہوش جیلانی اور اکبر جیلانی کے دو بچے ہیں، رومی اور آبص۔ آبص ایک حادثہ کی وجہ سے اپنی زندگی سے بےزار ہے۔

چھٹی قسط

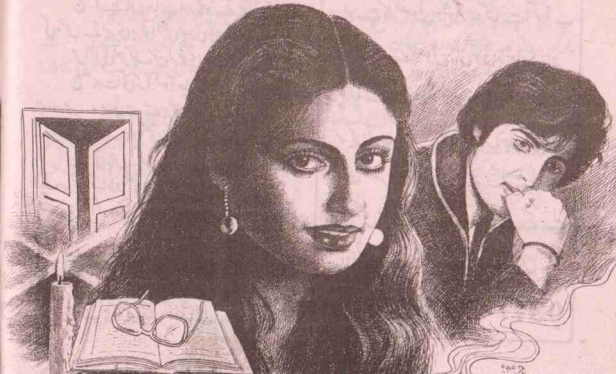

سکندر وہیں تخت پر لیٹ گیا اور سگریٹ سلگا کر دھیرے دھیرے کش لینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا بس آج آخری دن ہوگا اس کے بعد وہ خالہ کے گھر نہیں آئے گا۔ نیلوفر کل رخصت ہو جائے گی۔ وہ ظالم بے رحم کسی اور کے نام ہو کر اس کے لیے شجر ممنوعہ بن جائے گی۔ پھر بھلا وہ یہاں کیوں اور کس کے لیے آیا کرے گا۔ اب تو دل کسی کے دیدار کو نہیں تڑپے گا بلکہ یہاں آ کر تو زخم سے تڑپ کر رہ جایا کرے گا۔

اس نے سگریٹ کیاری میں پھینک دی اور ایک افسردہ سی سانس بھر کر صحن میں طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے قدم جما رہا تھا۔ ہر شے پر تاریکی مسلط ہو رہی تھی۔ اس نے الیکٹریشن کو اشارہ کیا، الیکٹریشن نے بھی کام ختم کر دیا تھا پھر لائٹ یک دم کھول دی اور صحن برقی قمقموں سے جگمگانے لگا۔

"ارے واہ۔ کیا بات ہے۔" نیلوفر کے ہمراہ اریبہ پارلر سے لوٹی تو گھر کا نقشہ ہی اور تھا۔ اس جگمگاہٹ کے ساتھ گویا اس کا معصوم دل بھی جگمگا اٹھا۔

"آپ نے تو کمال کر دیا۔" وہ سکندر سے کہنے لگی۔ سکندر اس کی اس ستائش پر فقط مسکرا کر رہ گیا۔

نیلوفر بس اس پر ایک نظر ڈال کر سیدھا اندر چلی گئی اور کمرے میں جا گھسی۔ اس میں سکندر کو دیکھنے کا یارانہ تھا۔ خالی دامن، بکھرے دل کے ہمراہ وہ اس گھر کی خوشیاں شیئر کر رہا تھا۔ اپنی ویرانیاں چھپا کر اس گھر کو جگمگائے دے رہا تھا۔

اریبہ سکندر کے اردگرد ہی منڈلا رہی تھی۔ سکندر کو جانے کیوں اب محسوس ہوا گویا وہ اس کی توجہ چاہ رہی تھی۔

"جاؤ جا کر کپڑے چینج کرو۔ تم کو نیلوفر کے سسرال جانا ہے ابھی۔" وہ شفقت سے بولا۔

وہ آج خالہ اور اماں کے ہمراہ نیلوفر کے سسرال جا رہی تھی دولہا کی چیزیں اور ساری پہناوُنی وغیرہ دینے۔

"میرا ہیئر اسٹائل کیسا ہے۔" وہ اس کے سامنے آ کر اپنے کھلے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ گھنے دراز بال آئرن سے چمک دار بنائے، ہلکے ہلکے میک اپ میں وہ یک دم بہت بڑی بڑی دکھائی دے رہی تھی۔ مگر سکندر کو اس کے سراپے سے کہیں زیادہ اس کے لہجے اور اس کے انداز میں بڑا پن محسوس ہوا۔ وہ آج سے پہلے اس لہجے اور انداز میں سکندر سے مخاطب نہ ہوئی تھی۔ نہ اپنی ذات کے حوالے سے اس طرح کوئی سوال کیا تھا نہ رائے لی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہو۔ اب جاؤ اور تیار ویار ہو جاؤ۔" وہ اسی مشفقانہ لہجے میں کہہ کر اپنی چیزیں سمیٹ کر بائیک کی طرف بڑھ گیا۔

"ابھی تو آپ کے لائے ہوئے کپڑے پہن کر اور بھی اچھی لگوں گی۔" وہ اترا کر کہہ رہی تھی۔ سکندر سنی ان سنی کر کے اماں کو خدا حافظ کہہ کر بائیک گھر سے باہر نکال لے گیا۔

"کتنے اچھے ہیں سکندر بھائی...... ہے نا اماں۔" وہ اماں کے دروازہ بند کر کے پلٹنے پر بولی اور پورے صحن میں نگاہیں دوڑائیں۔ "اتنا سب کچھ اکیلے سنبھال لیا ہے۔ آپ کو تو بیٹے کی کمی بھی محسوس نہیں ہونے دی انہوں نے۔"

"ہاں...... یہ تو ہے۔" اماں نے اس کی بات کی تائید میں سر ہلایا۔" پھر حسرت سے سانس بھری۔ "بس اس کم بخت ارسلہ نے ہی قدر نہ کی۔" اماں کی آہ میں ملال نہیں بس افسوس تھا۔

"ارسلہ آپی کو تو اتنا سب کچھ مل گیا۔ اب کیا چاہیے۔" وہ ہنسی پھر دل ہی دل میں بولی۔ "سکندر بھائی کی قدر تو کوئی میرے دل سے پوچھے۔"

دوسرے پل اس نے اپنے ہی کسی چور جذبے سے سٹپٹا کر ادھر دیکھا جیسے اماں نے تو دل کی آواز نہیں سن لی۔ اماں ابا کے روم میں جا چکی تھیں، وہ ہلکا سا سانس بھر کر روم میں چلی آئی۔ اتنا کم وقت رہ گیا تھا اسے بھی تیار ہونا تھا۔ کپڑے بدل کر جیولری پہننے لگی۔ پھر دوپٹا اٹھایا تو ارسلہ یاد آئی۔

"اب دوپٹا کس سے سیٹ کراؤں گی، آپی صاحبہ تو پارلر میں ہیں۔" اس نے الجھ کر نیلوفر کو دیکھا اور سوچا نیلو

ابا کو تو فیشن کا بھی پتا نہیں ٹھیک سے۔

"اب کیا مسئلہ ہے۔" نیلوفر اسے الجھتا دیکھ کر بولی۔

"ارسلہ آپی کی کمی تو ابھی سے محسوس ہونے لگی ہے قسم سے۔ اب یہی دیکھ لیں۔ وہ ہوتیں تو اچھے طریقے سے دوپٹا پن اپ کر دیتیں۔ ہاں بھئی ان کے تو عیش ہیں بڑی سی گاڑی میں پارلر گئی ہیں۔ گاڑی آ رہی ہے پارلر لے جانے کو...... شاپنگ پر لے جانے کو۔ ان کی کیا بات ہے۔"

"ادھر دو دوپٹا۔" نیلوفر اس کی باتیں سنی ان سنی کرتے ہوئے اس کا دوپٹا مسہری سے اٹھا کر کھولنے لگی۔ "شوق نہیں ہے ہر فیشن خود پر آزمانے کا مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ جدید فیشن سے بے خبر ہوں۔" اس نے مسکرا کر پیارے دوپٹے کا ایک سرا اس کے کندھے پر پھیلایا وہاں پن لگا دیا۔ دوسرا سرا دوسرے بازو سے نکال کر اس کی کلائی میں پلو سے لپیٹا۔

"ارے واہ۔ آپ کو تو خوب آتا ہے۔" وہ چھیڑتے ہوئے بولی۔ نیلوفر ہنس پڑی اور چپت مارنے لگی۔ "اب نکلنے کی کرو۔ خالہ کی آواز آ رہی ہے وہ پہنچ چکی ہیں۔" نیلوفر جلدی جلدی کمرے کا پھیلاوا سمیٹنے لگی۔

☆☆☆

شادی کی رونق عروج پر تھی۔ دو بہنیں ایک ساتھ اتری تھیں مگر نیلوفر اور احمر کا حسن ارسلہ کی سج دھج اور خوب صورت شخصیت کے سامنے ماند ہو کر رہ گیا تھا۔

مہنگے ترین لباس، قیمتی جیولری اور عمدہ پارلر سے تیار ہوئی ارسلہ کوئی ملکہ دکھائی دے رہی تھی۔ جھلملاتے لہنگے کا کنارہ کارپٹ سے سجی روش پر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ کیمرے کی تیز لائٹس میں وہ سج سج کر قدم رکھتی کسی فاتح ملکہ کی طرح گویا شہر فتح کرتی چلی آ رہی ہو۔ ادھر اماں تو بلائیں لیتی نہ تھک رہی تھیں۔ نظر بد کی آیتیں پڑھ پڑھ کر دم کیے جا رہی تھیں۔ ایسے وقت تو وہ نیلوفر کو بھی بھول گئیں۔ جب ارسلہ داخل ہوئی تھی۔

نیلوفر کے سسرال والے اتنا شاندار انتظام دیکھ کر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ جلن کا بھی شکار ہوئے تھے۔ [illegible]از نہ کوئی نہیں کر رہا تھا مگر کمتری کا احساس از خود غالب آ رہا تھا۔ ارسلہ کے سراپے سے لے کر اس کے سسرال تک سب کچھ شاندار دکھائی دے رہا تھا۔ جلنا تو فطری عمل تھا تاہم احمر کی بڑی آپا احمر کو گویا تسلی دینے کی غرض سے کہنے لگیں۔

"چلو تمہاری بیوی تو واجبی شکل کی ہے۔ تم تو اس کے مقابلے میں بہت بہتر ہو۔ ارسلہ کے سسرال سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں تمہیں۔ لڑکے کے پیر میں لنگ ہے۔ دیکھ نہیں رہے ہو اسٹک سے چلتا ہوا آیا تھا۔ شکل کا پیسے کا کیا کرنا ہے۔ خاک ڈالو۔ ہے تو عیب دار نا۔ تبھی تو غریب کی لڑکی کو پھانسا ہے۔"

"آہستہ بولو آپا۔" احمر نے جلدی سے انہیں ٹوکا۔ گو کہ آپا کی باتوں سے تسلی ہو رہی تھی۔

"ابھی ایکسیڈنٹ ہوا ہے اس لیے وہ ابھی اسٹک سے چل کر آیا ہے دو چار ہفتوں میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"توبہ توبہ۔ تو ایسی کیا جلدی مچی تھی شادی کی۔ مہینہ دو مہینہ ٹھہر جاتے۔"

"مجھے تو دال میں کالا لگتا ہے۔"

"اچھا بس۔ یہیں بٹھا کر ساری باتیں...... تبصرے کر لو گی۔" نیلوفر کی ساس نے دونوں بیٹیوں کو آنکھیں دکھائیں۔

"یار پھول کہاں ہیں کچھ خبر بھی ہے یا ارسلہ کے سسرال کے نمود و نمائش دکھاوے میں کھو گئی ہو کم بختوں۔"

اتنا بڑا بینکوئٹ اور اس میں گہما گہمی تھی۔ حیات علی اور راجیلہ (اماں) کو دونوں بیٹیوں کے سسرال والوں کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور ایسے میں انہیں سکندر کا خیال نہیں آیا بلکہ کسی کو بھی خبر نہ ہوئی

کہ سکندر اس جھلملاتی محفل سے کب کا اٹھ کر چلا گیا تھا۔ ایک اریبہ کی نظریں ہی اسے ڈھونڈ رہی تھیں۔ پورا وقت اس کی نظریں سکندر کو دیکھنے کو بھٹکتی رہیں۔ آخر رہا نہ گیا تو اس نے اس کو کال کر لی۔

"ارے آپ کہاں ہیں سکندر بھا......" وہ بھائی کہتے کہتے ذرا سا جھجکی پھر سنبھل کر بولی۔ "سکندر بھائی۔ آپ دکھائی نہیں دے رہے۔"

"یہیں ہوں گڑیا۔ مردانے میں۔" اس نے صاف جھوٹ بولا۔ اور رابطہ منقطع کر دیا۔

"اسے کیا بتاتا کہ وہ ایک ویران سڑک پر کب سے پیدل چلتا جا رہا ہے۔ ایک بے قراری اور اضطراب سمیٹے۔ دل کے جلتے آبلے اور بھی ٹپکنے لگے تھے۔ جلتی آنکھیں بند کرتا تو اس قاتلہ ارسلہ کا چہرہ اتر آتا اور سارا جسم ان دیکھی آگ میں جلتا محسوس ہونے لگتا۔ جسے وہ ٹھنڈا کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

میرے ہم نفس میرے ہم نوا، مجھے دوست بن کے دغا نہ دے
میں ہوں درد عشق سے جاں بہ لب مجھے زندگی کی دعا نہ دے
میں غم جہاں سے نڈھال ہوں، کہ سراپا حزن و ملال ہوں
جو لکھے ہیں میرے نصیب میں وہ الم کسی کو خدا نہ دے

وہ گھر پہنچ چکا تھا۔ تالے میں چابی گھمائی اور دروازہ دھکیل کر اندر آ گیا۔

صحن میں اس کے اپنے دل کی طرح تاریکی اور ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے یکلخت لگا جیسے یہ سناٹا اس کے نصیب کا ہے یہ تاریکی اس کے مقدر کی ہے جو ہر جگہ پھیلی دکھائی دے رہی تھی۔

وہ صحن میں ہی کرسی پر یوں بیٹھ گیا۔ جیسے مزید چلنے کا یارا ہی نہ ہو۔ جسم بے دم ہو گیا ہو اور مزید چلا تو گر جائے گا۔ اسے تو خود خبر نہ تھی وہ کتنا پیدل چلتا ہوا گھر تک پہنچ گیا تھا۔

نہ یہ زندگی میری زندگی، نہ یہ داستاں میری داستاں
میں خیال و وہم سے دور ہوں، مجھے آج کوئی صدا نہ دے
میرے گھر سے دور ہیں راحتیں، مجھے ڈھونڈتی ہیں مصیبتیں
مجھے خوف یہ کہ میرا پتا کوئی گردشوں کو بتا نہ دے
میرے ہم نفس میرے ہم نوا، مجھے دوست بن کے دغا نہ دے

اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ یک دم اس کی جیب میں پڑا موبائل بجنے لگا۔ اسے پورا یقین تھا کال اریبہ نے ہی کی ہوگی۔ پہلے اس نے سوچا وہ یونہی بیٹھا رہے موبائل کو جیب سے بھی نہ نکالے مگر مسلسل بجنے والی ٹون اس کے اعصاب پر ضرب کی طرح لگ رہی تھی۔ اس نے بے دلی سے موبائل جیب سے نکالا۔ کال نیلوفر کی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی خفگی سے بولی۔

"فرار ہو گئے۔"

"پتا نہیں۔" وہ آہستگی سے گویا ہوا۔

"بس اتنی ہی ہمت تھی۔" وہ ہنوز ناراضی سے کہہ رہی تھی۔

وہ ہلکے سے ہنس دیا۔ خود آزار قسم کی ہنسی تھی۔

"اتنی بھی ہمت نہیں تھی جتنی دکھاتا آ رہا ہوں۔" وہ بے اختیار کہہ گیا۔

"سکندر...... کیا ہو گیا ہے تمہیں۔" وہ دل گرفتہ ہونے لگی اس کی آواز میں ایک تکلیف دہ کراہٹ تھی۔ "اس طرح بکھر کر بات مت کرو۔ میں تم سے مل کر رخصت ہوں گی۔ کیسے بھائی ہو۔ سر پر ہاتھ نہیں رکھو گے۔ دعا دے کر رخصت نہیں کرو گے۔"

سکندر، خود آزاری کی انتہا پر تھا۔ ضبط کے جانے کس کس مراحل سے گزر کر ہنسا۔

"پگلی ساری دعائیں تمہارے لیے تو ہیں۔ تمہیں احمر کے ہمراہ دیکھ کر بہت سی دعائیں دل سے نکلی تھیں۔ چلو ابھی بھی دے دیتا ہوں کہ خدا تمہیں سدا......"

"سکندر پلیز۔" یک دم رو پڑی۔ "تمہیں آنا پڑے گا۔ میں تمہیں ایک بہادر سکندر کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں جو جذبوں کے آگے بکھر اور ٹوٹ نہیں سکتا۔ تمہارا دل بہت قیمتی ہے۔ سکندر۔ یہ ایک مادہ پرست لڑکی کے لیے نہ ٹوٹ سکتا ہے نہ بکھر سکتا ہے۔ ناقدروں کے لیے خون نہیں جلاتے۔" وہ اسے حوصلہ دے رہی تھی یا دلاسا۔ مگر سکندر کو اب سنبھلنے کے لیے لفظوں اور جملوں کی نہیں، وقت کی ضرورت تھی۔

"آ رہے ہونا، سکندر۔"

"نہیں نیلو۔ ضد مت کرو۔ تم کیا چاہتی ہو میں اس کے رخصت ہونے کا منظر بھی دیکھوں۔ خدا اسے خوش رکھے۔"

"رخصت!" نیلو کو جھٹکا لگا۔

"ہاں، تم نہ بتاؤ گی تو کیا مجھے خبر نہ ہوگی۔" وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

نیلوفر یک دم چپ سی رہ گئی۔ پھر ہلکی سانس بھر کر بولی۔

"خبر اب بھی رکھتے ہو اس کی۔ اریبہ نے دی ہوگی تمہیں یہ خبر!"

"ہاں۔"

"دراصل ارسلہ کے سسرال والے رخصتی کا اصرار کر رہے ہیں یوں بھی جہیز کی ڈیمانڈ تھی نہیں ان کی، کوئی دوسری رسموں میں یہ پڑنا نہیں چاہتے۔ تو مناسب یہی ہے کہ رخصتی ہو جائے۔ وہ بھی کنارے لگے۔" وہ تفصیل بتانے لگی۔

وہ چپ ہو کر سنتا رہا۔ یہ ساری باتیں اریبہ پہلے ہی گوش گزار کر چکی تھی جب سکندر کو اصرار کر کے بلا رہی تھی کہ آپ چلے گئے ہیں مجھے سب خبر ہے۔ اب تو ارسلہ آپی کی رخصتی بھی ہو رہی ہے۔ میں بہت خفا ہوں آپ سے۔ مجھے آپ کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ سکندر بھائی۔ پلیز آ جایئے۔ نیلو آپا بھی آپ کے بنا رخصت نہیں ہوں گی۔

اس نے لائن کاٹ دی۔

"اتنی ظالم خبر سننے کے بعد رہی سہی ہمت بھی دم توڑ چکی تھی۔ گویا کوئی جلتا بجھتا چراغ ہو، تیز ہوا چلے تو بجھ جائے۔ ہمیشہ کے لیے۔ اسے اپنا دل بھی ایسا ہی چراغ محسوس ہوا جو تیز ہوا میں رکھ دیا گیا ہو۔

"میرے داغ دل سے ہے روشنی یہی روشنی میری زندگی
مجھے ڈر ہے اے مرے چارہ گر یہ چراغ تو ہی بجھا نہ دے
میرے ہم نفس! میرے ہمنوا، مجھے دوست بن کے دغا نہ دے
میں ہوں درد عشق سے جاں بہ لب، مجھے زندگی کی دعا نہ دے

☆☆☆

دونوں بیٹیوں کو ایک ساتھ رخصت کرنا کم ہمت کی بات نہ تھی۔ اماں رو رہی تھیں، عقیلہ خالہ انہیں سنبھال رہی تھیں۔ ارسلہ سجی سنوری بڑی سی گاڑی میں اپنے مہکتے جذبوں کو سنبھالے دھڑکتے دل کی دھک سنتے ہوئے جیلانی ہاؤس کی جانب روانہ ہو گئی تھی۔ آنے والے لمحوں کا تصور بڑا خیر کن تھا۔ بڑا ہوش ربا۔ کسی اجنبی شہزادے کے محل میں داخل ہونے کا تصور اسے مسرور کیے جا رہا تھا۔

اس کی گاڑی کے پیچھے کئی گاڑیاں روانہ ہوئیں۔ جو سب جیلانی ہاؤس کے پارکنگ ایریا میں آ کر رکتی گئی تھیں۔ ہر طرف سے پٹاخے سنائی دینے لگے۔ بڑا حسین نظارہ تھا۔ اوپر تک اٹھتے آتشی گولے پھٹ کر فضا کو رنگین بنا رہے تھے۔ آتش بازی کا بھرپور مظاہرہ جاری تھا ایسے میں گاڑی سے اتر کر روجی کے ہمراہ سج سج کر اندر داخل ہوئی کوٹھی کسی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ اتنی آرائش اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہر قدم پر مووی میکرز اس کے دلکش پوز بنا رہے تھے۔ موبائل پر کوئی یہ منظر قید کر رہا تھا۔ ہر نظر اس جوڑے پر مرکوز تھی۔

ساری رسمیں نمٹا کر جب وہ آبص کی خواب گاہ میں پہنچی تو کتنے پل تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ وہ اس کوٹھی کی بہو بن چکی ہے۔ اور یہ شہزادے جیسا مرد اس کا شوہر بن چکا ہے۔ اس کے سارے خوابوں کی تعبیر اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی تھی کسی خوش نما منظر کی طرح۔

”میرے خدا۔ خواب یوں بھی پورے ہو جاتے ہیں۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں۔ ابا اماں آ کر دیکھیں ذرا اپنی لاڈلی کو۔ اور...... اور نیلوفر آپا تم...... تم تو کہتی تھیں کہ ”ایسی خواہشیں مت پالو جو پوری نہ ہوں اور قسمت سے زیادہ کسی کو نہیں ملتا۔ ہاں تو ٹھیک ہے میں بھی اپنی قسمت کا لکھا پا رہی ہوں اور قسمت خواہشیں پالنے والے اور ان کے حصول کی جدوجہد کرنے والوں کی ہی تو بدلتی ہے۔“

اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس خواب ناک دلکش سحر آفرین ماحول میں یہاں سے وہاں چک پھیریاں کھاتی پھرے اونچے اونچے قہقہے لگائے۔ اپنی خوش نصیبی پر بھنگڑا ڈالے دھمال ڈالے۔ کیا کر ڈالے۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو وہ جلدی سے سنبھل کر قرینے سے بیٹھ گئی...... جہازی سائز بیڈ پر عین مرکز میں وہ بیٹھی تھی اس کا جگمگاتا شرارہ آدھے بیڈ کو گھیرے ہوئے تھا۔ آنے والا بلاشبہ آبص تھا۔ اسٹک کے سہارے دبیز قالین پر پیر جماتا وہ بیڈ کے نزدیک آنے کے بجائے بیڈ کے ساتھ جڑے دو سیٹر صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ شیروانی وہ بہت پہلے ہی اتار چکا تھا، گاڑی میں بیٹھتے ہی۔ اس وقت سفید شلوار پاجامے اس کا سراپا بہت مسحور کن دکھائی دے رہا تھا۔ آستینیں کہنی تک فولڈ کے گریبان کے آگے کا ایک بٹن کھولے وہ بہت آرام دہ انداز میں صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر دھیرے دھیرے سگریٹ پینے میں مصروف ہو گیا تھا۔

ارسلہ دوپٹے کی اوٹ سے دیکھا اور دل ہی دل میں اسے سراہے بنا نہ رہ سکی۔

”کیا قاتل انداز ہے شہزادے کا۔“

یک دم اسے اپنے دل کی دھڑکن تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ آبص نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی تھی اور اب اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ وہ اپنی بے ترتیب ہوتی دھڑکنوں کو سنبھالے سر جھکائے بیٹھی رہی۔

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پندوگرو راہ گزر تو دیکھو
وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو

اسے سکندر کے گنگنائے شعر یاد آنے لگے جو آبص کو دیکھ کر اس کا دہرانے کو دل چاہ رہا تھا۔

”ارسلہ آپ تھک گئی ہوں گی۔ چاہیں تو چینج کر لیں۔“ گہری خامشی کو آبص کی آواز نے توڑا تھا۔ ”آرام چاہیں تو کر سکتی ہیں۔“

وہ اس طرح کے کسی بھی جملے کے لیے شاید تیار نہ تھی۔ جھٹکا لگنا فطری عمل تھا۔ اس نے ذرا سا چہرہ اونچا کیا پھر جھکا کر بولی۔

”نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بہتر محسوس کر رہی ہوں۔“

آبص نے اس کے جھکے سر پر ایک نگاہ ڈالی۔ اس کے چہرے کی سنجیدگی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

”میں چاہتا ہوں آپ ایزی فیل کریں۔ کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔“ عجیب سرد سرد سا انداز تھا۔ مگر وہ لہجے کی سنجیدگی اور سرد مہری محسوس ہی نہ کر پائی۔ اپنے ہی نشے میں مست سر ہلاتے ہوئے بولی۔

”جی بہتر۔“

”یوں بھی اتنے بھاری بھر کم کپڑوں سے الجھن اسے بھی ہو رہی تھی۔ مسلسل کئی گھنٹوں سے بدن پر کسی بوجھ کی طرح لدے ہوئے تھے۔

اس نے وزنی دوپٹے کو ہلکے سے پیچھے کھسکایا تو وہ سامنے ہی بیٹھا نظر آیا۔ مگر وہ بجائے اس کی طرف متوجہ ہونے کے اپنے موبائل میں مصروف دکھائی دیا۔ اب کے اسے کچھ عجیب سا بلکہ برا سا محسوس ہوا۔ اس طرف نہ کوئی لپک، نہ جذبات کی شدت، نہ قربت کا نشہ نہ اسے دیکھنے کی لگن تڑپ کچھ بھی ایسا تاثر دکھائی نہ دے رہا تھا۔ بس بے مہری فضا تنی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس صورت حال نے اسے ذرا بوکھلا سا دیا۔ تاہم وہ سنبھل کر بیڈ سے اترنے لگی۔

عجیب بندہ ہے کم از کم بیڈ پر بیٹھ جاتا۔ گھونگٹ ہی اٹھا لیتا کچھ نہیں تو رسمی سی بات چیت کر لیتا۔ کچھ نہ سہی تو موبائل ہاتھ میں جو پکڑے ہے اس سے اس کی کچھ تصویریں ہی لیتا۔ اس کی طرف سے کوئی رسپانس تو دکھائی دیتا۔ شاید اس کلاس میں اس طرح ہی فسٹ نائٹ منائی جاتی ہوگی۔ امیر زادوں کے رویے ایسے ہی ہوتے ہوں گے۔ غرور تکبر ہوگا۔ یہ بھی ایک ادا ہے۔

وہ سوچوں میں الجھی بیڈ سے اتر گئی اب مسئلہ باتھ روم جانے کا تھا۔

باتھ روم کس طرف ہے۔“ وہ اسے متوجہ کرنے کی غرض سے بولی۔ شاید اس بہانے وہ آنکھ اٹھا کر اسے دیکھ لیتا۔

مگر اس کی یہ کوشش بھی ناکام گئی۔ اس نے فقط ہاتھ کے اشارے سے جواب دیا۔

باتھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے ایک پل تو اسے دھچکا لگا تھا کہ اب اسے اتنا خوب صورت جوڑا اتار دینا پڑے گا۔ یہ ساری جیولری بھی اور اتنا مہنگا میک اپ بھی دھو لینا پڑے گا۔

عجیب واہیات آدمی ہے۔ نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں کہ وہ کیسی لگ رہی تھی۔ یا خدا۔ یہ رات ایسی ہوتی ہے۔ تو فلموں ڈراموں میں تو کچھ اور ہی دکھایا جاتا ہے۔

وہ دکھی دل کے ہمراہ باتھ روم میں جا گھسی۔ مگر باتھ میں گھستے ہی پہلے والا تاثر زائل ہو گیا وہ باتھ کی کشادگی اس کی آرائش کے سحر میں کھو سی گئی۔ اس کے اپنے روم سے کہیں بڑا تو باتھ روم تھا۔ سیاہ پالش والی دیوار گیر الماریاں جن کے دروازے یوں چمک رہے تھے، گویا پانی پر تیرتی چکنی چکنی بطخیں۔ ذرا چھو لیں تو نشان ابھر آئیں۔ چاروں طرف ہیروں کی مانند دمکتے شیشے۔ جس میں اپنا عکس دیکھ کر وہ کتنے ہی لمحے دیکھتی رہ گئی۔ اس نے نزدیک ہو کر ایک دیوار گیر آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ اف۔ کس قدر دلربا حسین دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے ہی حسن کے سحر میں جانے کتنی دیر کھڑی رہی کہ یک دم اسے باہر بیٹھے آبص کا خیال آ گیا۔

اس نے جلدی جلدی ادھر ادھر نظریں دوڑائیں کہ کپڑے دکھائی دے جائیں۔ پھر خیال آیا۔ کپڑے تو یقیناً ان وارڈروب میں ہوں گے۔ اب یہ کوئی اس کا چھوٹا سا گھر تو نہ تھا کہ اس کے کپڑے اسے کبھی مسہری پر تو کبھی الماری سے باہر لٹکتے نظر آتے۔ اس نے وارڈروب کھولی تو ایک سے ایک نایاب جوڑا دکھائی دیا۔ اس نے ایک مناسب نائٹ گاؤن نکال کر پہن لیا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد وہ باتھ روم سے برآمد ہوئی تھی۔ نیم گیلے بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھے۔ نیلے

رنگ کے سادہ سے گاؤن میں آبص نے دراز سے کچھ تلاش کرتے ہوئے ذرا سی نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک پل وہ اپنی ماں کی چوائس کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ تاہم اس کے چہرے پر پھیلی سرد مہری میں کمی آنے کے بجائے اضافہ ہو گیا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ اپنے اندر کے کسی جذبے کے ابال کو دبا رہا ہو۔ جو جسم کے ہر عضو پر چٹکیاں بھر رہا تھا۔ ایک ہلکی سی سانس کھینچ کر اس نے چہرے کا رخ موڑ لیا۔

ارسلہ تو پہلی نظر کے تصادم کے بعد کچھ ایسی گھبرائی تھی کہ ترچھی کھڑی ہو کر اس کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا۔

''پلیز آپ بیٹھ جایے۔ اس طرح کی فارملیٹز نباہنا میرے لیے مشکل ہے۔'' اس نے نظر اس کے چہرے سے ہٹالی۔

بڑا بے اعتماد کر دینے والا۔ دھڑکا دینے والا لہجہ تھا۔ وہ جھٹ سے بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

''یہ ماما نے آپ کے لیے دیا ہے۔ رکھ لیں۔'' بہرحال کچھ فارمیلٹیز تو پوری کرنا ہی پڑتی ہیں۔ زندگی میں اب جانے کیا کچھ دیکھنا اور نباہنا پڑے گا۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑا بڑا سا مخملی بکس اس کے آگے پھینکنے کے انداز میں رکھا۔

ارسلہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ وقت...... ان لمحات میں وہ کس لہجے میں اور کسی سرد مہری سے بات کر رہا تھا۔ عجیب چبھتا ہوا تلخ لہجہ۔ جیسے کوئی اٹھا کر پٹخ رہا ہوں۔

اس کا دل انجانے خوف کی کیفیت سے دوچار ہوا۔ بکس پر انگلیاں جماتے ہوئے اس نے آبص کو جانچتی نظروں سے دیکھا۔ مگر وہاں نہ شوق کی لپک تھی نہ دلچسپی کی رمق۔

وہ یک دم اس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''میں پوچھ سکتا ہوں ارسلہ کہ آپ نے ایک معذور شخص سے آئی مین مجھ سے شادی کیوں کی ہے اور اتنی خوش بھی دکھائی دے رہی ہیں۔ میرے لیے بہت حیرت کی بات ہے۔'' وہ چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔

''جی۔ میں سمجھی نہیں۔'' وہ حقیقتاً سٹپٹا گئی تھی۔ بلکہ جب سے لے کر اب تک وہ حیران ہی ہو رہی تھی۔ تصور اور گمان سے ہٹ کر کچھ ہو رہا تھا۔

''میرے پیر کے بارے میں تو تم جانتی ہو۔ اتنا بڑا فالٹ (عیب) تمہیں دکھائی نہ دے یہ تو ہو نہیں سکتا۔'' اب کے وہ ٹرخا تھا۔

''ارے نہیں۔ یہ کوئی بڑی بات تو نہیں ہے۔'' وہ سنبھل کر بولی پہلی بار دھیرے سے مسکرائی۔

''واٹ...... ! بڑی بات نہیں ہے؟''

''بالکل۔ چھوٹے موٹے ایکسیڈنٹ ہو جاتے ہیں پھر لوگ ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں۔ آپ بھی جلد ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔'' اس کا اعتماد دھیرے دھیرے بحال ہو رہا تھا۔

مگر میں ٹھیک نہیں ہوں گا اس لیے کہ میں ہونا نہیں چاہتا۔ یہ معذوری عمر بھر میرے ساتھ رہے گی۔''

''یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔'' اب کے وہ خوف زدہ دکھائی دینے لگی۔ ''ایک معمولی حادثہ تھا۔ زخم ٹھیک ہو جائے گا تو آپ......''

''یہ معمولی حادثہ نہیں تھا۔ ارسلہ صاحبہ۔ بہت بڑا حادثہ تھا اور رہی زخم کی بات تو یہ زخم کبھی نہیں بھرے گا اب کبھی نہیں۔'' وہ ایک پل رکا۔ اس کے لہجے میں تلخی کے ساتھ بے بسی بھی چیخ رہی تھی۔ ''کچھ زخم اور ان کی شدت کسی کی یاد سے وابستہ ہوتی ہے جیسے ہم دانستہ بھولنا نہیں چاہتے۔ چاہتے ہی نہیں ان پر کھرنڈ آئے۔ میں بھی میں بھی نہیں چاہتا کہ یہ زخم بھرے۔ ان پر کھرنڈ آئے۔''

ارسلہ خوف حیرت اور بے یقینی کی کیفیت میں بیٹھی اسے دیکھتی رہ گئی۔

''تقدیر کبھی ہماری خواہش کے مطابق نہیں چلتی۔ وہ اپنے راستوں پر چلاتی ہے۔ ایک مسلمان ہونے کے واسطے ہم بچپن سے یہ باتیں جانتے اور مانتے ہیں اس کے باوجود خواہشوں کے محل تعمیر کرتے ہیں۔ آرزوؤں کے ایوان سجا لیتے ہیں اور جب یہ پیروں میں ریت کی دیوار بن کر ڈھیر ہو جاتے ہیں تو ہم تقدیر سے شاکی ہو جاتے ہیں۔ قدرت سے شکوہ کرنے لگتے ہیں۔ خواب پورے نہیں ہوتے۔'' وہ شدید اداسی کی لپیٹ میں تھا۔

''مگر خواب تو پورے ہو جاتے ہیں۔ خواہش اور تمنائیں بھی۔ پوری ہو جاتی ہیں۔'' وہ بے اختیار بول پڑی۔ مگر دوسرے پل آبص کی اٹھنے والی نظروں سے خفیف ہو کر بولی۔ ''کچھ خواب پورے ہوتے ہیں میرا خیال ہے۔''

وہ لب بھینچ کر نظریں اس کے چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

''سوری ارسلہ، شاید آج مجھے یہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ وقت مناسب نہیں ان باتوں کے لیے...... فرصت میں کروں گا۔ اوکے۔ آپ چاہیں تو ریسٹ کر سکتی ہیں چاہیں تو بھرپور نیند لے سکتی ہیں۔'' وہ اسٹک پر ہتھیلی کا دباؤ ڈال کر صوفے سے اٹھ گیا اور باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

وہ دم سادھے بیٹھی رہ گئی۔ بس خالی خالی نظروں سے اس کی پشت کو دیکھا۔ تذلیل کا احساس دل کے کسی گوشے سے اٹھا اور رگوں میں کھولن سی بھر گیا۔

اس قدر بے مروتی بے اعتنائی کا تو تصور بھی نہ تھا۔ اس کے پاس۔ ملن کے یہ خوب صورت لمحات اس کی بے رخی کی نذر ہو جائیں گے۔ اس کا سارا جوش ماند پڑ گیا۔

وہ باتھ روم سے باہر آیا تو وہ یونہی بیٹھی تھی۔ وہ نائٹ گاؤن کی دوڑی کستا اس پر ایک نظر ڈال کر بیڈ پر دراز ہو کر کروٹ بدل گیا۔

وہ یونہی بیٹھی رہی۔ یہ رات اسے ایک مذاق سے زیادہ نہیں لگ رہی تھی۔

''پلیز لائٹ آف کر دیں ارسلہ، اور آپ بھی سو جایے۔ تھک گئی ہوں گی آپ بھی۔'' وہ کرٹ بدلے بدلے بھاری ہوتی آواز سے بولا۔

''بڑا خیال ہے میری تھکن کا جیسے۔'' وہ سلگتی اٹھ کر لائٹ بند کر کے بیڈ کے کنارے ہو کر لیٹ گئی پھر ذرا سی گردن موڑ کر اس جانب دیکھا۔ جہاں وہ حسین شہزادہ اس کے جذبات کا قتل کر کے لیٹ گیا تھا۔ مگر سویا نہیں تھا اندھیرے میں ننھا سا بے ضرر شعلہ چمک رہا تھا جو یقیناً اس کی انگلیوں میں دبی سگریٹ کا تھا۔

وہیں زندگی کے حسیں خواب ٹوٹے
میرے ہم سفر تم جہاں ہم سے چھوٹے

اس کے دماغ میں پرانا گانا چلنے لگا۔ پھر غصے کی لہر اٹھی۔

''بھاڑ میں جاؤ۔''

اس نے غصے سے چادر پیر سے سر تک کھینچ لی۔ مگر آنکھیں بے اختیار پھر چھلک آئی تھیں۔ ارمانوں کا خون ہوا تھا کوئی معمولی بات تو نہ تھی۔

☆☆☆

اریبہ نے صبح صبح سکندر کو فون کر کے جگا دیا کہ ارسلہ کے یہاں ناشتا لے کر جانا ہے۔ اتوار کا دن تھا وہ سکون سے کئی راتوں کی اجڑی نیندیں پوری کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے یکلخت اڑا کر رکھ دیا۔

''امی تو کہہ رہی ہیں ٹیکسی میں چلے جائیں گے مگر آپ گاڑی کا انتظام کر دیتے تو اچھا ہو گا۔''

''کیوں ٹیکسی میں کیا برائی ہے۔'' وہ پہلے ہی تپا ہوا تھا اور وہ صبح صبح اسے اس سلگتے احساس میں دھکیل رہی تھی۔

''ارے نہیں برائی تو کوئی نہیں۔ مجھے تو بائیک پر بھی اعتراض نہیں ہے۔ آپ ساتھ ہوں تو۔'' وہ مخمور لہجے میں بولی۔

سکندر اتنا تھکا نڈھال تھا کہ اس کے لہجے کے اس خمار کو محسوس ہی نہ کر پایا۔

''وہ کیا ہے کہ نیلو آپا کے یہاں تو ٹیکسی میں جانے میں کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر ارسلہ آپی کی طرف جانے میں مسئلہ ہے۔ آپ تو جانتے ہیں ان کی عادت کو، شور مچادیں گی کہ ٹیکسی رکشے میں کیوں آئے ہو۔ عزت کا معاملہ ہے ان کا تو۔''

''اس کے سسرال والے جانتے ہیں کہ ہم لینڈ کروزر نہیں رکھتے۔'' وہ چڑ کر بولا۔ ''اور بات سنو میں ٹیکسی کرواتا ہوں تم اور اماں چلے جانا۔ میں امی کو بھی لے آتا ہوں۔''

''اور آپ...... آپ نہیں آئیں گے کیا؟'' اریبہ کا دل بجھ سا گیا۔

''نہیں بہت اچھا لگوں گا میں ناشتا لے کر جاتا ہوا۔ یہ خالص زنانیوں کے کام ہیں۔''

اس کے زنانیوں کہنے پر اریبہ کو ہنسی آگئی۔

''آج کے دور میں لڑکیاں مردانہ کام کرتی ہیں تو آپ ایک زنانہ کام کرلیں گے تو کوئی برا نہیں کہے گا۔ آجائیں نا سکندر بھائی۔ آپ کے بنا مزا نہیں آئے گا۔''

''خدمت کرو بیا۔ تم فون رکھو میں امی کو لے کر آتا ہوں۔'' اس نے ہی لائن منقطع کردی۔

نیلوفر کے یہاں سے ہو کر عقیلہ خالہ اور اریبہ ارسلہ کے سسرال ''جیلانی ہاؤس'' چلی آئیں۔ لمبی سی کھانے کی میز انواع واقسام لوازمات سے سجی ہوئی تھی۔ مہوش جیلانی نے بڑے اخلاق سے ان دونوں خواتین کا خیر مقدم کیا ساتھ ہی ناشتا دیکھ کر خفگی ظاہر کی۔

''اس کی کیا ضرورت تھی اب۔ کہاں آپ ان رسموں میں پڑ گئیں۔''

''یہ تو بس یونہی چھوٹی سی رسم ہے۔ آپ نے تو کچھ کرنے ہی کب دیا ہمیں۔'' عقیلہ خالہ ہنس کر بولیں۔

''مجھے تو بہت پسند ہے یہ رسم۔ اس طرح ناشتا سجا کر لے کر آنا۔ ڈراموں میں بھی اس طرح دیکھتی تھی نا تو بڑا مزا آتا تھا۔'' اریبہ معصومیت سے بولی۔

''ارے......'' مہوش محظوظ ہو کر ہنس پڑیں۔ ''چلو تم خوش ہو تو ہم خوش۔'' وہ ان کا لایا ہوا ناشتا ملازمہ سے کہہ کر کھانے کی میز پر ہی لگوانے لگیں۔ ارسلہ بھی اپنے روم سے چلی آئی۔

نیلے اور سفید امتزاج کے لباس میں دوپٹا قرینے سے اوڑھے وہ خاصی بدلی بدلی اور دلکش لگ رہی تھی۔

اریبہ تو اسے دیکھتے ہی پٹ سے اس کے گلے جھول گئی۔

''اوہ ہوں۔ ذرا تمیز سے۔'' اس نے ناگواری سے گھر کا ''سالوں بعد کوئی مل رہے ہیں۔''

اریبہ خفیف سی ہو گئی۔ پھر ادھر ادھر نظر ڈال کر بولی۔ روی نظر نہیں آرہی ہے آنٹی۔''

''ارے کہاں۔ وہ تو ایسی سوئی ہے کہ اب شام سے پہلے نہیں اٹھے گی۔ رات بھر تک تو فوٹو سیشن رہا ہے۔'' مہوش بتانے لگیں پھر ارسلہ کو دیکھ کر بولیں۔ ''ارے ارسلہ! اپنی خالہ اور بہن کو ناشتا واشتا کرواؤ اچھی طرح سے۔'' پھر عقیلہ خالہ کے ہاتھ کو ہلکے سے تھپتھپا کر کہنے لگیں۔ ''پلیز آپ بیٹھیے...... ناشتا لیجیے۔ میں ذرا اکبر کو دیکھتی ہوں۔''

مہوش کے وہاں سے جاتے ہی ارسلہ نے دوپٹا سر سے اتار اور کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے میکے سے آئے

ناشتے کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا۔ پھر منہ بنا کر بولی۔

''یہ کیا اٹھالائی ہیں۔ جب ایسا ہی دو ٹکے کا ناشتا لانا تھا تو لانے کی ضرورت ہی کیا تھا۔ یہ اماں بھی نا بس کبھی نہیں سمجھیں گی۔ تھوڑا خرچا ہی کرلیتیں۔''

''آئے ہائے لڑکی۔ ذرا دم تو لو۔ تمہاری اماں نے تو بس رسم پوری کی ہے۔ شکر کرو۔'' عقیلہ خالہ نے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔

''یہ رسم بھی نہ کرتیں تو اچھا ہی ہوتا۔ پہلے کون سی کرلی ہیں۔ دیکھ رہی ہیں میری اس ٹیبل کو۔ اس کے سامنے یہ ناشتا...... ناشتا کہلائے گا۔ اس سے اچھا تو ملازم کھاتے ہیں۔''

''اچھا بس۔'' عقیلہ خالہ نے اسے ٹوک دیا۔ تمہارا یہ دستر خوان سدا ابھرا رکھے خدا۔ ہم نے کون سا ان سے مقابلہ کرنا تھا۔ ایک رسم تھی جو ادا کرلی۔ یوں تمہارا منہ بھی دیکھ لیا۔''

''چھوڑ دیں خالہ۔ آپی کو تو نہ قدر ہے نہ لحاظ۔ سکندر بھائی نے اونچی دکان سے یہ سب پیک کروایا ہے۔ نیلو آپا کی طرف تو بس واجبی سا لے کر گئے تھے تب بھی انہوں نے شکریہ ادا کیا تھا۔'' اریبہ سے رہا نہ گیا۔ ''اتنی تضحیک اور ذلت سے وہ چڑ کر بولی۔

''اونہہ...... اونچی دکان...... چند ہزار خرچ کر کے وہ احسان نہیں کر رہا ہے۔'' وہ تمسخر سے ہنسی۔ ''اور سنو یہ نیلو کے سسرال سے میرے سسرال کا کیا مقابلہ وہاں کے لیے تو ہو گا اچھا اچھا...... ان کنگلوں نے دیکھا ہی کیا ہے جو تنقید کریں گے۔ ان کے لیے مفت کا ناشتا آگیا یہی بہت ہو گا۔''

''خدا کے لیے آپا۔'' خالہ کی موجودگی میں ارسلہ کی یہ میں گل افشانی اریبہ کو شرمندہ کر رہی تھی۔ یہاں آکر سارا جوش، ساری خوشی بھک سے اڑ گئی تھی۔ پچھتاوا ہونے لگا اسے یہاں آنے پر۔

''اچھا خیر۔'' اس نے جیسے احسان کیا پھر اریبہ کو بازو سے پکڑ کر خود سے نزدیک کرتے ہوئے بولی۔ ''تم لوگ کس میں آئے ہو۔ میرا مطلب ہے رکشا وکشا کر کے تو نہیں چلے آئے ہو۔ بے عزتی تو نہیں کرادی کہیں میری۔''

''نہیں رکشے میں کیوں آئیں گے آپا۔ لینڈ کروزر میں آئے ہیں جوابا نے چند ہفتے پہلے ہی خریدی ہے ہائی لیکس بدل کر۔'' جواباً اریبہ کچھ اس ادا سے بولی کہ عقیلہ خالہ نے اختیار ابھرنے والی مسکراہٹ منہ پھیر کر چھپالی۔

ارسلہ نے کھا جانے والی نظروں سے اریبہ کو دیکھا۔

''ہاں تو آپ نے جہاز بھیجا تھا یا گاڑی۔''

''سیدھی طرح سے کہو رکشا میں پھٹپھٹاتے ہوئے آئے ہو۔''

''ہاں۔ بالکل۔ مگر نہیں ٹیکسی میں...... اور ٹیکسی میں ہی جائیں گے۔'' اریبہ کو شدید سبکی کا احساس ہو رہا تھا۔

''میرے خدا۔'' وہ ٹیکسی کا سن کر تپ کر رہ گئی۔ اسے خالہ یا اریبہ کی سبکی خفگی کی مطلق پروا نہ تھی۔

''یہ سکندر کا ہے کا ہیرو بنا پھرتا ہے۔ اس سے اتنا نہیں ہوا کہ گاڑی ہی کسی سے مانگ کر لے آتا۔ اب کتنی بے عزتی ہو گئی میری۔ کتنے ملازم اور چوکیدار نے تم کو ٹیکسی سے اترتے دیکھا ہو گا۔ خالہ آپ ہی مشورہ دے دیتیں اماں کو...... حد ہو گئی۔ اماں نے مجھے ذلیل کرانے کا قصد کرلیا ہے۔'' وہ خالہ کے سر ہونے لگی۔

''خالہ جان۔ ہمیں یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ چلیں واپس چلتے ہیں۔'' اریبہ برا مان کر کرسی دھکیل کر کھڑی ہونے لگی۔

''اچھا اچھا! اب زیادہ نہیں، بیٹھ کر ناشتا کرلو۔ چائے پی لو۔'' وہ سنبھل کر بولی۔

"شکریہ، آپ کا شاہی ناشتا آپ کو ہی مبارک۔ ہمیں نہیں کرنا۔ جتنا کھلا پلا دیا آپی یہ بہت ہے۔" وہ پہلی بار ارسلہ کے سامنے جواب دے رہی تھی۔ ورنہ آج تک وہ ڈانٹ ڈپٹ سن کر چپ ہولیا کرتی تھی۔ مگر مسئلہ خالہ کے سامنے عزت کا تھا۔ سسرال میں بھلا کون بے عزت کرتا ہے۔ وہ سخت تپی ہوئی تھی۔

خالہ اٹھنے لگی ہی تھیں کہ مہوش چلی آئیں۔ مہوش کو ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے دیکھ کر ارسلہ نے جلدی سے اریبہ کی کلائی دبوچی اور اس کی طرف جھک کر دبی زبان میں بولی۔

"سنو، اب پھوٹ مت دینا کہ ٹیکسی میں آئے ہیں۔ پوچھیں تو کہنا سکندر ڈراپ کر کے گیا ہے۔"

اریبہ نے تحمل سے کلائی اس کی گرفت سے چھڑالی اور کرسی سے اٹھ گئی۔

آبص سے ملنے کی خواہش بھی دل ہی دل میں دبا کر رہ گئی۔ انہوں نے وہاں مزید رکنا عبث جانا اور مہوش سے علیک سلیک کر کے اٹھ آئیں۔ مگر پورا راستہ اریبہ کا دماغ کھولتا رہا۔ عقیلہ خالہ اسے پیار سے ٹھنڈا کرتی رہیں۔ اور تنبیہہ بھی کی کہ اب یہ ساری باتیں اپنی اماں سے جا کر نہ کرنا۔ ناحق راحیلہ کا دل خراب ہوگا۔

"ارے، اس نگوڑ ماری کو عقل تو آگے آ کے آئے گی۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔ بس اپنے گھر میں خوش رہے وہ آباد رہے یہ دعا کرو۔ راحیلہ اور حیات بھائی کی فکر کم ہوگئی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے۔" وہ راستہ بھر اسے سمجھاتی رہیں۔

اریبہ سر ہلاتی رہی۔ مگر دل ہی دل میں اسے خوب برا بھلا کہتی رہی اور پکا سوچ لیا کہ اماں کو نہ سہی نیلو آپا اور سکندر کو تو ضرور بتائے گی۔ "سمجھتی کیا ہیں خود کو۔ کوٹھی کی بہو وہ ہیں، ہم تو نہیں۔"

ارسلہ کے میکے والوں کے جانے کے بعد مہوش ارسلہ کے ساتھ لیونگ روم میں آگئیں اور انہیں بہت بے چینی تھی یہ جاننے کے لیے کہ آبص کا رویہ ارسلہ کے ساتھ کیسا رہا۔ بہانے بہانے سے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں تاکہ معلوم ہو سکے مگر کوئی ایسی ناخوش گوار بات یا رویہ محسوس نہ کیا کہ معلوم ہوتا وہ ناخوش ہے۔ ان کے سارے خدشے رفع ہوگئے۔ انہوں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ ایک رات تو خیریت سے گزر گئی جو خطرے کی طرح ان کے سر پر منڈلا رہی تھی۔

☆☆☆

آبص کی آنکھ کھلی تو اس نے کمرے میں خاموشی محسوس کی جس کا مطلب تھا ارسلہ خواب گاہ میں موجود نہیں تھی۔ اس نے سکون کا ایک سانس کھینچا اور ذرا سا تکیہ کو اونچا کر کے بیٹھنے کے انداز میں لیٹ کر سگریٹ سلگا کر دھیرے دھیرے پینے لگا۔

رات کا پورا منظر نگاہوں میں گھومنے لگا۔ اسے ملال ہونے لگا کہ اسے اتنا سرد اور روکھا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا ارسلہ کے ساتھ۔ وہ یقیناً ہرٹ ہوئی ہوگی۔ یہ باتیں وہ ولیمے کے بعد کے لیے اٹھا رکھتا۔ بلکہ اب کرنا ہی نہیں ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ اب ماضی کی کوئی بات اس سے نہیں کرے گا بس اپنی ذات تک محدود رہے گا۔ نارمل بی ہیو کرے گا۔ محبت نہ سہی۔ عداوت بھی تو نہ تھی اس سے۔ ایک درمیانی راستہ بھی تو ہے جسے سمجھوتا کہتے ہیں۔

وہ شاور لے کر باتھ روم سے نکلا اور بال بنانے اور کمرے سے نکلنے تک وہ گلٹی فیل کرتا رہا کہ جانے ارسلہ کا ردعمل کیا ہوگا۔ اس سے نظریں وہ کیسے ملائے گا۔ کہیں اس نے ساری باتیں مہوش سے نہ کر دی ہوں۔ موقع دیکھ کر اپنے رویے کی سوری کر لے گا۔ پتا نہیں اس کے کتنے خواب بلکہ سارے ہی خواب ٹوٹ گئے ہوں گے کہاں بیٹھ کر وہ خود کو جوڑ رہی ہوگی۔ میں اتنا سخت گیر اور بے رحم تو کبھی نہیں تھا۔ نادیہ کا انتقام مجھے ارسلہ سے لینا تو نہیں چاہیے۔

وہ اپنی ہی سوچوں میں گم کمرے سے نکلا تو ارسلہ کو لیونگ روم سے ملحقہ روم میں مہوش کے ساتھ خوش گوار موڈ کے ساتھ بیٹھے ولیمے کے جوڑے پر فریفتہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔

جہازی سائز بیڈ پر ارسلہ کے ولیمے کا دلکش جوڑا جگمگا رہا تھا۔ اپنی جگمگاہٹ سے اس کے بے پناہ قیمتی ہونے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس پر جڑاؤ سیٹ سونے پر سہاگا۔ ارسلہ کا چہرہ اس جوڑے سے کہیں زیادہ جگمگا رہا تھا۔

"میں نے سوچا سرپرائز دوں گی۔" مہوش کہہ رہی تھیں۔ "کیسا لگا۔"

"بہت زبردست ...... اوف ...... تعریف کے لیے الفاظ نہیں مل رہے آنٹی۔" اس نے آج سے پہلے اتنا حسین جوڑا نہیں دیکھا تھا۔ "پہن کر دیکھوں۔"

"ارے ...... ارے ...... آج شام کو تو پہننا ہی ہے ناں۔" مہوش اس کی مسرت دیکھ کر مسکرائیں پھر آبص کو دیکھ کر چونکیں۔ آبص پلٹ رہا تھا مہوش کی پکار پر رک گیا۔

"آبص دیکھو ذرا۔ ارسلہ کے ولیمے کا جوڑا۔ کیسا ہے ارسلہ کو تو بہت پسند آیا ہے۔"

وہ پلٹ کر کمرے میں چلا آیا۔ اور ایک نظر ارسلہ پر ڈالی۔ جس کی توجہ جڑاؤ سیٹ کے کنگن پر تھی۔ وہ اپنی سفید چمکتی گداز کلائی میں ڈال کر چیک کر رہی تھی۔

"جس کو پہننا ہے اس کو پسند ہے، کافی ہے۔" وہ عجیب سرد مہری سے بولا۔

"لو ...... صرف اسے ہی کیوں۔ دیکھنا تو تم نے ہے نا۔ اپنی پریٹی بیوی کو پہنتے۔"

"وہ حیرت سے نکل کر تاسف کی زد میں تھا۔ سہاگ رات کی جھلملاہٹوں کا تصور کرچی کرچی ہو جانے کا کوئی دکھ اس کے چہرے پر رقم نہ تھا۔ اس کی ساری دلچسپی توجہ ان کپڑوں اور جیولری پر مرکوز تھی۔ آبص کو دیکھ کر وہ ذرا سا سنبھل ضرور گئی تھی مگر دھیان ان چیزوں پر تھا۔ ادھر آبص ماں کی اس سازش سے بخوبی باخبر تھا جو ارسلہ کو دولت کی چمک دمک سے گھیرے بیٹھی تھیں۔ اپنے معذور بیٹے کی معذوری اور اس کے سرد جذبات پر یہ حسین پردہ ڈالنا چاہتی تھیں اور کامیاب تھیں۔

وہ اس روم سے نکل کر لیونگ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ نصیر کاکا اس کے لیے ناشتا لگانے لگے۔ اور وہ سوچ رہا تھا دولت کی چمک دمک تو ایک بے معنی سی شے ہے۔ محبت سے اس کا کیا مقابلہ۔ انسان کو زندہ ہی محبت رکھتی ہے رشتوں سے اگر محبت نکال لی جائے تو وہ ایسے ہو جاتے ہیں جیسے کچی مٹی کے کھنکھناتے بدرنگ برتن۔ پھر بھلا ایسا کیسے ممکن ہے کہ عورت ہو اور محبت کی طلب نہ ہو۔ شریک سفر کی توجہ اور پیار کی خواہش مند نہ ہو۔

"ناشتا کر لیجیے آبص میاں۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" نصیر کاکا کی آواز اسے سوچوں سے کھینچ لائی۔

"پاپا آفس چلے گئے۔" وہ ناشتے پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"جی ...... وہ چلے گئے۔ اور کہہ کر گئے ہیں کہ آپ کو بے آرام نہ کیا جائے۔ اس لیے کہ آپ آفس ابھی میرا مطلب ہے ایک دو دن نہیں جائیں گے۔"

نصیر کاکا اسے اکبر جیلانی کا جاری کیا ہوا حکم نامہ سنا رہے تھے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل کر منجمد ہوگئی۔

"آج تو ولیمے کا جھنجٹ ہے۔ کل سے آپ مجھے ٹائم پر جگا دیا کیجیے گا نصیر کاکا۔ آفس جانا بہت ضروری ہے۔" اس کے انداز میں بےزاری سی تھی۔ ولیمے کو جھنجٹ کہنے پر نصیر کاکا نے اس کی طرف دیکھا پھر سر ہلا دیا اور پلٹنے لگے مگر یک دم جیسے کسی خیال سے جھجک سے گئے۔

"میں جگا دیا کروں!"

وہ ذرا سا ٹپٹا گئے۔ اب کیسے ممکن ہوگا۔ اب وہ شادی شدہ تھے۔ کمرے میں ان کی بیوی موجود تھی۔

"آپ الارم رکھ لیا کیجیے گا۔ ارسلہ بی بی اٹھا دیا کریں گی۔" وہ آہستگی سے بولے۔ جواباً آبص نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے ابرو اچکا کر انہیں دیکھا۔ پھر خامشی سے چائے پینے لگا۔

نصیر کا کا دم بھر رکے شاید نیا حکم ملے مگر اس طرف خامشی پا کر پلٹ کر لیونگ روم سے نکل گئے۔

☆☆☆

ولیمہ بے حد شاندار اور بڑے پیمانے پر ارینج کیا گیا تھا۔ آبص اور ارسلہ بے حد خوب صورت کپل دکھائی دے رہے تھے۔ مہوش بے پناہ خوش تھیں کہ سب کچھ ان کی توقع کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ آبص ایک فرماں بردار بیٹے کا رول بہت عمدگی سے ادا کر رہا تھا۔ اور نادیہ شاہ کے سحر سے آزاد ہو چکا تھا۔ ان کی جان پہچان کی تمام عورتوں نے ارسلہ کی بے حد تعریف کی اور ان دونوں کو اس ایر کا سب سے خوب صورت جوڑا قرار دیا۔

"مہوش کی پسند کو تو داد دیتے ہیں ہیرا ڈھونڈ کر لائی ہے۔" اکثر خواتین کا یہی خیال تھا۔

ادھر حیات علی کی فیملی بھی بے حد مطمئن اور خوش تھی۔ ولیمے سے واپسی پر سب شاندار ولیمے کی باتیں اور کھانے اور انتظامات کی تعریف کر رہے تھے۔ سکندر گاڑی لے کر آیا تھا سب اسی میں واپسی کا سفر کاٹ رہے تھے۔ سب کے تبصرے جاری تھے سوائے سکندر کے جو خامشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اس کی یہ غیر معمولی خاموشی کو سوائے نیلوفر کے کوئی محسوس نہ کر پایا تھا۔

"بڑے ہی اچھے لوگ ہیں۔ بالکل بھی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی اکبر جیلانی کے پاس بیٹھ کر، اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔" ابا بے حد خوش اور پر سکون دکھائی دے رہے تھے۔

"ہاں ان کی بیگم بھی بڑی ملنسار اور محبت کرنے والی خاتون ہیں۔ اپنی ارسلہ پر تو جی جان سے فدا ہیں۔" اماں عقیلہ خالہ سے کہنے لگیں۔ تم نے دیکھا نا عقیلہ کیسے وہ واری صدقے جا رہی تھیں۔ اتنے مہمانوں کو اٹینڈ کرنے کے ساتھ ساتھ ارسلہ سے غافل نہیں تھیں۔

"ہاں...... یہ تو ہے...... ارسلہ بہت خوش ہے۔ آبص بھی بڑا اسلجھا ہوا لڑکا معلوم ہوتا ہے۔" عقیلہ خالہ نے کھلے دل سے تعریف کی۔

"ہاں ماشاء اللہ آبص بڑا اسلجھا ہوا لڑکا ہے۔" ابا نے سر ہلایا پھر چہرے پر ایک پل کو تشویش ابھری۔ "اس کے پیر کی طرف سے ذرا دل سہما ہوا ہے۔ کہیں یہ لنگ رہ نہ جائے۔"

"آئے ہائے۔ خدا نہ کرے۔ کیسی بدفال منہ سے نکال رہے ہیں۔ رہ کیوں جائے گا۔ علاج ہو رہا ہے اور خیر سے اتنے پیسے والے لوگ ہیں۔ ان کے پاس کس چیز کی کمی ہے کہ علاج میں کوتاہی کریں گے۔ مہوش بتا تو رہی تھیں کہ بس دو ہفتے کے بعد وہ اسٹک بھی چھوڑ دے گا۔ ٹھیک سے چلنے لگے گا۔" اماں کی بات پر نیلوفر کے دل کو جیسے تسلی نہ ہوئی۔

"تو دو ہفتے رک کر رخصتی کر لیتے۔ ایسی کیا جلدی مچی تھی۔ اماں۔"

سکندر نے ابرو اچکا کر نیلوفر کو دیکھا۔ جو بلاوجہ اماں سے الجھی تھی۔

"اچھا بس۔ اب ہو گئی سو ہو گئی۔ بچی خوش ہے اپنے گھر میں یہ اطمینان کافی ہے۔" اماں اسے ٹوک گئیں۔

"ہاں بیٹا۔ یہ تو وقت متعین ہوتا ہے نکاح کا۔ جب لکھا تھا ہو گیا۔ بس اب دعا ہے کہ آبص کو صحت دے اور ارسلہ کو سدا سکھی اور آباد رکھے اپنے گھر میں...... سدا سہاگن رہے۔" عقیلہ خالہ نے ہمیشہ کی طرح میٹھے نرم لہجے میں کہہ کر نیلوفر کو مزید حجت سے روک دیا۔

نیلوفر آج میکے جا رہی تھی۔ احمر ہوٹل سے ہی چلا گیا تھا۔ اس کی اماں کے ہمراہ اور وہ احمر کی اجازت سے میکے چلی آئی تھی۔

"مجھے تو آج بہت مزا آیا۔" گاڑی گھر کے سامنے رک چکی تھی سب اتر گئے تھے اور اریبہ اترتے اترتے بولی۔ "مجھے تو لگتا ہے سکندر بھائی آپ بہت بور ہوئے ہیں۔"

"ارے نہیں تو۔ ایسا کیوں لگا تمہیں۔" وہ چونک سا گیا اور اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ جیسے کوئی تاثر مٹانا چاہا ہو۔ کیا اس کے چہرے سے کچھ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی دل گرفتگی، رنجیدگی اس نے یونہی گاڑی میں لگے شیشے میں اپنا چہرہ ٹٹولا۔

"آپ پورے راستے چپ جو رہے ہیں کوئی کمنٹ نہیں کیا۔"

"کیا کہتا۔ جو اچھا تھا سو اچھا تھا۔ آپ سب لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اب میں کیا کمنٹس کرتا سب تو کر رہے تھے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ بال سمیٹ کر اترنے لگی پھر ذرا سا رک کر سکندر کی گردن اور چمکتے بالوں پر نظر ڈال کر بولی۔ "مجھ پر کمنٹس کر دیتے کہ میں کیسی لگ رہی تھی۔"

سکندر کے اعصاب پر گویا پتھر سا آ کر لگا۔

یہ کھکھلاتی معصوم اریبہ کا لہجہ تو نہ تھا۔ اس نے یونہی ذرا سی گردن موڑی۔ تو وہ جھپاک سے گاڑی سے اتر گئی اور دروازہ بند کرتے ہوئے سکندر کی نگاہوں سے یوں نظریں چرا گئی گویا کوئی نو آموز چور چوری کرتے ہوئے یک دم پکڑے جانے کے ڈر سے سہم گیا ہو۔

عقیلہ خالہ احتراماً اماں ابا کو دروازے تک چھوڑنے گئی تھیں پھر پلٹ کر گاڑی میں آ کر بیٹھیں تو سکندر نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

"خدا کا شکر سب خیر خیریت سے نمٹ گیا۔"

وہ گہری سانس بھر کر اپنی چادر درست کر رہی تھیں اور سکندر ارسلہ کے تصور سے سلگ رہا تھا۔

☆☆☆

ارسلہ ہوٹل سے کوٹھی پہنچی تو یہاں بھی فوٹو سیشن ہونے لگے مہوش اور رومی کے ہمراہ۔ رومی کی فرینڈز اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مختلف پوز بنتے گئے اور خود ارسلہ کو بھی بے حد شوق چرایا ہوا تھا۔ اپنا یہ روپ وہ ہر انداز ہر زاویے سے قید کر لینا چاہتی تھی تصویر میں۔

آبص البتہ ہوٹل سے کوٹھی میں آ کر سیدھا اپنی خواب گاہ میں چلا آیا تھا اسے سروکار نہ تھا کہ ارسلہ کتنی دیر باہر ہے اور کتنی تصویریں بنا رہی تھی۔ وہ شب خوابی کا لباس بدل کر ایک اضمحلال سمیٹے بیڈ پر چت لیٹ گیا۔ اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔

محسن میرے وجود کو سنگسار کرتے وقت
شامل تھا سارا شہر اک تہوار کی طرح

یہ چند روز اور گزرا دن جس کرب سے گزرے تھے اس کا اندازہ خدا کو تھا یا پھر اس کے تپتے بے سکون دل کو۔ سارے سوئے ہوئے درد جاگ کر ٹیس دینے لگے تھے۔ اس کا خیال تھا اس کی ماں نے اس پر بے حد ظلم کیا ہے۔ بہت بڑی زیادتی کی ہے۔ آخر کب تک وہ درمیانی راستے پر چل سکے گا۔ وہ تو ابھی سے تھکنے لگا تھا۔ آج تو ایسا لگ رہا تھا جیسے خود کو تنکا تنکا جمع کر کے مضبوط بنانے کا سارا عمل بکھر کر رہ گیا تھا۔ خود اپنی ذات سے بھی اعتماد اب تو اٹھتا محسوس ہو رہا تھا۔

کبھی کبھی انسان کتنا بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے زمین پر رینگنے والے کیڑے سے بھی زیادہ بے بس مجبور، چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کر سکتا ہو۔

اس نے بازو آنکھوں پر دھر لیا۔ جیسے نادیہ شاہ کی نگاہوں سے چھپنا بچنا چاہ رہا ہو۔

”چلو۔ آج تمہارے ہمراہ تمہارے گھر چلتا ہوں۔ آنٹی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہے۔ تم بہت تعریف کرتی ہو ان کے پکے ہوئے کھانوں کی۔“ اس روز وہ اس کے گھر جانے پر مصر تھا۔

”ارے رے، ایسے کیسے چلو گے۔ پاگل ہو گیا؟“

”کیوں؟“

”کس ناتے لے جاؤں۔ کیا کہوں گی امی کو۔ اور امی کیا کہیں گی۔“

”کیا کہیں گی! میرے جیسے حسین گبرو جوان کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گی۔“

”جی نہیں۔ کہیں گی، پڑھنے بھیجا ہے لڑکا پھنسا کر آئی ہو۔“

”نہیں......لڑکے نے لڑکی پٹالی ہے۔“

”بات تو سچ ہے۔ مگر بات ہے رسوائی کی۔“ وہ ہنسنے لگی پھر جلدی سے شولڈر بیگ کندھے پر لٹکایا اور بینچ سے کھڑی ہو گئی۔

”اچھا، اب جا کہاں رہی ہو۔ لنچ کرتے ہیں مل کر۔“

”خاطر جمع رکھو۔ اتنا فری نہیں کر رہی۔ اب چلوں گی تم نے دس منٹ پہلے ہی میرے ضائع کر دیے۔ امی ٹائم دیکھ رہی ہوں گی بلکہ اب تو گھڑی پر نگاہیں گاہے بگاہے ڈال کر بڑبڑا رہی ہوں گی کہ خدا جانے یہ لڑکی کہاں رہ گئی۔ اور جو ذرا اور دیر ہوئی تو پڑھنا شروع کر دیں گی آیت کریمہ۔“

”واؤ، کتنی خوش نصیب ہو تم نادیہ۔ اتنی چاہنے والی ماں ہے تمہاری۔“ وہ بھی بینچ سے اٹھ گیا۔

”مائیں تو چاہنے والی ہی ہوتی ہیں بلکہ چاہت کا نام ہی ماں ہوتا ہے۔ بس، ہم اولاد ان کی چاہت...... ان کے اعتماد کا بھرم رکھیں بات تب ہے۔ او کے بائے......اوہ......“ وہ پلٹتے پلٹتے رکی۔ ”سوری۔ اماں کہتی ہیں بلکہ گھرکتی ہیں کہ بائے بائے مت کیا کرو۔ سلامتی لو اور سلامتی دو۔ اللہ حافظ کہا کرو۔ ایک دوسرے کو دعائیں دے کر رخصت کیا کرو۔ پتا نہیں پھر ملنا ہو یا نہ ہو۔“

وہ کسی باد صبا کے جھونکے کی طرح چلی گئی، اپنے پیچھے خوشبو کا جہاں چھوڑ کر۔ وہ ڈھونڈتا رہ گیا۔

ہاں پھر ملنا ہو یا نہ ہو۔

اس کی آنکھوں ریت سی چبھنے لگی

”آہ۔ جانے کس کھوہ میں کھو گئی ہو نادیہ شاہ۔ کہاں گم ہو گئیں۔ تم بے وفا تھیں...... بے وفائی کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تم نے دھوکا دیا ہے۔ راہ بدل لی۔ ہاں مجبور ہو کر شادی ضرور کی ہو گی۔ میرے گھر والوں کے رویوں پر دل برداشتہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی ہو گی۔ جب تک مجھ سے مل کر خود نہ کہو گی کہ میں نے بے وفائی کی ہے۔ میں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔“

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور نئی سگریٹ سلگانے لگا تب دروازہ کھلا اور ارسلہ اندر داخل ہوئی۔ پہلے تو ذرا سا جھجکی پھر دروازہ آہستگی سے لاک کر دیا۔ کمرے کی گہری خامشی کو اس کے ہاتھوں میں پڑیں سونے کی چوڑیوں نے کھنک کر توڑا تھا۔

”آپ بہت جلدی کمرے میں آ گئے۔ ابھی تو سب کو آپ کے ساتھ تصویریں اور وڈیوز بنانی تھیں۔“ وہ اٹالین طرز کی، دلکش سنگار میز کے پاس آ کر رک گئی۔ اسے بیڈ پر شب خوابی کے لباس میں دراز دیکھ کر بولی۔ ”لگتا ہے آپ کو زیادہ دلچسپی نہیں ان چیزوں سے۔“

”کچھ ایسا ہی ہے۔“ وہ یکسر بے کیف لہجے میں بولا۔

”ایسے لمحات زندگی میں بار بار تو نہیں آتے۔ مجھے تو یہ سب بہت اچھا لگتا ہے۔“ وہ جیولری اتارنے لگی۔

”آپ اپنے سارے شوق پورے کر سکتی ہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔“ اس نے اپنا موبائل اٹھاتے ہوئے اس پر اچٹتی نظر ڈالی۔

”ارے نہیں اب ایسا بھی کوئی زیادہ شوق نہیں۔“ وہ اس کے لہجے سے یہی اخذ کر سکی کہ وہ طنز کر رہا ہے۔

”وہ تو بس رومی کے اصرار پر۔ میں انکار نہ کر سکی۔“ وہ خواہ مخواہ وضاحت دینے لگی۔

”اٹس او کے۔ میں نے کہا نا مجھے اعتراض نہیں۔ آپ اپنے شوق پوری کر سکتی ہیں۔ میں آپ کے کسی شوق کسی خوشی میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔“ وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔ ارسلہ نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تکیہ درست کر کے شاید سونے کی تیاری کر رہا تھا اس کے دل کو دھچکا سا لگا۔

”آپ شاید تھک گئے ہیں۔“ وہ جھک کر اس کے نزدیک چلی آئی۔

آبص نے نظریں اٹھائیں۔ پہلی بار غور سے دیکھا۔ مگر دوسرے پل نظریں چرا گیا۔

”گلاب اور موتیے کی خوشبو کے ہمراہ پرفیوم کی تیز مہک سب کچھ گڈمڈ ہو کر اس کے حواس پر چھانے لگی تو وہ وحشت زدہ سا ہونے لگا۔

”پلیز ارسلہ۔ آپ چینج کر لیں مجھے الجھن ہو رہی ہے ان کپڑوں کو دیکھ کر۔“ وہ اپنے لہجے کو کوشش کے باوجود کھردرے پن سے نہ روک سکا۔

اس کا یہ انداز اور لہجہ ارسلہ کے لیے حیران کن ہی نہیں پریشان کن بھی ثابت ہوا تھا۔ وہ ٹپٹا کر جلدی سے پلٹ کر واش روم کی جانب چل دی۔

آبص انتہائی بے چارگی اور بے بسی محسوس کر کے رہ گیا۔

وہ باتھ روم سے باہر آئی تو آبص اپنی وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ اور شاید اس کے باہر آنے کا منتظر تھا۔ وہ اپنے نم نم بالوں پر برش پھیرنے لگی۔ آبص سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر اسے لبوں سے دبا کر لائٹر کا شعلہ دکھاتے ہوئے چند لمحے اس کی کارروائی دیکھتا رہا۔ جب وہ بال لپیٹ کر اپنے بیڈ کی طرف جانے کو مڑی تب اس نے اسے پکار لیا۔

”پلیز ارسلہ یہاں آ کر بیٹھیں مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ اس کا لہجہ دھیما اور سادہ سا تھا تاہم کسی قسم کی دلچسپی یا شوق کی لپک نہ تھی۔

ارسلہ حیران پریشان سی اس کے سامنے رکھی مخملی گداز کرسی پر بیٹھ گئی۔

سوری ارسلہ۔ میں جو باتیں آپ سے کرنے جا رہا ہوں یقیناً آپ اس کے لیے تیار نہ ہوں گی۔ شاید یہ سب شاکنگ ہو آپ کے لیے۔ لمحے توقف کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

”آپ مجھے ”تم“ کہہ سکتے ہیں۔ آپ لفظ بہت بھاری لگتا ہے کانوں کو۔“ وہ اس کی بات کے درمیان بولی۔ پھر ہنسی۔ ”عادت نہیں ہے۔ آج تک ”تم“ ہی لفظ سنتی رہی ہوں۔ اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ ”آپ“ سے اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔ چلیں اب کہیے کیا کہنا چاہ رہے تھے آپ۔“

آبص اپنے کھنچے ہوئے اعصاب کو سنبھالنے کے لیے ایک گہری سانس کھینچ کر بے مقصد مسکرا دیا اور سوچنے لگا وہ بات کہاں سے شروع کرے۔

”آپ کچھ کہہ رہے تھے۔ میرا مطلب ہے کہنا چاہ رہے ہیں۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔ شکر ہے آپ نے بھی باتیں کرنے کی بات کی۔ ورنہ میں تو سمجھ رہی تھی آج بھی آپ چپ چپ رہیں گے اور سو جائیں گے۔“ وہ اپنا اعتماد بحال کر چکی تھی۔ اور اس کا مظاہرہ بھی کر رہی تھی۔

''سوری، ہوسکتا ہے میری باتیں آپ کو خوشی نہ دیں۔ خیر......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکا پھر ہلکی سانس کھینچ کر سر کو ہلکے سے جنبش دے کر اصل مقصد پر آتے ہوئے بولا۔ ''پہلی بات یہ کہ میں وضاحت کردوں کہ میں یہ بات کہنے کی ہمت اس لیے کررہا ہوں کہ مجھے یقین ہے کہ تم نے مجھ سے ایکسپیکٹیشن (توقعات) زیادہ نہیں رکھی ہوں گی۔ تم نے مجھے دیکھا نہیں تھا نہ ملی تھیں مجھ سے۔ میرا مطلب ہے جانے پہچانے بنا ایک اجنبی سے شادی کا فیصلہ کرلیا۔ جس سے میں یہ سمجھ سکا ہوں کہ تم میری ذات سے زیادہ میرے اسٹیٹس اور میری دولت میں دلچسپی رکھتی ہو۔'' اس نے کب کا دھواں بہر حال نکالنے کی ٹھان ہی لی تھی۔

ارسلہ اچنبھے سے دیکھنے لگی۔

''میں سمجھی نہیں۔'' پھر آہستگی سے سر جھکا گئی۔ ''آپ وضاحت دیں۔''

''تم سمجھ رہی ہو جو میں کہہ رہا ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ذرا سا دبنگ لہجے میں بولا۔

''منگنی ہونے تک تم نہ مجھ سے ملیں نہ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میری فیملی سے انسپائر تھیں یا میری دولت سے۔ اور مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم نے صرف اور صرف پیسہ دیکھا۔ یہ اسٹیٹس یہ سہولیات......'' وہ رک کر اس کے چہرے کو ٹٹولنے لگا۔

ارسلہ کے لیے یہ سچویشن خاصی سٹپٹا دینے والی تھی۔ کھسیاہٹ سے اس کے چہرے پر سرخی جھلکی۔

''ارے نہیں، مجھے آپ کی فیملی کے ممبرز بہت اچھے لگے اور پھر رومی سے دوستی تھی نا۔ ہاں۔ وہ اچھی لگی۔ آپ کا گھر۔ سب اچھا لگا تھا۔'' وہ دھیرے سے ہنسی مگر اسے اپنی ہنسی بڑی کھوکھلی لگی۔

''سوائے میرے۔ سب اچھا لگا تم کو۔'' وہ مسکرایا۔ طنز اس کے لہجے میں ہی نہیں اس کی مسکراہٹ میں بھی اُمڈ تھا۔

''آپ کی تصویر دیکھی تھی، رومی نے دکھائی تھی۔ آپ اچھے لگے کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ میں آپ کو رد کرتی۔'' اس کا لہجہ دفاعیہ تھا۔

''اتنے بڑے فالٹ (عیب) کے باوجود......!'' اس نے اپنے پیر کی طرف اشارہ کیا۔ بظاہر تم ایک مکمل لڑکی ہو اور میرا نہیں خیال کے کوئی لڑکی ایک معذور ہم سفر کی خواہش مند ہوگی۔'' وہ حقیقتاً متعجب ہوا تھا۔

''ارے نہیں......وہ......''

''کیا تمہارے علم میں یہ بات نہیں کہ میری یہ ٹانگ پچھلے آٹھ ماہ پہلے ایکسیڈنٹ میں ٹوٹ گئی تھی۔'' وہ اس کی جانب جھکا یہ روح فرسا انکشاف کررہا تھا پھر یک دم سیدھا ہوا اور ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے اس کے چہرے پر دیکھا۔ ''مگر شاید تمہیں اس سے بھی زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔''

''آٹھ ماہ پہلے...... یہ بات میرے علم میں نہیں تھی۔'' وہ صدمے کی سی کیفیت میں اس کے پیروں کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

گویا رومی اور مہوش نے اس سے کھلا جھوٹ بولا۔

''کاش! تمہارے علم میں ہوتا تو تم انکار کردیتیں۔''

آبص کی نظریں اس کے چہرے پر یوں جمی تھیں جیسے کسی فریم میں جڑی تصویر کی جامد نظریں۔ مگر وہ جامد نہ تھیں۔ اس میں حیرت بھی سوال تھا۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات کو جانچ رہا تھا۔ وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ فوری طور پر کوئی جواب سمجھ میں نہیں آیا۔ تب وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

ارسلہ نے نظریں چرالیں۔ اس نے سوچا وہ اگر نہ کہے گی تو وہ طنز کرے گا کہ دولت کے لیے شادی کی ہے اور ہاں کہتی تو زبان ہی لڑکھڑا جاتی۔ اسے تذبذب میں دیکھ کر آبص نے جیسے اس کی مشکل آسان کردی یہ کہہ کر۔

''خیر، چھوڑو یہ بے کار کی باتیں ہیں اور بے معنی سوال و جواب۔ یوں بھی تمہارے کسی بھی جواب سے میری زندگی نہیں بدل سکتی۔ جو ہونا تھا وہ ہوچکا ہے بلکہ جو نہیں ہونا تھا وہ ہوچکا ہے۔ قسمت سے لڑ نہیں سکتا۔''

اس نے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر اپنے لبوں کے درمیان باہم دبائی اور اسے لائٹر کا شعلہ دکھایا۔ پھر ایک گہرا کش لے کر دھواں اپنی آنکھوں کے گرد پھیلا دیا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر پڑے آڑے ترچھے بل اس کی دلی کیفیت کی غمازی کررہے تھے۔ وہ کس شدید ذہنی دباؤ اور شدید بدلی کا شکار دکھائی دینے لگا تھا۔

ارسلہ شاک کی کیفیت سے نکل چکی تھی۔ اپنی حیرت سمیٹ چکی تھی۔ اور اس سرمئی دھویں کو دیکھ رہی تھی جو اس کے تراشیدہ ہونٹوں سے نکل کر اس کے چہرے کے اردگرد پھیل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں گہری سرمئی تھیں اور ایسا لگ رہا تھا اس کی آنکھوں کا رنگ ہر جگہ اردگرد پھیل رہا ہو۔

''کیا آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔'' وہ اس کی وہیل چیئر کو پلٹتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

وہ رک گیا۔ یونہی گردن ذرا سی موڑ کر اسے دیکھا۔ اعصاب ایک پل کے لیے کھنچتے ہوئے محسوس ہونے لگے پھر اس نے ہلکی سی سانس کھینچی اور تنے ہوئے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے موبائل پر جھک گیا۔

چند لمحوں بعد وہ اسے نادیہ شاہ کی تصویر دکھا رہا تھا۔ جو اس نے مری میں چپکے سے لی تھی۔ جس کا علم خود نادیہ شاہ کو بھی نہ تھا۔

ماضی کے اذیت آمیز...... مسرت آمیز سارے ہی درد جاگ اٹھے گویا۔ اسے لگا روح کے زخموں کے ٹانکے دھڑ دھڑا ادھڑنے لگے ہوں۔ ہر زخم آنچ دینے لگا ہو۔ یادوں کا ایک ریلا سا اُمڈ رہا تھا۔

ہنستی مسکراتی، تلخ زہریلی یادیں۔......

وہ ارسلہ کو داستان عشق سنا رہا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ اسے کھو کر بہت دکھی ہے۔ ملول اور اداس ہے۔

آبص کا خیال تھا وہ یہ سب سن کر اسے برا بھلا کہے گی۔ روئے گی۔ ماتم کرے گی۔ مگر وہ نادیہ شاہ کی تصویر دیکھ کر اس شاک سے ہی نہ نکلی تھی کہ ایک عام سی شکل و صورت کی ایک متوسط گھرانے کی......نادیہ شاہ، میں تھا ہی کیا کہ یہ شہزادہ اس پر فدا ہوگیا تھا۔ اس کے غم کو دل سے لگالیا۔

وہ سر اٹھا کر دھیرے سے مسکرائی۔

''یہ تو بہت عام سی کہانی ہے۔'' اس کے لہجے کا اعتماد قابل دید تھا۔ نادیہ شاہ کو دیکھ کر کلیجے میں جلن کے بجائے ٹھنڈ سی پڑ گئی تھی۔ خود کو وہ اس کے مقابلے میں شہزادی کہتی تو غلط نہ ہوتا۔

''حیرت ہے آپ کی پسند اور اتنی بری۔ میرا مطلب ہے عام سی......''

اس نے موبائل سے سر اٹھا کر حیرت کے طور پر اس کو دیکھا۔

''دیکھیں نا، محبت تو انسان اس سے کرتا ہے نا جس میں کوئی کشش ہو۔ یا اچھی شکل صورت ہو یا اعلا خاندان، اسٹیٹس مگر یہ تو بالکل عام سے گھر کی ایک معمولی شکل و صورت کی لڑکی ہے۔ اس میں کیا نظر آیا آپ کو۔ آپ کہاں اور وہ کہاں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے لبوں پر پھیلنے والی مسکراہٹ نہ روک سکی۔ پھر دوسرے پل آبص کے چہرے پر پھیلنے والی سنجیدگی اور نگاہوں سے ٹپکنے والی ترشی سے ذرا سی خفیف سی ہوگئی۔

''سوری۔ مگر میرا خیال ہے کہ میں اس سے کہیں بہتر ہوں۔'' وہ اٹھ کر بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ لہجے میں غرور کی چھنک خود بخود اتر آئی۔

آبص نے موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے خود آزاری کی سی کیفیت میں سر کو خفیف سی جنبش دی۔ بہت سخت بات کہنے کی خواہش مچل کر اندر ہی دم توڑ گئی۔ جیسے کوئی بھری ہوئی سوچ ساحل پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ

دی جائے۔ وہ فقط متاسفانہ سانس بھر کر رہ گیا۔
مگر ادھر وہ اس کی دلی کیفیت سے بے خبر دل ہی دل میں فخر سمیٹے یہ سوچ رہی تھی کہ آبص صاحب، اسے محبت نہیں کہتے۔ آنکھوں میں کنکرے پڑنا کہتے ہیں۔ اب نادیہ شاہ جیسی لڑکی سے کوئی تم جیسا لڑکا محبت کر سکتا ہے اسے شادی کے لیے پسند کر سکتا ہے بھلا۔

"محبت کے معاملے میں ہر کسی کا نقطہ نظر الگ ہوتا ہے ضروری نہیں جو شے تمہیں متاثر کر رہی ہو وہ کسی اور کے لیے بھی اتنی ہی اثر انگیز ہو۔" وہ کھڑکی کے پاس جا کر بلائنڈ کھول کر جھانکنے لگا۔ پھر بلائنڈ بند کر کے اس کی جانب گھوما۔

"میرے نزدیک شکل وصورت بگڑ جانے والی شے ہے۔ پیسہ آنے جانے والی شے۔ اور محبت لافانی جذبہ ہے۔ یہ دل سے دل تک کا سفر ہے یہ روح کو روح سے مکمل کرتی ہے اس کے راستے میں شکل صورت، دولت، اسٹیٹس نہیں آتے یہ خواہش کی اور تمناؤں سے جڑی نہیں ہوتی۔ اس کی الگ اپنی ایک دنیا ہے۔ جس کو ایک سطحی سوچ رکھنے والا نہیں سمجھ سکتا۔ عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر ایسے ہی طے نہیں پا جاتا۔ عاشق کو ہر شے میں...... سوز وساز میں بھی چڑیوں کی چہک یا پھولوں کی مہک، پتھر کی سختی، زمین کی نرمی، دریا کی روانی مرغزاروں بہاروں میں...... سب میں ایک ہی ہستی کا جلوہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہر شے اس کے لیے بس اس کی یاد...... اس کا تصور بن جاتی ہے۔ یہ دولت کیا ہے۔ شکل وصورت کیا ہے۔ اسے تو اپنا آپ بھی بے معنی حقیر محسوس ہونے لگتا ہے۔"

وہ اس کے سامنے حقیقی محبت کی تصویر کشی کر رہا تھا جبکہ ارسلہ قطعاً متاثر نہیں ہو رہی تھی بلکہ اس کے لیے یہ محض موٹے گاڑھے الفاظ سے زیادہ نہ تھے۔ اسے تو یوں بھی سکندر کے جملوں سے کبھی دلچسپی نہ تھی۔ آبص کے ان جذبات پر ہاں ہنسی ضرور آرہی تھی۔

"آج کے دور میں ایسی محبت کون کرتا ہے۔ اس طرح کے جذبات کون پالتا ہے۔ سب فضول باتیں ہیں۔" وہ تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئی۔

وہ ہنسی نہیں تھی مگر آبص کو لگا وہ ہنسی ہو۔ اس کا مذاق اڑا رہی ہو۔

"تمہاری نظر میں محبت فضول اور بے معنی جذبہ ہے۔"

اس نے چبھتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"فضول تو نہیں کہا۔ مگر ایسا بھی کچھ نہیں کہ ایک بندے کے لیے دنیا ہی تیاگ دیں۔ مل گئی تو ٹھیک نہ ملی تو کوئی بات نہیں۔ زندگی کا سفر رک تو نہیں جاتا کسی ایک کے نہ ہونے سے۔" وہ اپنے نادر خیالات کا برملا اظہار کر رہی تھی۔

"کمال ہے......!" وہ حیرت میں تھا۔ "محبت سے بھی کوئی منکر ہوتا ہے۔"

اس نے ایک گہرا سانس یوں بھرا جیسے اپنے منتشر ذہن کو سنبھالا دینا چاہا ہو۔

"محبت کے بغیر زندگی کیسے گزر سکتی ہے۔"

"سچ کہوں۔" وہ اس کی بات سن کر سیدھی ہو بیٹھی۔ "محبت کے بغیر تو زندگی گزر سکتی ہے، بہت آرام سے مگر آسائشات اور سہولیات کے بنا نہیں گزر سکتی۔ آبص صاحب۔" وہ اپنی بات پر جم کر کھڑی تھی۔ "اب دیکھیے نا۔ اے سی کی خنک ریز ہوا میں بیٹھ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ گرمی کا کیا ہے یہ تو موسم ہے گزر جائے گا مگر اندھیرے میں بیٹھے گرمی کھاتا ہوئے شخص کی پہلی ترجیح بجلی کا آنا ہوگا۔ محبت کا پانا نہیں۔"

"لاحول ولا......" آبص کے اعصاب پر اس کے جملے کسی ضرب کی طرح لگے۔ وہ بات کو کہاں سے کہاں ملا رہی تھی۔ اس کی نگاہ میں سہولیات، آسائشات آسودگی تھی۔

محبت کی ناکامی سے بڑی ناآسودگی کیا ہوگی۔ دل بجھے ہوں تو محل بھی برے لگتے ہیں۔ چاہتیں نہ ہوں تو گھر ویران لگتے ہیں۔ محبت ہی تو ہر شے میں رنگ بھر دیتی ہے۔

وہ کہنا چاہتا تھا مگر اس سے الجھنا محض وقت کا زیاں خیال کر کے سوچا شب خوابی کا لباس بدل کر سو جائے، یہ بہتر ہوگا۔

"آپ ناراض ہو گئے شاید۔" وہ اس کا رخ ہاتھ باتھ روم کی جانب دیکھ کر اٹھ کر اس کی کرسی تک آئی۔

"میں تو ایک عام سی بات کر رہی تھی میرا مقصد آپ کو احمق سمجھنا یا کہنا نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح کی محبت تو شاید ہر امیر زادہ اپنی نوجوانی میں کر ہی لیتا ہے جسے محبت نہیں غلطی کہتے ہیں پھر بھول بھال جاتا ہے۔"

"مائنڈ اٹ" آبص نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ملامت سے گھورا۔ "محبت اور فلرٹ میں بہت فرق ہے ارسلہ صاحبہ۔" وہ جیسے بھڑکا تھا۔ "ہر کوئی محبت نہیں کرتا اور نہ ہر کوئی اس قابل ہوتا ہے کہ اس سے محبت کی جائے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اسے ملامت بھری نظروں سے دیکھا اور وہیل چیئر کا رخ باتھ روم کی جانب کر لیا۔

ارسلہ بیڈ پر آکر بیٹھ گئی۔ ایک نظر باتھ روم کے خوش نما دروازے پر ڈالی پھر گزرے واقعات پر غور کرنے لگی۔ عجیب ذلت کا احساس ہونے لگا۔ ملن کے یہ خوب صورت دن یوں بے اعتنائی کی نذر ہو جائیں گے۔ اس کا تصور بھی نہ تھا اس کے پاس۔ اس کا سارا جوش ماند پڑ گیا۔ آبص کی ساری باتیں اس کے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح لگنے لگیں۔ اسے سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ اتنا سب کچھ پا کر خوشی منائے یا آبص کی باتوں پر بین کرے۔ وہ معذوری کی زندگی گزارے گا۔ اسی طرح اسٹک پر چلتا رہے گا۔ اسے نادیہ شاہ کا غم نہیں تھا اس کا خیال تھا ایسا تو ہر امیر زادے کی زندگی میں تھرل آتا ہے۔ مگر یہ معذوری والی بات اس کے گلے میں اٹک رہی تھی۔ اسے یکدم مہوش ایک مکار اور چالاک عورت محسوس ہونے لگی جس نے کس خوب صورتی سے اس کے والدین کو بے وقوف بنا لیا تھا...... محبت کا ناٹک رچا کر اسے گھیر لیا تھا۔

وہ جلتی کڑھتی بیڈ پر چت لیٹ گئی۔ اس کے دماغ میں کھولن ہونے لگی جیسے رگوں میں خون نہیں آگ دوڑ رہی ہو۔ کچھ دیر وہ آبص کی معذوری، اس بے اعتنائی پر سوچتی رہی۔ پھر کمرے پر طائرانہ نگاہیں دوڑائیں۔

یہ محل نما کوٹھی یہ آسائش سے پر کمرا، اس کی نگاہوں میں پھرنے لگا۔ اس نے ہلکے سے سانس کھینچا اور سوچوں کا رخ بدلا تو اسے لگا سودا مہنگا تو پھر بھی نہیں تھا۔ محبت تو اس کی ڈیمانڈ پہلے بھی نہ تھی۔ وہ سوچ رہی تھی آبص کی معذوری کو سر پر سوار نہیں کرنا چاہیے۔ الٹا وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ مہوش کو چھری تلے لے سکتی تھی۔ اور ہر بات منوا سکتی تھی۔ آخر اتنی بڑی قربانی لی ہے مجھ سے اس مکار عورت نے۔ ایسے تو نہ چھوڑ دوں گی۔

اس کا ذہن مستقبل کا پلان مرتب کرنے لگا۔ پھر اسے خبر ہی نہ ہوئی کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

آبص باتھ روم سے نکل کر بیڈ پر آنے کے بجائے ٹیرس میں چلا آیا۔ اسے گہری نیند میں غرق دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ اس کا تو خیال تھا وہ کمرے کے کسی کونے میں بیٹھی آنسو بہا رہی ہوگی۔ مگر وہاں تو گہری نیند کے مزے لوٹے جا رہے تھے گویا یہ اس کے لیے معمول کی بات ہو۔ اس نے بیڈ کے سائڈ دراز سے اپنا لائٹر اور سگریٹ کا پیکٹ اٹھاتے ہوئے اس کے چہرے پر یونہی نگاہ ڈالی۔ بلاشبہ وہ نیند میں بھی اتنی ہی خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ جتنی جاگنے میں اس نے دیکھی تھی۔

"کاش اتنے حسین چہرے کے ساتھ دل بھی حسین ہوتا۔"

اسے تاسف ہو رہا تھا کہ وہ ایک سطحی سوچ رکھنے والی لڑکی تھی۔ مادہ پرست، گو کہ اس کی نظر میں وہ غلط لڑکی نہیں تھی دولت کی چاہ کوئی عیب نہیں تھا مگر مسئلہ تو سارا آبص کے ذہن سوچ کا تھا۔ وہ اس طرح کی سوچ رکھنے

نفیسہ سعید

دل مومی

والی لڑکی کبھی اس کا آئیڈیل نہ تھی۔ اگر حسن ہی اس کی ڈیمانڈ ہوتا تو اس کے سرکل میں اس کے اردگرد ایسے حسین چہرے بہت تھے کسی کا بھی ہاتھ تھام لیتا۔ جسم کی تسکین کوئی مشکل نہیں۔ تن کی آسودگی مسئلہ نہ تھا۔ جذبات کی تسکین بھی ہو جائے گی۔ مگر روح کو مطمئن کرنے والا۔ دل کو بھا جانے والا۔ ذہن کو قبول ہونے والا ساتھی نہیں ملتا۔ مل جائے اور مل کر بچھڑ جائے اس سے بڑا دکھ کوئی نہیں ہوتا۔

اس نے سگریٹ کیس سے آخری سگریٹ اٹھا کر لبوں سے لگایا اور اسے لائٹر کا شعلہ دکھایا۔ ننھا سا بے ضرر شعلہ نیم تاریکی میں چمکنے لگا۔ وہ ہاتھ کا تکیہ بنائے بیڈ پر دراز ہو گیا۔

جیلانی ہاؤس میں سناٹا پھیلا ہوا تھا سب تھکن سے بے حال گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے بس آبص کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ نیند ہی کیا۔ اس کا خیال تھا اس کی زندگی میں سے سکون بھی خارج ہو چکا ہے۔ بے نام سی خامشی اور سناٹا پھیل گیا ہے۔

ارسلہ ذرا فاصلے پر گہری نیند میں غرق تھی۔ اس کے نزدیک ہونے کے باوجود بہت فاصلے پر محسوس ہو رہی تھی۔ وہ فاصلے جسے وہ پاٹنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اور ایک نادیہ شاہ ہزاروں میل پر جیسے جا بیٹھی تھی۔ مگر دل کے اتنے پاس کہ جب چاہے آنکھیں بند کر کے چھو لیتا تھا۔

اس کی آنکھیں یوں جلنے لگیں جیسے ریت سی پڑ گئی ہو۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا دی اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

وہ ارسلہ کے ساتھ یہ رویہ اختیار کر کے خوش ہرگز نہیں تھا اسے لگنے لگا کوئی چیز اس کا دل مسوس رہی تھی۔ اس کی روح پر چٹکیاں بھر رہی تھی۔ سامنے ہی صوفے پر اس کے ولیمے کی شاندار میکسی نیم اندھیرے میں جگمگا رہی تھی۔ مگر اپنی ناآسودگی پر ماتم کناں کرتی محسوس ہوئی اسے۔ اس نے کرب سے لب بھینچ لیے۔

عموماً یوں ہوتا ہے جذبات کا طوفان تھم جاتا ہے۔ غصے اور تلملاہٹوں کی روانی میں سستی آتی ہے تو سوچنے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اپنے رویوں پر کبھی پچھتاوا کبھی بے بسی محسوس ہوتی ہے۔

اسے بھی پچھتاوا ہونے لگا کہ کم از کم اسے ارسلہ کے ساتھ یہ رویہ قطعی اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ محبت نہ سہی اس کے ساتھ ایک اچھا دوست بن کر بات کی جا سکتی تھی۔

پتا نہیں کتنے جذبے، خواہشات اور خواب سجا کر اس کی خواب گاہ میں اتری ہو گی۔ دولت اسٹیٹس کوٹھی کے خواب! کوئی نارسائی کا انتقام اس سے لینا بنتا تو نہیں تھا عجیب آزردگی کی لپیٹ میں تھا وہ۔ ایک بدمزا اذیت آمیز کیفیت میں اپنے آپ کو گرفتار محسوس کر رہا تھا۔

وسیع و عریض بیڈ پر لیٹے ہونے کے باوجود کوشش کے نیند آنکھوں سے یوں دور تھی جیسے صحرا سے پانی۔

درد صحرا ہے
دہکتا ہوا ظالم صحرا
پاؤں پڑ جائے جو اک بار تو جیون جل جائے
رات کس بیتے ہوئے عشق کی یادوں میں گزار آئے ہو
تم کہ ویران کبھی ایسے تو نہ تھے
تم کہ خالی کبھی ایسے تو نہ تھے
تم کہ بکھرے کبھی ایسے تو نہ تھے
اے دل عشق زدہ

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

بڑی بھابھی کا شمار یقیناً ان لوگوں میں ہوتا تھا جو دوسروں کو حیران کرنے کا فن بخوبی جانتے ہوں اور یہ بھی شاید ان کی ایک ایسی واحد صلاحیت تھی جس کا اعتراف دل ہی دل میں سہی پر ثناء کئی بار کر چکی تھی اور ایسا ہی اب ہوا جب ایک دن اچانک انہوں نے امی کے پاس اپنی ایک ایسی خواہش کا ذکر کیا جسے سن کر وہ ایک دم ہی تڑپ اٹھیں اور قدرے ناگواری سے بڑبڑا ئیں۔

"کیا ہوگیا ہے بہو تمہیں...... جانے کیا کیا کرنے کا سوچتی رہتی ہو ہر وقت کوئی الٹا سیدھا منصوبہ تمہارے دماغ میں جگہ بنائے رکھتا ہے۔"

"لیں، اس میں غلط کیا ہے جو آپ اس قدر برا مان گئیں۔" امی کی ناپسندیدگی کے اظہار نے بھابھی کو کچھ دیر کے لیے ہکابکا کر دیا۔

"یہ تو نیکی کا کام ہے......" بھابھی کا یہ جملہ کان سے ٹکراتے ہی کچن میں کام کرتی ثناء کا ہاتھ رک گیا اور کان مکمل طور پر باہر ہونے والی گفتگو کی جانب لگ گئے۔ "ویسے بھی مجھے جاوید نے اجازت دے دی ہے اور اب میں صرف آپ کو بتانا چاہ رہی تھی تاکہ کل کلاں اس بات کو لے کر آپ ناراض نہ ہوں لیکن آپ تو ناراض ہو بھی گئیں۔"

"جب اس زن مرید نے اجازت دے ہی دی تو پھر بھلا مجھے اطلاع دینے کی بھی کیا ضرورت تھی جو تم لوگوں کے جی میں آئے کرتے رہو۔"

مائرہ بھابھی کو باتیں سناتے ہوئے امی لاؤنج کے صوفے سے اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں جب ساتھ میں کولڈ ڈرنک کا گلاس تھامے ثناء کچن سے باہر نکلی تو دیکھا بھابھی اوپر جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

"ارے! آپ کہاں جا رہی ہیں؟ بیٹھ جائیں میں چائے بناتی ہوں۔" کولڈ ڈرنک بھابھی کے قریب رکھتے ہوئے ثناء جلدی سے بولی۔

"رہنے دو چائے۔ یہاں تو کوئی بات بتانا حرام ہے۔ مجال ہے جو کوئی تمہاری خوشی میں خوش ہو بس ہر وقت مخالفت......"

غصہ سے کہتے ہوئے بھابھی اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں اور پیچھے کھڑی ثناء دیر تک یہ سوچتی رہی کہ آخر ماجرا کیا ہے جس نے بیک وقت اماں اور بھابھی کے موڈ کو خراب کر دیا ہے اور معاملہ جاننے کے لیے ضروری تھا کہ دونوں میں سے کوئی ایک اپنی زبان کھولے تاکہ اسے اصل حقیقت پتا چل سکے اور جب تک اصل حقیقت کا علم نہ ہوتا وہ جاذب سے بھی کوئی بات نہ کر سکتی تھی یہ ہی سوچتی ثناء دوبارہ کچن کی جانب آ گئی تاکہ جلدی جلدی روٹی بنا کر امی کو کھانا دے سکے جو ظہر کی نماز کے فوراً بعد کھانا کھا لیا کرتی تھیں اور آج تو وہ ویسے بھی غصہ میں تھیں تو ایسے میں ضروری تھا کہ انہیں کھانا وقت پر دیا جائے۔

☆☆☆

بالآخر شام تک وہ بلی تھیلے سے باہر آ گئی جس نے صبح ثناء کو پریشان کر رکھا تھا۔ جاذب گھر آ کر ابھی فریش ہی ہوا تھا جب بیڈ روم کا دروازہ دھیرے سے بجا کر امی نے اندر جھانکا۔ انہیں دیکھتے ہی ثناء جلدی سے بولی۔

"آ جائیں امی......" اور خود بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی تاکہ سالن گرم کر کے ٹرالی کمرے میں ہی لے آئے اور امی کے ساتھ مل کر کھانا کھا لیا جائے۔ جبکہ امی کسی گہری سوچ میں ڈوبی سامنے موجود صوفہ پر بیٹھ گئیں۔ یقیناً وہ جاذب کے فارغ ہونے کی منتظر تھیں جو الماری میں سر دیے کچھ تلاش کر رہا تھا اور جب تک وہ فارغ ہو کر بیڈ پر بیٹھا تب تک ثناء بھی کھانا گرم کر کے کمرہ میں آ چکی تھی جب اس کے کانوں سے ٹکرانے والا امی کا یہ جملہ اسے واضح کر گیا کہ وہ مائرہ بھابھی کی بات کر رہی ہیں۔

"میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس عورت نے جاوید پر ایسا کون سا جادو کیا ہے۔ جو اس شخص کے منہ میں زبان ہی نہیں رہی ہے مٹی کے مادھو کی طرح جو بیوی کہتی ہے وہ آنکھیں بند کر کے پوری کیے جاتا ہے۔"

"چھوڑیں امی۔ آپ کیوں ٹینشن لیتی ہیں، کرنے دیں دونوں میاں بیوی کو جو ان کا دل

چاہے۔ آ جائیں آپ کھانا کھائیں۔"

جاذب نے امی کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کھانے کی خالی پلیٹ ان کی جانب بڑھائی جبکہ امی کو تو جاذب کے جواب نے جیسے پتنگے لگا دیے۔

"لو بھلا۔ میں ایسے کیسے جانے دوں، میرے بیٹے کے گھر کا مسئلہ ہے کوئی مذاق تھوڑا ہے جو جانے دوں۔"

"کیا ہوا امی...... صبح بڑی بھابھی بھی بڑے غصے میں اوپر گئی تھیں۔" ثناء جلدی سے بولی۔ کیونکہ وہ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی کہ امی سے اصل حقیقت جاننے کی کوشش کرے۔

"ہونا کیا ہے روز کا نت نیا تماشا، اب محترمہ ایک لے پالک بچہ پالنے کا سوچ رہی ہیں کہ اس عمر میں انہیں احساس ہوا کہ دو بچے بہت کم ہیں۔"

امی نے تیزی سے جواب دیا جسے سن کر سالن میں چمچہ گھماتی ثناء کا ہاتھ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ جاذب اس کی جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"تمہیں کیوں سکتہ ہو گیا، کھانا کھاؤ سکون سے یہ بڑی بھابھی ہیں اس لیے ہمیشہ یاد رکھو کچھ بھی کرنے کی خاص صلاحیت ان کے بے چین جسم میں ہر وقت مچلتی رہتی ہے۔ لہٰذا ان کے چھوڑے گئے چھوٹے چھوٹے جھٹکے سہنے کی عادت ڈالو۔"

"کچھ بھی......" ثناء بڑبڑائی۔ "مطلب کچھ بھی......" بات کرتے ہوئے اس نے امی اور جاذب پر باری باری نظر ڈالی۔ "زریاب ماشاءاللہ نویں کلاس میں ہے اور پنکی کلاس سیونتھ میں ایسے میں بھلا بڑی بھابھی اب کیسے نئے سرے سے بچہ پالیں گی، وہ بھی کسی دوسرے کا...... ویسے یہ جھٹکا نہیں ہے کافی سنجیدہ مسئلہ ہے۔" وہ جاذب کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"عقل گھاس چرنے گئی ہے اس عورت کی کہتی ہے پنکی کو چھوٹے بچے کی بہت خواہش ہے تو اسے سالگرہ کا تحفہ دینا ہے۔"

امی کی بات سن کر پانی پیتی ثناء کے حلق میں جیسے پھندا لگ گیا۔

"بیٹی نے کہا کہ منا چاہیے اور اماں باوا ہلکان ہو گئے۔ منا نہ ہوا کوئی کھلونا ہوا جو یہ خرید کر لے آئیں گے۔" امی بڑبڑائیں۔

"مگر بچہ آئے گا کہاں سے؟ موجودہ صورت حال میں جاذب کا سوال خاصا معقول تھا۔

"اسپتال سے......" امی کے جواب نے دونوں میاں بیوی کو پھر سے چونکا دیا۔

"اسپتال میں کیا بچے بھی بکتے ہیں؟" جاذب نے حیرت سے ماں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا جو برا سا منہ بناتے ہوئے بولیں۔

"کہہ رہی ہے جاوید کا کوئی دوست کسی اسپتال میں کام کرتا ہے۔ وہ لا کر دے گا کوئی لاوارث بچہ، جسے اس کی ماں چھوڑ کر بھاگ گئی ہو۔ اب اللہ جانے لاوارث لا دے گا یا کسی ماں کی گود اجاڑ کر ہماری بہو کی خواہش پوری کرے گا۔"

"حیرت ہے، جاوید بھائی کو نہیں پتا، یہ خاصا غیر قانونی کام ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ ایسے لوگ پیسے کی خاطر کچھ بھی کر سکتے ہیں لہٰذا لاوارث تو ماننا ہی پہلی غلطی ہوگی۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں زن مرید اور مٹی کا مادھو، بھلا قانونی اور غیر قانونی وہ کیا جانے۔ اسے تو صرف وہ ہی پتا ہے جو سبق بیوی پڑھا دے، بس وہ ہی اس کے لیے حرفِ آخر ہے۔ اب بچے آنا ہے تو لازمی آنا ہے بے شک کسی ماں سے اغوا کر کے لا دیا جائے۔ یا بے شک بچے کے حصول کی خاطر ماں باپ مار دیے جائیں کہ وہ لاوارث ہو سکے۔"

امی ابھی بھی غصہ میں تھیں اور اب ثناء کی سمجھ میں آیا کہ امی کے غصہ کی اصل وجہ کیا تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ محض چند روپوں کی لالچ میں کوئی اسپتال کا ملازم بچہ چوری کر کے جاوید بھائی کو نہ بیچ دے جسے لے کر بعد میں انہیں پچھتانا پڑے اور پھر کسی ماں کی گود اجاڑنے کا گناہ الگ۔ مگر اب یہ بات بڑی بھابھی کو کون سمجھاتا جو ٹھان ہی چکی تھیں کہ انہیں ایک لاوارث بچے کو ماں بن کر پالنا ہے۔ جس کے لیے وہ خاصی پرجوش تھیں اور انہیں یقین تھا کہ اس نیکی کا اجر دین و دنیا کی کامیابی ہے۔ ایسے میں انہیں کوئی غلط یا صحیح بات سمجھانا جوئے شیر لانے

کے مترادف تھا۔ پھر بھی ثناء نے فیصلہ کیا کہ وہ رات میں یا کل دن میں کسی وقت اوپر جاکر بڑی بھابھی کو تمام اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کرے گی۔ شاید وہ مان جائیں اور یہ ہی تسلی پریشان حال امی کو دے کر ثناء اس سوچ میں ڈوب گئی کہ بھابھی سے بات کس طرح شروع کرے گی۔ جبکہ امی کو پورا یقین تھا کہ ثناء کا بھابھی سے بات کرنا بے کار اور فضول ہے کیونکہ وہ اپنے ارادے سے پیچھے ہٹنے والی عورت نہ تھیں۔ ثناء لیکن پھر بھی ایک کوشش ضرور کرنا چاہتی تھی۔ لہٰذا دوپہر میں کام سے فارغ ہو کر جب وہ اوپر گئی تو لاؤنج میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر سامنے رکھی کاٹ پر پڑی جس نے ثناء کو ٹھٹک کر رکھنے پر مجبور کردیا جبکہ صوفہ پر بھی چھوٹے چھوٹے کپڑوں کا ڈھیر رکھا ہوا تھا۔ یعنی بھابھی اپنی تمام تیاری مکمل کر چکی تھیں اور یقیناً یہ سب بچے کے انتظام کے بعد ہی ممکن ہوا۔

"یا اللہ...... اتنی خوشی......" سارا سامان دیکھتے ہی ثناء کے ذہن میں پہلی بات ہی یہ آئی کہ بھابھی کی اس قدر خوشی میں ٹانگ پھنسانا یقیناً ایک ایسا عمل ہوگا۔ جو انہیں قطعی طور پر پسند نہ آئے گا مگر چونکہ وہ امی سے وعدہ کر چکی تھی اس لیے ضروری تھا کہ بھابھی کو امی کے خدشات سے آگاہ کردیا جائے جسے لے کر ان کا موڈ خراب تھا۔ وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی جب اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے۔ بھابھی باہر نکلیں اور ثناء پر نظر پڑتے ہی طنزیہ مسکرائیں۔

"چلو تم نے یہ سارا سامان دیکھ لیا ہے تو نیچے جاکر۔ امی کو بتا دینا کہ بھابھی نے بچے کی خریداری مکمل کر لی ہے۔ تاکہ وہ ہمارا مزید جینا دوبھر کردیں۔" ایسے سے بھابھی پہلے امی سے بہت ڈرتی ہوں۔ ثناء کو سوچ کر ہی ہنسی آگئی جسے روکتے ہوئے وہ بولی۔

"آپ بلاوجہ بدگمان ہو رہی ہیں امی کا وہ مقصد یقیناً نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔" اب بات شروع ہو ہی گئی تھی تو بہتر تھا کہ ایک دفعہ میں کھل کر سب کچھ بتا دیا جائے اس لیے ثناء نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"امی کو آپ کے بچہ گود لینے پر کوئی اعتراض نہیں ہے آپ بے شک لیں آپ نے پالنا ہے تو ہم میں سے کسی کو، کوئی بھی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے۔"

ثناء کی باتیں سنتے ہی مائرہ نے حیرت سے اسے دیکھا اور زور سے ہنس دیں۔

"مجھے بیوقوف مت بناؤ کل دیکھا نہیں تھا ذرا سی بات سنتے ہی انہوں نے کس قدر ہنگامہ برپا کیا کہ اللہ معاف کرے اور آج تم بتا رہی ہو کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں اونہہ......" منہ بناتی بھابھی غصہ سے بولیں۔

"ان کے ہنگامہ برپا کرنے کی بہت ساری وجوہات ہیں جن کا سمجھنا آپ کے لیے بہت ضروری ہے۔" ثناء نے ہاتھ پکڑ کر بھابھی کو اپنے ساتھ صوفہ پر بٹھا لیا۔ "آپ یہاں بیٹھ کر میری بات تحمل سے سنیں اور فیصلہ کریں ہم مانتے ہیں کہ آپ ایک لاوارث بچے کو اپنا نام دے رہی ہیں جو یقیناً قابل تحسین عمل ہے مگر آپ نے یہ بچہ لینا کہاں سے ہے؟ کون دے گا آپ کو اپنا بچہ؟"

"تم تو ایسے بات کر رہی ہو جیسے تمہیں پتا ہی نہ ہو...... بھابھی نے ثناء کو دیکھتے ہوئے طنزیہ کہا۔" میں نے امی کو کل ہی بتایا تھا جاوید کے دوست کا بھائی کسی سرکاری اسپتال میں نوکری کرتا ہے جہاں کچھ مائیں بحالت مجبوری اپنے بچے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں اور وہ بچے ایدھی سینٹر دے دیے جاتے ہیں۔ تو ایسے میں اگر کوئی بچہ میں اپنی اولاد سمجھ کر پال لوں تو کیا برا ہے یا کوئی گناہ کا کام ہے؟"

"ایسی کون سی مجبوری ہوتی ہے جو ایک ماں اپنی اولاد اسپتال چھوڑ کر غائب ہو جائے۔" ثناء کو حیرت ہوئی۔

"پہلا سوال تو یہ ہی ہے جو ہم سب کو پریشان کر رہا ہے ورنہ آپ بچہ پالیں ہم میں سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔

"اتنی بہت ساری مجبوریاں ہوتی ہیں ثناء بی بی، جو ایک ماں کو انتہائی قدم اٹھانا پڑتا ہے۔" جواباً بھابھی نے ایک سرد آہ بھری۔ "پانچ، چار بیٹیوں کی یکے بعد دیگرے پیدائش ہر سسرال برداشت نہیں کرتا خاص طور پر غریب لوگ، جبکہ بیٹے کی آس و امید میں یہ عورتیں لگاتار کئی بیٹیوں

کی ماں بن جاتی ہیں اور پھر اکثر اپنے شوہر اور سسرال کے خوف سے اپنی چھٹی یا ساتویں بیٹی یونہی اسپتال چھوڑ کر فرار ہو جاتی ہیں اور کچھ تو زائد بچوں کے سبب، غربت کی بنا پر بھی اپنے بچے اسپتال چھوڑ جاتے ہیں۔

"ہیں۔" ثناء کے لیے بھابھی کی بتائی گئی تمام معلومات نہ صرف نئی بلکہ کافی تکلیف دہ تھیں اسے حیرت اور دکھ ہوا کہ ایک ماں اتنی بھی مجبور ہو سکتی ہے کہ اپنا گھر بچانے کے لیے اپنی ہی سگی اولاد قربان کردے یا بھوک کا خوف انہیں یہ انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کرے۔

"میں جو کہہ رہی ہوں وہ سو فیصد سچ ہے مگر امی نے تو کل میری پوری بات سنے بنا ہی ہنگامہ کھڑا کردیا اب بھلا بتاؤ ہم کیا کوئی بچہ اغوا کر کے پالنے جا رہے ہیں جو امی نے اتنا تماشا لگایا۔"

"ہو سکتا ہے آپ درست کہہ رہی ہوں لیکن یہ بھی تو سوچیں شاید وہ شخص پیسے کی لالچ میں کسی ایسی ماں کی گود ہی نہ اجاڑ ڈالے جو اپنا بچہ خود پالنا چاہتی ہو۔" امی کا خدشہ ثناء کے الفاظ میں ڈھل گیا۔

"لو بھلا وہ ایسا کیوں کرے گا؟" بھابھی نے ماتھے پر تیوری ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"کرنے کو تو کوئی کچھ بھی کر سکتا ہے اس لیے بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنی فیملی سے کوئی ایسا بچہ ایڈاپٹ کرلیں جس میں دونوں فریقین کی رضامندی بھی شامل ہو اور آپ کو بھی اطمینان رہے گا کہ پالنے والا بچہ آپ کا اپنا ہی ہے اس میں کسی ماں کی بددعا شامل نہیں۔"

"کوئی بھی ماں باپ اپنی اولاد کسی کو نہیں دیتا۔" بھابھی کی اس بات سے ثناء کو بالکل بھی اختلاف نہ تھا کیونکہ یہ ہی دنیا کا سب سے بڑا سچ ہے پھر بھلا بھابھی کیسے سوچ سکتی ہیں کہ مائیں اپنی جائز اولاد اسپتال میں پھینک جاتی ہوں گی۔ وہ سوچ رہی تھی اور بھابھی مسلسل بول رہی تھیں۔

"اور اگر کوئی دے بھی دے تو اس میں کافی شرعی مسائل ہیں۔" بھابھی نے اپنی بات درمیان سے روک کر ثناء پر ایک نظر ڈالی۔ "پہلی اور اہم بات ولدیت کی تبدیلی ہے جو ہم نہیں کر سکتے جبکہ ایسے بچے جن کے ماں باپ کو ہم جانتے نہ ہوں ان کی ولدیت تبدیل کرنے میں کوئی قباحت نہیں تو اب بتاؤ بھلا میں کسی کا بچہ لوں اور خود پالوں جبکہ ولدیت کے خانہ میں اس کے اصل ماں باپ کا نام لکھا جائے تو مجھے کیا فائدہ ہوگا۔ اور ماں باپ کا نام تبدیل کروں تو اپنی عاقبت خراب۔" بھابھی بڑبڑائیں۔

"جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی اولاد دے دی تو یہ کھڑاگ پالنے کی ضرورت کیا ہے۔"

"یہ جملہ ثناء نے دل ہی دل میں سوچا ضرور مگر بھابھی کے سامنے نہ کہہ سکی کیونکہ وہ اس وقت کوئی معرکہ کھڑا کرنے کے موڈ میں قطعی نہ تھی اس لیے جب بولی تو صرف اتنا کہ پھر آپ کسی یتیم خانہ سے بچہ اپڈاپٹ کرلیں کیونکہ یہ عمل اسپتال والے عمل سے زیادہ محفوظ اور مناسب ہے۔"

"ان یتیم خانہ والوں کے بڑے نخرے ہیں پہلے جاوید اور میں یتیم خانہ ہی گئے تھے۔ جہاں پیدائشی بچوں کو گود لینے کے لیے ایک فارم بھر کر جمع کروایا اور آج چھ ماہ گزر جانے کے باوجود وہاں سے کوئی فون نہیں آیا بقول یتیم خانہ انچارج چھوٹے بچوں کے لیے لاتعداد درخواستیں آتی ہیں جنہیں پڑھ کر پوری تحقیقات کے بعد بے اولاد جوڑے کو ہی دیا جاتا ہے لو یعنی جن کی پہلے اولاد ہوں ان کے لیے سمجھو صاف انکار، اب بتاؤ بھلا۔ اگر آدمی کوئی نیک عمل کرنا بھی چاہے تو اتنی رکاوٹیں اور مشکلات کہ اللہ کی پناہ...... بس ان تمام باتوں کے پیش نظر ہمیں اسپتال سے رابطہ کرنا پڑا۔"

اپنی بات ختم کر کے بھابھی تو اٹھ کھڑی ہوئیں مگر ثناء ایک نئی سوچ میں ڈوب گئی کہ آخر بھابھی کیوں چاہتی ہیں کہ کوئی نہ کوئی ایسا کام کیا جائے جس سے ان کا نام خاندانی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے اور ایسا ہی ہوا جس کا علم اسے اگلے ہی دن جاذبیہ آپا سے صبح صبح آنے والے فون سے ہو گیا جسے سن کر اسے محسوس ہوا کہ شاید بھابھی کا یہ ہی مقصد تھا جو خاندانی واہ واہ نے پورا کردیا۔

☆☆☆

جاذب ناشتا کر کے آفس جا چکا تھا اور وہ کچن میں برتن سمیٹ رہی تھی جب جاذبیہ آپا کا فون آیا جن کی آواز سن کر لگ رہا تھا کہ وہ خاصی پرجوش ہیں لہٰذا معمول کی

سلام دعا کے بعد ثناء نے فون امی کے حوالے کر دیا اور خود وہیں لاؤنج میں صوفے پر ہی بیٹھ گئی تاکہ ماں بیٹی کی گفتگو سن سکے جب امی کی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

''لو بھلا یہ کون سا ایسا کارنامہ ہے جسے لے کر تم یوں خوشی سے چھلانگیں لگا رہی ہو۔''

ثناء کے کان کھڑے ہو گئے مگر ظاہر ہے یک طرفہ گفتگو سے کوئی خاص بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لیے پوری بات سمجھنے کے لیے اسے امی کے فون بند کرنے کا انتظار تھا۔ لہٰذا جیسے ہی امی فون بند کر کے ثناء کی جانب پلٹیں ان کے چہرہ پر چھایا غصہ ثناء کو صاف دکھائی دے گیا۔

''لو بھئی ہم اپنی بہو کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے میں ہلکان ہیں۔ ادھر خاندان بھر نے انہیں ایک بار پھر سے دیوی کا ٹائٹل دے دیا ہے۔'' بڑبڑاتے ہوئے امی اس کے قریب آن بیٹھیں۔'' جاذبیہ کے سسرال میں خوب واہ واہ ہو رہی ہے کہ مائرہ کا اتنا دل گردہ کہ لاوارث بچے کو پالنے کے لیے سرگرداں ہیں ہر شخص ان کے اس عمل کو سراہ رہا ہے کہ مانو ہم تو جیسے بیوقوف ٹھہرے اور تو اور میری اپنی بیٹی اتنی خوش ہے کہ ایک نادیدہ بچے کے لیے خریداری کرنے کا سوچ رہی ہے۔ اور اسے اپنے بھائی کی سگی اولاد بھی تصور کرنے لگی ہے۔'' امی کی باتیں سن کر ثناء کو یقین آگیا کہ بڑی بھابھی کے اس عمل کے پیچھے یقیناً واہ واہ کا جذبہ کارفرما تھا جسے سن کر انہیں دلی تسکین حاصل ہوتی ہے اور ایسا ہی ہوا تھا کہ بھابھی کے قدم اٹھانے سے قبل ہی ان کی اس نیکی کی دھوم خاندان بھر میں مچی ہوئی تھی کہ صورتحال نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا اور امی کے وہ تمام خدشات درست ثابت ہوئے جن کی وجہ سے وہ بڑی بھابھی کے اس فیصلہ کی مخالفت کر رہی تھیں۔

پنکی کی سالگرہ میں چند روز باقی رہ گئے تھے بھابھی نے اس دفعہ سالگرہ ذرا دھوم دھام سے منانے کا فیصلہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ روز بازار جا رہی تھیں۔ پنکی اور زریاب کی شاپنگ، اپنی خریداری اور ساتھ ہی ساتھ پنکی کو تحفہ میں دیا جانے والا جیتا جاگتا وجود کے حصول کے لیے دن رات کی جانے والی ان کی کوششیں بھی عروج پر تھیں۔ جاوید بھائی غالباً روز ہی اس بندہ کو فون کرتے تھے جو اسپتال میں ملازم تھا اور جس نے بچہ دینے کا وعدہ کیا تھا کہ اچانک ٹی وی پر آنے والی ایک خبر نے گویا بڑی بھابھی کے ارمانوں پر پانی پھیر دیا۔

☆☆☆

جاوید بھائی باہر سے آئے تو کچھ پریشان تھے کیونکہ اوپر جاتے ہوئے وہ کچھ دیر امی کے پاس بھی رک کر گئے تھے جس کی وجہ سے ثناء کو ان کے چہرے چھائی پریشانی محسوس تو ضرور ہوئی مگر اس حوالے سے کچھ پوچھنا اسے مناسب نہ لگا اس لیے خاموش رہی۔

شام میں اسے بھابھی نے بتایا کہ جانے کیوں شکیل فون نہیں اٹھا رہا۔ شکیل وہ شخص تھا جس نے بھابھی سے بچے کا وعدہ کر کے ان کی تمام دلی خواہشوں کو زور دیا تھا اور اب حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ فون نہیں اٹھا رہا تھا جس کی وجہ سے بھابھی کا پریشان ہونا بنتا تھا جبکہ پنکی کی سالگرہ میں بھی صرف دو سے چار دن باقی تھے۔'' ہوسکتا ہے کہیں مصروف ہو۔'' ثناء نے انہیں تسلی دینا چاہی۔

''ایسی بھی کیا مصروفیت تین دن پہلے ہی اس نے ہمیں بتایا تھا کہ کوئی عورت اپنی بیٹی ہمیں دینے کو تیار ہے جس کی وجہ سے اس عورت کو ایک مناسب رقم کے علاوہ ہم نے ادویات اور اسپتال کے اخراجات کی مد میں بھی خاصی بڑی رقم شکیل کو دی ہے۔'' روانی میں بولتی بڑی بھابھی ساری تفصیل ثناء کو بتاتی گئیں جسے سن کر اسے حیرت کے ساتھ ساتھ افسوس بھی ہوا کہ بھابھی جاوید بھائی کی اتنی محنت کی کمائی کس طرح لٹا دیتی ہیں مگر وہ کچھ بول کر نہیں ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جبکہ وہ پہلے ہی خاصی پریشان تھیں اس لیے خاموشی سے ان کی ہر بات سنے گئی اور بھابھی بولتی گئیں۔

''اور آج کا اس کا وعدہ تھا بچی دینے کا اور آج صبح ہی اس نے اپنا فون بند کر رکھا ہے۔ میں نے تو جاوید سے کہا ہے کہ خود اسپتال جا کر شکیل سے ملیں۔''

وہ یہاں تک ہی پہنچی تھیں کہ کمرے سے آتی جاوید کی آواز نے دونوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کروالی

وہ بڑی تیز آواز میں مائرہ بھابھی کو پکار رہے تھے جو جاوید بھائی کی آواز سنتے ہی اندر کمرے میں چلی گئیں۔

اور قبل اس کے کہ اکیلی کھڑی ثناء بھی نیچے چلی جاتی کہ بھابھی کی دل خراش چیخ سن کر وہ مجبوراً ان کے کمرے کی جانب بڑھی جہاں پردہ ہٹاتے ہی بالکل سامنے ٹی وی اسکرین پر کوئی بریکنگ نیوز چل رہی تھی جسے دیکھتے ہوئے بھابھی زور شور سے چلا رہی تھیں۔

''توبہ استغفار اتنا بڑا فراڈ، یہ آدمی شکل سے ہی خبیث لگ رہا ہے پتا نہیں آپ کس طرح لوگوں پر اعتبار کر لیتے ہیں۔''

اب ان کی توپوں کا رخ جاوید بھائی کی جانب مڑ چکا تھا جو ہکا بکا نیوز دیکھ رہے تھے جس کے مطابق اسپتال میں چھاپے کے بعد اس کے دو ملازمین گرفتار کر لیے گئے جو وہاں پیدا ہونے والے بچے چرا کر بے اولاد لوگوں کو بھاری قیمت میں بیچ دیا کرتے تھے اور ان دو ملازمین میں ایک نام شکیل کا بھی تھا اور ثناء کے لیے یہ ہی کافی تھا جو جان چکی تھی کہ بھابھی نے چیخ کیوں ماری۔

☆☆☆

اس واقعہ کو گزرے کئی دن ہو گئے مگر بھابھی ابھی بھی حالت سکتہ میں تھیں یہ ہی وجہ تھی کہ اس دن کے بعد انہوں نے بچہ گود لینے کے سلسلہ میں کوئی بات نہ کی اور ثناء کو قوی یقین تھا کہ یہ بھوت ان کے دماغ سے اتر گیا ہوگا۔ جب ایک شام بھابھی پنکی کی سالگرہ کا بلاوا دینے نیچے آئیں تو کافی دنوں بعد ثناء کو وہ پرسکون دکھائی دیں اس لیے ڈرتے ڈرتے ثناء نے شکیل کی بابت دریافت کر ہی لیا جواباً جو کچھ بھابھی نے عرض کیا اسے سن کر ثناء ہکا بکا رہ گئی اور دل ہی دل میں بھابھی کی عقل مندی کو داد دیے بنا نہ رہ سکی۔

''دراصل جاوید کو علم تھا کہ شکیل نوزائیدہ بچے اسپتال سے چرا کر مجبور لوگوں کو بھاری قیمت پر بیچ دیتا ہے۔'' بھابھی کا یہ انکشاف جہاں امی کو چونکا گیا وہاں ثناء بھی حیران پریشان ان کا منہ دیکھے گئی۔

''ہاں بھئی، سچ کہہ رہی ہوں۔'' شاید بھابھی ثناء کے چہرہ پر چھائے تاثرات بھانپ چکی تھیں اس لیے اپنی بات کی تصدیق کرتے ہوئے بولیں۔'' اب بتاؤ بھلا مجھے بچہ ایڈاپٹ کرنے کی کیا ضرورت تھی شکر الحمد للہ اس ذات کا جس نے رحمت و نعمت دونوں سے نوازا یہ تو مجھے جاوید نے جب شکیل کے کالے کرتوت بتائے تو ہم نے فیصلہ کیا کہ ایسے شخص کو پولیس کے حوالے ضرور کرنا چاہیے جو ماؤں کی گود اجاڑتا ہے تو بس ہم دونوں میاں بیوی اپنے پلان کے مطابق اس سے ملے اور پھر آگے کی ساری کہانی تو تم لوگ جانتے ہی ہو، جاوید نے بھی پولیس کو بتایا تھا کہ اس نے کس دن بچی دینے کا وعدہ کیا تھا لہٰذا اسی دن وہ بچی اٹھاتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔''

بھابھی ساری کہانی سنا کر اوپر جا چکی تھیں اور ثناء سوچ رہی تھی کہ اگر وہ اس شام اوپر نہ ہوتی جب شکیل کی گرفتاری کی خبر ٹی وی پر نشر کی گئی تھی تو یقیناً آج اسے بھی بڑی بھابھی کی بیان بازی پر بالکل اس طرح ہی یقین آجاتا ہے جسے امی کو اس وقت آگیا تھا اور وہ بھی انہیں دیگر لوگوں کی طرح ایک مہان دیوی تسلیم کر چکی ہوتی۔ اس نے دیکھا امی بھابھی کے جانے کے بعد سے ہی مسلسل ان کی تعریف میں رطب اللسان تھیں اور اپنے تمام پچھلے دعوؤں سے منکر ہوتے ہوئے یہ اعتراف کر رہی تھیں کہ بڑی بھابھی نہ صرف ایک سمجھ دار بیوی اور بہو ہیں بلکہ ایک ایسی عقل مند عورت بھی ہیں جو معاشرے سے برائی ختم کرنے کے لیے کوئی بھی کردار ادا کر سکتی ہیں۔

ایسے میں ثناء نے دل سے خواہش کی کاش آنے والے وقتوں میں بڑی بھابھی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کر لیں کیونکہ ان کا خاندانی سیاسی کردار خاصا مضبوط ہو چکا تھا اور امید کی جا سکتی تھی کہ منافقت سے بھرپور ملکی سیاست میں بھی وہ کامیابی سے اپنے قدم جما سکتی ہیں اب ثناء کی یہ معصوم سی خواہش کب پوری ہو یہ تو ہمیں آنے والا وقت ہی بتائے گا جس کے لیے ہم سب کو اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔

☆☆

جنت پیار

نگہت سیما

مکمل ناول

''تو...... تو تم نے اس بار بھی اپنے بابا سے بات نہیں کی۔''

نہر کے کنارے چلتے چلتے مہرین عبدالستار نے پوچھا تو شجاع محی الدین نے رک کر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں۔'' اور پھر قدم آگے بڑھا دیے۔

''لیکن کیوں...... کیوں بات نہیں کی تم نے۔ جانتے ہونا ہمارے فائنل امتحان میں صرف چند ماہ ہی رہ گئے ہیں...... اور......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ کر شجاع کی طرف دیکھا۔

یہ...... یہ شجاع محی الدین...... یہ اسے کتنا عزیز، کتنا پیارا ہے کہ اس سے جدائی کے تصور سے ہی اس کی سانس رکنے لگتی تھی۔ یہ طے تھا کہ وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کیا یہ نہیں جانتا کہ میں اس کے بغیر جی نہیں پاؤں گی۔ پھر...... پھر یہ کیوں بات نہیں کرتا اپنے والدین سے، کیوں نہیں بھیجتا انہیں ہمارے گھر رشتے کے لیے۔

''میں نے تم سے محبت کی ہے شجی! تمہیں چاہا ہے اور صرف چاہا ہی نہیں تمہارے ساتھ زندگی گزارنے کی چاہ بھی کی ہے۔ میں اپنی زندگی کا ہر ہر پل تمہاری ہمراہی میں گزارنا چاہتی ہوں۔ میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا کہ محبت تو میں تم سے کروں اور شادی کسی اور سے کرلوں۔ میں منافقت کی زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں مر جاؤں گی شجی...... لیکن......'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک درخت کے نیچے آ کھڑے ہوئے تھے۔

''کاش! آپ نے مجھ سے محبت نہ کی ہوتی۔ اور میں نے اس محبت کی پذیرائی نہ کی ہوتی۔'' شجاع محی الدین نے ایک نظر مہرین عبدالستار کے چہرے پر ڈالی اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔

''بولو...... بولو نا شجی! کب بات کرو گے اپنے ماما بابا سے......!''

اسے خاموش دیکھ کر مہرین بے چین ہوئی تھی۔

''مسئلہ میرے والدین کا نہیں ہے، آپ کے والدین کا ہے مہرین! اگر وہ مجھ سے آپ کی شادی کے لیے رضامند ہوں تو میں اپنی اماں جان اور ابا جان کو آپ کے گھر بھجواتا ہوں۔ ورنہ ان کی عزت وقار مجھے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔'' نرم لہجے میں ہولے ہولے بولتے ہوئے، لمحہ بھر کے لیے نظریں اٹھا کر شجاع محی الدین نے بے چینی سے اپنی طرف دیکھتی مہرین عبدالستار کی طرف دیکھا۔ پتوں سے چھن چھن کر آنے والی دھوپ نے اس کے گندمی رخساروں پر ہلکی سرخی بکھیر دی تھی اور وہ عام دنوں سے کہیں زیادہ خوب صورت اور دلکش لگ رہی تھی۔

''کیا...... کیا مطلب ہے تمہارا کہ میرے ابی جان انکار کر دیں گے اور تمہارے ابا جان کے وقار کو ٹھیس لگے گی۔ بے عزتی ہوگی۔'' وہ پہلے سے زیادہ

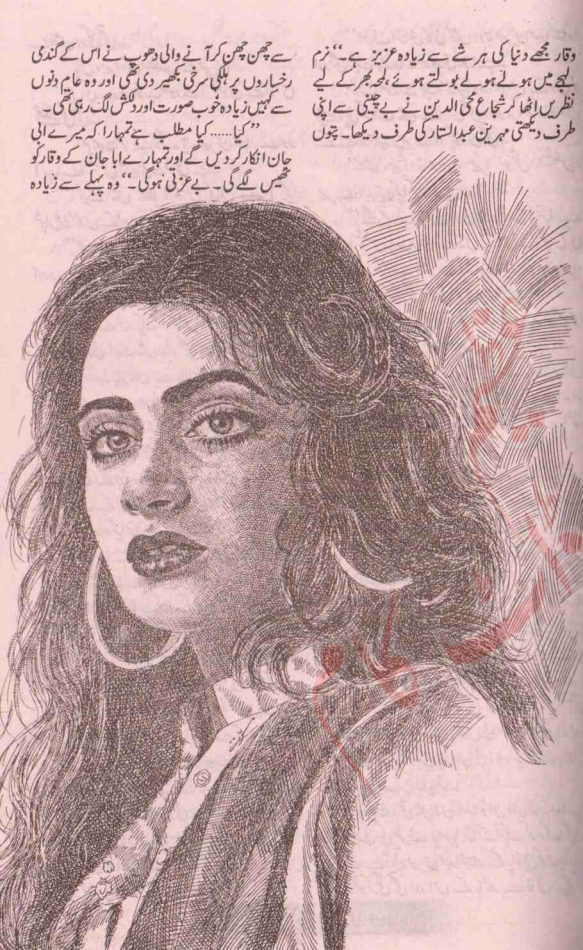

بے چین ہوگئی تھی۔

''ہاں، میرا یہی مطلب ہے مہرین!''

اس کی بے حد خوب صورت آنکھوں سے اداسی جھلکنے لگی تھی۔

''ہم بہت غریب لوگ ہیں مہرین! ہمارے اور آپ کے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے۔''

''محبت میں بھلا اسٹیٹس کہاں سے آ گیا شجاع!'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''محبت میں اسٹیٹس تو ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ اور رہے گا۔'' شجاع نے اپنے دل کو بھیگتے محسوس کیا۔

''ہرگز نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''میرے نزدیک اسٹیٹس، دولت، پیسہ، عمر، ذات برادری محبت میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ محبت ان سب چیزوں سے بالاتر ہوتی ہے شجاع محی الدین! محبت جب ہوتی ہے تو وہ کچھ نہیں دیکھتی۔ مقام، عزت، مرتبہ، خاندان کچھ بھی نہیں۔''

''ہاں محبت کچھ نہیں دیکھتی۔ لیکن والدین دیکھتے ہیں۔ آپ کے ابی جان کے نزدیک یہی بات اہم ہو گی جو آپ کے نزدیک اہمیت نہیں رکھتی۔'' وہ یک دم بے حد سنجیدہ ہوگیا تھا۔

''تم چاہتے ہو شجی! کہ میں پہلے گھر میں تمہارے متعلق بات کروں اور ابی جان کو اعتراض نہ ہو تو پھر تم اپنے گھر بات کرو گے تو اطلاعاً عرض ہے کہ میں نے امی جان کو تمہارے متعلق سب کچھ بتا رکھا ہے۔'' وہ شوخ ہوئی۔ ''اور امی جان کو میری پسند پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ انہوں نے بھی مجھے کہا ہے کہ تم سے کہوں کہ اپنے والدین کو بھیجیں۔ کیونکہ میرے دادا جان کی شدید خواہش ہے کہ میری تعلیم مکمل ہوتے ہی وہ مجھے گھر سے رخصت کردیں۔''

''کیا بتایا ہے آپ نے۔'' وہ اب بھی سنجیدہ تھا۔ ''یہی نا کہ آپ شجاع محی الدین کو پسند کرتی ہیں جو آپ کا کلاس فیلو ہے۔ اسمارٹ اور ذہین ہے۔''

''ہاں تو اور کیا بتانا تھا۔'' اس کی سوالیہ نظروں میں شوخ سی چمک تھی۔

''صرف اتنا ہی کافی نہیں ہوتا مہرین عبدالستار! اور بھی بہت کچھ جاننا ضروری ہوتا ہے۔''

خوب صورت لہجہ، گمبھیر آواز مہرین کے دل کو جیسے اپنی گرفت میں لے رہی تھی، وہ سر اٹھائے اس کے بے حد سنجیدہ چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

''مثلاً میرا خاندان، میرا سوشل اسٹیٹس، میرے والدین کیا کرتے ہیں اور......''

''مجھے تم سے شادی کرنی ہے شجاع! تمہارے سوشل اسٹیٹس یا خاندان سے نہیں۔'' اس نے شجاع کی بات کاٹی۔ ''سب اللہ کے بندے ہیں۔ خاندان، ذات برادری کچھ بھی ہو، کیا فرق پڑتا ہے۔''

''پڑتا ہے مہرین!'' اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔

''تو پھر مجھے بتا دو اپنے متعلق سب کچھ تاکہ میں امی جان کو بتا سکوں۔'' مہرین نے لاپروا سے انداز میں پاس سے گزرتی ہوئی چند لڑکیوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور پھر شجاع کی طرف دیکھا۔

''ہاں تو بتاؤ نا۔ سب کچھ بتا دو آج تاکہ یہ خلش بھی دل سے نکل جائے لیکن یاد رکھنا مجھے اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا...... ہاں تو......''

شجاع محی الدین نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ خوب صورت تو وہ تھی ہی لیکن اس کے چہرے کی معصومیت، اس کی سادگی اور اس کی گھور سیاہ آنکھیں اسے سب سے ممتاز بنا دیتی تھیں۔ نگاہیں ایک بار اس پر پڑتیں تو دوبارہ پلٹ کر دیکھنے کی خواہش ضرور دل میں پیدا ہوتی تھی۔ دلکش قد و قامت، تیکھے نقوش، سیاہ گھنی پلکوں والی پرکشش آنکھیں اور سیاہ ہی گھنے بالوں کی موٹی سی چٹیا۔ اور شجاع محی الدین کو پہلی بار اس کی اس سیاہ گھنے بالوں والی چٹیا ہی نے چونکایا تھا۔

وہ یونیورسٹی میں اس کا ساتواں دن تھا۔ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی طرف جا رہا تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ سامنے سے آتی مہرین عبدالستار کے پاؤں کو نہ جانے کیسے ٹھوکر لگی تھی اور اس کے ہاتھ سے فائل نیچے گر

پڑی تھی جیسے وہ جھک کر اٹھنے لگی تھی کہ دائیں کندھے سے پھسل کر اس کی چوٹی نے زمین کو چھوا تھا۔

''ناگن'' اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا اور لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور سیدھا ہوتے ہوئے اس کی نظر مسکراتے ہوئے شجاع محی الدین پر پڑیں تو اس کی پیشانی پر ناگوار سی شکن نمودار ہوئی تو شجاع نے فوراً لب بھینچ لیے تھے۔ اب وہ اس سے نظریں ہٹا کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ کچھ پریشان سی ہے۔

''کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟'' وہ چند قدم چل کر اس کے قریب آیا تھا۔

''جیسے آپ کے بھائی بندے کر رہے ہیں۔'' اس نے ایک عصیلی نظر اس پر ڈالی تھی اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔

''نیو کمر۔'' وہ سمجھ گیا تھا کہ ضرور اسے فول بنایا جا رہا ہے۔ ''میں بھی آپ کی طرح نیا ہوں۔ کیمسٹری میں ایڈمیشن ہوا ہے میرا۔''

''کیا واقعی......!''

وہ ذرا سا چہرہ اوپر اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی حیرت اسے اچھی لگی تھی اور اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''مجھے بھی کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کی طرف جانا ہے۔ دراصل میرا آج فرسٹ ڈے ہے۔ میری فرینڈ فرخندہ نے کہا تھا کہ وہ کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کے باہر میرا انتظار کرے گی۔ دراصل میری کچھ طبیعت خراب تھی پھر فری نے بھی کہا تھا کہ پڑھائی تو کچھ دن بعد ہی شروع ہو گی تو کچھ دن بعد ہی آ جانا...... وہ کلاس میں ماسٹر کر رہی ہے نا لاسٹ ایر اس نے ایڈمیشن لیا تھا...... ایک گھنٹہ ہو گیا ہے مجھے ادھر سے ادھر چکراتے ہوئے کوئی لائبریری کی طرف بھیج دیتا ہے تو کوئی کینٹین کا راستہ دکھاتا ہے اور کسی کو کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ کا گماں واش رومز پر ہوتا ہے۔ افوہ، جانے نئے آنے والوں کو فول بنانے کی روایت کس نے ڈالی تھی۔''

وہ جو بہت تحمل سے اس کی لمبی بات سن رہا تھا اس نے بمشکل اپنی مسکراہٹ کو چھپایا تھا۔

''چلیے میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔''

وہ لمحہ بھر مشکوک نظروں سے اسے دیکھتی رہی پھر کندھے اچکا کر اس کے ساتھ چل پڑی۔

''چلیں آپ کو بھی آزما لیتے ہیں...... ویسے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نئے آنے والوں کو کس خوشی میں فول بنایا جاتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ ان کی مدد کی جائے۔ تاکہ اچھا تاثر ہو نہ کہ یونیورسٹی اور پڑھائی سے ہی دل اچاٹ ہوجائے۔''

وہ کیمسٹری ڈپارٹمنٹ تک مسلسل بولتی رہی تھی۔ فول بنانے والوں کے خلاف اس نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی تھی اور وہ خاموشی سے سنتا رہا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں اس نے دو تین بار ضرور کہا تھا۔ کس قدر بولتی ہے یہ لڑکی...... پھر دور سے ہی اسے اپنی دوست نظر آ گئی تھی...... اور وہ اس کا شکریہ ادا کر کے اس کی طرف چلی گئی تھی۔

اور یہ مہرین عبدالستار سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ پہلی نظر میں ہی اس کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ لیکن اس پہلی ملاقات نے ان کے درمیان تعلق کا ایک باریک سا دھاگا ضرور جوڑ دیا تھا۔ ایک ہی ڈپارٹمنٹ میں ہونے کی وجہ سے اس پہلی ملاقات کے بعد روز ہی ان کی ملاقات ہوتی تھی اور سرسری سی بات بھی ہو جاتی تھی۔ اس نے اپنی دوست فرخندہ سے بھی اسے متعارف کروایا تھا جو اس کے ابی جان کے کسی دوست کی بیٹی تھی۔ حیرت انگیز طور پر دونوں کا مقصد بھی ایک تھا۔ دونوں پڑھائی کے بعد ٹیچنگ کے شعبے سے وابستہ ہونا چاہتے تھے۔

''تم اتنے ذہین ہو شجی ایف ایس سی میں تم نے ٹاپ کیا۔ بی ایس سی میں بھی تمہاری پوزیشن تھی تو تم نے ڈاکٹر یا انجینئر بننے کا کیوں نہیں سوچا۔ لوگ تو بس ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور تم...... پتا ہے تمہیں ہمارے ہاں ٹیچر کو وہ عزت نہیں ملتی جس کا وہ حق دار ہوتا ہے۔''

بہت سارے دنوں بعد جب ان میں بے تکلفی ہو گئی تھی تو اس نے پوچھا تھا۔ وہ اب بھی بہت بولتی تھی۔ اگر فرخندہ بھی ساتھ ہوتی تو دونوں خاموشی سے اسے سنتے تھے۔ وہ ہر موضوع پر بے تکان بولتی تھی۔

"دراصل میرے ابا جان کی خواہش ہے کہ میں استاد بن کر اپنے ملک کے بچوں کی تربیت میں حصہ لوں ان کی شخصیت کی تشکیل میں بھی مددگار ہوں وہ بچے جنہوں نے کل ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔ میرے ابا جان یہ سوچ کر بہت دکھی ہوتے ہیں کہ صرف چند سالوں میں ہم نے بھلا دیا ہے کہ ہم نے یہ ملک کیوں حاصل کیا تھا۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ بچے جو مجھ سے علم حاصل کریں میں انہیں بتاؤں کہ پاکستان کتنا ناگزیر تھا۔ میں ان کے دلوں میں پاکستان کی محبت پیدا کروں۔" خلاف معمول اس نے تفصیل سے بتایا تھا۔

"اور میرے دادا جان بھی کچھ ایسی ہی خواہش رکھتے ہیں۔" مہرین پرجوش ہوئی تھی۔ "وہ کہتے ہیں مجھے قوم کی بچیوں کی تربیت کرنا ہے۔ انہیں امانت، دیانت اور سچائی کا سبق سکھانا ہے۔ انہیں بتانا ہے کہ اس ملک کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے بڑی قربانیاں دی ہیں اور اس کے لیے ضروری ہے کہ میں ٹیچر بنوں۔ دادا جان تو مجھ سے تین سال بڑی میری بہن نرگس کو بھی ٹیچر بنانا چاہتے تھے لیکن پھر بی اے کے بعد امی جان اور ابی جان نے ان کی شادی کر دی۔ اور اب وہ اپنے دو عدد جڑواں بچوں کی ٹیچر بنی ہوئی ہیں حالانکہ وہ بے چارے ابھی صرف سال سال کے ہیں اور مجھے ابھی سے پتا ہے کہ وہ کبھی بھی اچھی ٹیچر نہیں بن سکتی تھیں۔ سو اچھا ہوا۔ اب میں دادا جان کا خواب پورا کروں گی اور وہ ساری باتیں اپنی شاگرد لڑکیوں کو بتایا کروں گی جو دادا جان اکثر مجھے بتاتے ہیں۔ وہ سارے دکھ، تکالیف جو مسلمانوں نے برداشت کیے اور قربانیاں جو ہمارے بزرگوں نے وطن حاصل کرنے کے لیے دیں۔"

اس روز مہرین کی باتوں سے وہ متاثر ہوا تھا۔

اور جب میں ابا جان کو آپ کے ان خیالات کے متعلق بتاؤں گا تو وہ مہینوں خوش ہوتے رہیں گے کہ ہمارے ملک کی زمین ابھی بنجر نہیں ہوئی ابھی اس زمین میں مہرین عبدالستار جیسی بیٹیاں ہیں۔"

اور پھر ان گزرے ڈیڑھ سالوں میں وہ ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ ایک روز اسے لگا تھا کہ وہ مہرین عبدالستار سے محبت کرنے لگا ہے اور مہرین عبدلاستار ایسی تھی کہ اس سے محبت کی جاتی اسے چاہا جاتا۔ اور شاید مہرین عبدالستار کو بھی ایسا ہی لگا تھا کہ وہ شجاع محی الدین کی محبت میں ڈوب چکی ہے۔ اس انکشاف نے دونوں کو ہی اپنی اپنی جگہ چونکایا تھا۔ لیکن دونوں پر اس انکشاف نے الگ الگ اثر کیا تھا وہ جان بوجھ کر اس سے دور رہنے لگا تھا جبکہ مہرین زیادہ سے زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ وہ پریشان تھا اور وہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔"

"کمال ہے یعنی کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں حد ہوتی ہے بے وقوفی کی ہے نا۔"

وہ نہ جانے کب آپ سے تم پر آ گئی تھی لیکن وہ آج بھی اسے آپ کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ وہ خود تو دھڑلے سے اسے تم کہہ کر بلاتی تھی لیکن اسے شجاع کا اسے آپ کہہ کر بلانا اچھا لگتا تھا۔

"کیا تم ...... تم بھی شجاع محی الدین مجھ سے ایسی ہی محبت کرتے ہو جیسی محبت میں تم سے کرتی ہوں۔" ایک روز اس نے پوچھا تھا تو اس نے نظریں چرالی تھیں۔

"محبت کرنے والے ایک دوسرے کے سنگ زندگی گزارنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں مہرین عبدالستار اور شاید ہمارے لیے یہ ممکن نہ ہو۔ میرا اور آپ کا کوئی میل نہیں ہے۔ میں ایک غریب محنت کش کا بیٹا ہوں اور آپ ......"

"تو ......" مہرین نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔ "کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے شجاع محی الدین! محبت نے بھلا کب امارت اور غربت کا فرق دیکھا ہے وہ تو ہو جاتی ہے۔ خود بخود۔"

"لیکن امارت اور غربت کا کوئی جوڑ بھی نہیں ہوتا۔ مہرین عبدالستار اس سے پہلے کہ یہ آگ بھڑک کر ہمیں خاکستر کر دے ہمیں خود کو روک لینا چاہیے۔"

وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

مہرین لمحہ بھر گہری نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی اور پھر ہولے سے ہنس دی تھی۔

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے شجاع کہ آگ ابھی بھڑکی نہیں وہ تو کب کی بھڑک کر شعلہ بن چکی۔ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ شاید تمہارے پاس ہو لیکن میرے پاس نہیں۔ جب محبت میرے دل پر کسی الہام کی طرح اتری تو میں نے بہت سوچا اور پھر میں نے جانا، چاہے کچھ بھی ہو میرا ہر راستہ تمہاری طرف ہی جاتا ہے میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔"

وہ اپنے جذبوں کا اظہار بلا جھجک کر دیا کرتی تھی اور وہ اس کی محبتوں کی شدتوں کے سامنے ہار گیا وہ خود کو روک نہیں پایا تھا اور دونوں محبتوں کے راستے پر آگے ہی آگے بڑھتے رہے اور اب مہرین چاہتی تھی کہ وہ اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجے۔ وہ جانتا تھا اس کے بابا جان اور اماں جان کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن مہرین کے ابی جان۔ اس نے ایک بار انہیں دیکھا تھا جب وہ خود مہرین کو لینے آئے تھے کہ شاید اس کا ڈرائیور چھٹی پر تھا۔ اکڑی ہوئی کلف لگی گردن کے ساتھ وہ اسے بہت مغرور اور خود پسند سے لگے تھے۔

"کیا دیکھ رہے ہو۔ بتاؤ نا وہ سب جو اپنے متعلق بتانا چاہ رہے ہو۔" اسے یوں سوچ میں گم دیکھ کر مہرین نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرایا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ "یہ سب تمہارا خیال ہے کہ مجھے تمہارے متعلق معلوم ہونا چاہیے۔ تمہارا بیک گراؤنڈ تمہاری، ذات پات سب ورنہ میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میرے لیے صرف تم اہم ہو باقی سب ثانوی چیزیں ہیں۔ میں نے اس سارے عرصے میں تمہیں دیکھا۔ جانچا اور پرکھا ہے اور میں نے جانا کہ میں نے جس سے محبت کی ہے وہ ایک بہترین انسان ہے۔ اور اس پوری دنیا میں میرے لیے اس سے اچھا اور بہترین انسان کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"آپ لڑکیاں بھی کتنا مبالغہ کرتی ہیں مہرین دنیا اچھے انسانوں سے بھری پڑی ہے۔"

وہ ہولے سے ہنسا۔

"لیکن میرا ارادہ دنیا گھوم کر کسی اچھے انسان کی کھوج کرنے کا نہیں۔ میرے سامنے تو تم ہو شجاع۔"

پاس سے گزرتے لڑکوں کے گروپ میں سے دو لڑکوں نے قہقہہ لگایا تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔ اب پتا نہیں وہ ان کے متعلق کوئی بات کر کے ہنسے تھے یا اپنی ہی کسی بات پر لیکن مہرین کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اور پھر سر جھٹک کر وہ شجاع کی طرف دیکھنے لگی۔ جواب پھر پہلے کی طرح سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"اگر میرا تمہارے متعلق جاننا ضروری ہے تو تمہیں بھی تو حق ہے نا میرے متعلق جاننے کا۔" اس نے کھنکار کر گلا صاف کرنے کی کوشش کی۔ میں ہوں مہرین عبدالستار، سید عبدالستار گیلانی کی بیٹی، مجھ سے بڑے دو بھائی اور ایک بہن ہیں اور تینوں ہی شادی شدہ ہیں۔ میرے ابی جان بزنس مین ہیں۔ اور ہم ماڈل ٹاؤن بلاک بی میں رہتے ہیں۔ میں اپنے ابی جان اور امی جان سے زیادہ اپنے دادا جان کی لاڈلی ہوں۔"

"مجھے آپ کے متعلق جاننے کی ضرورت نہیں ہے مہرین۔" شجاع نے اس کی بات کاٹی۔

"ضرورت تو مجھے بھی نہیں ہے جی، خیر تم بولو۔"

وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے اسے دیکھ رہی تھی۔

"جیسا کہ آپ کو پتا ہے میں ایک چھوٹے سے شہر سے آیا ہوں وہاں کے مشہور "ماڑیوں والے محلے"

کی ایک گلی میں رہتا ہوں جسے نیل گروں کی گلی کہتے ہیں۔ اس گلی کے آخر میں ہمارا چھوٹا سا چار مرلے کا گھر ہے۔ اور میرے ابا جی محی الدین شاہ کی چھوٹی سی دکان اسی گلی میں گھر کے بالکل سامنے ہے۔'' وہ ہولے ہولے بول رہا تھا اور وہ بے حد دھیان سے نگاہیں اس پر جمائے سن رہی تھی۔

'' مطلب تمہارے ابا جان بھی بزنس مین ہیں۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔

''اور تم یوں ہی پریشان ہو رہے تھے بات تو اتنی سی ہے نا کہ تمہارے بابا کی چھوٹی سی دکان ہے اور میرے ابی جان کی مال پر الیکٹرانک کی اشیاء کی بہت بڑی دکان ہے۔

''بات اتنی سی نہیں ہے مہرین۔'' وہ اس کی بات پر پتا نہیں کیوں دل گرفتہ سا ہو گیا تھا۔

''میرے ابا جان......''

'' اوہ مائی گاڈ۔ آج تو ڈرائیور کے ساتھ امی جان نے بھی آنا تھا۔ ہمیں فری کے گھر جانا تھا اس کے نکاح کی مبارک باد دینے۔''

'' اس نے شجاع کی بات کاٹی۔'' خان چاچا مجھے ڈھونڈتا پھر رہا ہوگا۔''

'' اوکے، آپ جائیں مہرین۔'' اس نے گہری سانس لی۔

'' تم بھی چلو نا۔ امی جان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ اور کیا تمہیں ہوسٹل نہیں جانا۔ میں راستے میں تمہیں ڈراپ کر دوں گی۔'' وہ دو تین بار پہلے بھی اسے ڈراپ کر چکی تھی۔

''نہیں مجھے ابھی نہیں جانا۔ لائبریری سے ایک دو بکس ایشو کروانی ہیں۔''

'' اچھا ٹھیک ہے پارکنگ تک تو چلو نا۔ امی جان سے تمہارا تعارف کروا دوں گی۔ اچھا ہے نا جب تمہارے ابا جان اور اماں جان ہمارے گھر آئیں گے تو امی تمہیں پہلے ہی مل چکی ہوں گی۔''

اور شجاع محی الدین کو مہرین عبدالستار کی خوش فہمی پر دل ہی دل میں ہنسی آئی تھی لیکن وہ کچھ کہے بغیر خاموشی سے اس کے ساتھ پارکنگ کی طرف چل پڑا۔

☆☆☆

سید ظہیر الدین شاہ وسیع دیوان خانے میں ادھر سے ادھر ٹہل رہے تھے ان کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ دیوان خانے میں تین اطراف پر بھاری وکٹورین صوفے تھے۔ بائیں طرف ایک بڑے تخت پر گاؤں تکیے سے ٹیک لگائے حمیدہ بیگم بیٹھی تھیں۔ ان کے سامنے چاندی کا بڑا سا پاندان پڑا تھا۔ دیواروں پر سید ظہیر الدین کے دادا پر دادا کی روغنی تصاویر تھیں۔ دائیں دیوار پر بارہ سنگھے کا سینگ اور شیر اور چیتے کے بھس بھرے سر تھے فرش پر دبیز قیمتی ایرانی قالین بچھا تھا۔ صوفوں کے ساتھ کونوں میں نقشین تپائیوں پر چاندی کے خوب صورت شمع دان تھے اور درمیان میں ایک بڑی چوکور میز تھی جس پر نازک گلدان میں تازہ پھول سجے تھے۔ دیوان خانے میں فالتو سجاوٹ نہیں تھی۔ لیکن سادگی اور خوب صورتی کا دلکش امتزاج نظر آتا۔

'' کیا بات ہے آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔'' حمیدہ بیگم نے پاندان کا ڈھکن کھولتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

''ہاں......نہیں تو۔'' وہ چونکے اور قریبی صوفے پر بیٹھ گئے۔ ''بس یونہی ملکی حالات کے متعلق سوچ رہے تھے کہ دیکھو حالات کس کروٹ بیٹھتے ہیں۔''

''ہم تو آپ کو تب سے پریشان دیکھ رہے ہیں جب سے آپ علی گڑھ سے آئے ہیں۔ پوچھا اس لیے نہیں کہ آپ جب مناسب سمجھیں گے تو خود ہی بتا دیں گے۔'' حمیدہ بیگم کی کھوجتی نظریں لمحہ بھر کے لیے ان کے چہرے پر ٹھہریں اور پھر وہ پان بنانے لگیں۔ وہ دل ہی دل میں حمیدہ بیگم کی گہری نظر کے قائل ہوئے۔ وہ کسی کام سے علی گڑھ گئے تھے تو مامون الرشید سے بھی ملنے چلے گئے تھے لیکن پتا چلا کہ پچھلے دنوں ایک جلوس پر لاٹھی چارج ہوا تھا جس میں وہ بھی زخمی ہو گئے تھے۔ چوٹ سر پر لگی تھی اور خون کافی بہہ گیا تھا اور وہ ہاسپٹل میں تھے۔ حمیدہ بیگم پریشان ہو جاتیں اس لیے انہوں نے ذکر نہیں کیا تھا۔ البتہ اپنے منشی کے بیٹے وحید الدین کو ان کے پاس چھوڑ آئے تھے۔

'' ہم کیا حمیدہ بیگم، سب ہی پریشان ہیں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ اگر مسلم لیگ نہ جیت سکی تو ہمارا الگ وطن حاصل کرنے کا مطالبہ کمزور ہو جائے گا۔''

'' لیکن ہارون تو کہہ رہے تھے کہ جس طرح قائداعظم اور دوسرے مسلم لیگی جگہ جگہ جا کر مسلم لیگ کے موقف سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہیں اس سے امید تو بہت ہے کہ مسلم لیگ ہماری توقع سے زیادہ سیٹیں حاصل کرے گی۔''

''ان شاءاللہ۔''

انہوں نے حمیدہ بیگم کے ہاتھ سے پان کی گلوری لے لی۔ یوں وہ پان کھانے کے عادی نہ تھے لیکن کبھی کبھار حمیدہ بیگم اگر انہیں گلوری پیش کرتیں تو وہ انکار بھی نہ کرتے تھے۔

''آپ نے مامون سے کہا نہیں تھا کہ وہ ایک چکر گھر کا لگا جائیں۔ ہمارا نہیں تو دلہن کا ہی خیال کر لیں بیاہ کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ دو ماہ ہو گئے نہ تو کوئی خط پتر بھیجا نہ ہی خود آئے۔''

''کہہ رہے تھے اب تو الیکشن کے بعد ہی چکر لگائیں گے۔''

''دلہن کی اداسی دیکھی نہیں جاتی۔ ان سے کہیں الیکشن سے پہلے ایک چکر لگا جائیں۔''

''ٹھیک ہے ہم پیغام بھجوا دیں گے لیکن یہ بیاہ بھی تو آپ کے اصرار پر ہی ہوا۔ ورنہ وہ تو بضد تھے کہ پاکستان بننے کے بعد ہی شادی کریں گے۔'' سید ظہیر الدین مسکرائے۔

''تو اور کتنے دن یوں ہی پھرتے رہتے، اتنی عمر میں تو ہارون دو بچوں کے باپ بن چکے تھے۔ اور یہ ایں کہ پہلے تو ان کی پڑھائیاں ہی ختم نہیں ہو رہی تھیں پھر اور آپ کو تو جیسے خبر ہی نہیں تھی کہ چھوٹی دلہن کی والدہ کس قدر بیمار تھیں۔ پھر آئے دن جو یہ ہندو مسلم فساد شروع ہو گئے ہیں تو اس نے انہیں اور بھی بوکھلا رہا تھا۔ کتنی ہی بار کہلوا کر بھیجا کہ وہ جلد اس کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔''

حمیدہ بیگم چند ماہ کی بیاہی دلہن کو دیکھتیں تو انہیں افسوس ہوتا تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ زیادہ نہیں تو مامون مہینے میں ایک بار تو ضرور چند دنوں کے لیے آیا کریں۔ لیکن مامون آنے والے الیکشن کے سلسلے میں بہت مصروف ہو گئے تھے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ جگہ جگہ جا کر جلسے اور تقریریں کرتے پھر رہے تھے۔ سید ظہیر الدین حمیدہ بیگم کی لمبی بات سن کر مدھم سا مسکرائے۔

''سچ تو یہ ہے، حمیدہ بیگم کہ ہم بوڑھے تو اب گلی گلی جا کر ووٹ مانگنے سے رہے۔ آزادی کی نعمت کوئی یوں گھر بیٹھے ہی جھولی میں نہیں دیتا۔ ہمارے جناح صاحب اور ان کے ساتھی ان تھک محنت کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے مامون کو نہیں روکا۔ یہ ان جوانوں کا ہی کام ہے اب اور مامون الرشید کے دل سے تو ابھی تک یہ قلق نہیں گیا کہ اگر وہ گھر پر نہ آئے ہوئے ہوتے تو قائداعظم کی بگھی کو کھینچنے کی سعادت انہیں بھی حاصل ہوتی۔ ہم نہیں چاہتے کہ اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہیں اس جدوجہد میں حصہ لینے سے روک دیں۔ اور یہ دکھ عمر بھر کے لیے ان کے دل میں ٹھہر جائے کہ وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔

''خیر ہمارا یہ مطلب بھی نہیں تھا۔'' حمیدہ بیگم نے ان کی پوری بات بہت دھیان سے سنی تھی۔ ''ہم تو خود فاطمہ جناح اور دوسری خواتین کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ موئی کانگریس تقسیم کے خلاف کیوں ہے۔''

''اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے...... خیر، اس موضوع پر پھر بات کرتے ہیں۔ ابھی ذرا ہمیں کام سے جانا تھا۔'' سید ظہیر الدین اٹھ کھڑے ہوئے۔

''ارے دیکھو، ہمیں جو بات کرنا تھی وہ رہ ہی

گئی۔ حمیدہ بیگم نے پیشانی پر ہلکا سا ہاتھ مارا سید ظہیر الدین سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔

"ہارون کے بڑے صاحبزادے ماشاء اللہ پانچ سال کے ہوگئے ہیں۔ ہم چاہ رہے تھے کہ ان کی رسم بسم اللہ کی تقریب پر ماموں بھی شریک ہوجائیں۔ چھوٹی دلہن بھی خوش ہوجاتیں اور ہمارا کلیجہ بھی انہیں دیکھ کر ٹھنڈا ہوجاتا۔"

"مولوی صاحب تو آرہے ہیں نا صاحبزادے کو پڑھانے۔ تقریب کا کیا ہے ماموں جب بھی دو چار روز کے لیے آئیں گے آپ تقریب رکھ دیجیے گا۔" سید صاحب رسم ورواج کے زیادہ قائل نہ تھے۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ ماشاء اللہ مولوی صاحب نے کئی چھوٹی سورتیں یاد کروادی ہیں۔ لیکن تقریب کے سلسلے میں کچھ تیاری بھی تو کرنی ہوتی ہے نا۔ آپ کم از کم ماموں کو پیغام تو بھجوادیں کہ وہ کچھ اتا پتا بتائیں کہ کب آنے کا پروگرام ہے۔"

حمیدہ بیگم پاندان کا ڈھکن بند کرکے اٹھ کھڑی ہوئیں تب ہی یاسمین (ملازمہ) اجازت طلب کرکے اندر آئی۔

"صفدر علی نے اندر پیغام بھجوایا ہے کہ وحید الدین آئے ہیں ملاقات کے لیے۔"

"ہم چلتے ہیں۔" سید ظہیر الدین نے حمیدہ بیگم کی طرف دیکھا۔

"منشی کی بیوی آئی تھی سلام کو کہہ رہی تھی وحید الدین علی گڑھ گیا ہوا ہے۔ کیا خبر ماموں سے بھی ملاقات ہوئی ہو۔ حال احوال پوچھیے گا۔"

حمیدہ بیگم نے کہا تو وہ سر ہلاتے ہوئے دیوان خانے سے باہر نکل گئے تو حمیدہ بیگم یاسمین کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"یاسمین بی بی۔ ذرا مغلانی جی کو بڑی دلہن کے کمرے میں بھجوادیں، ہم بھی ادھر ہی جارہے ہیں۔" پھر وہ یاسمین کے پیچھے ہی باہر نکل گئیں۔

مردانے میں وحید الدین ان کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہیں دیکھ کر کھڑا ہو کر سلام کیا۔

"بیٹھو بیٹھو وحید الدین۔" سلام کا جواب دے کر سید ظہیر الدین دیوار کے ساتھ لگے کوچ پر بیٹھ گئے۔

"پہلے تو یہ بتایئے کہ ماموں کیسے ہیں۔"

"جی وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آج انہیں کلکتہ جانا تھا۔ وہاں کوئی جلسہ ہے۔ پھر جالندھر اور امرتسر کا پروگرام ہے۔ وہاں سے واپسی پر گھر کا چکر لگائیں گے۔"

"شکر اللہ کا سر کا زخم تو ٹھیک ہوگیا ہے نا۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی۔" وحید الدین نے ادب سے کہا۔ تب ہی خیر دین نے حاضری کی اجازت چاہی۔

"آؤ..... آؤ خیر دین کیسے آنا ہوا۔"

"جی وہ جوتے تیار ہوگئے تھے وہی دینے حاضر ہوا تھا۔" خیر دین آداب بجالا کر ایک طرف کھڑا ہوگیا تو سید ظہیر الدین نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"بیٹھ جاؤ خیر دین۔"

"پورے گاؤں کے خیرو موچی کو جب سید ظہیر الدین خیر دین کہہ کر بلاتے تو اس کا سینہ چوڑا ہوجاتا۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے کپڑے کے تھیلے میں سے دو جوڑے جوتوں کے نکالے اور سید صاحب کو دکھائے۔

"بڑے صاحبزادے ہارون الرشید صاحب نے بنوائے ہیں۔ اپنے کسی دوست کے لیے۔"

"ہاں، ہاں مجھے علم ہے۔ دلّی سے ان کے ایک دوست آئے تھے انہیں آپ کے ہاتھ کے بنے ہوئے جوتے بہت پسند آئے تھے۔ قرب وجوار میں کوئی آپ کے جیسے جوتے تو نہیں بنا سکتا۔"

انہوں نے وحید الدین کو جوتے لینے کا اشارہ کیا۔

"اللہ کا کرم ہے شاہ جی کہ لوگوں کو ہمارا کام پسند آجاتا ہے۔" خیر دین عاجزی سے بولتا ہوا اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔

"اور سناؤ خیر دین عبدالستار کو مدرسے بھیجا کہ نہیں۔

"جی مولوی اکبر صاحب کے مدرسے میں چھوڑ آیا تھا۔ مولوی صاحب بھی تعریف کررہے تھے کہ بہت تیز ہے منٹوں میں سبق یاد کرلیتا ہے۔ ماشاء اللہ۔"

"مدرسے کی تعلیم ختم کرلے تو اسے شہر میں پڑھنے کے لیے بھجوادیں گے۔ خرچ کی فکر نہ کرنا۔"

"آپ کی دعا ہے کبھی تنگی ترشی نہیں ہوئی۔"

انہوں نے وحید الدین کو قریب بلا کر جوتوں کی رقم ادا کرنے کی ہدایت کی اور خیر دین سے کچھ دوسرے لوگوں کے متعلق پوچھنے لگے۔

سید ظہیر الدین ایک بہت بڑی جاگیر کے مالک تھے ان کی جاگیر میں کئی گاؤں شامل تھے۔ ددھیال کی طرف سے ان کی رشتہ داری ریاست جونا گڑھ کے نوابین سے بنتی تھی جبکہ ننھیال کا تعلق ریاست بہاولپور سے تھا۔ ان کے نانا کی ریاست بہاولپور میں بہت بڑی جاگیر تھی۔ ان کے دو بیٹے ہارون الرشید اور مامون الرشید تھے اور ایک بیٹی زیب النساء تھی۔ تینوں شادی شدہ تھے۔ بڑے بیٹے کے دو بیٹے تھے۔ بڑے پانچ سال کے اور چھوٹے تین سال کے تھے۔ مامون ابھی علی گڑھ کے طالب علم تھے لیکن حمیدہ بیگم کے اصرار پر چند ماہ پہلے ان کی شادی ہوئی تھی جبکہ زیب النساء بیاہ کر کلکتہ گئی تھیں ان کے میاں بیرسٹر تھے جو ان کے ماموں زاد بھی تھے۔ وہ بھی ایک بیٹے اور ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی۔ سید ظہیر الدین بے حد سخی اور نرم دل تھے۔ ان کی جاگیر میں ہندو مسلمان سب شیر وشکر ہو کر رہ رہے تھے سب لوگ خوش حال تھے سید ظہیر الدین سب کا ہی خیال رکھتے تھے کسی پر کوئی مصیبت یا پریشانی آتی تو ذاتی طور پر اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کرتے۔ چھوٹے بڑے سب کی عزت کرتے تھے۔ اور سب کی خوشی میں شریک ہوتے تھے۔

وحید الدین نے خیر دین کو رقم ادا کی۔ خیر دین جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی خیر دین کے ساتھ باہر نکلے۔

"وحید الدین! ہم ذرا چوہدری عظمت کی طرف جارہے ہیں پتا چلا ہے کہ ان کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ تو سوچا عیادت کرآئیں۔ اندر صفدر علی کے ہاتھ اطلاع بھجوادیں۔"

"جی بہتر سرکار۔" وحید الدین نے سر جھکایا۔

تب ہی حویلی کے اندرونی گیٹ سے دو بچے ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے سبز ہلالی پرچم اٹھائے باہر نکلے۔ وہ پاکستان زندہ باد کے نعرے بھی لگا رہے تھے۔ دونوں ہارون الرشید کے صاحبزادے تھے سید ظہیر الدین کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"واہ ہمارے شہزادوں نے اتنے پیارے پرچم کہاں سے لیے۔"

اماں جان نے بنا کر دیے ہیں۔ بڑے بچے نے جس کی عمر تقریباً پانچ سال کی تھی بتایا اور پھر خیر دین کی طرف دیکھا۔

"خیر دین چاچا۔ آپ ہمارے لیے سنہرے تلے والے جوتے بنادیجیے گا۔ جیسے چچا جان کی شادی پر بنائے تھے۔ ہم اپنی بسم اللہ کی تقریب میں پہنیں گے اور ہاں جناح صاحب کے لیے بھی ایسے ہی جوتے بنادیں جب وہ یہاں آئیں گے جلسے میں تو ہم انہیں تحفے میں دیں گے۔"

"جناح صاحب ایسے جوتے نہیں پہنتے بیٹا۔" سید ظہیر الدین صاحب کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"اچھا وہ جیسے پہنتے ہیں ویسے بنادیجیے گا۔"

"ہاں ضرور بنادوں گا۔"

"خیر دین بھی مسکرادیا اور دونوں بچے اپنے پرچم لہراتے پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے مارچ کرتے واپس اندر حویلی کی طرف چلے گئے۔

☆☆☆

"آپ کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے کمزوری بھی بہت ہے۔ ایک دو روز اور آرام کرلیتے تو اچھا تھا۔ افشاں بیگم نے شوہر کو دکان کی چابی اٹھائے گھر سے باہر جاتے دیکھا تو انہیں روکا۔

"اگر آرام کرتے رہے تو شیخ صاحب کے

بچوں کے جوتے وقت پر تیار نہیں ہو سکیں گے۔ بچوں نے اپنے ماموں کی شادی میں پہننے ہیں۔ آپ تردد نہ کریں ہماری طبیعت اللہ کے کرم سے اب کافی بہتر ہے۔"

وہ تسلی دیتے ہوئے گھر سے نکلے۔ گلی عبور کر کے سامنے ہی چھوٹی سی دکان تھی۔ ان کے بنائے کوہاٹی اور پشاوری چپل بہت پسند کیے جاتے تھے۔ پچھلے کئی دنوں سے انہیں بخار تھا جس نے نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ ہولے ہولے چلتے ہوئے دکان تک آئے اور دکان کھول کر پہلے جھاڑو دی۔ ٹین کے ڈبے میں پانی ڈال کر چمڑے کا ٹکڑا ڈالا اور صندوقچی سے رانبی نکال کر اس کی دھار تیز کی۔

تب ہی السلام علیکم کی آواز پر سر اٹھایا۔

حاجی صاحب کا معمول تھا کہ اپنی دکان پر جاتے ہوئے وہ ضرور گھڑی دو گھڑی رک کر سلام دعا کرتے تھے۔

"وعلیکم السلام، حاجی صاحب، سنایئے کیسے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے شاہ صاحب وہ جس حال میں رکھے۔ آپ نے آج تین دن بعد دکان کھولی ہے۔ خیریت تھی؟"

"بخار ہو گیا تھا لیکن اب اللہ کے فضل سے بخار تو اتر گیا ہے تھوڑی کمزوری ہے وہ بھی ان شاء اللہ جاتی رہے گی۔"

حاجی صاحب عموماً سلام دعا کے بعد چلے جاتے تھے لیکن آج خلاف معمول رک گئے تھے۔

"صاحبزادے کا کیا حال ہے کہاں تک پہنچی ان کی پڑھائی۔"

"بس اب تو چند ماہ ہی رہ گئے ہیں۔"

"اللہ اسے کامیاب کرے۔" حاجی صاحب دکان کے باہر پڑی لوہے کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"آپ کے لیے چائے منگواؤں حاجی صاحب۔" شاہ صاحب نے پوچھا تو انہوں نے منع کر دیا۔

"نہیں شاہ صاحب۔ چائے تو پی کر ہی نکلا تھا۔ آپ کی بھابھی نے آج ناشتا بھی تگڑا بنایا تھا پائے اور نان۔"

شاہ صاحب کے لبوں پر مدہم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہو گئی۔

"صاحبزادے پڑھائی سے فارغ ہو کر نوکری لگ جائیں تو پھر شادی کر دیجیے گھر میں بہو اور بچوں سے رونق ہو جائے گی۔ اکیلا گھر تو کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے۔ ہم دو بندے تو کبھی کبھی اتنا گھبرا جاتے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ گھر چھوڑ کر بھاگ جائیں۔ اپنا شہزادہ ہوتا تو۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

کون تھا جسے شہزادے عالمگیر کی جوان مرگی کا دکھ نہ ہو جھنگا، گلو بادشاہ، ہادی لیس والا تو جیسے ہر روز ہی کسی نہ کسی بہانے شہزادے کا ذکر نکال بیٹھتے تھے۔ شاہ صاحب بھی حاجی صاحب کے دکھ سے آشنا تھے اور اکثر ان کے گھر میں بھی اس کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔

"بس حاجی صاحب اپنا شہزادہ تو اتنی ہی عمر لکھوا کر لایا تھا اللہ اس کے درجات بلند کرے اور آپ کے حوصلے کو قائم رکھے۔"

"آمین۔"

حاجی صاحب نے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھوں کی نمی پونچھی۔

"آپ کا بچہ بھی اپنا ہی بچہ ہے۔ آپ اور افشاں بھابھی فکر نہ کیجیے گا، آپ کی بھابھی ہیں نا۔ جب بھی کوئی ایسا سلسلہ ہوا تو تین چار لڑکیاں تو وہ بھی بتا دیں گی۔ اپنے ستار شوز والوں کی بھی بچیاں ہیں۔"

"جی......" شاہ صاحب ہمیشہ سے ہی کم گو تھے۔

"خیر وہ وقت تو آئے۔" حاجی صاحب آج جیسے فرصت میں تھے۔ "ہاں اصل بات تو ذہن سے ہی نکل گئی وہ میرے دوست ہیں نا محبوب صاحب سرگودھا والے آپ نے دو سال پہلے ان کے لیے کھیڑیاں بنائی تھیں۔

ان کا پیغام آیا تھا کہ دو جوڑے کھیڑیاں اور

بنا دیں ایک دو روز میں ماپ بھجوا دیں گے۔"

"جی یہ شیخ صاحب کے بچوں کے جوتے بن جائیں تو پھر......"

"ہاں...... ہاں کوئی جلدی نہیں جب فرصت ملے۔" حاجی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

شاہ صاحب نے پھر رانبی اٹھائی اور بوڑم پر پڑے چمڑے کو چھیل کر پتلا کرنے لگے پھر ایک پر اٹھا کر پتلا ہی کیا تھا کہ گلو بادشاہ بھاگتا ہوا آیا اور ان کی دکان کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"شاہ جی...... شاہ جی......" اپنی سانس پر قابو پاتے ہی وہ تیز تیز بولنے لگا "جلدی چلیں شاہ جی۔ وہ طابی ہے نا۔ اپنا چائے والا وہ ٹرے میں چائے کے کپ رکھ کر ادھر فضل بھائی کی دکان کی طرف جا رہا تھا تو ایک دم چکر کھا کر گر پڑا۔ اب زمین پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ آپ جلدی سے آکر دم کر دیں۔"

"میں......" انہوں نے حیرت سے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "مولوی صاحب سے کہو جا کر۔"

"مولوی صاحب تو جی پتا نہیں اس وقت کہاں ہیں۔ آپ دم کر دیں جلدی سے۔"

"میں...... لیکن میں نے کبھی دم نہیں کیا۔"

"کیا تھا شاہ جی...... مجھے کیا تھا ایک بار......" گلو کے لہجے میں خود بخود ہی فخر سا آ گیا تھا۔ "اماں مجھے بتاتی ہیں ایک بار میں بچپن میں بیمار ہو گیا تھا بخار اترتا ہی نہیں تھا۔ سب کہتے تھے نظر لگ گئی ہے۔ اماں آپ کے گھر مجھے آپا جی سے دم کروانے لے کر گئی تھیں لیکن وہ گھر پر نہیں تھیں تو آپ نے دم کیا تھا اور اماں کہتی ہیں میں دو ہی دن میں بھلا چنگا ہو گیا تھا۔"

"اچھا۔"

انہیں یاد نہیں تھا لیکن وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اماں جان کہا کرتی تھیں کہ بیٹا یہ سب گلی محلے والے سادہ اور محبت کرنے والے لوگ ہیں اور اگر کبھی کوئی آس لے کر آئے تو مایوس کبھی نہ لوٹانا۔ وہ بچیوں کو قرآن پڑھاتی تھیں۔ کوئی آس پاس سے چھوٹے بچوں کو دم کروانے کے لیے آتا تو کر دیتی تھیں۔ وہ انہیں اور افشاں کو بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی دعائیں یاد کرواتی رہتی تھیں تو ہو سکتا ہے کبھی گلو کی والدہ آئی ہوں تو انہوں نے نظر کی دعا پڑھ کر دم کر دیا ہو۔ اماں جان صرف انہیں اور افشاں کو ہی نہیں، قرآن پڑھنے آنے والی بچیوں کو بھی بہت ساری دعائیں یاد کروا دیتی تھیں۔ گلو بہت یقین اور آس کے ساتھ ان کے پاس آیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ طابی کی دکان کی طرف چل پڑے۔ دکان کے سامنے ہی آس پاس کے دکاندار اور کچھ راہگیر دائرہ بنائے کھڑے تھے۔

"ہٹو ہٹو۔ راستہ دو شاہ جی آئے ہیں دم کریں گے۔" گلو نے بلند آواز سے کہا تو کچھ لوگ اِدھر اُدھر ہو گئے۔

انہوں نے دیکھا طابی زمین پر پڑا اِدھر اُدھر سر مارتا تھا اور اس کے منہ سے جھاگ نکلتا تھا۔ فیاض منیاری والا جھک کر اسے جوتا سنگھا رہا تھا۔ ان سادہ سے لوگوں کے اپنے ہی ٹوٹکے تھے ایک نظر دیکھتے ہی انہیں پتا چل گیا تھا کہ اسے مرگی کا دورہ پڑا ہے اس کے سرہانے بیٹھ کر وہ آیت شفا پڑھنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد اس کا تڑپنا کم ہو گیا تھا۔

"انہیں گھر بھجوا دیں یہ مرگی کے مریض ہیں۔"

انہیں یاد تھا کہ جب وہ چھوٹے تھے۔ چاچا رحمت کے بیٹے صدیق بھائی کو بھی مرگی کا دورہ پڑتا تھا۔ ڈاکٹر عالم نے انہیں ایک ٹیبلٹ لکھ کر دی تھی کہ یہ گولی انہیں پوری زندگی کھانی ہے۔ ہر روز ایک گولی تو صدیق بھائی جب تک زندہ رہے وہ کھاتے رہے۔ اور پھر کبھی انہیں دورہ نہیں پڑا۔ کئی بار وہ میڈیکل اسٹور سے چاچا رحمت کے کہنے پر گولیاں لے کر آئے تھے۔

"اور گلو بیٹا۔ آپ میرے ساتھ چلیں میں آپ کو ایک دوائی کا نام لکھ کر دیتا ہوں۔ طابی کی والدہ سے کہیے گا ہر روز ایک گولی انہیں کھلانی ہے پھر ان شاء اللہ دورہ نہیں پڑے گا۔"

وہ واپسی کے لیے مڑے تو وہاں کھڑے سب لوگوں کی آنکھوں میں ان کے لیے محبت اور عقیدت تھی۔ وہ کون تھے کس ذات برداری کے تھے وہ لوگ نہیں جانتے تھے رحمت چاچا انہیں شاہ جی کہتے تو سب گلی والے انہیں شاہ جی ہی کہنے لگے۔

فیاض منیاری والے کو بھی اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ کبھی رحمت کی دکان پر جاتا تھا تو رحمت چاچا کہا کرتے تھے۔ بڑے اعلا حسب نسب ہیں۔ ہجرت نے کیسے کیسے لعل و گوہر کو بے گھر کر دیا ہے۔

فیاض منیاری والا سب کو بتارہا تھا اور وہ سر جھکائے اپنی دکان کی طرف جارہے تھے۔

☆☆☆

''اوئے، عبدالستار یہ اس وقت کہاں جارہا ہے بن ٹھن کر۔'' خیر دین جو ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہا تھا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''ایک بزنس ڈنر ہے ابا جی! وہاں ہی جانا ہے۔ دعا کیجیے گا۔ سیٹھ معراج کے ساتھ پارٹنر شپ کا معاملہ طے پا جائے۔ دراصل سیٹھ صاحب کو اپنی نئی مل کے لیے ایک پارٹنر کی ضرورت ہے اور میں......''

''او ستاریا۔'' خیر دین نے اسے ٹوک دیا۔ ''او اتنا تیز نہ دوڑ، کہیں منہ کے بل گر نہ جانا۔ بہت کما لیا کہاں لے کر جائے گا اتنی دولت بس کر دے زیادہ کا لالچ نہ کر۔''

عبدالستار نے برا سا منہ بنایا اور دل ہی دل میں خیر دین سے پارٹنر شپ کی بات کر کے پچھتایا۔ جانتا تھا اب خیر دین کا نصیحت نامہ شروع ہو جائے گا۔

''ادھر بیٹھ عبدالستار۔ میری بات دھیان سے سن یہ جو سیٹھ معراج ہے نا شکل سے چور اچکا لگتا ہے۔ ایک آنکھ نہیں بھاتا مجھے۔ میں اس کے باپ دادا کو اچھی طرح جانتا ہوں اور......''

''بس ابا جی۔'' عبدالستار نے ذرا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ ''مجھے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔ سیٹھ معراج کا شجرہ نسب پھر کسی روز سن لوں گا۔''

''اچھا جا تم نے پہلے کب میری سنی ہے جواب سنے گا اور ہاں بیوی کو بھی ساتھ لے جارہا ہے بے شرموں کی طرح۔ غیر مردوں کے سامنے لے جاتے حیا نہیں آتی خیر دین نے لاؤنج سے باہر نظر دوڑائی عبدالستار اپنی بات مکمل کر کے رکا نہیں تھا تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔

''ہوں، نشہ تو دیکھو اس موچی کی اولاد کا پوری بات ہی نہیں سنی۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھی گردن میں سریا ڈال رکھا ہے کمبخت نے۔''

خیر دین کچھ دیر بڑبڑاتا رہا پھر ملازمہ کو آواز دی۔

''شمو...... شمو ذرا حقہ تازہ کر کے لے آ جلدی سے۔''

ایک سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی اندر آئی۔

''جی بابا جی۔''

''بابا جی کی بچی تجھے حقہ لانے کے لیے کہا تھا۔''

''لیکن وہ جی بیگم صاحبہ نے منع کیا ہے ادھر ٹی وی روم میں حقہ پینے کا۔ وہ کہتی ہیں جب آپ نے حقہ پینا ہو تو لان میں بیٹھ کر پیا کریں۔ یا اپنے کمرے میں ادھر اسمیل ہو جاتی ہے تو چھوٹی بی بی کے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ جی تمباکو کی بو سے طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔''

''اچھا...... اچھا...... چل رہنے دے زیادہ زبان نہ چلا۔''

''یہ بتا، تیری چھوٹی بی بی آ گئی ہے سہیلی کے گھر سے۔''

''جی بیگم صاحبہ اور بی بی ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آئی ہیں اور بیگم صاحبہ کے ہی کمرے میں ہیں۔'' پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور رازداری سے بتایا۔ ''بیگم صاحبہ بہت غصے میں ہیں اور چھوٹی بی بی رو رہی ہیں۔''

''کیا؟''

خیر دین کے دل پر گھونسا سا لگا تھا وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ مہرین کے آنسو خیر دین سے کہاں برداشت ہوتے تھے۔ مہرین کا نام خیر دین نے مہر

النساء رکھا تھا لیکن ان کی بہو نے اس کے نویں جماعت میں بڑے اسکول میں داخلے کے وقت بدل کر مہرین رکھ دیا تھا۔ چونکہ مہرین کو بھی اپنا نام مہر النسا پسند نہ تھا سو وہ چپ رہا تھا۔ ورنہ مہرین کے ہر معاملے میں وہ اپنی مرضی کرتا تھا کسی کی نہیں سنتا تھا۔

''جی پھر حقہ تازہ کر کے لان میں رکھ دوں۔'' شمو ابھی تک کھڑی تھی۔

''چل بھاگ۔'' اس نے غصے سے اسے گھورا اور کھڑا ہو گیا۔ ''جب تازہ کرنا ہو گا بتا دوں گا۔''

وہ لاؤنج سے نکل کر عبدالستار کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا اور سامنے ہی بیڈ پر سعادت پروین بیٹھی تھی اور کمرے کے وسط میں مہرین کھڑی تھی۔

''اوہ ہو...... ابا جی...... یہ سنیں آ کر اپنی لاڈلی کی باتیں۔'' سعادت کی نظر خیر دین پر پڑی۔

''کیا ہوا سعادت پروین! کیا کہہ دیا میری لاڈلی نے۔''

خیر دین نے کمرے میں قدم رکھا۔

''ہونا کیا ہے۔ اسی سے پوچھیں۔'' وہ جھلائیں۔

''ہاں ہاں...... کیا ہوا میرا بچہ...... یہ تیری ماں کیوں لوہے کے چنے چبا رہی ہے؟''

''دادا جان!''

مہرین نے نظریں اٹھائیں۔ بھیگی پلکیں نم آنکھیں خیر دین نے تڑپ کر اس کے گرد اپنا بازو حمائل کیا۔

''کچھ نہیں دادا جی۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''کچھ نہیں کیا۔ ایویں ہی میرے بچے کی آنکھیں لالوں لال ہو رہی ہیں ضرور اس سعادت پروین نے خلاف مزاج بات کی ہو گی۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا ابا جی۔ جو کچھ کیا اس کا اس کیا دھرا ہے۔'' سعادت نے سر سے ڈھلک جانے والے دوپٹے کو درست کیا۔

''کہا تھا نا یونیورسٹی نہ بھیجیں۔ اور آپا زرینہ کو رشتہ دے دیں۔ پڑھا لکھا شکل صورت والا ہے۔''

''اچھا تو اب اس نے تمہیں اپنا وکیل بنایا ہے۔ کہہ تو دیا تھا میں نے زرینہ کو کہ میں مہرین کا رشتہ اسے نہیں دے سکتا۔ بھلا ٹاٹ میں مخمل کا پیوند کیسے لگ سکتا۔'' آدھی بات انہوں نے دل ہی دل میں کہی تھی۔

''آپ کا اپنا نواسا ہے۔ نہ خاندان نہ ذات کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اور نرگس کے وقت تو آپ کچھ نہ بولے حالانکہ میں اتنی جلدی سے اس کی شادی کے حق میں نہ تھی۔ ادھر آپا زرینہ نے بڑے بیٹے کے لیے جھولی پھیلائی ادھر۔

''اوہ، میں نے مجبور نہیں کیا تھا تمہیں نرگس کا رشتہ زرینہ کو دینے کے لیے تم دونوں کا فیصلہ تھا۔ عبدالستار کو بہت پسند تھا اپنا بھانجا۔ اور اب دیکھو کتنی خوش ہے نرگس۔

''ہاں، وہ تو ہے ابا جی آپا اسی لیے تو کہتی ہیں اپنی مہرین کا رشتہ دوسرے بیٹے کو دے دیں۔ اچھا ہے دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں ہوں گی تو......''

''اوہ! نہیں سعادت پروین میں مہرین کا رشتہ زرینہ کو نہیں دے سکتا۔ بھلے اس کا بیٹا بادشاہ ہی کیوں نہ بن جائے۔

''تو پھر کر دیں اس جفت ساز کے بیٹے سے جس کو آپ کی لاڈلی پسند کیے بیٹھی ہے۔'' سعادت نے جھلا کر کہا تو مہرین نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

''کیا...... کیا مطلب۔'' خیر دین کی آنکھیں ہی نہیں منہ بھی کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جفت ساز۔'' خیر دین کے لبوں سے بمشکل نکلا۔ تمہارا مطلب ہے کہ......''

''ہاں میرا وہی مطلب ہے جو آپ سمجھے ہیں ابا جی۔'' سعادت پروین کا موڈ بے حد خراب تھا۔

''پوری بات بتاؤ سعادت پروین خواہ مخواہ میں پہلیاں نہ بجھواؤ۔''

''زرینہ آپا کے بیٹے کے لیے آپ راضی نہ تھے۔ تو میں نے سوچا چلو جو لڑکا مہرین کو پسند ہے اس کے ساتھ اس کی شادی کر دیں گے۔ تعریفیں سن سن

کے کان پک گئے تھے میرے آج مجھے راجا صاحب کی طرف جانا تھا مہرین کو لے کے فرخندہ کے نکاح کی مبارک دینے تو میں جب مہرو کو یونیورسٹی لینے گئی تو مہرو نے مجھے اس سے ملوایا۔ اس میں تو کوئی شک وشبہ نہیں کہ لڑکا بلاشبہ شہزادوں جیسا تھا۔" اب سعادت کا موڈ قدرے بہتر تھا اور وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

"پر جب میں نے پوچھا آپ کے والد کیا کرتے ہیں تو بولا ہمارے والد جفت ساز ہیں۔" میں تو ہکا بکا اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ بڑا آیا نوابزادہ کہیں کا۔

"امی!" مہرین نے احتجاج کیا۔

"تم چپ رہو مہرو! پسند ہی کرنا تھا تو کسی خاندانی لڑکے کو کیا ہوتا۔ پسند بھی کیا تو جوتے بنانے والے کا بیٹا۔ کہاں ہماری مہرین عبدالستار اور کہاں وہ۔"

"ہاں ہاں سعادت پروین یہ بات تو تم نے سولہ آنے صحیح کہی ہے۔ بھلا کہاں ہماری سیدہ مہرین اور کہاں۔" مہرین نے اس کی بات سن کر اس کا بازو اپنے کندھے سے ہٹایا اور شاکی نظروں سے خیر دین کو دیکھا۔

"آپ بھی دادا جی! امی جان کی طرح بات کررہے ہیں۔ حالانکہ پہلے تو آپ کہتے تھے سب انسان برابر ہیں۔ غریب امیر سب۔ شجاع ایک بہترین انسان ہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کے بابا جان جفت ساز ہیں۔ یہ تو ایک پیشہ ہے اور پیشہ تو کوئی بھی کوئی انسان اختیار کرسکتا ہے۔"

"آپ اسے سمجھائیں ابا جی ہماری ایک عزت ہے نام ہے۔ کاروباری حلقے میں اس کے ابی جان جانے پہچانے جاتے ہیں، کیسے ہم ایک موچی کو اپنی بیٹی کا رشتہ دے دیں۔ بھلے وہ شکل وصورت کا شہزادہ ہی کیوں نہ ہو۔" سعادت کو پھر غصہ آگیا تھا۔

خیر دین نے مہرین کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں پھر نمی پھیلتی جارہی تھی اور سعادت سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے سمجھالوں گا۔ تم اب اپنی بڑبڑ بند کرو۔" اس نے مہرین کا ہاتھ پکڑا۔

"آؤ مہرین بچے ادھر چل کر بیٹھتے ہیں پھر تم آرام سے ساری بات مجھے سمجھانا۔"

اور مہرین منہ پھلائے روٹھی روٹھی سی خیر دین کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی۔ اور بیڈ کے سامنے پڑی روم چیرز میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ خیر دین نے بھی اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے غور سے اسے دیکھا۔

"ایک آپ سے مجھے امید تھی دادا جی کہ آپ میرا ساتھ دیں گے لیکن آپ بھی امی کے ساتھ مل کر ان کے جیسی ہی باتیں کرنے لگے ہیں۔ حالانکہ شجاع بہت اچھا ہے۔ بہت ذہین ہے بہت مہذب، آج تک مجھے اس نے تم کہہ کر نہیں بلایا۔ ہمیشہ آپ کہہ کر بلاتا ہے۔"

"مہرین بچے۔ آپ کی بات صحیح ہے۔ ٹھیک کہتی ہیں پر آپ اصلی کھری نجیب الطرفین سید اور......" خیر دین کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح مہرین کو سمجھائے کہ وہ اس کی شادی کبھی جفت ساز کے بیٹے سے نہیں کرسکتا۔

"جب ثروت خالہ نے نرگس آپا کا رشتہ مانگا تھا تو آپ نے امی جان سے کہا تھا کہ نرگس کی مرضی پوچھ لو اسے وہ ثروت خالہ کا لمبوتنی خورا بیٹا پسند نہ تھا۔ تو پھر امی جان نے نرگس آپا سے پوچھ کر ثروت خالہ کو منع کردیا تھا، حالانکہ ثروت خالہ کو موڈ خراب ہوگیا تھا امی جان نے کتنی مشکلوں سے انہیں مشتاق بھائی کی شادی پر راضی کیا تھا۔" مہرین سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔ "اور پھر جب سلیم بھائی کا رشتہ آیا تب بھی ابی جان نے آپا سے ان کی مرضی پوچھی تھی۔ پوچھی تھی نا۔"

"خیر دین نے سر ہلایا۔"

"تو پھر میری مرضی۔"

"تو میری شہزادی آپ کی بھی تو مرضی پوچھے بغیر......"

"تو بتادی ہے نا میں نے آپ کو اپنی مرضی۔ مجھے شجاع کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کرنی بس۔" وہ اٹھی اور تقریباً بھاگتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ خیر دین حیران سا کھلے دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

سید ظہیر الدین شاہ کی حویلی میں آج کسی دعوت کا سا سماں تھا۔ اندر باہر ہر جگہ چراغاں ہورہا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا آج ہارون الرشید کے بڑے صاحبزادے کی رسم بسم اللہ تھی۔ مردانے زنانے میں ملازم ملازمائیں نئے کپڑے پہنے پھر رہے تھے۔ حویلی سے ملحق احاطے میں ماہر باورچی بہترین کھانے پکانے میں مصروف تھے۔ گاؤں کے ہر گھر میں مٹھائی کے تھال بھجوائے گئے تھے۔ سبھی گھروں میں کھانا بھی بھجوایا جانا تھا۔ گھر میں بھی چند قریبی عزیز مدعو تھے خوب رونق لگی تھی۔

درخشاں دلہن اپنے کمرے میں تیار ہورہی تھیں انہیں مامون الرشید کا انتظار تھا جو تین ماہ بعد آج محی الدین کی رسم بسم اللہ کی تقریب میں شرکت کے لیے آرہے تھے۔ درخشاں نے سنگار میز کے آئینے میں اپنی تیاری کا جائزہ لیا۔ تب ہی مامون الرشید دبے قدموں دروازہ کھول کر اندر آئے۔ آئینے میں درخشاں کا عکس دیکھ کر مدھم سا مسکرائے اور کندھوں سے پکڑ کر ان کا رخ اپنی طرف کیا۔

"آئینہ آپ کے حسن کو وہ خراج تحسین پیش نہیں کرسکتا جو ہم کرسکتے ہیں۔"

درخشاں لجا گئیں۔ بار حیا سے ان کی گھنی پلکیں جھک گئیں اور رخساروں پر جیسے شفق اتر آئی۔

درخشاں ایک تو تھیں ہی خوب صورت پھر یہ بناؤ سنگار اور پہلی بار ماں بننے کا حسن ان پر ٹوٹا پڑتا تھا۔ مامون کی نظریں تو جیسے ان کے حسین چہرے پر ٹھہری گئی تھیں۔

"بخدا، درخشاں انجم۔ ہمارے پاس آپ کے حسن کی تعریف کے لیے لفظ ہی نہیں ہیں۔"

وہ علی گڑھ کے طالب علم تھے اور اپنے جذبوں کے اظہار میں خاصے بے باک بھی تھے۔ لیکن آج تین ماہ بعد اپنی دلہن کے سامنے وہ ساکت کھڑے انہیں دیکھے جارہے تھے۔

درخشاں جوان کی اچانک آمد سے حیران سی رہ گئی تھیں انہیں اچانک احساس ہوا تھا کہ وہ بغیر دوپٹے کے کھڑی ہیں انہوں نے آہستگی سے مامون کے ہاتھ اپنے کندھوں سے ہٹائے اور تیزی سے جھک کر بیڈ پر پڑا اپنا بڑا سا دوپٹا اٹھا کر اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کی گو اماں جان نے ان دنوں کے لیے انہیں کافی کھلے کھلے کپڑے بنوادیے تھے پھر بھی انہیں مامون سے جھجک سی محسوس ہوئی۔ مامون جو بہت گہری نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے مسکرائے۔

"آپ کا بہت شکریہ درخشاں۔"

"کس بات کا۔" درخشاں نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔

"اس خوب صورت تحفے کے لیے جو آپ ہمیں دینے جارہی ہیں۔"

اور درخشاں ان کی بات سمجھ کر شرما گئیں۔

"آپ کو کیسے......"

"اماں جان نے بتایا ہے۔" انہوں نے بے حد دلچسپی سے انہیں دیکھا تو ان کی نگاہوں کی تپش نے ایک بار پھر ان کے رخساروں کو دہکا دیا۔

"تین ماہ بعد گھر آنے والے شوہر کی پذیرائی کیا ایسے کی جاتی ہے درخشاں انجم، نہ بیٹھنے کے لیے کہا اور نہ......"

وہ شوخ ہوئے اور انہیں اپنی بانہوں کے حلقے میں لیے لیے بیڈ پر بیٹھ گئے تو درخشاں نے پوچھا۔

"آپ اب کے کچھ دن تو ٹھہریں گے نا۔"

"نہیں ہم زیادہ دن نہیں رک سکیں گے۔ بس زیادہ سے زیادہ دو دن مزید ٹھہریں گے۔"

مامون نے درخشاں کو اداس ہوتے محسوس کیا تو شرمندہ ہوگئے۔

"ہم آپ سے شرمندہ ہیں اور معذرت خواہ

ہیں کہ ہم آپ کو وہ وقت نہیں دے پائے جس کی آپ حق دار تھیں۔ اسی لیے ہم نے اماں جان سے کہا تھا کہ ابھی رخصتی میں جلدی نہ کریں۔"

"تو کیا آپ ہم سے شادی کر کے پچھتا رہے ہیں۔" درخشاں نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

"جی ہرگز نہیں۔ آپ نہیں جانتیں آپ ہمارے دل کی اولین خواہش ہیں۔ آپ کو پانا زندگی کی تمام خوب صورتیوں کو پالینا ہے۔ آپ کی رفاقت ہمارے لیے زندگی کی معراج حاصل کرنا ہے۔ ہمیں صرف آپ کا احساس ہے۔ خود ہمارے لیے بھی آپ سے خود دور رکھنا آسان نہیں ہے لیکن ہم جس اعلا و ارفع مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کر رہے ہیں اس کے سامنے ذاتی خواہشات بے معنی ہو جاتی ہیں۔ ابھی بھی اماں جان کے بے حد اصرار پر ہم محی الدین کی رسم بسم اللہ کی تقریب میں شرکت کے لیے آئے ہیں۔ اور کچھ ہمارا اپنا دل بھی بے ایمان ہو رہا تھا آپ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے کہ اس نئے روپ میں آپ کیسی لگتی ہیں ورنہ ہم ہر لمحہ جناح صاحب کے ہم قدم رہنا چاہتے ہیں۔"

مامون الرشید کی باتوں نے جہاں درخشاں انجم کے دل میں پھول کھلائے تھے وہاں وہ کچھ اداس بھی ہو گئی تھیں۔

"ہم نے آپ سے کوئی گلہ کیا ماموں ہم تو خود ہر لمحہ جناح صاحب کی کامیابی کے لیے دعا گو رہتے ہیں۔"

"آپ کے حقوق کی ادائیگی میں ہم سے جو کوتاہی ہو جاتی ہے اس کے لیے ہمیں معاف کر دیجیے۔" مومن الرشید یک دم سنجیدہ ہو گئے تھے۔

"ایسی باتیں نہ کریں ماموں۔" درخشاں روہانسی ہو گئیں۔ "ہمیں آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ ہم حالات اور وقت کی نزاکت سمجھتے ہیں۔"

"تھینک یو، درخشاں ہم جانتے ہیں کہ آپ کا دل بہت خوب صورت ہے لیکن اماں جان جب بھی خط یا پیغام بھجواتی ہیں تو ہم اپنے دل پر بوجھ سا محسوس کرتے ہیں۔" وہ ہنوز سنجیدہ تھے۔

"آپ ہماری طرف سے بے فکر ہو کر اپنے مقصد پر توجہ دیں اور ہمارے متعلق بالکل نہ سوچا کریں۔" درخشاں نے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو مامون نے ان کے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔

"جس کی اتنی حسین دلہن ہو وہ بھلا کیسے خود کو اس کے متعلق سوچنے سے روک سکتا ہے۔"

درخشاں کی پلکیں بار حیا سے جھک گئیں۔ اور ہونٹوں پر دلکش سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"خدارا درخشاں بیگم، ہماری سوچوں پر تو پابندی نہ لگائیں۔" وہ پھر شوخ ہوئے تو درخشاں کو یکدم ہی خیال آیا۔

"ہم نے آپ کو مسلم لیگ کی کامیابی کی مبارک باد تو دی ہی نہیں...... یہ جیت مبارک ہو۔"

"آپ کو بھی بہت مبارک ہو۔ درخشاں یہ ہم سب مسلمانوں کی کامیابی ہے کہ نہ صرف مرکزی اسمبلی بلکہ صوبائی اسمبلی میں بھی جیت مسلم لیگ کو ہی نصیب ہوئی۔ اب پاکستان کو دنیا کی کوئی بھی طاقت وجود میں آنے سے نہیں روک سکتی۔"

وہ ایک دم پر جوش ہو گئے تھے۔ کچھ دیر وہ دسمبر 1945 میں ہونے والے مرکزی قانون ساز اسمبلی اور جنوری 1946 میں ہونے والے صوبائی اسمبلی کے انتخابات پر مسلم لیگ کی کامیابی کے حوالے سے بات کرتے رہے اور پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اماں جان سے مل کر سیدھا آپ کی طرف ہی آیا ہوں۔ ابھی ابا جان سے ملاقات نہیں ہو سکی بھائی جان سے بھی باہر سرسری سی ملاقات ہوئی ہے۔ اجازت ہے۔" انہوں نے ہلکا سا سر خم کیا۔

"جی۔" درخشاں بھی کھڑی ہو گئیں۔

"ارے ہاں۔" وہ جاتے جاتے پلٹے۔

"اماں جان نے پیغام دیا تھا کہ مولوی صاحب کے اور ان کے گھر والوں کے لیے کپڑے اور مٹھائی کا ٹوکرا باہر مردانے میں بجھوا دیں۔"

نرمی سے درخشاں کے رخسار کو انگلی سے چھوتے ہوئے وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

"اماں جان۔ افشاں کہہ رہی تھیں کہ آپ کی خوراک بہت کم ہو گئی ہے۔ دن کو بھی آپ نے کھانا نہیں کھایا۔" محی الدین نے ان کی چارپائی کی پائنتی بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اسّی سال عمر ہو گئی ہے محی الدین...... اس عمر میں یہی ہوتا ہے۔ کبھی بھوک لگتی ہے کبھی نہیں لگتی۔ اللہ کا شکر ہے اس نے ابھی ہاتھ پاؤں سلامت رکھے ہیں۔ کسی کی محتاجی نہیں۔" کلثوم فاطمہ نے شفقت سے انہیں دیکھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے اماں جان لیکن پھر بھی اگر آپ طبیعت میں گرانی محسوس کر رہی ہیں تو ڈاکٹر کی طرف لے چلوں۔" محی الدین نے ان کے پاؤں پر ہاتھ رکھے۔ ان کی عادت تھی کہ دکان سے آکر کچھ دیر کلثوم فاطمہ کے پاؤں دباتے تھے۔

"نہیں...... ہمیں ڈاکٹر کی طرف نہیں جانا۔ یہ چھوٹی موٹی بیماریاں تو جان کے ساتھ لگی ہیں اب مر کر ہی جان چھوڑیں گی۔ افشاں دلہن نے پودینے والا قہوہ بنا کر دیا تھا۔ اس سے کافی طبیعت بہتر ہو گئی ہے۔"

"اللہ آپ کو لمبی حیاتی دے اماں جان، آپ کے سوا ہمارا اور ہے ہی کون۔"

"اور کتنے برس جئیں گے محی الدین۔" ان کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "پتا نہیں۔ اتنے برس کیسے جی لیے۔ آپ کا اور افشاں کا خیال ہی تھا جو ہمت بندھاتا رہا ورنہ جینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔"

"اماں جان پلیز ابھی آپ نے شجاع کی کامیابیاں اور خوشی دیکھنی ہے ایسی باتیں نہ کریں ہمارے دل کو کچھ ہوتا ہے۔" محی الدین بھی افسردہ ہو گئے تھے۔

"اچھا۔" کلثوم فاطمہ مسکرائیں۔ "نہیں کرتے ایسی باتیں۔ آپ بتائیں شجاع میاں کب آرہے ہیں؟ اس بار بہت دنوں سے چکر نہیں لگایا۔"

"پہلے پڑھائی میں مصروف تھے پھر پیپرز شروع ہو گئے۔ اب ان شاء اللہ دو چار روز میں پیپرز ختم ہو جائیں گے تو آجائیں گے۔" محی الدین نے بتایا۔

"وہ آتے ہیں تو گھر میں رونق سی ہو جاتی ہے۔ جب سے لاہور پڑھنے گئے ہیں۔ دل اس خاموشی سے گھبراتا ہے۔ افشاں دلہن اپنے کام میں لگی رہتی ہیں آپ دکان پر چلے جاتے ہیں۔ قرآن پڑھنے والی بچیاں بھی اب دو چار ہی ہیں۔" انہوں نے محی الدین کا ہاتھ اپنے پاؤں سے ہٹایا۔ "بس کر دیں اب سارا دن کے تھکے ہارے آتے ہیں اور......"

"اماں جان پلیز۔ آپ ہمیں مت روکا کریں۔ ہم اور تو آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس خدمت سے محروم نہ کیا کریں" محی الدین افسردہ ہو گئے۔

"آپ نے ہماری بہت خدمت کی محی الدین چھوٹی سی عمر میں ہی مشقت میں پڑ گئے۔ کاش ہم آپ کو کچھ بہتر زندگی دے سکتے۔" ان کی آنکھیں پتا نہیں کیوں نم ہو گئیں۔

محی الدین کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں انہیں روتے یا صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے نہیں دیکھا تھا۔

"کیا ہوا اماں؟" انہوں نے بے اختیار ان کے ہاتھ تھام لیے۔ "ہم نے جو کیا ہمارا فرض تھا اور ہمیں کبھی اپنی زندگی سے گلہ نہیں ہوا۔ بخدا۔ اماں جان، ہم بہت خوش اور مطمئن ہیں اور آپ خود ہی تو کہتی تھیں کہ محنت کرنے میں کوئی عار نہیں۔ الکاسب وحبیب اللہ (محنت کرنے والا اللہ کا دوست) ہے۔"

"ہاں، محنت کرنے میں کوئی عار نہیں ہم آج بھی کہتے ہیں بس یونہی آپ کی مشقت بھری زندگی کا خیال آگیا تھا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"ہم کبھی آپ کو بتا نہیں پائے محی الدین کہ آپ کو یہ کام کرتے دیکھ کر ہمارا کلیجہ کٹتا تھا اور دل کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔

"ہمیں چاچا رحمت نے یہی کام سکھایا تھا اس کے علاوہ ہم اور کر بھی کیا سکتے تھے۔"

محی الدین نے ان کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگایا اور بوسہ دیا۔

"کئی بار ہم نے سوچا محی الدین صرف آپ کی خاطر کہ ایک بار لاہور جائیں کہ آپ کے بابا جان کے دوست تھے وہاں، ان کا نام تو معلوم تھا پتا نہیں تھا۔ انہیں کیسے تلاش کرتے یہاں رحمت بھائی کے گھر ہماری عزت محفوظ تھی۔ سو ہم اللہ کی رضا پر راضی ہو گئے۔ مالک نے جس حال میں رکھا خوش ہیں۔ بس آپ کو اور افشاں دلہن کو تعلیم نہ دلوا سکنے کا دکھ ہے خیر اچھی بھلی گزر گئی اب تو بس شجاع میاں کام سے لگ جائیں تو ان کی شادی کی خوشی دیکھ لیں۔" محی الدین کی آنکھوں میں پھیلتی اداسی دیکھ کر کلثوم فاطمہ نے موضوع بدلا۔

"اوہ ہاں یاد آیا۔" محی الدین سمجھ گئے تھے کہ ماں اب گزری زندگی پر بات نہیں کرنا چاہتیں۔

"اس روز حاجی صاحب آئے تھے دکان پر وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ شجاع نوکری سے لگ جائیں تو ان کی شادی کر دیں۔ اپنی گلی میں ہی کئی اچھے رشتے موجود ہیں۔"

"اللہ وہ دن لائے۔ ویسے حاجی صاحب کیسے ہیں۔ جوان بیٹے کی موت کا دکھ تو عمر بھر کا ہے۔" کلثوم فاطمہ کے پاس جب بھی حاجی صاحب کی بیگم آتیں ان کے دل میں شہزادہ عالمگیر کا دکھ تازہ ہو جاتا تھا۔ چھوٹا سا تھا جب وہ ان کے پاس اسے قرآن پڑھنے کے لیے چھوڑنے آئی تھیں۔

"مسجد نہیں جاتا آپا جی۔ مولوی صاحب سے ڈرتا ہے آپ اسے بھی بچیوں کے ساتھ قرآن پڑھا دیا کریں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں پڑھا دیا کروں گی۔"

وہ انہیں اپنے شجاع کی طرح ہی لگا تھا۔

"حاجی صاحب مرد ہیں۔ اللہ کی رضا پر راضی ہیں ظاہر نہیں کرتے لیکن کبھی کبھی آنکھیں شہزادے کے ذکر پر بھر آتی ہیں۔" محی الدین کو بھی شہزادے کی جواں مرگی کا آج تک دکھ تھا۔

"کھچڑی تیار ہو گئی ہے اماں جان، لے آؤں۔" افشاں نے کمرے میں جھانکا۔

"لے آئیے۔"

کلثوم فاطمہ کے بجائے محی الدین نے جواب دیا اور اٹھ کر کمرے میں بائیں دیوار کے ساتھ پڑی لکڑی کی چھوٹی سی میز کو کلثوم فاطمہ کی چارپائی کے سامنے رکھا اور دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے موڑھے بھی اٹھا کر میز کے پاس رکھے۔ رات کا کھانا وہ تینوں کلثوم فاطمہ کے کمرے میں ہی کھاتے تھے۔ افشاں نے گرم گرم بھاپ اڑاتی کھچڑی کا پیالہ میز پر لا کر رکھا ساتھ میں پلیٹیں، چمچے اور کٹوری میں لیموں کا پانی والا اچار تھا۔

"مونگ کی دال کی کھچڑی کا مزا تو لیموں کے اچار کے ساتھ ہی آتا ہے کیوں اماں جان؟"

محی الدین نے پلیٹ میں تھوڑی سی کھچڑی ڈالی اور لیموں کا ایک ٹکڑا رکھ کر کلثوم فاطمہ کی طرف بڑھایا۔

"کچھ دن ہوئے حاجرہ لیموں دے گئی تھی۔ ہم نے اچار ڈال لیا۔"

کلثوم فاطمہ نے اپنے بے حد صابر و شاکر بیٹے کی طرف دیکھا۔ جو بہت رغبت سے کھچڑی کھا رہے تھے۔ اور پھر افشاں پر نظر ڈالی جو پانی کا جگ اور گلاس رکھ کر خود بھی موڑھے پر بیٹھ گئی تھی۔ اللہ کا شکر تھا کہ دنوں میاں بیوی نے زندگی بہت صبر و شکر کے ساتھ گزاری تھی۔ عام عورتوں کی طرح افشاں کبھی کوئی حرف شکایت لب پر نہ لائی تھی دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے انہوں نے کھچڑی کا لقمہ منہ میں ڈالا۔ اور کوئی بیتا ہوا منظر آنکھوں کے سامنے آ کر آنکھوں کو دھندلا کر گیا۔

☆☆☆

شجاع یونیورسٹی کے لان میں ایک الگ تھلگ گوشے میں بیٹھا نوٹس تیار کر رہا تھا کہ مہرین اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں آئی۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا شجاع محی الدین صاحب کہ آپ کو سچ بولنے کا اتنا مراق کیوں ہے۔"

اس نے اپنی فائل زمین پر پٹخی اور خود بھی اس کے برابر زمین پر بیٹھ گئی تو شجاع نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ آپ کو آخر امی جان سے اتنا سوچ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ جب غصے میں ہوتی یا اس سے کچھ ناراض ہوتی تو آپ کہہ کر بلاتی تھی۔

"کیا آپ کی امی جان سے میں جھوٹ بولتا؟"

وہ حیران سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"جھوٹ نہ بولتے لیکن یہ بھی تو نہ کہتے کہ میرے بابا جان جفت ساز ہیں۔" مہرین نے اب کے آہستگی سے کہا۔

"اس میں چھپانے کی بھی تو کوئی بات نہیں تھی مہرین۔ بابا جان جب جوتے بناتے ہیں تو مجھے یہ ہی بتانا تھا نا کہ وہ جفت ساز ہیں۔"

شجاع جانتا تھا مہرین کی والدہ کو یہ بات ہضم نہیں ہو گی لیکن اسے ہمیشہ سچ بولنے کی تربیت دی گئی تھی۔

"تم یہ بھی تو کہہ سکتے تھے نا شجی کہ تمہارے بابا کی دکان ہے۔" مہرین کی ناراضی خود ہی ختم ہو گئی تھی۔

"ہاں لیکن ان کا دوسرا سوال یہی ہوتا کہ کس کی دکان۔" شجاع کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہاں تو کہہ دیتے کہ جوتوں کی دکان ہے۔" مہرین پھر جھنجلائی تھی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے مہرین۔"

شجاع نے ہاتھ میں پکڑا پین بند کر کے فائل کے اندر رکھا۔

"پڑتا ہے شجاع تمہیں کیا پتا امی جان نے گھر جا کر کتنا رولا ڈالا۔" مہرین روہانسی ہو گئی۔

"جانتا ہوں مہرین کیا کہا ہو گا انہوں نے۔"

شجاع نے ایک گہری سانس لی۔

"یہی نا کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی ایک موچی سے نہیں کر سکتے۔ اسی لیے تو میں نے کہا تھا کہ مسئلہ میرے والدین کا نہیں آپ کے والدین کا ہے۔"

مہرین کچھ دیر سر جھکائے آنسو پینے کی کوشش کرتی رہی۔

"مجھے یقین تھا کہ اگر ابی جان نہ بھی مانے تو میں دادا جان کو منا لوں گی لیکن حیرت تو مجھے تب ہوئی جب دادا جی نے بھی امی جان والی بات کی۔ حالانکہ دادا جی نے تو کبھی امیری غریبی کو اہمیت نہیں دی۔ اب بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ بے شک لڑکا غریب ہو لیکن اصلی اور کھرا اسید ہو۔ وہ میری شادی کسی ایسے ویسے خاندان میں نہیں کر سکتے، حالانکہ دونوں بھائیوں کی شادیوں میں دادا نے ایسی کوئی بات نہیں کی بڑی بھابھی شیخ ہیں تو چھوٹی بھابھی کے ابا گجر ہیں۔ نرگس آپا کی تو خیر زرینہ پھپھو کے گھر شادی ہوئی۔ لیکن میرے لیے یہ پابندی کیوں۔" آنسو آنکھوں سے پھسل کر رخساروں پر ڈھلک آئے۔

"لیکن میں تمہارے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی اگر دادا جان نہ مانے تو میں مر جاؤں گی خودکشی کر لوں گی۔"

"حرام موت مریں گی آپ؟" شجاع کانپ گیا۔

"تو اور کیا کروں؟" اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

شجاع نے بے بسی اس کی طرف دیکھا۔

"تم...... تم مجھ سے شادی کر لو۔ ہم آج ہی نکاح کر لیتے ہیں۔ یا پھر کورٹ میرج اور نکاح ہو جائے گا نا تو پھر کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔"

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں مہرین؟" شجاع گھبرا گیا۔

"ہمارے والدین نے ہماری ایسی تربیت تو نہیں کی کہ ہم کسی کو تکلیف پہنچائیں اور وہ بھی آپ کے والدین کو۔"

"تم اپنی اخلاقیات اور والدین کی تربیت پر حرف نہ آنے دینا شجاع محی الدین اور مجھے کھو دینا ہمیشہ کے لیے۔" آنسو پھر سے اس کی آنکھوں میں بھر گئے تھے۔ "میرے ابی جان اور دادا جان تم سے میری شادی نہیں کرنے والے۔"

"میں جانتا تھا ایسا ہی ہونا ہے اس لیے آپ کو سمجھاتا تھا کہ ہم دو الگ راستوں کے مسافر ہیں۔" شجاع نے سر جھکا لیا تھا اس میں مہرین کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہ تھا۔ "آپ بھی سمجھ لینا کہ ہم دو اجنبی مسافر تھے جو کسی جنکشن پر اتفاقاً ملے تھے اور پھر اپنی اپنی ٹرین آنے پر......"

بات ادھوری چھوڑ کر شجاع نے ایک نظر اس پر ڈالی اور پھر نظریں جھکا لیں۔

"بھول جانا سب کچھ مہرین۔"

"کیا بھولنا اتنا ہی آسان ہے شجاع!" مہرین تلخ ہوئی۔

"نہیں...... مشکل ہوگا...... شاید بہت مشکل لیکن کوشش تو کی جاسکتی ہے نا بھولنے کی۔"

شجاع نے جھکا سر نہیں اٹھایا تھا۔ مہرین کو ہمیشہ کے لیے کھو دینے کا خیال دل کو مٹھی میں لے کر بھینچا تھا۔

"تم کرنا کوشش مجھے بھولنے کی لیکن مجھے مشکل کام کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ نہیں بھولوں گی میں تمہیں دیکھ لینا تم" وہ فائل اٹھا کر کھڑی ہوگئی۔ "تم بھی نہیں بھول سکو گے مجھے۔"

شجاع جانتا تھا کہ وہ اسے کبھی بھول نہیں پائے گا۔

"اور نہیں جی سکو گے میرے بغیر۔ جی لوگے کیا؟" سوالیہ نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ اور پھر آنکھوں میں پانی بھر گیا۔ وہ تیزی سی مڑی۔

"سنو...... سنو مہرین!" وہ اپنی فائل اٹھا کر اس کے پیچھے لپکا۔

"ہاں میں نہیں بھول سکتا نہیں جی سکتا آپ کے بغیر۔"

اس نے بے بسی سے اعتراف کیا۔

"تو......"

وہ تیزی سے اس کی طرف مڑی۔ بھیگی آنکھیں امید کی روشنی سے چمک اٹھی تھیں۔ "ٹھیک ہے میں ہر ممکن طریقے سے دادا جان کو راضی کرنے کی کوشش کروں گی اور اگر وہ راضی نہ ہوئے تو تو پھر تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔"

"کیا؟"

"میں پھر تمہارے گھر آجاؤں گی اور تمہارے بابا جان سے کہوں گی کہ میں خود اب آگئی ہوں قاضی کو بلائیں اور اپنے بیٹے سے میرا نکاح پڑھوا دیں۔"

وہ شوخی سے ہنسی۔ پاس سے گزرتے لڑکیوں کے ایک گروپ نے رک کر اسے دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئیں۔

"مہرین......" شجاع نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"بس۔" مہرین نے ذرا سا ہاتھ بلند کیا اور اسے وہاں ہی حیران کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

☆☆☆

جون 1946 کا وسط تھا جب مامون الرشید اپنی بے پناہ مصروفیات میں سے وقت نکال کر درخشاں کی والدہ کی عیادت کے لیے دہلی آئے تھے لیکن ان کی آمد سے دو دن قبل ان کا انتقال ہوگیا تھا اور بروقت اطلاع نہ ملنے کی وجہ سے وہ جنازے میں بھی شرکت نہ کرسکے تھے۔ ان کی آمد سے صرف گھنٹہ بھر پہلے سید ظہیر الدین حمیدہ بیگم اور ہارون جنازے میں شرکت کے بعد حویلی واپس گئے چلے تھے یوں ان سے بھی ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ البتہ درخشاں دلہن یہاں ہی تھیں۔ سب سے مل ملا کر وہ زنان خانے میں آئے تو درخشاں غم سے نڈھال رحمانی بوا کی گود میں سر رکھے لیٹی تھیں انہیں دیکھ کر اٹھ بیٹھیں اور آنکھیں

برسنے لگیں۔ رحمانی بوا کمرے سے باہر چلی گئیں تو انہوں نے درخشاں کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"ہم نہیں جانتے کہ اس شدید غم کے موقع پر ہم آپ سے کیا کہیں۔ کوئی بھی لفظ اس دکھ کی تلافی نہیں کرسکتا جو والدین کی دائمی جدائی کی صورت میں ملتا ہے۔"

درخشاں کے آنسو اور تیزی سے بہنے لگے تو انہوں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"ہم آپ کے دکھ کو ایسے ہی محسوس کر رہے ہیں درخشاں انجم جیسے یہ ہمارا اپنا دکھ ہو۔ ہمیں ان کی شدید علالت خبر کی علی گڑھ میں ملی تھی تب ہم آگرہ جارہے تھے۔ اور پھر آگرہ سے کلکتہ کا کام نبٹا کر سیدھے دہلی آئے ہیں اور ......" انہوں نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور چند لمحوں بعد بولے۔

"کاش ہم ان کی زندگی میں آپاتے۔ ہمارے نصیب میں تو ان کے جنازے کو کندھا دینا بھی نہیں لکھا تھا۔ آپ تو ہفتہ بھر پہلے ہی آگئی تھیں نا۔ ابا جان نے بتایا تھا۔"

"ہاں اماں جان کی بیماری کی اطلاع ملتے ہی ہارون بھائی جان کے ساتھ ہم فوراً ہی آگئے تھے۔" درخشاں نے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔ "لیکن اماں جان سے زیادہ بات نہ ہو سکی وہ زیادہ تر بےخودی میں ہی رہتی تھیں۔"

"اللہ کو یہ ہی منظور تھا درخشاں انسان تو بہت بے بس ہے اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ آپ کو اور چچا جان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔" انہوں نے کمرے میں نظر دوڑائی۔

"یہ افشاں کہاں ہے۔ ہر وقت اس کی پیاری صورت آنکھوں کے سامنے رہتی ہے۔"

"افشاں کو تو ہم ساتھ نہیں لائے۔ وہ تو ہر وقت امی جان کے گلے کا ہار بنی رہتی ہیں۔ ایک تو پچھلے دو ماہ سے ہماری طبیعت بہت خراب تھی اور بھابھی جان ہی اسے سنبھال رہی تھیں۔ پھر دانت نکالنے کی وجہ سے چڑچڑ ہو رہی تھیں اور اماں جان نے بھی منع کیا کہ ایک تو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں پھر والدہ کی بیماری خواہ مخواہ تنگ کرے گی۔"

درخشاں نے بتایا تو وہ افسردہ سے ہوگئے۔ افشاں میں ان کی جان تھی جب سے وہ پیدا ہوئی تھی وہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر مہینے میں ایک دو چکر گھر کے لگا لیا کرتے تھے۔ ابھی وہ سال بھر کی تھی اور درخشاں ایک بار پھر تخلیق کے مراحل سے گزر رہی تھیں۔

"یہ اچھا کیا اماں جان نے ورنہ یہاں آپ کو تنگ ہی کرتیں ان شاء اللہ جلد ہی اپنی زندگی سے ملاقات ہوگی۔"

افشاں کے تصور سے ہی ان کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہو کر معدوم ہوگئی۔

"ان شاء اللہ۔" درخشان نے آہستہ سے کہا۔

"آپ کچھ دن رکیں گے کیا۔" ان کی سوالیہ نظریں مامون کی طرف اٹھیں۔

"نہیں...... میں آج رات ہی کسی وقت نکل جاؤں گا۔ آپ کو پتا ہے نا قائداعظم نے کابینہ مشن پلان منظور کرلیا ہے۔ کسی کو امید نہیں تھی سو خوب ہلچل مچی ہوئی ہے۔ آپ تو ابھی ٹھہریں گی نا۔ چچا جان تو بالکل تنہا ہوگئے ہیں۔ اس عمر میں شریک حیات کا ساتھ چھوٹ جانا زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ابھی کم از کم مہینہ بھر ان کے پاس ہی رہیں۔ ان کا دکھ بٹائیں۔ ہم ایک ماہ بعد آئیں گے اور آپ کو یہاں سے لیتے ہوئے ہی گھر چلے جائیں گے۔ بلکہ چچا جان کو بھی کچھ عرصہ کے لیے ساتھ ہی لے چلیں گے۔ وہاں ابا جان کی معیت میں اچھا وقت گزر جائے گا۔"

لیکن وہ پندرہ دن بعد ہی آگئے درخشاں انہیں بے وقت آتا دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔ وہ گہری نیند میں تھیں جب رحمانی بوا نے انہیں جگا کر مامون کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی سی ابا جان کے کمرے میں آئیں مامون ان ہی بتا رہے تھے۔

"آپ کو پتا ہے چچا جان ہندو مسلم فسادات تو

ڈیڑھ دو سال سے ہو ہی رہے ہیں لیکن اٹھارہ جولائی کو جب حکومت برطانیہ کی طرف برصغیر کو دو ممالک میں تقسیم کرنے کے لیے قانون آزادی ہند کی منظوری کا اعلان ہوا تو فسادات میں شدت آگئی ہے۔ سر شام ہی کرفیو لگا دیا جاتا ہے۔ پھر بھی سیکڑوں مسلمان اور ہندو مارے جا رہے ہیں۔ یہ فسادات مزید شدت اختیار کریں گے۔ جو لوگ حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں انہوں نے ان علاقوں کی طرف ہجرت شروع کر دی ہے جو یقینی طور پر پاکستان میں شامل ہوں گے۔ بھائی جان دو ماہ پہلے اپنے کسی کام کے سلسلے میں لاہور گئے تھے تو ایک دوست کے مشورے پر لاہور کے علاقے ماڈل ٹاؤن میں ایک گھر خریدا تھا۔ ایک ہندو ڈاکٹر کا خالی کیا جانے والا گھر مناسب قیمت پر مل گیا تھا۔ میں ٹرین کے فرسٹ کلاس کے ٹکٹ لے آیا ہوں۔ آپ لوگ تیاری کر لیں۔ اپنا قیمتی سامان اور جیولری وغیرہ رکھ لیں۔ صبح گیارہ بجے یہاں سے ٹرین کی روانگی ہو گی۔ حالات بہتر ہوئے تو واپس آجایئے گا۔ رحمانی بوا، درخشاں اور آپ چلے جائیں۔ مرد ملازموں کو چھوڑ جائیں۔ ہم نے رفیق بھائی کو ٹیلی گرام بجھوا دیا ہے وہ آپ کو اسٹیشن سے لے لیں گے۔ لاہور والے گھر کے کاغذات چابیاں سب ان کے پاس ہی ہیں گھر کی دیکھ بھال کے لیے بھائی جان نے ایک ملازم وہاں رکھ لیا تھا۔“

درخشاں ماموں کی ساری بات سن کر اور بھی پریشان ہو گئی تھیں۔

”آپ نے تو میاں سارے فیصلے خود ہی کر لیے ہمیں تو کچھ سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔“ درخشاں کے والد شاید اس طرح فوراً جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔

”چچا جان یہ ناگزیر ہے۔ ہمیں اندر کے لوگوں نے خبر دی ہے کہ پاکستان کے قیام کا اعلان ہوتے ہی مسلمانوں کا قتل عام شروع ہو جائے گا۔ ہندوؤں اور سکھوں کے جتھے ٹرینوں وغیرہ پر حملے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔“

”اور افشاں...... ہماری افشاں۔“ درخشاں نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری تو ماموں نے پہلی مرتبہ خاموشی سے اندر آکر ایک طرف بیٹھ جانے والی درخشاں پر نظر ڈالی۔

”آپ پریشان نہ ہوں ہم آپ کو ٹرین پر سوار کرا کے سیدھے گھر ہی جائیں گے اور وہاں سے سب کو بھجوا دیں گے۔ ان شاء اللہ دو چار روز میں وہ بھی آپ کے پاس ہوں گے۔“

”اور آپ......!“ درخشاں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”ہم...... بھلا ابھی کیسے آسکتے ہیں۔ ان شاء اللہ جلد ملاقات ہو گی۔“

”ان شاء اللہ۔“ درخشاں کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ لیکن وہ درخشاں سے نظر ہٹا کر چچا جان کی طرف متوجہ ہوئے۔

”ہم نے زیادہ ٹکٹ لے لیے تھے۔ رحمانی بوا کے علاوہ بھی اگر آپ کسی کو ساتھ لے جانا چاہیں تو لے جا سکتے ہیں۔“

باقی سب ملازم تو گھر بار والے ہیں ہاں رحمانی بوا کی نواسی ہیں دس بارہ سال کی۔ رحمانی بوا کے سوا اس کا اور کوئی نہیں۔

”ٹھیک ہے چچا جان!“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ہم دو دن سے مسلسل سفر میں ہیں کچھ دیر آرام کریں گے اور رحمانی بوا کو سمجھا دیجیے گا کسی کو ہماری لاہور کی طرف روانگی کا، کانوں کان خبر نہ ہو۔ خاص طور پر ہندو ملازموں کو۔“

درخشاں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں کہ انہیں ضروری تیاری کرنی تھی جب کے ان کے والد کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

ریلوے اسٹیشن پر ہمیشہ کی طرح گہما گہمی تھی۔ ویٹنگ روم کے علاوہ بھی ادھر اُدھر لوگ زمین پر اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے تھے۔ مختلف اشیاء فروخت کرنے والوں کی آوازیں بھی پہلے کی طرح ہی آرہی تھیں۔ وہی بھگدڑ، وہی افراتفری لیکن ایک بات جو انہوں نے نوٹ کی وہ ہندوؤں کی آنکھوں کا وہ تنفر تھا جو کسی مسلمان کو دیکھ کر ان کی آنکھوں سے جھلکنے لگتا تھا۔ ٹرین کی روانگی میں کچھ دیر تھی، وہ سب کو ویٹنگ روم میں بٹھا کر چچا جان کے لیے سگریٹ لینے باہر نکلے تو خیر دین کو ایک طرف اپنے سامان کی گٹھڑیوں کے ساتھ بیٹھا دیکھ کر چونکے۔ خیر دین نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔

”سلام چھوٹے سرکار!“ وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

”خیریت خیر دین چاچا! کہاں کا ارادہ ہے؟“

”خیریت کہاں چھوٹے سرکار! کمار اور اس کے بیٹوں نے ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے۔ دیوار سے دیوار ملی ہے۔ راتوں کو چھت سے آکر گندی گالیاں دیتے ہیں۔ اینٹ پتھر جو ہاتھ میں آتا ہے، اوپر سے صحن میں پھینکتے ہیں۔ ایک دن تو حد ہی ہو گئی، کمار نے بلاوجہ ہی عبدالستار کو پکڑ کر مارا، وہ بے چارہ مدرسے سے آرہا تھا۔ بولا تم نے میرے گھر پتھر پھینکے ہیں، بے چارے کا سر پھٹ گیا، اتنا خون بہا۔ وہ تو لالہ دھنی رام نے چھڑایا ورنہ وہ تو مار ہی ڈالتا۔ میرا بہنوئی آیا ہوا تھا اس روز...... اس نے زور دیا کہ کچھ عرصہ کے لیے اس کے پاس لائل پور چلے آئیں۔ جب آزادی مل جائے گی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ عبدالستار کی والدہ نے بھی ضد باندھ لی کہ چلتے ہیں۔ منہ اندھیرے گھر سے نکل پڑے تھے۔ اب دو دن سے یہاں اسٹیشن پر بیٹھے ہیں، ٹکٹ ہی نہیں مل رہے۔ ٹرینیں پیچھے سے ہی بھری ہوئی آرہی ہیں۔“

”آپ نے ابا جان سے شکایت نہیں کی چاچا! وہ سمجھاتے کمار چند کو۔“ ماموں الرشید نے خیر دین کی ساری بات تحمل سے سنی۔

”کیا بات کرتے چھوٹے سرکار! بڑے سرکار کی بات بھی اب کہاں سنتے ہیں۔ سب کی نظریں بدل گئیں۔ برملا دھرمیندر وغیرہ کہتے پھرتے ہیں کہ ان مسلوں کو اپنی دھرتی میں نہیں رہنے دینا۔ جائیں اپنے پاکستان۔“ ماموں الرشید اس کی بات سن کر پریشان ہو گئے۔

”ہفتہ بھر پہلے ہی تو ابا جان کا خط آیا تھا لیکن انہوں نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا کہ...... خیر چچا جان اور درخشاں وغیرہ لاہور جا رہے ہیں۔ فرسٹ کلاس کے ٹکٹ ہیں ہمارے پاس۔ آپ، چاچی اور بچے ان کے ساتھ ہی لاہور چلیں۔ وہاں ابا جان کے آنے تک ان کے ساتھ ہی رہیں۔ چاچی کی وجہ سے افشاں کی والدہ کو بھی تسلی رہے گی۔ رحمانی بوا اور ان کی نواسی بھی ہیں۔ آپ لوگ بھی ہوں گے تو تنہائی محسوس نہیں ہو گی۔“

خیر دین خوش ہو گیا تھا۔ ماموں نہ ملتے تو نہ جانے کتنے دن مزید یوں ہی خوار ہونا پڑتا۔

ماموں خیر دین کی باتیں سن کر ازحد پریشان ہو گئے تھے۔ اگرچہ انہیں مسلم لیگ کے کچھ لوگوں سے ملاقات کرنی تھی لیکن سب کو ٹرین میں سوار کرا کے وہ فوراً ہی حویلی کی طرف روانہ ہو گئے لیکن ظہیر الدین شاہ نے انہیں تسلی دی۔

”پریشانی کی کوئی بات نہیں ماموں! کمار اور دھرمیندر جیسے شرپسند لوگ تو ہر جگہ ہی ہوتے ہیں۔“

”لیکن ابا جان! ہر جگہ فسادات شروع ہو گئے ہیں۔“ ماموں مطمئن نہ تھے۔

”ہاں آس پاس سے ایسی خبریں آتو رہی ہیں لیکن ہمارا علاقہ محفوظ ہے۔ ہم نے ہارون کے ساتھ پچھلے دنوں پوری جاگیر کا چکر لگایا تھا۔ سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کا قیام ضروری تھا اور ہماری شدید خواہش بھی تھی اور ہے کہ ہمارا اپنا ایک الگ وطن ہوتا۔ ہمیں اقبال اور جناح صاحب کی اس بات سے ذرا سا بھی اختلاف نہیں ہے کہ اپنے قومی اور دینی تشخص کے لیے ایک الگ مملکت کا قیام ناگزیر ہو چکا ہے اور ہم نے اس کے لیے دعائیں بھی بہت کی ہیں۔ لیکن فی الحال ہمارا ہجرت کا ارادہ نہیں ہے۔ یہاں اپنا گھر ہے، اپنی زمینیں ہے، تو ہم کیسے......“

”ابا جان! یہاں لوگوں کے تیور بدل رہے

ہیں۔ حالات بہتر ہو گئے تو آپ آسکتے ہیں۔'' مامون نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

''اپنی زمینوں پر کام کرنے والوں اور دوسرے کچھ سر کردہ لوگوں سے ملا ہوں، سب نے ہی یقین دلایا ہے کہ تقسیم کے بعد بھی ہمارے تعلقات پہلے جیسے ہی رہیں گے۔'' انہیں بے حد یقین تھا۔

''ٹھیک ہے ابا جان! لیکن احتیاطاً خواتین اور بچوں کو تو بھجوادیں۔ افشاں کی والدہ تو پہلے ہی وہاں پہنچ چکی ہیں۔'' ان کی تربیت مزید بحث کی اجازت نہیں دیتی تھی، اس لیے انہوں نے درمیانہ راستہ نکالا۔

''کچھ دن مزید حالات کا جائزہ لیتے ہیں پھر اگر مناسب لگا تو خواتین اور بچوں کو بھجوادیں گے۔''

مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی، سو مامون واپس دہلی آئے۔ یہاں رفیق صاحب کا سب کے بخیریت لاہور پہنچ جانے کا ٹیلی گرام آیا ہوا تھا۔ سو مزید ایک دن دہلی میں رک کر جن لوگوں سے ملنا تھا، ان سے ملاقات کی اور دو تین مسلم لیگی ساتھیوں کے ساتھ مراد آباد روانہ ہو گئے اور چند دن علی گڑھ میں قیام کے بعد ایک بار پھر وہ حویلی روانہ ہو گئے۔ دہلی میں انہیں وحید الدین ملا جس نے بتایا کہ حالات کافی خراب ہو چکے ہیں۔ اپنی زمینوں پر کام کرنے والے بھی اب آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ اردگرد کے علاقوں سے ہندو اور سکھ آ کر اجیت سنگھ کی حویلی میں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ فساد کا خطرہ ہے۔ بڑے سرکار نے دینو کے ہاتھ آپ کو پیغام بھجوایا تھا کہ اگر ہو سکے تو فوجی ٹرک کا بندوبست کر کے حویلی بھجوادیں تاکہ خواتین اور بچوں کو وہاں سے بھجوایا جاسکے۔

''شاید ہمارے وہاں سے نکلنے کے بعد دینو چاچا یہاں پہنچے ہوں گے۔''

مامون نے بھاگ دوڑ کر کے ایک دوست کی مدد سے فوجی ٹرک حاصل کیا۔ وحید الدین اور اپنے دو دوستوں کے ساتھ جو بلوچ رجمنٹ میں تھے کے ساتھ حویلی روانہ ہو گئے اور یہ 9 اگست 1947ء کی شام تھی جب وہ گھر پہنچے تو گھر میں خاندان کے لوگوں کے علاوہ آس پاس کے علاقوں سے بھی کچھ دور نزدیک کے عزیز آ کر پناہ گزین ہو چکے تھے۔ ہارون نے انہیں بتایا کہ ایک دن پہلے قریبی قصبے سے تھانیدار نے آ کر سب مسلمان گھروں سے یہ کہہ کر فساد کا خطرہ ہے اسلحہ لے لیا تھا۔ ابا جان نے عقلمندی کی، کچھ اسلحہ چھپالیا۔ تھری ناٹ تھری کی ایک بندوق اور کچھ دوسرے ہتھیار تھے۔

''اس سے کیا ہوگا ہارون بھائی!'' انہوں نے ہارون الرشید کی بات کاٹی۔ ''میں فوجی ٹرک لایا ہوں۔ ہمیں آج رات نکل جانا چاہیے۔''

''ہاں تم بچوں اور خواتین کو لے کر چلے جاؤ۔ ہم اتنے سارے لوگوں کو جو ہمارے پاس پناہ لینے آئے ہیں، چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔'' سید ظہیر الدین نے صاف انکار کر دیا۔

''آپ ایک بندوق سے کیا کرلیں گے ابا جان!'' مامون از حد پریشان تھے۔

''نہیں۔ ہمارے پاس کچھ اور بندوقیں بھی ہیں۔ حویلی پر حملے کی صورت میں ہم مقابلہ کریں گے۔ آپ کے ٹرک میں خاندان کی خواتین اور بچوں کے علاوہ جتنے مزید خاندان آسکتے ہیں' انہیں لے جائیں۔'' سید ظہیر الدین کا لہجہ حتمی تھا۔

''ابا جان صحیح کہہ رہے ہیں مامون! جو لوگ جاسکتے ہیں، انہیں لے جاؤ۔ خاص طور پر خواتین کو۔ ہم یہاں ہیں...... اور انہیں بے یارو مددگار چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔ گاؤں کے تقریباً سب مسلمان خاندان ادھر جمع ہیں...... مردانے میں، احاطے میں، ملازموں کے ہاں...... اگر ہو سکے تو دہلی جا کر ہمارے لیے مدد بھجوادینا۔ یوں مجھ سے ایک دوست نے بھی وعدہ کیا ہے کہ وہ حویلی کی حفاظت کے لیے تھانے سے سپاہی بھجوادے گا۔''

اور مامون کے پاس ہارون الرشید کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی وہ سب کو لے کر نکل گئے تھے۔ ابا جان اور ہارون سے

گلتے ملتے ہوئے دل جیسے بار بار ڈوبتا تھا۔

''دہلی جا کر کوشش کروں گا کہ جہاز یا ٹرین کا ٹکٹ مل جائے تو بھابھی جان اور بچوں کو لاہور بھجوا کر چچا جان کو ٹیلی گرام بھجوادوں گا۔ رفیق بھائی کو بھی اطلاع کردوں گا۔ باقی لوگوں کو کیمپ چھوڑ کر میں زیب آپا کی طرف جاؤں گا۔ وہاں پتا نہیں حالات کیسے ہیں۔ وہاں کلکتہ میں تو کافی پہلے سے فسادات ہو رہے ہیں۔''

ہارون کو بتا کر وہ خاموشی سے نکل آئے۔ راستے میں دو تین جگہ انہوں نے کرپانیں اٹھائے سکھوں کے جتھے دیکھے لیکن ٹرک میں بندوقیں اٹھائے کھڑے بلوچ رجمنٹ کے جوانوں کو دیکھ کر کسی نے کچھ نہ کہا۔ وہ بحفاظت دہلی پہنچ گئے تھے۔ جہاز کے ٹکٹ تو نہ مل سکے البتہ ٹرین کے ٹکٹ مل گئے تھے۔ وہ بھی گیارہ اگست کے اکانومی کلاس کے۔ دہلی پہنچ کر ہی انہیں پتا چلا تھا کہ اماں جان ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ ایک رشتہ دار خاتون نے بتایا کہ وہ ٹرک میں سوار ہی نہیں ہوئی تھیں بلکہ کچھ دیر پہلے ہی یہ کہہ کر چلی گئی تھیں کہ ابھی وہ نہیں جاسکتیں۔

گیارہ اگست کی صبح سب کو ٹرین میں سوار کرا کے وہ فوراً ہی زیب کی طرف چلے گئے کہ بیمار خاوند اور دو چھوٹے بچوں کے ساتھ وہ از خد پریشان ہوں گی۔ انہیں اپنے سے تین سال بڑی اس بہن سے بے پناہ محبت تھی۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ وہ لوگ چند دن پہلے شادی میں شرکت کے لیے کسی عزیز کے ہاں امرتسر چلے گئے ہیں۔ وہ مطمئن ہو گئے کہ زیب کے میاں اور سسر سمجھ دار آدمی ہیں۔ ضرورت محسوس ہوئی تو وہاں سے نکل جائیں گے۔ زیب النساء کے کچھ سسرالی عزیز لاہور میں بھی تھے۔ ادھر سے اطمینان ہوا تو وہ ایک بار پھر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ کوئی چھٹی حس تھی کہ وہ اس بار پنجاب اور بلوچ رجمنٹ کے چھ سات جوانوں کے ساتھ ٹرک لے کر گئے تھے۔ یہ لوگ یوں بھی ادھر سے فسادات کا شکار ہونے والے لوگوں کو لا رہے تھے لیکن تیرہ اگست کو جب وہاں پہنچے تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ حویلی کا آدھا گیٹ جلا ہوا تھا۔ رضا کار احاطے سے لاشیں اٹھا اٹھا کر باہر کھڑے ٹرک میں رکھ رہے تھے۔ حویلی کے باہر وہ کچھ دیر ساکت کھڑے رہے تب صوبیدار احمد خان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ہم نے دیر کردی ہے سر!''

انہوں نے چونک کر صوبیدار احمد خان کی طرف دیکھا اور بنا کچھ کہے حویلی کے ٹوٹے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔ وہاں ابھی بھی کچھ لاشیں پڑی تھیں۔

''چھوٹے سرکار!'' دینو جانے کہاں سے نکل کر ان کے سامنے آیا تھا اور انہیں دیکھتے ہی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔

''دینو چاچا......'' ان کی آواز گھٹ گئی تھی۔

''سب ختم ہو گیا سرکار! مجھے تو سرکار نے آپ کی طرف علی گڑھ بھیجا تھا۔ جب وہاں آپ نہیں ملے تو میں پھر آپ کے لیے پیغام چھوڑ کر واپس آیا۔ آپ کچھ دیر پہلے ہی سب کو لے کر جا چکے تھے۔ سرکار چھت پر تھے۔ میں انہیں آپ کا بتانے چھت پر گیا تھا۔ سرکار چھت پر گھوم پھر کر اطراف کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے آپ کا بتایا کہ آپ نہیں ملے تو انہوں نے بتایا کہ آپ خواتین کو لے کر چلے گئے ہیں۔ دعا کرو سب خیریت سے پہنچ جائیں۔ بائیں طرف دھرمیندر کے گھروں کی چھت پر ہلچل سی محسوس ہوئی تو میں ادھر جا کر دیکھنے لگا۔ تب ہی بیگم صاحبہ اوپر آئیں تو سرکار حیران رہ گئے۔

''آپ مامون کے ساتھ نہیں گئیں۔''

''نہیں، عمر بھر آپ کا ساتھ نباہنے کا عہد کیا تھا۔ تو اب کیسے آپ کو چھوڑ کر چلے جاتے۔''

ابھی ان کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ جانے کہاں سے گولی آئی جو سیدھی بیگم صاحبہ کو لگی اور......''

دینو پھر رونے لگا۔

''تو کیا اماں جان......'' مامون کے لبوں سے بمشکل نکلا۔

"جی......" دینو کا سر جھک گیا۔ "صبح صبح جنازہ ہوا۔ سرکار نے تھانے میں بھی اطلاع بھجوادی تھی۔ تھانے کچھ سپاہی حویلی کی حفاظت کے لیے آگئے تھے۔ سردار اجیت سنگھ اور کچھ دوسرے ہندو سرکار کے پاس تعزیت کے لیے بھی آئے تھے بلکہ سردار اجیت نے تو یہ بھی کہا کہ عورتوں کو حفاظت کے خیال سے ان کے گھر بھجوادیں لیکن سرکار نے انکار کردیا۔ دو دن تو سب ٹھیک رہا لیکن پھر کل رات انہوں نے حملہ کردیا۔ میں اصطبل کی چھت پر تھا۔ میں نے دیکھا گیٹ پر پہرا دیتے سپاہی بھی حملہ آوروں میں شامل ہوگئے تھے۔ میں وہاں ہی اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے چھپا رہا۔ اس طرف کوئی نہیں آیا اور......" وہ پھر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

"بڑے سرکار اور ہارون صاحب نے آخری دم تک مقابلہ کیا لیکن پھر......"

ماموں کو لگا جیسے ان کا دل پھٹ جائے گا۔ ضبط گریہ کی کوشش میں ان کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

"ابا جان اور بھائی جان ......کیا وہ......"

"نہیں سرکار! وہ تو اللہ رکھا اور میں نے صبح صبح ہی اندرونی صحن میں گڑھا کھود کر دفنادیا تھا تاکہ وہ لوگ لاشوں کی بے حرمتی نہ کریں۔ اللہ رکھا اصطبل میں تھا، چارے کے ڈھیر کے پیچھے چھپا رہا۔ آج دن میں ہم اندر ہی چھپے رہے۔ ان لوگوں نے اچھی طرح سے حویلی کو لوٹا، آگ لگائی...... زیادہ تر لوگ تو مارے گئے تھے، جو بچ گئے تھے اور ادھر اُدھر چھپ گئے تھے، انہیں بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر مارا۔ ابھی رضا کار آئے ہیں تو ہم باہر نکلے ہیں۔"

دینو سے تفصیل سن کر وہ بھاری دل کے ساتھ اندر صحن میں آئے تھے۔ کچھ دیر وہاں ہی کھڑے دل ہی دل میں سید ظہیر الدین اور ہارون الرشید سے باتیں کرتے رہے۔ فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کتنی ہی دیر اٹھائے رکھے۔ احمد خان جو ان کے ساتھ ہی تھا، اس نے پھر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"زیادہ دیر یہاں رکنا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں اب چلنا چاہیے۔ آگے سونا نگر سے بھی ہیڈ کوارٹر میں فساد کی خبریں آئی تھیں، وہاں چل کر دیکھتے ہیں شاید کسی کو ہماری ضرورت ہو۔"

وہ حویلی پر ایک الوداعی نظر ڈال کر اللہ رکھا اور دینو کو لے کر نکل آئے۔ باہر آئے تو ٹرک کو دیکھ کر ادھر اُدھر چھپے ہوئے کچھ لوگ ٹرک کے پاس اکٹھے ہوگئے۔ یہ ان کی زمینوں پر کام کرنے والے مسلمان کسان تھے۔ سب انہیں دیکھ کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سب ہی زخم خوردہ تھے۔ سب نے اپنوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے دیکھا تھا۔

انہیں تسلی دے کر ٹرک میں بیٹھنے کا کہہ کر زخمی اور روتے دل کے ساتھ وہ اس گاؤں سے نکل آئے تھے۔ جہاں انہوں نے زندگی کے بہت سارے خوش گوار سال گزارے تھے۔

☆☆☆

"کیسی فضول باتیں کررہے ہو عبدالستار۔" خیر دین نے عبدالستار کی طرف دیکھا۔

"کیوں ابا جی! اس میں فضول بات کیا ہے۔ سیٹھ معراج کا بزنس کی دنیا میں ایک بڑا نام ہے۔ ایک کپڑے کی مل ہے اور اب ٹیکس فری زون میں ایک اور مل لگا رہا ہے۔ جس میں اسے ایک پارٹنر چاہیے۔ کئی بزنس مین خواہش مند ہیں اور سیٹھ معراج کے ساتھ پارٹنر شپ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایسے میں سیٹھ صاحب نے مجھ سے مہرین کے رشتے کی بات کی ہے۔ اگر ہم مہرین کا رشتہ ان کے بیٹے کو دے دیتے ہیں تو میری پارٹنر شپ پکی ہے۔" عبدالستار بات کرتے ہوئے پرجوش ہوگیا۔

"اچھا، تیری پارٹنر شپ کے لیے ہم اس نائی کی اولاد کو اپنی مہرین کا رشتہ دے دیں۔ واہ بھئی واہ۔" خیر دین نے تالی بجائی۔

"ابا جی......" عبدالستار نے احتجاج کیا۔

"سیٹھ صاحب ایک معزز شخص ہیں۔ خاندانی آدمی ہیں۔"

"اوئے۔ مجھے نہ بتا اس کا خاندان۔ ساری عمر

اس کے باپ دادا جالندھر میں ٹاہلی کے نیچے کرسی پر میز رکھ کر لوگوں کی حجامتیں بناتے رہے ہیں۔ بیسیوں بار تو میں اپنے کام سے جالندھر گیا ہوں اور اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور تم مجھے اس کا حسب نسب بتانے چلے ہو۔" خیر دین نے غصے سے حقے کی نے ایک طرف کی اور کھڑا ہوگیا۔

"میں نے نہیں دینا اپنی بیٹی کا رشتہ اس تیرے سیٹھ معراج الدین کے بیٹے کو۔"

"اوہ ابا جی...... کہاں چلے آپ...... بیٹھ کر آرام سے میری بات سنیں۔"

عبدالستار نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پایا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر خیر دین غصے سے باہر نکل گیا تو پھر جلدی بات کرنے کا موقع نہیں ملے گا اور وہ آج ہی خیر دین سے بات کرنا چاہتا تھا۔

"سیٹھ صاحب کا بیٹا کوئی جاہل، ان پڑھ نہیں ہے۔ اسی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے جس میں اپنی مہرین پڑھتی ہے۔ شاید اسی کے کہنے پر......"

"لو عبدالستار! اب مہرین کے ساتھ سینکڑوں لڑکے پڑھتے ہیں۔ اب جو رشتہ مانگے گا اسے مہرین کا رشتہ دے دوں گا۔ اصلی اور کھرا سید دیکھوں گا۔" خیر دین نے اسے گھورا۔

"اصلی اور کھرے سید کیا بازاروں میں مل رہے ہیں، جو آپ خرید کر لے آئیں گے۔ پہلے آپ نے زرینہ کو انکار کیا اور پھر اب...... کیا ساری زندگی گھر میں بٹھائے رکھیں گے۔" عبدالستار کا موڈ بھی خراب ہوا۔

"یہ تیرا سردرد نہیں ہے عبدالستار! تو جا، دو جمع دو کر۔"

"کیوں...... ان کا سردرد کیوں نہیں ہے۔ اولاد ہے ان کی۔" سعادت جانے اسی وقت وہاں آئی تھی یا باہر کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ "آپ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ اتنا اچھا رشتہ ٹھکرانے کی کوئی تک نہیں ہے۔"

"تم چپ کرو سعادت پروین! ہزار دفعہ کہا ہے ہم باپ بیٹے کی گفتگو میں دخل نہ دیا کرو۔" خیر دین نے سعادت کی طرف دیکھا۔

"کیوں دخل نہ دوں ابا جی! یہ ہماری بیٹی کا مسئلہ ہے۔" وہ دروازے کے نزدیک پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"دخل دو...... بے شک دخل دو لیکن میں نہیں دینے والا مہرین کا رشتہ کسی ایرے غیرے کو۔ کان کھول کر سن لو تم دونوں۔" خیر دین نے تنبیہ کے انداز میں شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی۔ "بہتر ہے عبدالستار کہ تم خود ساری اسٹوری اسے سمجھا دینا ورنہ......"

"تو کیا اس جوتیاں گانٹھنے والے کو دیں گے اپنی سیدزادی بیٹی کا رشتہ۔" سعادت نے چیخ کر کہا۔

"کون جوتیاں گانٹھنے والا؟" عبدالستار نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ اس معاملے سے بے خبر تھا۔

"ہے ایک لڑکا۔ یونیورسٹی میں اپنی مہرو کے ساتھ ہی پڑھتا ہے اور مہرین بیگم اس سے شادی کا فیصلہ کیے بیٹھی ہیں۔ آپ کے ابا جی نے اپنی دلاری کو تسلی دی ہے کہ وہ امتحان سے فارغ ہوجائے تو پھر یہ لڑکے سے ملیں گے۔ لڑکا اچھا لگا تو ہاں کردیں گے اور ان کی لاڈلی تب سے ہواؤں میں اڑتی پھر رہی ہے کہ اچھا نہ لگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ نے اچھی شکل وصورت دی ہے تو...... میں نے پوچھا والد کیا کرتے ہیں جواب دیا وہ جفت ساز ہیں۔" سعادت نے بہت اطمینان سے مسکرا مسکرا کر خیر دین کی طرف دیکھتے ہوئے تفصیل بتائی جو دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہا تھا۔

"یہ تیری بیوی کی چھپ چھپ کر باتیں سننے کی عادت ابھی تک گئی نہیں۔ میں نے تو مہرین سے وہ سب اس لیے کہا تھا کہ وہ پرسکون ہو کر امتحان دے دے۔ پریشان رہے گی تو دو سال کی محنت اکارت جائے گی۔ بعد میں سنبھال لوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ میری بات نہیں ٹالے گی۔ ایک دو خاندان ہیں میری نظر میں...... مہرین پڑھائی مکمل کرلے تو بات چلاؤں

گا۔" اب خیر دین نے نرمی سے بات کی۔

"آپ کے پاس کیا ثبوت ہے ابا جی کہ وہ لوگ اصلی اور کھرے سید ہیں...... کیا خبر وہ بھی......"

"ہر ایک کو سیٹھ معراج کی اور اپنی طرح مت سمجھ۔ میں نے ساری تحقیق کر لی ہے۔"

عبدالستار نے گھبرا کر سعادت کی طرف دیکھا لیکن وہ دل کی بھڑاس نکال کر اب مطمئن سی کسی سوچ میں گم بیٹھی تھی۔ ایک اطمینان بھرا سانس لے کر اس نے خیر دین کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"تم اپنے دل سے یہ خناس نکال دو عبدالستار کہ میں کبھی مہرین کا رشتہ دوں گا تمہارے اس سیٹھ کو۔"

سعادت ایک ناراض نظر ان پر ڈالتی کمرے سے نکل گئی۔

"ابا جی پلیز، اس پر غور کریں۔ سیٹھ صاحب کے ساتھ پارٹنر شپ......"

"بھاڑ میں جائے تمہاری پارٹنر شپ۔" خیر دین کو اب سخت تپ چڑھی تھی۔

"لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں مہرین کا رشتہ سیٹھ معراج کے بیٹے کو ہی دوں گا۔" عبدالستار کو بھی غصہ آ گیا تھا۔

"چل چپ کر موچی کی اولاد...... جا کر بتا دے اپنے سیٹھ معراج کو کہ میرا باپ اس کے بیٹے کو رشتہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے اور خبردار...... اب مزید کوئی بات کی تو۔" اس نے تنبیہ کی۔ "تیرا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دوں گا۔ تیرے سارے سنگی بیلیوں کو پتا چل جائے گی تیری اوقات...... موچی کا پتر نہ ہو۔"

عبدالستار یک دم کھڑا ہو گیا۔ خیر دین سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ ہر ایک کو الف سے ے تک ساری داستان سنا دے۔ وہ ایک نظر خیر دین پر ڈالتا بنا کچھ کہے تیزی سے باہر نکل گیا۔ خیر دین نے حقے کی نے اپنی طرف کی اور دھیمے دھیمے گنگنانے لگا۔

نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نئیں پایا
کِکر تے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا

☆☆☆

کلثوم فاطمہ برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی قرآن پڑھ رہی تھیں۔ برآمدے میں ہی بائیں طرف چولہے کے پاس افشاں بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں۔ قرآن پڑھ کر اسے جزدان میں لپیٹ کر انہوں نے افشاں کو آواز دی۔

"افشاں بیٹا! یہ قرآن طاق میں رکھ دیں۔"

افشاں نے گوندھا ہوا آٹا ڈھک کر رکھا اور صافی سے ہاتھ پونچھ کر ان سے قرآن مجید لے کر کچھ اونچائی پر بنے طاق میں رکھا۔

"آپ ادھر ہی بیٹھیں گی یا کمرے میں لے چلوں۔" اس نے پوچھا تو انہوں نے تخت پر پڑے گول تکیے کو دیوار کے ساتھ رکھا اور ٹیک لگائی۔

"اندر تو اس وقت گھٹن سی ہو رہی تھی، اس لیے باہر آئی تھی۔ یہاں ہی بیٹھوں گی۔"

صحن میں ہلکی دھوپ تھی اور ہوا بھی چل رہی تھی۔

"افشاں بیٹی محی الدین کو میرے چشمے کا یاد دلایا تھا صبح۔"

"جی اماں جان! کہہ رہے تھے نماز پڑھ کر لیتا آؤں گا۔"

تب ہی دروازے پر دستک دے کر محی الدین اندر آئے۔ کلثوم فاطمہ کو سلام کر کے نماز کی ٹوپی اتار کر تخت پر رکھی اور خود بھی وہاں ہی بیٹھ گئے۔

"یہ شجاع کہاں ہیں؟ آج نماز کے لیے مسجد میں نہیں آئے۔"

"ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ گھر میں ہی نماز پڑھ لی تھی۔" افشاں نے جواب دیا۔ "اب اندر کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں۔"

محی الدین نے سر ہلایا۔ ان کی عادت تھی کہ ظہر کی نماز مسجد میں پڑھ کر گھر آ جاتے۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام کرنے کے بعد دوبارہ دکان کھولتے تھے۔ لیکن آج کلثوم فاطمہ کو چشمہ جیب سے نکال کر دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ہمیں خیال ہی نہیں رہا، ظہر کے بعد مدنی صاحب نے دکان پر آنا تھا اپنا آرڈر لینے۔ ہم بس ان کو جوتے دے کر آتے ہیں۔ آپ اتنے میں روٹیاں بنا لیں۔" افشاں سے کہہ کر انہوں نے کلثوم فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "اماں جان چشمہ ٹھیک ہے، صاف نظر آ رہا ہے۔"

"بہت صاف۔ پرانے چشمے سے تو اب صاف نظر نہیں آتا تھا۔"

اور وہ مطمئن سے ہو کر باہر نکل گئے۔ تب ہی کمرے کا دروازہ کھول کر شجاع باہر آیا اور کلثوم کے پاس ہی تخت پر آ کر بیٹھ گیا۔

"ابھی کیا ابا جان نہیں آئے تھے اور پھر فوراً ہی چلے کیوں گئے۔"

"کوئی مدنی صاحب ہیں، بڑے بازار میں جوتوں کی دکان ہے ان کی۔ انہوں نے کچھ جوتوں کا آرڈر دے رکھا تھا اور ظہر کے بعد لینے آنا تھا۔ وہی دینے گئے ہیں۔"

کلثوم فاطمہ نے شجاع کی طرف دیکھا۔ سرخ آنکھیں رتجگوں کی گواہ تھیں۔ ستا ہوا چہرہ اور آنکھوں سے جھلکتی اداسی۔ شجاع ایسا تو نہ تھا۔ چھٹیوں میں گھر آتا تو گھر میں آپوں آپ ایک رونق سی ہو جاتی تھی لیکن اس بار تو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ وہ گھر آ گیا ہے۔

محی الدین نے صبح ہی تو کہا تھا کہ انہیں شجاع کچھ پریشان لگتا ہے۔ جانے کیا بات ہے۔ صحیح ہی تو کہہ رہے تھے وہ کتنا پریشان لگ رہا ہے۔

"دادی جان! یہ ابا جانے جوتے بنانے کا ہی کام کیوں کیا۔ کچھ اور کام بھی تو کر سکتے تھے نا مثلاً دکان میں کوئی چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں رکھ لیتے۔"

کلثوم فاطمہ نے چونک کر شجاع کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے تو شجاع نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔

"کیا آپ کو اپنے ابا جان کے کام پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔"

"نہیں...... بخدا نہیں۔" شجاع نے جیسے تڑپ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"ہم نے بس یوں ہی...... یوں ہی پوچھ لیا دادی جان۔"

"دراصل رحمت بھائی نے ہی ہنر سکھایا تھا انہیں اور آپ کے بابا جان کو بس جو آتا تھا اسی سے رزق حلال کمایا۔"

شجاع شرمندہ سا ہو گیا۔ پتا نہیں دادی جان نے ان کی بات سے کیا نتیجہ اخذ کیا ہو گا ورنہ انہوں نے آج تک کبھی یہ بتاتے ہوئے جھجک محسوس نہیں کی تھی کہ ان کے ابا جان جفت ساز ہیں۔ اسے یاد تھا آٹھویں جماعت میں جب ان کے اردو کے نئے ٹیچر نے ان سے پوچھا تھا کہ والد کیا کرتے ہیں تو انہوں نے بغیر جھجکے بتایا تھا۔ میرے ابا جان جوتے بناتے ہیں۔ دبی دبی ہنسی کی آوازیں آئی تھیں لیکن ٹیچر نے سب کو ڈانٹ دیا تھا۔

"اچھا آپ کے والد جفت ساز ہیں۔ بہت خوب۔ ایسے لوگ جو کوئی ہنر جانتے ہوں، بہت با کمال ہوتے ہیں۔" اور طلباء کی دبی دبی ہنسی سے لمحہ بھر کے لیے جو خفت انہیں محسوس ہوئی تھی وہ ختم ہو گئی تھی۔

"ہم تو خود اس بات کے قائل ہیں بھئی کہ......
کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی"

اور شجاع نے اس روز اپنے ابا جان پر بڑا فخر محسوس کیا تھا اور ہمیشہ یہ فخر قائم رہا تھا۔ لیکن اس سمے پارکنگ میں اپنی گاڑی کے باہر کھڑی مہرین کی والدہ کی آنکھوں سے جھانکتی حقارت اور تمسخر وہ بھلا نہیں پا رہا تھا۔ کلثوم فاطمہ گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"کیا سوچ رہے ہیں؟"

"ہاں...... کچھ نہیں۔" شجاع چونکا۔

"یہ رحمت دادا کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ تھا۔" شجاع آج وہ سب جان لینا چاہتا تھا جو نہیں جانتا تھا۔ کئی بار اس نے ادھر اُدھر سے سنا تھا کہ دادی جان

رحمت موچی کی منہ بولی بہن ہیں۔

''انسانیت کا...... خلوص اور محبت کا۔'' انہوں نے ایک گہری سانس لی۔

''انہوں نے ہمیں اس وقت پناہ دی تھی جب ہمارے سر پر نہ چھت تھی، نہ پاؤں کے نیچے زمین۔''

کلثوم کو بڑے دنوں بعد وہ رات یاد آئی جب مامون الرشید انہیں اور خاندان کے اور برادری کے سارے لوگوں کو ٹرک میں بٹھا کر دہلی لائے تھے۔ تب ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ پھر کبھی وہ اپنی حویلی کو نہ دیکھ سکیں گی۔ حیات ماموں، ممانی، ان کے بچے بھی جو اپنے علاقے میں فسادات کے بعد حویلی آگئے تھے، ان کے ساتھ ہی حویلی سے نکلے تھے۔ وہ، ان کے دونوں بچے، افشاں، مامون اور درخشاں کی بیٹی، افشاں کی آیا اور بوا شاہجہان بھی حویلی سے ان کے ساتھ ہی آئے تھے۔ حمیدہ بیگم واپس چلی گئی تھیں اور باقی دور پار کے عزیز یا جاننے والے تھے۔ مامون ان سب کو ایک دوست کے گھر چھوڑ کر باقی لوگوں کو کیمپ پہنچا کر آئے تو بہت پریشان تھے کہ بہت کوشش کے باوجود جہاز کے ٹکٹ نہیں مل رہے تھے۔ ایک روز مزید کوشش کے بعد انہوں نے حیات ماموں کے مشورے سے ٹرین کے ٹکٹ ہی لے لیے تھے۔ وہ بھی آسانی سے نہیں ملے تھے۔ ٹرین میں بٹھانے کے بعد انہوں نے تسلی دی تھی۔

''ہم نے رفیق بھائی کو ٹیلی گرام دے دیا ہے۔ وہ اسٹیشن پر لینے آجائیں گے اور آپ کو درخشاں اور چچا جان کے پاس پہنچادیں گے۔ آپ سب پریشان مت ہوں، ان شاء اللہ جلد ہی۔ ہم سب بھی آپ کے پاس ہوں گے۔ آپ کے حیات ماموں جان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے بہت تسلی ہے۔ ہم نے انہیں سب سمجھا دیا ہے کہ اگر کسی وجہ سے رفیق بھائی نہ آسکیں تو انہیں کہاں جانا ہے۔ آج کل ڈاک کے سسٹم میں بھی گڑبڑ ہے تو ہوسکتا ہے۔ رفیق بھائی کو بروقت ٹیلی گرام نہ مل سکے۔''

مامون انہیں خدا حافظ کہہ کر نیچے اترے تو ان کا دل ڈوب سا ہوگیا تھا۔ ان کا جی چاہا تھا وہ مامون کو روک لیں، ان سے کہیں کہ ہم نے کہیں نہیں جانا۔ وہ اکلوتی تھیں۔ بیاہ کر سسرال آئیں تو مامون الرشید نے انہیں بڑی بہنوں کا سا مان دیا تو انہیں بھی مامون سگے بھائی کی طرح عزیز ہوگئے تھے۔ برسوں پرانی بھائی کی خواہش پوری ہوگئی تھی۔

''مامون......'' بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔ مامون مڑ کر انہیں دیکھنے لگے تھے۔ ''اپنا خیال رکھیے گا، اللہ آپ کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''

''آپ کو بھی اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔''

مامون ٹرین کی روانگی تک وہاں ہی کھڑے حیات ماموں سے باتیں کرتے رہے۔ حیات ماموں اپنے علاقے میں بربریت کی جو داستانیں دیکھ کر آئے تھے اس کی وجہ سے بے حد پریشان تھے۔ لیکن ماموں نے انہیں تسلی دی تھی۔ کاش انہیں علم ہوتا کہ یہ عزیز اور پیارا چہرہ پھر کبھی نظر نہیں آئے گا تو وہ کبھی انہیں چھوڑ کر نہ آتیں۔ کہیں دل میں چھپالیتیں، کچھ کرلیتیں...... لیکن ٹرین روانہ ہوگئی۔ مامون کچھ دور تک ڈبے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور جب ٹرین نے رفتار پکڑی تو وہ پیچھے رہ گئے تھے۔ فرسٹ کلاس کے ڈبوں میں ایک دو فوجی بھی تھے۔ کھڑکیوں پر لکڑی کے تختے لگا کر بند کردیا گیا تھا اور مامون نے انہیں تاکید کی تھی کہ نہ تو وہ راستے میں کسی اسٹیشن پر اتریں نہ ہی کھڑکیاں کھول کر باہر جھانکیں۔ جب ٹرین آہستہ ہوتی تو دونوں فوجی اپنی بندوقیں اٹھا کر دروازے پر کھڑے ہوجاتے تھے۔ انہوں نے کھلے دروازے اور کھڑکیوں کی جھری سے دیکھا تھا۔ دونوں اطراف سکھ کرپانیں اٹھائے ٹہلتے نظر آتے تھے۔ وہ سارے راستے دعائیں مانگتی آئی تھیں۔ روزے کے باوجود سب کی بھوک پیاس اڑ گئی تھی۔ پانی اور کھجور سے روزہ افطار کرکے سب لیٹ گئے تھے۔ بچے اوپر کی برتھوں پر تھے۔ افشاں آیا کی گود میں تھی، خود وہ محی الدین کا سر گود میں رکھے، سیٹ سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ شاہجہاں بوا بھی

پاس ہی بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ شہاب حیات ماموں کے ساتھ اوپر برتھ پر تھے۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اچانک ٹرین رک گئی تھی۔ کوئی ویرانہ ہی تھا۔

''یا اللہ خیر!'' وہ سیدھی ہوکر بیٹھ گئی تھیں۔

''ٹرین پر حملہ ہوگیا۔''

کسی کی آواز کانوں میں پڑی تھی۔ ساتھ ہی چیخ و پکار...... ست سری اکال اور بندے ماترم کے نعرے کانوں میں آنے لگے۔ ساتھ ہی کوئی ان کے ڈبے کا دروازہ توڑنے لگا۔

''دروازہ مت کھولنا...... دروازہ مت کھولنا......''

یہ حیات ماموں کی آواز تھی۔ پھر نہ جانے دروازہ اندر سے کسی نے کھولا تھا یا ٹوٹ گیا تھا کہ حملہ آوروں کا جتھا شور کرتا اندر گھس آیا تھا۔ وہ یک دم منہ کے بل نیچے گری تھیں اور شاہجہاں بوا ان کے اوپر گرگئی تھیں۔ وہ شاہجہاں بوا کے نیچے چھپ گئی تھیں۔

''آواز نہ نکالنا...... چپ......'' شاہجہاں بوا نے سرگوشی کی تھی۔ وہ جو محی الدین اور شہاب الدین کو آواز دینے لگی تھیں۔ ان کی آواز گھٹ گئی تھی۔ سامان گھسیٹنے، گالیاں دینے اور نعروں کی آوازیں ان کے کانوں میں آتے آتے معدوم ہوگئی تھیں شاید وہ بے ہوش ہوگئی تھیں۔ دوبارہ جب ان کی آنکھ کھلی تو انہیں لگا جیسے ٹرین رینگ رہی ہو۔ ان کا دم گھٹ رہا تھا اور وہ بھاری بوجھ تلے دبی ہوئی تھیں۔ بمشکل انہوں نے پوری طاقت صرف کرکے خود کو اس بوجھ سے نجات دلائی۔ ڈبے میں ملگجی سی روشنی تھی۔ خون کی بو تھی۔ وہ یک دم اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ محی الدین...... شہاب الدین...... آس پاس لاشیں تھیں اور وہ بیٹوں کو پکارتے ہوئی رو رہی تھیں۔ تب ہی کسی نے ان کے اوپر ہاتھ رکھا۔

''اماں......'' یہ محی الدین تھے۔

''ہماری جان...... ہماری زندگی......'' انہوں نے محی الدین کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔

کچھ دیر بعد ان کے حواس بحال ہوئے تو انہوں نے محی الدین کو سیٹ پر بٹھا دیا اور خود کھڑے ہوتے ہوئے شہاب الدین کو آوازیں دینے لگیں۔ یک دم ان کے کانوں میں کسی بچے کے رونے کی آواز آئی تو انہوں نے دیکھا یہ افشاں تھی۔ اس کی آیا کا بازو ابھی تک اس کے اوپر تھا لیکن آیا زندگی ہار چکی تھی۔ انہوں نے لپک کر افشاں کو اٹھا لیا...... حیات ماموں، ممانی، بچے، شاہجہاں بوا...... سب کے سب خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہوں نے کتنے ہی بچوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن شہاب...... شہاب الدین کہیں نہیں تھا۔

صبح صادق کے وقت ان کی ٹرین لاہور ریلوے اسٹیشن پر آکر رکی تھی۔ وہ محی الدین کا ہاتھ پکڑے اور افشاں کو گود میں اٹھائے نیچے اتری تھیں۔ اسٹیشن پر واویلا مچا تھا۔ شور، ہنگامہ، چیخ و پکار...... لوگ اپنے پیاروں کو ڈھونڈ رہے تھے۔ پکار رہے تھے۔ وہ دیوانوں کی طرح شہاب الدین کو آوازیں دے رہی تھیں تب کسی نے اس کا بازو پکڑا۔

''بیٹی...... تمہارا بچہ اگر زندہ ہوتا تو بول پڑتا...... میں نے خود تمہارے بچے کو اوپر والی برتھ سے نیچے گرتے دیکھا تھا۔''

یہ کبریٰ خاتون تھیں۔ اسی ڈبے میں موجود تھیں اور ان کی طرح وہ بھی بچ گئی تھیں۔ انہوں نے حیات ماموں اور ممانی کے چہروں پر آخری نظر ڈالی اور کبریٰ خاتون کی طرف دیکھا۔

''میرے بچے کی......''

''ہم لاشیں لے کر کیا کریں گے۔ میں بھی اپنے تین جگر گوشوں کو چھوڑ کر جارہی ہوں۔ یہ لوگ کفن دفن کردیں گے۔''

کبریٰ خاتون کی عمر پچاس کے قریب ہوگی لیکن اس وقت وہ انہیں حقیقت پسند سے زیادہ ظالم لگی تھیں۔ ان کی نظریں ادھر اُدھر بکھری لاشوں میں شہاب الدین کو ڈھونڈ رہی تھیں کہ رضا کاروں کا ایک گروپ ڈبے میں داخل ہوا۔

''اوہ یہ ڈبا بھی......'' ایک آواز آئی پھر کسی نے

صدا لگائی۔
"کوئی زندہ یا زخمی ہے تو پہلے اسے باہر نکالیں...... لاشیں بعد میں۔"
کبریٰ خاتون نے ان کا ہاتھ پکڑا۔
"لیکن ہمارا بیگ...... سامان......" انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ "کافی زیور اور روپیہ تھا ان کے پاس۔"
"آؤ بیٹی...... آجاؤ۔ بیگ اور سامان سب لے گئے وہ۔"
افشاں کو کندھے سے لگائے محی الدین کی انگلی پکڑے وہ ڈبے سے اتریں تو انہیں یاد آیا کہ مامون نے رفیق بھائی کو ٹیلی گرام دے دیا تھا۔ وہ ضرور لینے آئے ہوں گے اور کبریٰ خاتون کو ساتھ لیے وہ اسٹیشن پر ادھر سے اُدھر رفیق بھائی کو کھوجتی پھریں لیکن وہ نہیں نہ تھے۔ وہ مل جاتے تو شاید شہاب الدین...... رفیق بھائی دو تین بار حویلی آئے تھے تو وہ انہیں پہچانتی تھیں۔
"گھر کا پتا وغیرہ ہے تو یہاں کسی سے بات کرتے ہیں۔ وہ تمہیں پہنچا دے گا۔" کبریٰ خاتون نے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تب ہی ایک لڑکے نے آکر پوچھا۔
"ہجرت کر کے آئے ہیں...... کوئی ٹھکانا نہیں تو ہے تو چلیں کیمپ پہنچا دوں۔"
تب کبریٰ نے ہی سے بتایا کہ انہیں کسی نے لینے آنا تھا لیکن نظر نہیں آ رہے۔
"نام بتائیں، میں اعلان کروا دیتا ہوں۔"
انہوں نے نام بتایا۔ کتنی ہی دیر تک اعلان ہوتا رہا کہ اگر رفیق احمد ہیں تو اپنے عزیزوں کے پاس آجائیں لیکن کوئی نہیں آیا۔ تب کبریٰ خاتون کے ساتھ ان کے کہنے پر وہ کیمپ میں آگئیں۔
یہ 12 اگست 1947ء کی خونچکاں صبح تھی۔ کیمپ میں آکر وہ دھاڑیں مار مار کر روئیں تو کبریٰ خاتون نے ہی انہیں تسلی دی۔ انہیں ان پر رشک آیا تھا جو اٹھارہ سترہ اور تیرہ سال کے جوان بچوں کی لاشیں چھوڑ کر آئی تھیں اور حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ انہیں حوصلہ دے کر، کسی سے کہہ سن کر بھوک سے نڈھال افشاں کے لیے کہیں سے دودھ اور محی الدین کے لیے بسکٹ کا ایک پیکٹ لے آئی تھیں۔ کبریٰ خاتون جنہیں وہ خالہ کہنے لگی تھیں، انہوں نے خود بخود ہی ان کی ذمہ داری لے لی تھی۔ کمبل، بستر، کھانا بھاگ دوڑ کر لے آئی تھیں۔ دن بھر سامان کی گاڑیاں کھانے کی دیگیں آتی رہتی تھیں۔
کبریٰ خالہ کے خاندان کے کچھ افراد تو اپنے گاؤں میں ہی مارے گئے تھے اور کچھ اب ٹرین میں۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سنا دی تھی۔ کبریٰ خالہ ہی کیمپ سے باہر نکلتیں، ادھر اُدھر سب سے رفیق بھائی اور مامون الرشید، ہارون سب کے متعلق پوچھتی رہتیں کہ شاید کوئی انہیں ڈھونڈتا ہوا آیا ہو۔ کیمپ میں ہی انہوں نے 14 اگست کو پاکستان کے قیام کا اعلان سنا تھا اور سجدہ شکر بجا لائی تھیں اور دعا مانگی تھی کہ ان کے بچھڑے مل جائیں اور جو آزادی کی راہ میں قربان ہوئے ان کی قربانیاں رائگاں نہ جائیں۔
انہیں کیمپ میں رہتے پچیس دن ہو گئے تھے۔ کوئی انہیں ڈھونڈنے نہیں آیا تھا۔ درخشاں اور چچا جان ہی آجاتے۔ وہ سوچتیں لیکن یقیناً انہیں ان کے آنے کی خبر نہ ہوگی شاید مامون کا ٹیلی گرام انہیں نہیں ملا تھا ورنہ ایک بار تو وہ آتے۔ وہ سارا دن ایک کونے میں افشاں کو گود میں لیے محی الدین کو گھٹنے سے لگائے بیٹھی رہتی تھیں۔ پھر ایک روز کبریٰ خالہ کے کوئی عزیز انہیں آکر لے گئے تھے۔ کبریٰ خالہ کا انہیں بہت سہارا تھا۔ وہ چلی گئیں تو وہ گھبرا گئی تھیں۔ جاتے جاتے وہ سمجھا گئی تھیں کہ سنبھل کر اور احتیاط سے رہنا۔ یہاں دس لوگ اچھے ہیں تو چار برے بھی ہیں۔ خالہ کبریٰ چلی گئیں تو انہیں خود ہی ہمت کر کے باہر نکلنا پڑا۔ کھانا لینے کے لیے۔
خالہ کبریٰ کو گئے تیسرا دن تھا جب ایک شخص نے آکر پوچھا تھا۔

"یہاں رفیق احمد ایڈووکیٹ کی کوئی عزیزہ ہیں؟"
وہ بے اختیار ہی کھڑی ہو گئی تھیں۔ خالہ کبریٰ نے انہیں بتایا تھا کہ یہاں ایک شخص سے انہوں نے بات کی ہے تو اس نے وعدہ کیا ہے جلد ہی وہ ان کے متعلق پتا کر کے انہیں کلثوم فاطمہ اور ان کے بچوں کے متعلق اطلاع دے دے گا۔
"رفیق بھائی کہاں ہیں؟" اپنے گرد اچھی طرح چادر لپیٹتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔
"وہ تو نہیں آسکے، لیکن انہوں نے کہا تھا۔ میں آپ کو ان کے گھر پہنچا دوں گا۔"
"لیکن......" وہ متذبذب سی ہو کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔
"آپ سید ظہیر الدین کی بہو اور ہارون الرشید کی بیگم ہیں نا۔" اور وہ سوچے سمجھے بغیر محی الدین کی انگلی تھامے اور افشاں کو کندھے سے لگائے، اس کے ساتھ ہو لی تھیں۔ حالانکہ یہ سب تو خالہ کبریٰ نے خود انہیں بتایا تھا۔
اس عمارت سے جہاں بہت سارے مہاجرین ٹھہرے ہوئے تھے، کافی آگے آکر کچھ تانگے کھڑے تھے۔ اس شخص نے انہیں اس تانگے میں بٹھایا اور خود بھی آگے کوچوان کے ساتھ بیٹھ گیا تھا۔
"ہم کہاں جا رہے ہیں اماں جان!"
"ہم آپ کی درخشاں چچی کے پاس جا رہے ہیں اور پھر وہاں آپ کے اباجان، داداجان، چچا جان سب آجائیں گے۔"
وہ آنے والے لمحوں سے بے خبر محی الدین کو بہلا رہی تھیں۔ کافی دیر بعد ایک جگہ تانگا روک کر وہ شخص اترا تھا۔
"میں کچھ دیر میں آتا ہوں بھائی! تم ادھر ہی رکو۔ مجھے ایک ضروری پیغام دینا ہے کسی کو...... اور......" اس نے ان کی طرف دیکھا۔ "آپ گھبرائیے مت، بس ابھی آیا۔"
اور تب انہوں نے دیکھا تھا یہ تو وہی شخص تھا جو جب بھی کھانا وغیرہ تقسیم کرنے اندر آتا تو اس کی بے باک اور غلیظ نظریں نوجوان اور جوان لڑکیوں کی تاڑتی رہتی تھیں۔ کوئی چھٹی حس تھی جس نے انہیں پریشان کر دیا تھا تب ہی کوچوان نے مڑ کر انہیں دیکھا۔
"بی بی! یہ کوئی شریف آدمی نہیں ہے۔ آپ واپس کیمپ چلی جاؤ۔"
اور وہ گھبرا کر تانگے سے اتر گئی تھیں اور تیز تیز چلنے لگی تھیں۔ کچھ آگے سڑک پر ایک بس رکی ہوئی تھی اور دروازے پر کھڑا کنڈیکٹر شور مچا رہا تھا۔
"گجرات...... لالہ موسیٰ...... شیرانوالہ......"
انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ شخص گلی سے نکل کر تانگے کی طرف آرہا تھا، وہ تیزی سے بس میں سوار ہو گئیں اور بس بھی فوراً ہی روانہ ہو گئی تھی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ آنکھیں موندے سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے گہرے گہرے سانس لیتی رہیں۔ ایک جگہ بس رکی تو کچھ لوگ اترے، کچھ نئے سوار ہوئے۔ وہ خوف زدہ سی بیٹھی رہیں۔ کنڈیکٹر سب سے ٹکٹ کے پیسے لیتا ہوا ان کے پاس آیا تھا۔
"کہاں جاؤ گی بی بی!"
انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پیچھے بیٹھے کسی شخص نے کوئی نام لے کر کہا تھا۔
"مجھے وہاں تک کا ٹکٹ دے دو۔"
"آرہا ہوں آپ کے پاس بھی بزرگو...... ہاں بی بی! کہاں جانا ہے۔"
اور انہوں نے بھی وہی نام لے دیا تھا اور دوپٹے کے پلو سے بندھے چند نوٹ جو کبریٰ خالہ جاتے جاتے انہیں دے گئی تھیں، کھول کر سے دے دیے۔
"میرے پاس یہی ہیں بھائی!" شرمندگی سے نظریں جھک گئیں۔ اس نے نوٹ دیکھے۔
"کرایہ ہو جائے گا آپا جی!"
پھر پتا نہیں بس کتنی دیر بعد ایک جگہ رکی اور کنڈیکٹر نے اس کا بازو ہلایا۔

"آپا جی! اٹھو...... سو گئی ہو کیا۔ تمہارا شہر آ گیا ہے۔"

وہ دونوں بچوں کے ساتھ اتر گئیں۔ اڈے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ بھی ایک طرف چل پڑی تھیں۔ کہاں جائیں گی، نہیں جانتی تھیں...... کون سا شہر تھا یہ بھی نہیں جانتی تھیں......

"یا اللہ! میری مدد فرما۔"

وہ نڈھال سی ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئیں۔ افشاں بھوک سے رو رو کر نڈھال ہو چکی تھی۔ محی الدین کو تیز بخار تھا۔ آنسوؤں نے پہلے حلق تر کیا اور پھر آنکھوں سے بہنے لگے۔

"کیا ہوا بہن! اس طرح کیوں رو رہی ہیں؟"

ایک مردانہ اور ایک زنانہ آواز ایک ساتھ ان کے کانوں میں آئی تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک بے حد مہربان نظر آنے والا شخص اور ایک خاتون تاسف سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"ہم...... ہمیں سر چھپانے کے لیے کوئی ٹھکانا چاہیے۔" بمشکل ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"آپ مہاجر ہیں؟" پوچھا گیا تو انہوں نے سر ہلایا۔

"چلیں بہن! ابھی تو ہمارے ساتھ چلیں۔ جو روکھا سوکھا ہم کھائیں گے، آپ بھی کھا لیجیے گا۔ بچی بھوکی لگتی ہے۔" خاتون نے ان کی گود سے افشاں کو لے لیا تھا۔ وہ محی الدین کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"آئیے بہن!" انہوں نے ایک تانگا روکا۔

"ارے بچے کو تو بخار ہے۔" اس شخص نے محی الدین کو لڑکھڑاتے دیکھا تو گود میں اٹھا لیا۔

"پہلے حکیم صاحب کے پاس چلیں فاتی کے ابا!" خاتون نے کہا تھا۔

وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چلتے ہوئے سوچ رہی تھیں کہ بس چند دن کو آسرا مل جائے تو وہ کہیں کسی شریف گھرانے میں ملازمت کر لیں گی اور کسی طرح درخشاں اور چچا جان کا پتا لگانے کی کوشش کریں گی لیکن نہیں جانتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے اس گھر کو ان کے نصیب میں لکھ دیا تھا۔ یہ رحمت اور اس کی بیوی نصرت کا گھر تھا۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا فتح محمد۔ لیکن بہت کمزور اور کچھ بیمار سا رہتا تھا۔ رحمت ایک بے حد شریف اور بھلا مانس آدمی تھا۔ اس کی بیوی بھی ایسی ہی نیک اور ہمدرد۔ دونوں نے انہیں بے حد عزت اور محبت دی تھی۔ انہوں نے بھی جو بیتی تھی سب رحمت بھائی سے کہہ دیا۔

رحمت اکثر اپنے کسی کام سے یا چمڑا وغیرہ خریدنے لاہور جاتا رہتا تھا۔ ایک جوتوں کی دکان کے لیے آرڈر پر جوتے بھی بناتا تھا۔ سادہ اور زری کے کام والی کھیڑیاں، کھسے وغیرہ۔ وہ جب بھی لاہور جاتا، مہاجرین کے کیمپ میں ضرور جاتا۔ جہاں جہاں پتا چلتا کہ مہاجرین ٹھہرے ہوئے ہیں، ان سے سید ظہیر الدین اور ہارون الرشید، مامون الرشید کے متعلق پوچھتا۔ ایک بار ریڈیو پر بھی جا کر اعلان کروایا کہ اکثر ریڈیو سے اعلان ہوتے رہتے تھے۔ جو بچھڑے عزیزوں کے لیے ہوتے تھے۔ راجہ صاحب پڑھے لکھے تھے، ان سے کہہ کر اخبار میں بھی اشتہار دلوا دیا تھا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ایک بار جب وہ والٹن کیمپ میں کسی سے ہارون الرشید کے متعلق پوچھ رہا تھا تو اسے وہاں دینو مل گیا تھا۔

"آپ ان کا کیوں پوچھتے ہیں؟" وہ بے چین سا ہو کر رحمت سے پوچھ رہا تھا اور جب رحمت نے بتایا تو وہ رو دیا۔

"وہ تو سب کے سب...... میں ان کا پشتی ملازم ہوں۔" اور تب رحمت اسے ساتھ ہی لے آیا تھا...... اور وہ اسے دیکھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔

"دینو چاچا آپ......"

اور دینو دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تھا۔ وہ ساکت کھڑی سب سن رہی تھیں۔

"اور مامون......" بڑی دیر بعد ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"پتا نہیں...... کچھ علم نہیں۔ شاید درخشاں بی بی

کے پاس چلے گئے ہوں۔ آپ کو ان کا اتا پتا ہے۔"

"نہیں۔"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا اور پھر پاس کھڑے محی الدین کو یک دم گلے سے لگا کر رو پڑی تھیں۔

"محی الدین...... آپ کے ابا جان سب...... سب ہمیں چھوڑ کر چلے گئے۔"

رحمت نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ نصرت نے گلے لگا کر تسلی دی تھی۔ بڑی دیر بعد وہ سنبھلی تھیں۔

"دینو چاچا! آپ کو رفیق بھائی کا کچھ پتا ہے، کہاں رہتے ہیں؟"

دینو کو علم نہیں تھا لیکن اس نے تسلی دی تھی۔

"آپ حوصلہ رکھیں۔ ان شاء اللہ کہیں نہ کہیں سے پتا لگا لوں گا۔ ہر وکیل کے دروازے پر دستک دوں گا، کوئی تو رفیق بھائی کے متعلق جانتا ہو گا۔"

دینو چلا گیا اور وہ انتظار ہی کرتی رہ گئیں۔ وہ کبھی لوٹ کر نہ آیا اور آتا بھی کیسے وہ تو لاہور ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے اترتے ہوئے منہ کے بل گرا اور وہاں ہی جان دے دی تھی۔

"آپ اتنا پریشان کیوں ہوتی ہیں بہن! ساری زندگی یہاں رہیں۔ آپ کے بھائی کا گھر ہے۔ بہن کہا ہے تو ساری زندگی اس رشتے کو نبھاؤں گا۔" رحمت نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور وہ بھی اللہ کی رضا پر راضی ہو گئیں۔

رحمت کا بیٹا فتح محمد چودہ سال کی عمر میں اللہ کو پیارا ہو گیا تو رحمت نے اپنی ساری محبتوں کا محور محی الدین کو بنا لیا تھا۔ اس کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ وہ محی الدین کو اسکول میں داخل کرواتا۔ انہوں نے گھر میں ہی اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم محی الدین اور افشاں کو دی تھی۔ خود وہ بچیوں کو گھر پر قرآن پڑھانے لگی تھیں۔ کڑھائی کا ہنر آتا تھا سو دوپٹوں اور بستر کی چادروں پر کڑھائی بھی کرنے لگی تھیں۔ یوں افشاں اور محی الدین کی چھوٹی موٹی ضروریات کے لیے کچھ رقم آ جاتی تھی۔ محی الدین اکثر ہی رحمت کے ساتھ دکان پر جانے لگے تھے۔ انہیں تو پتا ہی نہیں چلا کہ کب محی الدین نے رحمت سے اس کا ہنر سیکھا۔ انہیں تو تب پتا چلا جب ایک شام بارہ سالہ محی الدین نے زری کے کام والے ننھے سے جوتے ان کے سامنے رکھے۔

"یہ ہم نے افشاں کے لیے اپنے ہاتھ سے بنائے ہیں۔"

"یہ کہاں سے سیکھا؟"

"رحمت چاچا سے۔"

اور اس روز وہ محی الدین کو گلے لگا کر بہت روئی تھیں۔ وہ تو سوچ رہی تھیں، گھر پر تیاری کروا کے وہ آٹھویں جماعت کا امتحان دلوائیں گی لیکن محی الدین نے اپنے لیے خود ہی راستہ چن لیا تھا۔

"ہم اب رحمت چاچا کے ساتھ دکان پر بیٹھ کر کام کروائیں گے۔"

اور ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر رحمت شرمندہ ہو گیا۔

"معاف کر دینا بہن! اس نے ضد کر کے کام سیکھا، ورنہ کیا میں نہیں جانتا کہ کس خاندان کا چراغ ہے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں رحمت بھائی! ہنر کوئی بھی ہو اگر اس سے رزق حلال کمایا جا رہا ہے تو ہم اس میں کوئی برائی نہیں سمجھتے۔"

لیکن اندر جل تھل ہو گیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر محی الدین کے ہاتھوں کو چومتی رہی تھیں اور رحمت نے کہا تھا۔

"بہن! ہجرت کر کے آنے والے اپنی ادھر رہ جانے والی جائیداد کے عوض ادھر زمینیں لے رہے ہیں۔ آپ تو اتنے بڑے خاندان کی اور جاگیر والی ہیں۔ مجھے سب نام پتا، شہر بتائیں...... کہاں آپ کا گھر بار تھا، میں راجا صاحب سے کہتا ہوں وہ آپ کی طرف سے کلیم......"

"نہیں رحمت بھائی!" انہوں نے اس کی بات کاٹی تھی۔

''جو تھا وہ سب پاکستان پر صدقے کیا۔ ہم اللہ کی رضا میں راضی ہیں۔''

اور رحمت نے بہت عقیدت سے انہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت پیار سے محی الدین کو شاہ جی کہتا تھا۔ نیل گروں کی گلی کے سب ہی لوگوں نے انہیں عزت اور مان دیا تھا۔ پہلے نصرت اور پھر اس کے بعد رحمت بھی چل بسا لیکن مرنے سے پہلے اس نے گلی کے درمیان کھڑے ہو کر اعلان کیا تھا۔

''میرا کوئی خونی رشتہ نہیں۔ میرا گھر، دکان سب کچھ میرے بعد محی الدین اور اس کی والدہ کا ہے۔''

نہ کوئی لکھت، نہ پڑھت...... سب نے ان کا حق تسلیم کر لیا تھا۔ رحمت کی وفات سے چند ماہ پہلے انہوں نے محی الدین اور افشاں کی شادی سادگی سے کر دی تھی۔ سب گلی والوں نے ساتھ دیا تھا۔ کتنے ہی دن آس پاس سے لڑکیاں آ کر ڈھولک بجاتی رہی تھیں۔

''آپ کیا سوچنے لگیں؟'' شجاع نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکیں۔

''یوں ہی...... رحمت بھائی اور نصرت بھابھی یاد آ گئی تھیں۔ اگر اللہ تعالیٰ دنیا میں ایسے نیک بندے نہ بھیجے تو دنیا چند روز میں ہی ختم ہو جائے۔''

''آپ ہجرت کر کے آئی تھیں نا اور دادا نے آپ کو پناہ دی تھی۔ آپ کہاں سے آئی تھیں؟ آپ کا خاندان، ذات، برداری......'' شجاع بہت بے چین اور مضطرب نظر آ رہا تھا۔

''ہم کیا تھے...... خاندان، گھر بار...... پچاس برس گزر گئے کیا بتائیں۔ ہمیں تو لگتا ہے جیسے ہم نے یہاں ہی، اسی نیل گروں کی گلی میں جنم لیا تھا۔ گزرا سب بھول گئے۔ اب تو یہ ہی ہمارا وطن ہے جس کے لیے قربانیاں دیں۔''

پتا نہیں کیا کیا کچھ یاد آ رہا تھا اور وہ ضبط کیے بیٹھی تھیں۔

''پھر بھی دادی جان! کچھ تو بتائیں...... کہاں سے تعلق تھا...... آپ کی گفتگو...... آپ کا لب و لہجہ...... آپ......''

''کیا کریں گے جان کر؟'' انہوں نے شجاع کی بات کاٹی اور ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ کچھ تو تھا جس کا بوجھ ان کے دل پر تھا ورنہ پہلے تو شجاع نے ایسے سوال کبھی نہیں کیے تھے۔ لاہور میں کیا ہوا تھا ان کے ساتھ کہ انہیں اپنا حسب نسب جاننے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔

شجاع نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ محی الدین دستک دے کر اندر آئے۔ شجاع احتراماً کھڑا ہو گیا۔

''بیٹھ جائیں شجاع! اب کیسی طبیعت ہے آپ کی۔ اماں جان کہہ رہی تھیں کہ آپ کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔''

''بہتر ہے اب...... کچھ سر میں گرانی سی ہے۔''

شجاع موڑھا کھینچ کر بیٹھ گیا تو محی الدین نے بھی تخت پر بیٹھتے ہوئے جیب سے کچھ رقم نکال کر کلثوم فاطمہ کو دی۔ ان کی عادت تھی کہ دکان سے آتے تو دن بھر کی کمائی کلثوم فاطمہ کو دے دیتے لیکن اب کچھ عرصہ سے کلثوم فاطمہ وہ رقم افشاں کو دے دیتی تھیں۔

آج بھی حسب معمول انہوں نے ''جیتے رہیے، اللہ رزق میں برکت دے'' کہہ کر رقم افشاں کو دی کہ وہ سنبھال لیں۔

''افشاں کھانا لگا دیں۔ ہمیں ابھی عصر سے پہلے مولوی صاحب کی طرف جانا ہے، ان کی عیادت کے لیے۔ آج بھی ظہر کسی اور نے پڑھائی۔ وہ کافی دنوں سے بیمار ہیں۔''

افشاں نے ہمیشہ کی طرح لکڑی کی چھوٹی سی میز تخت کے سامنے رکھ کر کھانا لگا دیا۔

''حاجی صاحب ملے تھے......'' کھانا کھاتے ہوئے محی الدین کو یاد آیا۔ ''کہہ رہے تھے ایجوکیشن کے محکمے میں ان کے دو تین جاننے والے ہیں۔ شجاع کا رزلٹ آ جائے تو کاغذات انہیں دے دوں، ان شاء اللہ نوکری مل جائے گی اور شجاع......'' انہوں نے

شجاع کی طرف دیکھا۔ ''آپ کسی وقت حاجی صاحب سے مل آیئے گا، بہت پوچھ رہے تھے آپ کا۔''

''جی......'' شجاع چند لقمے لے کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا آپ کو کوئی پریشانی ہے شجاع!''

محی الدین نے گہری نظروں سے شجاع کو دیکھا۔

''نہیں...... بس وہ بتایا تھا نا کہ سر میں کچھ درد سا ہے۔ رات ٹھیک سے نیند نہیں آئی، شاید اب آ جائے۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے رکا نہیں تھا بلکہ تیزی سے کمرے میں چلا گیا۔

اب وہ انہیں کیا بتاتا کہ وہ کس اذیت سے گزر رہا ہے۔ کون سا غم ہے جو اس کی رگوں کو کاٹتا ہے۔ کاش اسے مہرین عبدالستار سے محبت نہ ہوتی اور اگر ہو ہی گئی تھی تو مہرین کو اس سے محبت نہ ہوتی۔ مہرین کی محبت اس کے مقابلے میں شدید تھی۔ وہ محبت کی خاطر جان پر کھیل جانے کا حوصلہ رکھتی تھی لیکن وہ...... شاید وہ نہیں...... اس کے سامنے اپنے ابا جان کا تھکا ہوا چہرہ، اپنی اماں جان کی آنکھوں میں جلتے امید کے چراغ...... دادی جان کی مشقت بھری زندگی آ جاتی۔ کیسے دادی جان گرمیوں کی تپتی دوپہروں میں باہر تخت پر بیٹھی بستروں کی چادریں اور تکیوں پر کڑھائی کرتی تھیں۔ ابا جان کی انگلیوں کی زخمی پوریں اس کی محبت کو کمزور کر دیتی تھیں...... اور وہ دل ہی دل میں اعتراف کرتا۔ وہ مہرین عبدالستار سے شاید اتنی محبت نہیں کرتا جتنی مہرین عبدالستار نے اس سے کی ہے۔

اس نے آنکھیں موند لیں اور اسے مہرین سے اپنی آخری ملاقات یاد آئی۔ آخری پیپر کے بعد وہ ایک دن آرام کرنا اور اپنی نیند پوری کرنا چاہتا تھا۔ ہوسٹل کے سب ساتھی بھی ایک دن آرام کرنے کے بعد ہی گھر جانے کا پروگرام بنا رہے تھے لیکن مہرین کے اصرار پر وہ اس سے ملنے یونیورسٹی چلا آیا تھا۔ آخری پیپر کے بعد اس نے کہا تھا۔ ''شجی کل ضرور آنا، کیا خبر میرے پاس تمہارے لیے کوئی خوش خبری ہو۔'' لیکن جب وہ آئی تو اس کی آنکھیں بشدت گریہ سے سرخ ہو رہی تھیں اور سوجی ہوئی تھیں۔

''دادا نے میرے ساتھ فراڈ کیا شجی...... دھوکا دیا مجھے۔'' اس کے سامنے بیٹھتے ہی وہ رو پڑی تھی۔

''کیا ہوا مہرین؟ کیا کہا دادا جان نے......'' وہ پریشان ہو گیا تھا۔

''انہوں نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ انہیں تم سے میری شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ صرف اس لیے کہ میں سکون سے پیپر دے سکوں لیکن جب کل میں نے ان سے کہا کہ صبح وہ میرے ساتھ چلیں اور تم سے مل لیں...... تو انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ وہ کسی صورت بھی میری شادی کسی موچی کے خاندان میں نہیں کر سکتے۔''

وہ اور شدت سے رونے لگی تھی اور اس تحقیر پر اس کا دل پھٹنے لگا تھا۔ اپنی پوری زندگی میں پہلی بار اسے ابا جان سے شکوہ ہوا کہ انہوں نے کوئی اور کام کیوں نہ سیکھا۔

''لیکن میں نے بھی کہہ دیا ہے کہ اگر مجھے شادی کرنا ہے تو صرف شجاع سے ورنہ کسی سے نہیں۔'' اس نے ہاتھوں کی پشت سے اپنے آنسو صاف کیے۔

''تم بھی تو کچھ کہو نا شجی!''

''کیا کہوں؟'' انتہائی دل گرفتگی سے اس نے مہرین کی طرف دیکھا تھا۔

''تم کچھ بھی نہ کہو شجی! لیکن میں کہہ رہی ہوں کہ میں تمہارے بغیر تو شاید جی لوں گی لیکن میں کسی دوسرے کے ساتھ منافقت بھری زندگی نہیں گزار سکتی۔ یاد رکھنا اگر کسی نے مجھ سے زبردستی کی تو زہر کھا لوں گی۔''

''نہیں...... پلیز نہیں......'' بے اختیار ہی اس نے مہرین سے التجا کی تھی۔

''یاد رکھنا تم شجی...... میں سچ کہہ رہی ہوں اگر ابی جان اور دادا جان نے مجبور کیا کہیں اور شادی کے

لیے تو مر جاؤں گی......"

"نہیں مہرین! آپ ایسا مت کرنا۔ نہیں تو شجاع بھی زندہ نہیں رہے گا۔" اس نے زیر لب کہا اور دیوار کی طرف کروٹ بدل لی اور بند آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر تکیہ بھگونے لگے۔

☆☆☆

"آپ کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہیں بیٹا!" خیر دین کی نظریں بار بار مہرین کی طرف اٹھ رہی تھیں جو پلیٹ میں ذرا سے چاول ڈالے بیٹھی تھی اور ابھی تک اس نے ایک لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔

دوپہر میں کھانے کی میز پر وہ، مہرین اور سعادت ہی ہوتے تھے۔ ہاں رات کو عبدالستار بھی ہوتا تھا۔ دونوں بیٹوں کو سال بھر پہلے عبدالستار نے ماڈل ٹاؤن میں ہی الگ گھر لے دیے تھے۔ دونوں بھائیوں کا بزنس بھی الگ کر دیا تھا۔ چھٹی والے دن البتہ دونوں بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آتے اور کھانا وغیرہ سب اکٹھا ہی کھاتے تھے۔ مہرین ان دنوں برائے نام ہی کھاتی تھی اور وہ جانتے تھے کہ وہ ناراض ہے اس لیے ایسا کر رہی ہے۔

"بس کھا لیا دادا جان!"

ایک بھی لقمہ لیے بغیر وہ ذرا سے چاول پلیٹ میں ہی چھوڑ کر کھڑی ہوگئی اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

خیر دین تڑپ کر رہ گیا۔

"یہ سب آپ کی وجہ سے ہے ابا جی! آپ کے لاڈ پیار نے اسے بگاڑا۔ ورنہ اور بچے بھی تو ہیں، کبھی کسی نے ضد کی۔"

"ان کی اور بات ہے لیکن مہرین......!" خیر دین بھی کھانا چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیوں...... ان کی اور بات کیوں ہے۔ چاروں کو میں نے دودھ پلایا ہے۔ نرگس کے ابی نے سب سے زیادہ لاڈ اس کے ہی اٹھائے ہیں۔ پھر یہ سب سے الگ کیسے ہوگئی کہ ہمیں اس کی زندگی کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہی نہیں رہا۔ کیا ہمارا حق نہیں ہے اس پر۔"

"میں نے یہ کب کہا سعادت پروین! میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ جہاں بھی مہرین کا رشتہ طے کیا جائے، وہ سید خاندان ہو۔" خیر دین کی آواز آہستہ تھی۔

"تو یہ سید خاندان کہاں سے ڈھونڈیں ابا جی!" سعادت چمک کر بولی۔ "وہ جو ماسی زبیدہ رشتہ لائی ہے، وہ تو شکل سے میراثی اور حرکتوں میں بھانڈ لگ رہے تھے اور نام کے ساتھ سید اور شاہ لگا رکھا تھا۔"

"ابھی مہرین کون سا بوڑھی ہوگئی ہے۔ اچھا رشتہ بھی مل ہی جائے گا۔ کوئی سید لڑکے دنیا سے عنقا تو نہیں ہوگئے نا۔" خیر دین ڈائننگ روم کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"عنقا ہوئے ہیں یا نہیں۔" سعادت نے ڈھیر سارا رائتہ اپنی پلیٹ میں ڈالا۔ "سیٹھ معراج کے بیٹے کے لیے آپ کو اعتراض تھا کہ وہ نائی ہے...... لیکن میرے بھانجے کا کیا مسئلہ ہے۔ ہمارا خاندان کوئی ایسا ویسا نہیں ہے...... ہم کاروباری لوگ ہیں...... شیخ...... اور ابا جی آپ کے بیٹے صبح کہہ گئے ہیں کہ ابا جی کو بتا دینا کہ مہرین کی شادی وہاں ہی ہوگی جہاں وہ چاہیں گے اور ایک دو روز میں وہ ان لوگوں کو گھر کھانے پر بلا رہے ہیں۔ آپ لڑکے سے بھی مل لیجیے گا۔"

"کون لوگ؟" خیر دین چونکا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

سعادت بے نیازی سے کہہ کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

"ضرور سیٹھ معراج ہی ہوگا۔ جانتا ہوں اچھی طرح اس ستارے کو، مل اونر بننے کے لیے اتاؤلا ہو رہا ہے۔"

دل ہی دل میں کہتا ہوا خیر دین ڈائننگ روم سے نکل کر مہرین کے کمرے میں آیا۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی تھی۔ دستک کی آواز پر اٹھ کر بیٹھ گئی اور بس نظر اٹھا کر خیر دین کو دیکھا لیکن زبان سے ایک لفظ تک نہ کہا تھا۔ ملگجے سے کپڑے، بجھی بجھی آنکھیں اور پیلا رنگ...... خیر دین کے دل کو کچھ ہوا۔

"مہرین بیٹا! یہ کیا حالت بنا رکھی ہے اپنی۔" مہرین نے کوئی جواب نہیں دیا تو خیر دین کے دل پر چوٹ لگی۔ "ایسا کیوں کر رہی ہو مہرین! مت کرو اس طرح۔"

"میں نے کیا کیا ہے دادا!" مہرین نے نظریں اٹھائیں۔ ویران آنکھیں...... جن میں دور دور تک دھول اڑتی تھی۔ خیر دین کا دل جیسے بند ہونے لگا تھا۔ کتنی شوخ اور شریر تھی وہ اور اب......

"آپ نے کہا شجاع سے میری شادی نہیں ہو سکتی تو...... میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں نہیں کروں گی شجاع سے شادی...... تو اب کیا ہوگیا ہے۔"

"مہرین...... میرا بچہ......" خیر دین نیچے قالین پر بیٹھ گیا۔

"دادا اوپر بیٹھیں۔" مہرین کو ان کا یوں نیچے دیکھنا اچھا نہ لگا تھا لیکن خیر دین نیچے ہی بیٹھا رہا۔

"مہرین بچے! آپ کے ابی جان اور امی جان اپنی مرضی سے آپ کی شادی کرنا چاہتے ہیں اور میں......"

"مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی دادا جان! چاہے وہ سیٹھ معراج کا بیٹا ہو، چاہے آپ کا منتخب کردہ سید زادہ...... اگر کسی نے مجھ سے زبردستی کی تو میں زہر کھا لوں گی۔" سخت سپاٹ چہرہ، بے لچک لہجہ۔

خیر دین کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔

"نہیں مہرین...... ایسے نہ کہو۔"

"میں سمجھتی تھی آپ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ابی جان اور امی جان سے بھی زیادہ...... ساری دنیا مجھے چھوڑ دے، میرا ساتھ نہ دے لیکن آپ میرا ساتھ دیں گے......" اس نے جیسے خیر دین کی بات سنی ہی نہ تھی۔ "لیکن آپ وعدے کر کے مکر گئے، آپ نے کہا شجاع سید نہیں ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ "کیوں...... آخر کیوں...... میری شادی کسی غیر سید سے نہیں ہو سکتی۔"

اور خیر دین کا سر جھک گیا۔ وہ کیسے بتاتا مہرین کو کہ اس کی شادی غیر سید سے کیوں نہیں ہو سکتی۔

پچاس سال پہلے مامون الرشید نے اسے عبدالستار، زرینہ اور بھاگاں کے ساتھ ٹرین پر بٹھایا تھا تو کہا تھا خیر دین چاچا! جب تک ابا جان، بھائی جان وغیرہ حویلی سے نہ آئیں، آپ کو وہاں ہی ٹھہرنا ہے۔ چچا جان خود بیمار اور کمزور ہیں۔ آپ کو سب کا خیال رکھنا ہے۔"

اور پھر جب رفیق صاحب انہیں اس چار کنال کے گھر میں چھوڑ کر گئے تھے تو انہوں نے بھی تاکید کی تھی۔ "خیر دین چاچا! جب تک سب لوگ نہیں آ جاتے، آپ کو یہاں ہی قیام کرنا ہے۔ چوکیدار اور ملازم لڑکا مامون کی دلہن کے لیے اجنبی ہیں۔ آپ کے یہاں رہنے سے چچا جان اور درخشاں بھابھی کو بھی ڈھارس رہے گی۔"

کوٹھی کیا تھی محل تھا اور سرونٹ کوارٹر بھی ان کے گاؤں والے مکان سے دوگنا بڑا تھا۔ زرینہ اور عبدالستار بہت خوش تھے اور خیر دین اس بھروسے پر نازاں تھا جو اس پر کیا گیا تھا۔ رفیق صاحب گاہے بگاہے چکر لگا لیتے تھے۔

پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا۔ مہاجرین کے قافلے کے قافلے آ رہے تھے لیکن جن کا انتظار تھا وہ نہیں آئے تھے۔ پھر ایک روز قیامت ہی آ گئی۔ رفیق صاحب نے آ کر بتایا۔

"مامون کے ایک دوست دہلی سے آئے ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ مامون دہلی آئے تھے۔ ہارون کی دلہن، بچوں اور ان کے ماموں جان کی فیملی کو ٹرین پر سوار کرایا تھا اور مجھے ٹیلی گرام بھجوایا تھا کہ اسٹیشن سے لے جاؤں۔ غالباً بارہ یا گیارہ اگست کو ٹرین لاہور پہنچی تھی۔ مجھے ٹیلی گرام نہیں مل سکا تھا لیکن کل مامون کے دوست کے ساتھ میں اسٹیشن پر گیا تو پتا چلا کہ گیارہ اگست کے بعد تو کوئی ٹرین سلامت نہیں آ سکی۔ ظالموں نے راستے میں ہی آنے والوں کو

لوٹ لیا اور مار ڈالا۔ زندہ بچ کر آنے والے کیمپ میں ہیں۔ ہم نے ایک دو جگہ مہاجرین کے کیمپ میں جا کر دیکھا لیکن بھابھی اور بچے نہیں ملے۔"

رفیق صاحب نے سر جھکا لیا۔

"اور — بھائی — صاحب...... ہارون...... دوسرے......" درخشاں کے والد نے پوچھا تھا۔

"سب بھی...... حویلی پر مامون کے آجانے کے بعد حملہ ہوا اور سب کے سب شہید ہو گئے۔ مامون واپس دہلی آئے تھے اور اپنے دوست کو بتایا تھا اور پھر اس کے بعد مامون کا کچھ پتا نہیں چلا انہیں۔ شاید کسی روز آجائیں۔"

درخشاں شدت غم سے بے ہوش ہو گئی تھیں۔

رحمانی بوا انہیں سنبھال رہی تھیں اور سید صاحب کی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ یہ غم تو ختم ہونے والا نہ تھا۔ خیر دین نے سید صاحب کے ساتھ مہاجرین کے کیمپوں میں کتنے ہی چکر لگائے کہ شاید ہارون کی دلہن اور بچے بچ گئے ہوں۔ ہر ایک — پوچھا لیکن کسی کو کچھ پتا نہ تھا۔ ایک روز وہ مایوس ہو کر کیمپ سے واپس آ رہے تھے کہ ایک پانچ سالہ بچہ جو زمین پر بیٹھا ہوا تھا ایک دم کھڑا ہو کر خیر دین کی طرف لپکا۔

"خیر دین چاچا...... خیر دین چاچا......"

یہ شہاب الدین تھا۔ خیر دین نے اسے پہچانتے ہی گود میں اٹھا لیا اور فرط جذبات سے اس کی آواز بھرا گئی۔

"سرکار...... سرکار...... یہ اپنے شہاب الدین......"

سید صاحب نے خیر دین سے فوراً ہی شہاب الدین کو لے لیا اور چومنے لگے۔

"آپ کی اماں جان، بہنا اور بھیا کہاں ہیں؟"

"پتا نہیں...... ہم نہیں جانتے۔" شہاب الدین رو رہے تھے۔ "ہمیں دادا جان، ابا جان اور اماں جان کے پاس جانا ہے۔"

"اس ڈبے میں صرف یہی ایک بچہ زندہ ملا تھا، باقی سب......"

ایک شخص نے جو شاید رضا کار تھا، بتایا اور وہ شہاب الدین کو کسی قیمتی متاع کی طرح سنبھال کر لے آئے تھے اور درخشاں نے انہیں گلے سے لگا لیا تھا۔

"خیر دین چاچا! آپ ہمیں کبھی چھوڑ کر نہ جائیے گا۔ ہم اکیلے نہیں رہ پائیں گے۔ یہاں چاچی ہیں پھر زرینہ ہے...... تنہائی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ مامون آجائیں گے تو پھر بھی ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے۔"

اور مامون کبھی نہ آئے اور نہ ہی کبھی ان کے متعلق معلوم ہو سکا۔ سید صاحب نے شہاب الدین کو اسکول داخل کروایا تو عبدالستار اور زرینہ کو بھی داخل کروا دیا۔ باہر کے سارے کام خیر دین نے خود ہی سنبھال لیے تھے۔ سودا سلف لانا، بچوں کو اسکول چھوڑنا، لے آنا۔ درخشاں کی بیٹی پیدا ہوئی تو درخشاں نے اس کا نام بڑی بیٹی کے نام پر افشاں ہی رکھا۔

رفیق صاحب نے سید صاحب سے ایک بار کہا کہ وہاں کی جائداد کے بدلے میں یہاں جائدادیں مل رہی ہیں تو آپ میرے ساتھ چلیے گا۔ ہم بھی کلیم کر دیتے ہیں۔ آپ کا دہلی والا گھر، دکانیں، درخشاں بھابھی کی حویلی، زمینیں......"

"ہم کیا کریں گے کلیم کر کے رفیق بھائی! آل اولاد پاکستان پر قربان کر دی تو زمین جائداد بھی اس پر صدقے۔"

"کیسے بڑے لوگ تھے وہ۔" خیر دین نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"زندگی گزارنے کو بہت ہے...... مزید کی خواہش نہیں۔"

وہ قیمتی سامان اور زیورات وغیرہ ساتھ لائے تھے۔ کچھ زیورات فروخت کر کے انہوں نے رفیق صاحب کے مشورے سے مال پر تین دکانیں خرید لی تھیں۔ جن کے کرائے سے بہت اچھا گزارا ہو جاتا تھا۔ بعد میں انہوں نے انارکلی میں بھی شہاب الدین کے نام سے تین دکانیں خرید لیں۔ دکانوں کے اوپر

رہائش کے لیے کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب حالات بہتر ہو گئے تو انہوں نے مال کی ایک بڑی دکان میں بجلی کا سامان رکھ لیا۔ ایک ملازم بھی رکھ لیا تھا۔ شہاب الدین نے جب میٹرک کا امتحان پاس کیا تو عبدالستار بی اے کر چکا تھا اور سید صاحب کے ساتھ دکان پر بیٹھنے لگا تھا۔

"ہم تمہارے اور عبدالستار کے سوا کسی اور پر اعتبار نہیں کر سکتے خیر دین!" ایک روز سید صاحب نے خیر دین کو بلا کر کہا۔ "ہماری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ عمر بھی ایسی ہے کہ کوئی نہ کوئی بیماری لگی رہتی ہے جانے کب کیا ہو جائے۔ شہاب ابھی چھوٹا ہے پھر نا بچہ ہے۔ اس لیے ہم نے عبدالستار کو مختار نامے دے دیے ہیں۔ وہ سمجھ دار بھی ہے اور میرے ساتھ دکان بیٹھنے سے کاروباری معاملات سمجھنے لگا ہے۔ ہمارے بعد درخشاں اور بچوں کا آپ نے اپنے بچوں کی طرح ان خیال رکھنا ہے۔ مامون زندہ ہوتے تو اب تک آچکے ہوتے۔"

خیر دین سے وعدہ لے کر وہ مطمئن سے ہو گئے تھے اور دو سال بعد انہوں نے افشاں اور شہاب الدین کا نکاح کر دیا اور نکاح کے تین دن بعد اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئے۔ شہاب الدین بہت کم گو اور سنجیدہ سے تھے۔ سید صاحب جنہیں افشاں کی تقلید میں وہ نانا جان ہی کہنے لگے تھے کی وفات کے بعد وہ اور زیادہ خاموش ہو گئے تھے۔ درخشاں بھی والد کی وفات کے بعد بہت افسردہ رہنے لگی تھیں۔ لیکن افشاں اور شہاب الدین کی خاطر خود کو سنبھالے رکھتی تھیں۔ شہاب الدین اپنی پڑھائی میں مصروف رہتے تھے۔ عبدالستار ہوشیار لڑکا تھا۔ بہت جلد اس نے کاروباری حلقوں میں اپنا نام بنا لیا تھا۔

شہاب الدین کو درخشاں نے بتایا تھا کہ ان کے ابا جان نے دہلی کالج سے ماسٹر کیا تھا اور چچا علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ سو شہاب الدین بھی ماسٹر کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے لیے میتھس کا مضمون منتخب کیا تھا پر پہلے میتھس اور پھر اکنامکس میں ماسٹر کیا اور ایک کالج میں پڑھانے لگے۔ انہیں کاروبار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"ستار بھائی ہیں نا...... وہ کاروباری امور بہتر سمجھتے ہیں۔" ایک بار درخشاں کے کہنے پر انہوں نے جواب دیا تھا۔ افشاں بھی بی اے کر چکی تھی سو درخشاں نے سادگی سے رخصتی کر دی۔

ان ہی دنوں عبدالستار کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ خیر دین تو اس کی شادی اپنی بھانجی سے کرنا چاہتا تھا لیکن عبدالستار نے شیخ صدیق کپڑے والے کے گھر شادی کی خواہش کی تو درخشاں نے خیر دین سے کہا کہ عبدالستار اگر وہاں شادی کرنا چاہتا ہے تو انہیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ نہیں تھا کہ عبدالستار نے سعادت کو دیکھ رکھا تھا یا پسند کیا تھا، دراصل عبدالستار کے کسی جاننے والے نے عبدالستار سے اس رشتے کی بات کی تھی اور عبدالستار کو اس رشتے میں ہر طرح سے فائدہ نظر آیا تھا۔ معزز خاندان، کاروباری لوگ......

کئی سال پہلے درخشاں کے کہنے پر وہ لوگ سرونٹ کوارٹر سے اٹھ کر اندر گھر میں آگئے تھے۔ عبدالستار کی شادی ہوئی تو درخشاں نے اس کے لیے الگ سے ایک بیڈروم تیار کروا دیا تھا۔ ان کی حیثیت اب گھر کے افراد کی سی تھی۔ دکانوں کے کرائے، کاروبار کا حساب کتاب سب عبدالستار کے پاس ہوتا تھا۔ نہ درخشاں نے کبھی حساب لیا نہ شہاب الدین نے کبھی پوچھا۔ جو عبدالستار دیتا رکھ لیا جاتا۔ ابھی شہاب اور افشاں کی شادی کو ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ درخشاں کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکیں۔

شہاب الدین اور افشاں کے ہاں شادی کے چھ سال بعد مہرین پیدا ہوئی۔ اس دوران عبدالستار کے دو بیٹے جو جڑواں تھے اور ایک بیٹی ہو چکی تھی۔ سعادت اور افشاں ایک دن ہی ہاسپٹل میں داخل ہوئی تھیں۔ سعادت اور افشاں دونوں کے ہاں بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ سعادت کی بیٹی پیدائش کے دو گھنٹے بعد مر گئی اور افشاں بیٹی کو جنم دینے کے چند گھنٹے بعد چل بسی۔ شہاب الدین کے لیے یہ بڑا صدمہ تھا۔

خیر دین نے مہرین کو سعادت کی گود میں ڈال دیا۔

"اسے اپنی ہی بیٹی سمجھو سعادت۔"

اور بیٹی کے غم میں مبتلا سعادت نے مہرین کو سینے سے لگالیا۔ مہرین ابھی سال کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ شہاب الدین اپنے دھیان میں گم سڑک عبور کرتے ہوئے ایک بس کے نیچے آگئے تھے۔ خون اتنا بہہ گیا تھا کہ ہسپتال جانے کے تین گھنٹے بعد جان دے دی۔ یوں سب کچھ اب عبدالستار کا تھا۔ گو خیر دین وقتاً فوقتاً اسے یاد دلاتا رہتا تھا کہ یہ گھر اور دکانیں ان سب کی مالک مہرین ہے۔ یہ سچ تھا کہ عبدالستار نے ان تھک محنت سے اپنے کاروبار کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ عبدالستار خیر دین کی بات کا جواب نہ دیتا تو اسے تپ چڑھ جاتی۔

"اپنی شادی اور اپنے نام والے کارڈ پر سید عبدالستار لکھ کر تو سید نہیں ہو گیا۔ یاد رکھنا۔"

شہاب الدین نے مرنے سے چند منٹ پہلے خیر دین سے وعدہ لیا تھا۔

"میری بچی کا بہت خیال رکھنا خیر دین چاچا! اور اسے جوان ہونے پر اپنے ہم پلہ سید خاندان میں بیاہنا۔"

اور شہاب الدین وعدہ نہ بھی لیتے تب بھی وہ کیسے اسے کسی ایسے ویسے خاندان میں بیاہ دیتے۔

"آپ مجھ سے محبت نہیں کرتے دادا! آپ کو مجھ سے زیادہ ہی اپنی انا پیاری ہے۔" اسے سر جھکائے خاموش بیٹھے دیکھ کر مہرین نے کہا تو خیر دین نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"میں آپ کو اپنا دل کیسے چیر کر دکھاؤں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" خیر دین کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اس نے ہمیشہ مہرین کو آپ کہہ کے ہی بلایا تھا۔ حالانکہ سعادت نے کتنی بار ٹوکا بھی تھا۔

"او ہو ابا جی! وہ آپ کی پوتی ہے، کوئی بزرگ نہیں ہے جو اتنے احترام سے بلاتے ہیں۔"

وہ ان کی پوتی ہی تھی۔ عبدالستار اور سعادت نے کبھی اسے احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ ان کی بیٹی نہیں ہے لیکن وہ تو جانتے تھے نا کہ وہ ان کے ہارون سرکار کی پوتی اور شہاب الدین کی بیٹی ہے۔

"دل چیر کر کس نے دیکھا ہے دادا جان!" دل گرفتگی سے کہتے ہوئے مہرین نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور سامنے دیوار کو دیکھنے لگی۔

خیر دین کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر نگاہیں جھکالیں۔ وہ تکلیف میں تھی، اذیت میں تھی اور عبدالستار نے کہا تھا مہرین کی شادی وہاں ہی ہو گی جہاں وہ چاہے گا۔ عبدالستار کو وہ دس باتیں سنا لیتا تھا اور وہ سن بھی لیتا تھا۔ یہ اس کی سعادت مندی تھی لیکن اگر وہ اپنی کرنی پر آجاتا تو وہ کیا کر سکتا تھا۔ وہ کمزور اور بوڑھا تھا اور عبدالستار کے ساتھ دو کڑیل جوان بیٹے بھی تھے۔ سب عبدالستار کے ہم نوا تھے کہ مہرین کا رشتہ سیٹھ معراج کے بیٹے کو دے دیا جائے اور اس کے ساتھ پارٹنر شپ ہو جائے ...... تو ...... سیٹھ معراج جس کے بڑے حجامت بناتے تھے اور شجاع جس کا باپ جفت ساز تھا۔ دونوں کے خاندان میں کیا فرق تھا۔

شجاع مہرین کو پسند تھا اور سیٹھ معراج کے بیٹے سے مہرین شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اور کہتی تھی کہ اگر زبردستی کی گئی تو وہ زہر کھالے گی اور وہ ایسا ہی کرے گی ...... وہ جانتا تھا۔ وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں تھی۔ سید ہارون الرشید کی پوتی تھی ...... وہ لوگ جو کہتے دو کرتے تھے تو پھر کیوں نہ مہرین کے دل کی خوشی کے لیے ......

خیر دین یک دم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مہرین کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"خیر دین کے جیتے جی کوئی آپ کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتا۔ آپ مجھے شجاع کا پتا بتائیں، میں آج ہی اس سے ملنے جاتا ہوں اور اس کے والدین سے ......"

"دادا جان آپ ......" مہرین کی نم آنکھیں یک دم چمک اٹھیں۔

"آپ ...... آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"آپ کی شادی شجاع سے ہی ہو گی مہرین!"

"دادا جان!" مہرین اٹھ کر ان سے لپٹ گئی اور وہ ہولے ہولے اسے تھپکنے لگا۔

☆☆☆

"السلام علیکم!"

حاجی صاحب نے بلند آواز میں کہا تو محی الدین نے جو کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے، چونک کر انہیں دیکھا۔

"وعلیکم السلام! حاجی صاحب۔ تشریف رکھیے۔"

"جوتے تیار ہو گئے۔ شاید آج کل میں محبوب صاحب چکر لگائیں۔" حاجی صاحب باہر پڑی لوہے کی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

"جی حاجی صاحب! بس پالش باقی تھی۔ ابھی ہو جاتی ہے۔" محی الدین نے پالش کی ڈبیا کھول کر برش اٹھایا۔

"شجاع میاں کیسے ہیں۔ ایک بار دکان پر ملنے آئے پھر نظر ہی نہیں آئے۔ آپ کی بھابھی بھی یاد کر رہی تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں نا، اپنے شہزادے کے دوستوں سے بہت محبت کرتی ہیں۔ اس کے ہم عمر اس کے ہم جماعت سب میں ہی شہزادے کو دیکھتی ہیں۔" بیٹے کا ذکر ہمیشہ ہی انہیں اداس کر دیتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں نم سا پھیل گیا تھا۔

"گھر پر ہی ہوتے ہیں سارا وقت۔" محی الدین نے ایک گہری سانس لی۔

"دو ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے شجاع کو لاہور سے آئے لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ وہ خاموش ہوتا جا رہا تھا۔ زیادہ تر کمرے میں دیوار کی طرف منہ کیے لیٹا رہتا۔ کلثوم فاطمہ اور وہ ایک ہی کمرے میں سوتے اور انہوں نے بتایا تھا کہ آدھی آدھی رات جاگتا رہتا ہے۔ سوتے میں چونک کر اٹھ جاتا ہے۔ اپنی اپنی جگہ تینوں نے ہی اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

"کوئی پریشانی نہیں ہے مجھے۔"

لیکن کچھ تو تھا جسے وہ چھپاتا تھا۔ خوراک بھی بہت کم ہو گئی تھی۔ آدھی آدھی رات تک صحن میں ٹہلتا رہتا۔ سوتا تو "نہیں نہیں" کہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اماں جان کے پوچھنے پر کروٹ بدل کر لیٹ جاتا تھا۔ کئی بار انہیں لگا تھا جیسے وہ دیوار کی طرف منہ کیے، چپکے چپکے رو رہا ہو۔ سب کے درمیان موجود ہو کر بھی جیسے وہ موجود نہ ہوتا۔ کوئی دکھ تھا جو اندر ہی اندر اسے چاٹ رہا تھا۔ کوئی غم تھا جو جگر کاٹتا تھا۔ ایک دو بار انہیں گمان گزرا تھا جیسے ان کا جوتے بنانا اسے گراں گزر رہا ہو۔ تب انہوں نے کلثوم فاطمہ سے کہا تھا۔

"اماں جان! آپ شجاع کو بتا دیں کہ ہم کوئی ایسے گئے گزرے نہیں ہیں۔ ہمارا تعلق بھی اعلا خاندان سے ہے۔ ہمیں پتا نہیں کیوں لگتا ہے جیسے انہیں ہمارے پیشے سے نفرت ہو گئی ہے انہیں ایک جفت ساز کا بیٹا کہلانا پسند نہیں ہے۔"

"آگاہی زیادہ عذاب دیتی ہے محی الدین! جان کر زیادہ تکلیف ہو گی انہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں، کچھ دنوں میں ٹھیک ہو جائیں گے۔ شاید کسی نے تحقیر سے پکارا ہو تو چوٹ دل پر لگی ہو۔ زخم مندمل ہونے میں کچھ وقت تو لگتا ہے محی الدین! یاد ہے آپ کو جب گلی میں کسی نے رحمت موچی کا بیٹا کہہ کر بلایا تھا تو کتنا روئے تھے آپ۔"

"لیکن تب ہم ناسمجھ تھے۔ ورنہ پھر تو ہم نے ہمیشہ رحمت بابا کو بابا جان کہہ کر فخر محسوس کیا تھا۔"

"شجاع بھی ایک دن اپنے ابا جان پر فخر کریں گے، جنہوں نے انہیں ساری زندگی رزق حلال کھلایا۔"

اماں جان نے انہیں تسلی دی تھی لیکن پھر بھی شجاع کی کیفیت انہیں بے چین کر دیتی تھی۔ حاجی صاحب کے آنے سے پہلے بھی وہ اسی کے متعلق سوچ رہے تھے۔

"کیا صاحبزادے کی طبیعت ناساز ہے کچھ؟"

حاجی صاحب نے انہیں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر پوچھا تو محی الدین نے چونک کر حاجی صاحب کی

طرف دیکھا اور سوچا حاجی صاحب سمجھ دار آدمی ہیں۔ دنیا دیکھ رکھی ہے، طرح طرح کے لوگوں سے میل ملاقات رہتی ہے۔ شاید وہ کوئی بہتر مشورہ دے سکیں، ہمیں شجاع کی کیفیت کا ان سے ضرور ذکر کرنا چاہیے۔ کوئی مشورہ ہی دیں گے اگر کہیں حکیم ڈاکٹر کی طرف لے کر جانا ہے تب بھی......

اور انہوں نے ساری بات حاجی صاحب سے کہہ دی۔ حاجی صاحب نے بہت دھیان سے ان کی بات سنی۔

"ہمارا شہزادہ بھی اچانک گم صم ہو گیا تھا۔ چپ گپ خلاؤں میں تکتا رہتا۔ راتوں کو صحن میں ٹہلتا رہتا۔ چھت پر جا کر جیسے چاند اور ستاروں سے باتیں کرتا رہتا۔ ہمیں تو خبر ہی نہ ہو سکی کہ بات کیا ہے۔ ایک بار اس نے کسی سے شادی کی خواہش کی تھی۔ میں نے کہا ابھی وہ کم عمر ہے اور پھر بات آئی گئی ہو گئی اس نے دوبارہ بات دہرائی نہیں ورنہ کہتا تو...... خیر ایک بار وہ جو صوفی آتے تھے ہماری گلی میں کبھی کبھی سفید لمبے چغوں میں ترکی ٹوپی والے ان میں سے ایک ملا تھا۔ شہزادے کے چلے جانے کے بعد بولتا تھا، آپ کے شہزادے کو عشق ہو گیا تھا۔"

ان کی آواز رندھ گئی۔

"یہ بڑی خطرناک عمر ہوتی ہے شاہ جی کیا خبر صاحبزادے کہیں دل لگا بیٹھے ہوں۔ محبت سے پیار سے دوست بن کر پوچھیے گا تو ضرور کچھ نہ کچھ بتائیں گے۔ آپ کو نہ سہی بھابھی صاحبہ یا آپا جی کو کسی کو بھی...... اصل بات بتا دیں گے تو ان شاء اللہ کوئی حل ڈھونڈ لیں گے۔ کسی کے پاؤں بھی پڑنا پڑا تو اپنے بچے کی خوشی کے لیے پڑ جائیں گے۔ آپ حوصلہ رکھنا شاہ جی! ہم میں بھی اب شہزادے کے بعد کوئی اور زخم کھانے کی سکت نہیں ہے۔ شجاع بیٹا تو ہمارا مان ہے۔ ہماری گلی کا فخر ہے۔ اللہ اسے لمبی عمر دے۔" حاجی صاحب بات مکمل کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

تب ہی ایک شخص نے قریب آ کر سلام کیا۔ سر اور مونچھوں کے بال بالکل سفید تھے۔ بھنوؤں میں سفید بالوں کی زیادتی تھی۔ عمر کوئی اٹھہتر اناسی سال لگتی تھی۔ قیمتی لباس سے کسی بڑے خاندان کے لگتے تھے۔

"کیا یہ محی الدین جفت ساز کی دکان ہے۔ مجھے ان سے ملنا ہے۔"

"جی ہم ہی محی الدین ہیں...... فرمائیے۔" محی الدین نے حیرت سے اس بزرگ کو دیکھا جو ان کے لیے اجنبی تھا۔

"شاہ جی! آپ اپنے مہمان سے ملیے، میں بعد میں ملازم بھیج کر جوتے منگوا لوں گا۔" حاجی صاحب نے ایک نظر اجنبی شخص پر ڈالی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ محی الدین اثبات میں سر ہلا کر اجنبی بزرگ کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کہیے، کیسے آنا ہوا۔ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟" محی الدین کا خیال تھا کہ شاید جوتے وغیرہ بنوانے ہوں گے اور کسی سے ان کے متعلق سن کر آئے ہوں گے۔

"میں خیر دین ہوں۔ لاہور سے آیا ہوں۔"

خیر دین نے جو شاہ جی کے نام پر الجھ کر محی الدین کی طرف دیکھ رہا تھا، جن کے نقوش اسے کچھ مانوس سے لگ رہے تھے۔ جیسے پہلے کہیں انہیں دیکھا ہو لیکن کہاں، یاد نہیں آ رہا تھا؛ چونک کر محی الدین کی طرف دیکھا۔

"شجاع آپ کی صاحبزادے ہیں؟"

"جی۔" محی الدین نے سر ہلایا۔

"میں مہرین کا دادا ہوں۔" خیر دین نے مزید اپنا تعارف کروایا۔

"کون مہرین؟" محی الدین سمجھ نہ پائے۔

"کیا شجاع نے ذکر نہیں کیا کبھی مہرین کا۔ دونوں ہم جماعت تھے، اکٹھے پڑھتے رہے۔"

"ممکن ہے اپنی والدہ سے کبھی ذکر کیا ہو، لیکن ہم سے نہیں۔ آپ غالباً شجاع سے ملنا چاہتے ہیں۔"

محی الدین حیران سے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے ابھی کچھ دیر پہلے حاجی صاحب نے جو خیال ظاہر

کیا تھا، وہ سچ ہی نہ ہو۔

"شجاع سے بھی ملاقات ہو گی لیکن آپ سے بھی ملاقات ضروری تھی اور کچھ بات چیت کرنی تھی۔" خیر دین نے سوچ سوچ کر کہا۔

"تو پھر مناسب یہ ہی ہے کہ گھر پر چل کر آرام سے بات کرتے ہیں۔ شجاع سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔" محی الدین نے دکان سے باہر آ کر دکان کا دروازہ بھیڑ دیا۔

"یہ سامنے ہی گلی پار کر کے ہمارا غریب خانہ ہے۔"

خیر دین بنا کچھ کہے ان کے ساتھ چل پڑا۔ محی الدین نے حسب معمول دروازے پر دستک دی۔ شام تک دروازے کو اندر سے چٹخنی یا زنجیر نہیں لگائی جاتی تھی کہ محلے کی بچیاں کلثوم فاطمہ سے قرآن پڑھنے یا افشاں سے کڑھائی وغیرہ سیکھنے آتی رہتی تھیں۔ سو وہ دستک دے کر گھر میں داخل ہوئے تھے کہ کوئی پردے والی بی بی ادھر ہو تو پردے میں ہو جائے۔ دستک کے کچھ دیر بعد انہوں نے اندر قدم رکھا۔

"ہمارے ساتھ ایک مہمان ہیں، آپ اندر چلی جائیں۔"

انہوں نے کلثوم فاطمہ کے ساتھ تخت پر بیٹھ کر کسی قمیص کی ترپائی کرتی افشاں کی طرف دیکھا تو وہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں تو انہوں نے مڑ کر خیر دین سے کہا۔

"آئیے جناب۔"

خیر دین سر جھکائے ان کے پیچھے چھوٹا سا صحن عبور کر کے برآمدے تک آیا۔

"یہ ہماری والدہ ہیں۔" انہوں نے کلثوم فاطمہ کی طرف دیکھا۔ "اور یہ خیر دین صاحب ہیں، لاہور سے تشریف لائے ہیں۔"

خیر دین نے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام بھائی! جیتے رہیے۔" کلثوم فاطمہ نے بنا نظریں اٹھائے سلام کا جواب دے کر دعا دی۔

محی الدین نے موڑھوں کے ساتھ پڑی اکلوتی کرسی اٹھا کر تخت کے سامنے رکھی۔

"تشریف رکھیے جناب!"

خیر دین بیٹھ گیا۔

"اماں جان! یہ شجاع سے ملنے آئے ہیں۔ ان کی پوتی ہمارے شجاع کی ہم جماعت ہیں۔"

"شجاع تو ابھی چند لمحے پہلے ہماری دوائی لینے گئے ہیں، آتے ہیں ہوں گے۔ آپ کی آمد کا شکریہ، کہیے کیسے زحمت کی۔" کلثوم فاطمہ بھی ان کی آمد سے کچھ الجھ سی گئی تھیں۔

محی الدین نے برآمدے میں ہی ایک طرف پڑے نعمت خانے سے پھلوں کی ٹوکری نکالی جس میں سیب اور کیلے تھے۔ پھر لکڑی کی چھوٹی میز پر ٹوکری اور دو پلیٹیں رکھیں۔ ساتھ ہی چھری رکھی۔ کلثوم فاطمہ نے چھری اٹھا کر سیب چھیلنا شروع کیا۔ محی الدین نے ایک کیلا اٹھا کر خیر دین کی طرف بڑھایا۔

"لیجیے جناب! شجاع آتے ہی ہوں گے، یہ آگے شیخوں کی گلی میں ہی میڈیکل اسٹور ہے۔"

خیر دین حیران سا بیٹھا تھا۔ کیا یہ ایک جفت ساز کا گھرانا ہے۔ اتنی تہذیب' ایسا شائستہ لب و لہجہ...... تو سید کا دم چھلا لگانے کے باوجود ان کے خاندان کے افراد میں نہیں تھا۔ سعادت پروین کہنے کو معزز خاندان کی شیخانی تھی لیکن جب بولتی منہ پھاڑ کر ہی بولتی تھی۔

"لیجیے نا۔" محی الدین نے کیلا تھوڑا سا چھیل کر آگے بڑھایا جسے غیر ارادی طور پر خیر الدین نے پکڑ لیا۔

"محی الدین بیٹے! یہ لاہور سے تین چار گھنٹے کا سفر کر کے آئے ہیں۔ افشاں دلہن سے کہیے، چائے بنا لیں۔ شجاع آ جائیں تو باہر سے کچھ منگوا لیں اور پھر کھانے کا بھی انتظام کر لیں۔" کلثوم فاطمہ نے محی الدین سے کہا جو ان کے پاس ہی تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔

"نہیں...... نہیں۔ فی الحال چائے رہنے

دیں۔ راستے میں پی لی تھی۔ مجھے دراصل آپ سے اپنی پوتی اور شجاع کے متعلق کچھ بات کرنی ہے۔''

خیر دین یہاں تک آ تو گیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تا کہ کیسے بات شروع کرے۔ اس کا خیال تھا کہ مہرین کی طرح شجاع نے بھی گھر میں مہرین کا ذکر کر رکھا ہوگا۔ غریب ماڑا سا موچی یہ سن کر کہ اسے اپنی پوتی کے لیے اس کے بیٹے کا رشتہ منظور ہے، سن کر خوشی سے اچھل پڑے گا لیکن یہاں آ کر تو وہ خود ہی مرعوب سا ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس کے سامنے بیٹھا شخص ایک غریب جفت ساز ہی تو تھا لیکن اس کی شخصیت میں ایک وقار، ایک تمکنت سی تھی۔

''جی فرمائیے، ہم ہمہ تن گوش ہیں۔'' خیر دین کو خاموش دیکھ کر محی الدین نے کہا۔ تو خیر دین نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

''دراصل آپ کا بیٹا اور میری پوتی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ شجاع اچھا بچہ ہے۔ مہرین بہت تعریف کرتی ہے اس کی۔ آج وہ دور نہیں کہ ماں باپ نے جہاں جی چاہا رشتہ کر دیا۔ بچوں کی مرضی اور پسند کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے تو مجھے بھی اور میری بہو کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔''

''اگر آپ کو اعتراض نہیں ہے بھائی صاحب تو ہمیں بھی آپ کی پوتی کو اپنی بہو بنا کر خوشی ہوگی۔ زندگی تو بچوں نے ہی گزارنی ہے۔ آپ جب کہیں گے ہم اپنے بچے کا رشتہ لے کر آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو جائیں گے۔'' کلثوم فاطمہ نے جیسے خیر دین کی مشکل آسان کی۔

''جی...... لیکن جب میری بہو کو شجاع نے بتایا کہ اس کے والد جفت ساز ہیں تو وہ بھڑک اٹھی اور کہہ دیا کہ وہ ایک موچی کے بیٹے سے اپنی بیٹی کا رشتہ کسی صورت نہیں کرے گی۔ میں نے بھی انکار کر دیا۔''

محی الدین کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ کلثوم فاطمہ نے مضطرب ہو کر ہاتھ میں پکڑی چھری پلیٹ میں رکھ دی۔ شجاع کی پریشانی کی وجہ انہیں سمجھ میں آ گئی تھی۔

''سب انسان اللہ کے بندے ہیں بھائی صاحب! نہ کوئی پیشہ برا، نہ کوئی ذات۔''

''بخدا، مجھے آپ کی بات سے رتی بھر انکار نہیں ہے لیکن......''

محی الدین نے اپنی ناگواری چھپاتے ہو[ئے] خیر دین کی بات کاٹی۔

''ہم آپ کے آنے کا مقصد سمجھ نہیں پائے۔ آپ کو اپنی پوتی کا رشتہ ایک جفت ساز کے بیٹے [کو] دینے سے انکار ہے اور آپ......''

''انکار تھا...... لیکن یقین مانیے ہماری بہو بیٹا[...] بھی کہہ رہے تھے، میرے انکار کی وجہ شجاع کا جفت سا[ز کا] بیٹا ہونا نہیں تھا۔ میں تو خود ذات کا موچی...... کمی کمین عاجز مسکین ہوں۔ محی الدین صاحب پر میری مہر[ین] اصلی اور کھری سید ہے نجیب الطرفین...... اور میں شہا[ب] الدین بیٹے سے کیے وعدے کا پابند تھا۔ اس لیے ا[...] کرتا تھا لیکن پھر مہرین کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں گ[ئی] کھانا پینا نہ ہونے کے برابر...... دو ماہ میں پیلی زرد ہو [گئی] ہے۔ بس برداشت نہیں کر سکا اپنی بچی کی حالت اور [...] کہ زندہ لوگوں کی خوشیاں مردہ لوگوں سے کیے وعدوں سے زیادہ اہم ہوتی ہیں۔ اس لیے آپ [کے] پاس آ گیا۔ میرا بیٹا، بہو اور پوتے ضد لگائے بیٹھے [...] کہ کسی سیٹھ کا رشتہ قبول کر لیا جائے۔ لیکن میں جانتا ہ[وں] مہرین جی نہ پائے گی۔ آپ سے درخواست ہے کہ مہ[رین] پوتی کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے قبول کر لیں۔ میں خود [...] کا نکاح شجاع سے کر دوں گا۔ جب آپ کہیں [...] مہرین کے ساتھ آ جاتا ہوں۔'' اس نے محی الدی[ن کی] طرف دیکھا، کیسے مانوس سے نقوش تھے، د[...] بھالے......

''ہم آپ کی بات بالکل بھی نہیں سمجھ پا[ئے] ہیں۔ بزرگوار آپ کی پوتی کھری سید [...] آپ......'' محی الدین بے حد حیران تھے۔ کلثوم فا[طمہ] بھی حیرت زدہ سی تھیں۔

''جی، لمبی کہانی ہے۔ مختصراً عرض کرتا ہوں۔''

خیر دین سر جھکائے ماضی دہرا رہا تھا۔ اس [...] جب مامون الرشید نے درخشاں دلہن کے ساتھ [...]

[...]رین میں بٹھایا تھا اور کلثوم فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو [نک]ل نکل کر ان کے رخساروں کو بھگوتے جا رہے تھے۔

''سب کے سب شہید ہو گئے۔ بڑی سرکار، چھوٹے سرکار...... مامون صاحب کا آج تک پتا نہ چل سکا۔ زندہ ہوتے تو کبھی تو آ جاتے۔ جانتے تھے سب اتا پتا۔''

''اور زیب آپا کا خاندان......'' بے اختیار کلثوم فاطمہ کے لبوں سے نکلا۔

''اور وہ اور ان کا خاندان امرتسر سے واپس جاتے ہوئے سب کے سب...... رفیق بھائی نے بتایا تھا کسی نے انہیں اطلاع......'' خیر دین روانی میں بولتے بولتے چونکا۔

''لیکن آپ...... آپ کیسے جانتی ہیں زیب بی بی کو......''

''ہم کلثوم فاطمہ ہیں۔ آپ کے ہارون سرکار کی بہو......'' آنسو اور زیادہ روانی سے بہنے لگے تھے۔

''اور یہ محی الدین ہیں۔''

''بڑی دلہن......'' خیر دین یک دم کرسی سے اٹھ کر زمین پر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔

''آپ پر کیا بیتی...... کتنا ڈھونڈا سب نے...... آپ یہاں رہتے رہے اور ہم......''

''قسمت میں ایسے ہی لکھا تھا خیر دین چاچا۔ اوپر کرسی پر بیٹھیں۔ آپ جانتے ہیں ابا جان نے ہمیشہ سب کو اپنے برابر بٹھایا۔ کبھی کمتر نہیں جانا۔ آپ اوپر کرسی پر بیٹھیں خیر دین! ہمیں اس طرح آپ کا نیچے بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا۔''

کلثوم فاطمہ نے بھی محی الدین کی تائید کی تو خیر دین آنکھیں پونچھتے ہوئے اٹھا اور محی الدین کے ہاتھ تھام لیے اور بے تابی سے ان کے ہاتھ چومنے لگا۔ بار بار ان کی انگلیاں دیکھتا، ان کی کھردری نشان زدہ پوروں کو چومتا اور روتا جاتا۔

''یہ ہاتھ جوتے بنانے کے لیے تو نہیں بنے تھے سرکار!''

''خیر دین چاچا!''

محی الدین نے خیر دین کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپکی۔

''یہ اللہ کی طرف سے آزمائش تھی ہمارے لیے اور ہم نے اپنی سی پوری کوشش کی کہ اس آزمائش میں پورا اتر سکیں۔ ہم آپ کے بھی شکر گزار ہیں خیر دین کہ آپ نہ ہوتے تو ہماری درخشاں دلہن، ہمارے شہاب الدین، چھوٹی افشاں پھر مہرین سب کتنے اکیلے ہو جاتے۔'' انہوں نے اپنے آنسو دوپٹے کے پلو سے پونچھے۔

''ہمارے مامون، ہمارے لاڈلے بھائی ہمیشہ سے ہی دور اندیش تھے۔ انہوں نے آپ کو ان کے ساتھ روانہ کر کے کتنا اچھا کیا۔''

''کیسی باتیں کرتی ہیں بڑی دلہن!'' خیر دین نے اب بھی محی الدین کے ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ ''آپ یہاں تکلیف اٹھاتے رہے۔ محل سے اٹھ کر جھونپڑے میں آ بیٹھے۔ ہمارے گھر بھر کے لاڈلے محی الدین صاحب جوتے......'' اس کی آواز گھٹ گئی۔ وہ ایک بار پھر بے اختیار ان کے ہاتھ چومنے لگا۔

''آپ کو یاد ہے خیر دین چاچا! ایک بار ہم نے آپ سے کہا تھا، ہمیں جناح صاحب کے لیے جوتا بنا دیجیے۔'' خیر دین نے سر ہلایا۔ ''پھر ہم نے سوچا ہماری محبت اور عقیدت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم خود اپنے ہاتھ سے ان کے لیے جوتا بنائیں اور ہم آپ کے پاس عبد الستار کے ساتھ آئے بھی تھے کہ ہمیں جوتا بنانا سکھا دیں۔'' ضبط گریہ کی کوشش میں ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، ورنہ آج انہیں بھی جانے کیا کیا یاد آ رہا تھا۔

''سب یاد ہے...... ہم نے بڑے سرکار کو بتایا تھا تو وہ ہنس دیے اور انہوں نے کہا تھا۔

''ہاں خیر دین! ہمارے صاحبزادے کو جوتے بنانا سکھا دو تا کہ یہ اپنے ہاتھ سے جناح صاحب کے لیے جوتے بنا سکیں۔'' خیر دین نے اپنے رخسار پونچھے۔

''ہم اپنے ہاتھ سے ان کے لیے جوتے تو نہ بنا سکے لیکن شاید اسی لمحے ہماری تقدیر میں جوتے بنا کر اور گانٹھ کر رزق حلال کمانا لکھ دیا گیا تھا۔ ہم نے جناح صاحب کے

پاکستان میں جوتے بنا کر رزق حلال کمایا ہے۔

”میری جان آپ پر قربان سرکار! ہم عیش کرتے رہے اور آپ تکالیف اٹھاتے رہے۔“

خیر دین غم سے نڈھال ہو رہا تھا۔ محی الدین نے سہارا دے کر اسے کرسی پر بٹھایا۔

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے خیر دین! جس نے رہنے کو ٹھکانا دیا اور عزت کی روٹی۔ اللہ نے رحمت بھائی کو ہمارے لیے وسیلہ بنا کر بھیجا۔“

خیر دین نے سوالیہ نظروں سے کلثوم فاطمہ کی طرف دیکھا تو انہوں نے جو کچھ ان کے ساتھ بیتا تھا، ہولے ہولے کہہ دیا۔ خیر دین کے آنسو ایک بار پھر بہہ نکلے تھے اور افشاں جو اس دوران خاموشی سے آ کر کلثوم فاطمہ کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں، وہ بھی رو رہی تھیں۔ باوجود ضبط کے محی الدین کی بھی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

”یہ افشاں ہیں۔ ہمارے ماموں اور درخشاں کی لاڈلی بیٹی۔ ہمارے محی الدین کی دلہن۔“ بھیگی آنکھیں پونچھتے ہوئے کلثوم فاطمہ نے پاس بیٹھی افشاں کی طرف دیکھا۔

”بنی بنائی چھوٹی دلہن ہیں۔“

خیر دین نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا اور پھر محی الدین کی طرف دیکھا۔ ان کے مانوس نقوش...... وہی ہارون الرشید جیسی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی تب ہی تو وہ پہلی نظر میں آشنا سے لگے تھے۔

”خیر دین! ہمیں ہمارے شہاب الدین، ہمارے ماموں کی دلہن اور چھوٹی افشاں کے متعلق بتائیے۔ کیسے تھے...... شہاب الدین ہمیں یاد کرتے تھے......“

اور خیر دین سر جھکائے ان سب کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں بتانے لگا۔

”اتنی دیر ہو گئی، شجاع دوا لے کر نہیں آئے۔“

محی الدین کو اچانک خیال آیا اور وہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ حاجی صاحب کی باتیں تصور میں آنے لگیں۔ تب ہی شجاع اندر داخل ہوئے، اپنے آپ میں گم، بے خود سے......

”اتنی دیر......“ محی الدین کے لبوں سے نکلا۔

”ہاں، ہم بے دھیانی میں دوسری ہی گلی میں چلے گئے تھے۔“ شجاع نے نظریں اٹھائیں اور اس اجنبی بزرگ پر ٹھہر گئیں جو بے حد محبت اور شوق سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ خیر دین چاچا ہیں، مہرین کے دادا جان!“

”مہرین کے دادا۔“ شجاع کے لبوں سے نکلا پھر باری باری سب پر نظر ڈالی...... بھیگی پلکیں، بھیگے رخسار...... دوائیوں کا شاپر ہاتھ سے گر پڑا۔

”کیا...... کیا ہوا...... مہرین تو ٹھیک ہے نا۔“ اس کا دل جیسے پاتال میں گرا تھا۔

”ہاں اللہ کا شکر ہے، مہرین ٹھیک ہے۔“ خیر دین مسکرایا۔ ایک اطمینان بھری مسکراہٹ کہ وقت مرگ کیا جانے والا وعدہ پورا ہوا تھا۔

خیر دین نے اٹھ کر شجاع کو گلے لگایا اور اس کی پیشانی چومی۔

”میری مہرین بہت خوش قسمت ہے جسے آپ جیسا شریک حیات ملے گا۔“ شجاع ابھی تک حیرت زدہ سے کھڑے تھے۔

”افشاں دلہن! کھانے کا انتظام کریں، خیر دین کھانا کھا کر جائیں گے۔“ کلثوم فاطمہ نے افشاں سے کہا تو وہ فوراً کھڑی ہو گئیں۔

”نہیں...... بڑی دلہن! آپ سب کیا میرے ساتھ نہیں چلیں گی۔ آپ کی امانت آپ کے سپرد کریں۔ یہ محل جیسا گھر ہے آپ کا...... اور آپ یہاں اس چھوٹے سے گھر میں...... میرا دل پھٹ رہا ہے۔“

اب خیر دین انہیں تفصیل بتا رہا تھا۔

”سید صاحب نے تو مختار نامہ دیا تھا عبدالستار کو۔ دکانوں کی ملکیت تو آپ کی ہے بڑی دلہن۔“

”ہم تو اپنے اس چھوٹے سے گھر میں بہت مطمئن ہیں خیر دین! ہم نے اب اور کہاں جانا ہے۔ بس ہمارا دل تڑپ رہا ہے اپنے شہاب کی بچی کو دیکھنے اور گلے لگانے کو۔“

”تو بس پھر فیصلہ ہو گیا، ابھی آپ سب میرے ساتھ چلیں۔ باقی باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔“ خیر دین

اس دم ہی سب کا بزرگ بن گیا تھا۔

”گاڑی اور ڈرائیور گلی کے باہر موجود ہیں۔ شام ڈھلنے سے پہلے پہنچ جائیں گے ان شاء اللہ۔“

محی الدین نے کہا۔ ”شجاع گھر پر ٹھہرے رہیں، گاڑی میں ہم تینوں کی جگہ ہو گی۔“

سو فیصلہ ہو گیا۔ سب ہی مہرین سے ملنے کو بے تاب ہو رہے تھے۔ کلثوم فاطمہ کی آنکھیں بار بار بھر آتی تھیں۔

”ہمیں بھی تو کچھ بتائیے اماں جان! یہ سب کیا ہے؟ یہ مہرین کے دادا جان سے آپ کی کیا رشتہ داری نکل آئی؟“

شجاع حیران سے افشاں سے پوچھ رہے تھے جو جلدی جلدی کلثوم فاطمہ کے اور اپنے کپڑے استری کر رہی تھیں۔ محی الدین دکان بند کرنے باہر نکل گئے تھے۔ خیر دین وہاں ہی بیٹھا کلثوم فاطمہ سے گزرے دنوں کی باتیں کر رہا تھا اور افشاں استری کرتے ہوئے شجاع کو مختصراً سب بتا رہی تھیں اور شجاع حیران سا سب سن رہا تھا۔

☆☆☆

خیر دین نے حقے کی نے منہ سے نکالی اور عبدالستار کی طرف دیکھا۔ جو کافی دیر سے لاؤنج میں ادھر سے ادھر ٹہل رہا تھا۔

”اوئے عبدالستار! یہ تیری ٹانگوں میں کیوں چکر نی لگی ہوئی ہے۔ کیوں روڈ ماسٹر بنا ہوا ہے۔ بیٹھ جا آرام سے، جو بات کرنی ہے کر لے۔“

عبدالستار نے شاکی نظروں سے خیر دین کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ جس طرح چند دن پہلے خیر دین، محی الدین اور بڑی دلہن کے ساتھ اچانک آیا تھا، وہ ابھی تک اس دھچکے سے سنبھلا نہیں تھا۔ ایک تو سیٹھ سراج کے ساتھ پارٹنر شپ تو بس ختم ہی سمجھو، دوسرے گھر، دکانیں، کاروبار سب ہاتھ سے جاتا نظر آ رہا تھا۔ وہ کچھ بھی کرتا، حق دار اور مالک تو وہی تھے۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا کہ ایسا کیا کرے وہ کہ سب کچھ اس کا ہی رہے۔ گو نہ تو محی الدین نے اور نہ ہی کلثوم فاطمہ نے کوئی حق جتایا تھا۔ وہ تو مہرین سے مل کر اور شجاع و مہرین کے رشتے کی بات طے کر کے چلے گئے تھے۔ دادی اور تایا کی موجودگی میں وہ مہرین کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا تھا۔ یہ تو ان کا بڑا پن تھا کہ انہوں نے شجاع کے لیے مہرین کا ہاتھ ان سے مانگا تھا۔

”آپ کی اپنی بچی ہے۔“ عبدالستار نے کہا تھا۔ ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”نہیں۔ عبدالستار اور سعادت بیٹی، مہرین کو آپ نے پالا پوسا، اس لیے ہمیں تو آپ کے آگے ہی جھولی پھیلانا ہے۔“ کلثوم فاطمہ نے کہہ کر ان کا مان بڑھا دیا تھا لیکن عبدالستار بے چین اور مضطرب تھا۔

”اتنے سالوں سے دوسروں کے مال پر عیش کر رہا تھا، اب حق دار آ گئے ہیں تو اس کے پیٹ میں مروڑ کیوں اٹھ رہے ہیں۔ سمجھا اس کو سعادت پر دین۔“ خیر دین نے سامنے والے صوفے پر بیٹھی سعادت کی طرف دیکھا جو بار بار اضطراب سے پہلو بدلتی تھی اور انگلیاں مروڑتی تھی۔

”میں کیا سمجھاؤں، میری تو اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ یہ اچانک اتنے سالوں بعد مہرین کے رشتہ دار...... دادی، تایا، خالہ کہاں سے آ گئے اور پھر...... یہ تو کوئی فلمی اسٹوری لگتی ہے مجھے۔“

”بس...... تو اپنی سمجھ دانی پر زور نہ ڈال۔ اللہ کی حکمت وہ ہی جانے۔“ خیر دین نے گھر کا۔

”ابا جی بہت محنت کی میں نے۔ سب سے دستبردار ہو جانا اتنا آسان نہیں ہے۔“ عبدالستار جیسے تھک کر خیر دین کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔ ”یہ گھر...... دکانیں...... میرا کاروبار...... اس سب کو اتنے عروج پر میں نے پہنچایا ہے۔“

”ہے نا آخر موچی کی اولاد...... تھڑ دلا...... کم ظرف۔ وہ تو بڑے ظرف والے لوگ ہیں۔ بول کیا انہوں نے تجھ سے کچھ مطالبہ کیا۔ کہا کہ یہ گھر ان کا ہے۔ جانتا ہے نا آج بھی یہ گھر ہارون الرشید صاحب کے نام ہے، جس میں پچاس سال سے رہ رہا ہے۔“

”میں اس سے انکار تو نہیں کر رہا ابا جی پر......“

"پرشر کو چھوڑ اور دھیان سے سن۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ تو نے کتنا کمایا اور کتنی جائداد بنائی۔ تیرے دونوں بیٹے الگ الگ کاروبار کرتے ہیں۔ اپنے الگ الگ گھر ہیں۔ تو نے خود ایک کوٹھی گلبرک میں اور ایک شادمان میں لے رکھی ہے۔ تو خالی کروالے ایک کوٹھی اور یہ گھر بڑی دلہن اور محی الدین کے حوالے کردے۔" خیر دین نے فیصلہ سنایا تھا۔ عبدالستار خاموش رہا۔

"اب کیوں سانپ سونگھ گیا ہے تجھے، الوؤں کی طرح آنکھیں بند کیے جھوم رہا ہے...... الو کی اولاد نہ ہو تو......"

عبدالستار نے برا سا منہ بنایا تھا لیکن سعادت پروین کو ہنسی آ گئی تھی۔ یہ ابا جی بھی نا...... عبدالستار کے بجائے خود کو ہی برا بھلا کہتے ہیں...... کبھی موچی کی اولاد کہہ کر اور کبھی الو کی......

"تیرے کیوں دانت نکل رہے ہے سعادت پروین! اس الو کی دم کو سمجھاتی کیوں نہیں۔ روز محشر جواب نہیں دینا ہم نے۔" اس نے اپنا غصہ سعادت پر نکالا۔ "او، کسی کا حق مار کر جہنم کے کس درجے میں جائے گا تو عبد الستار! ذرا غور کر اور کیسے سامنا کرے گا وہاں حق داروں کا۔ وہ تو بھلے مانس اور نیک لوگ ہیں۔ ایک بار بھی زبان سے کچھ نہیں کہا، اپنی کٹیا میں خوش ہیں۔"

"ابا جی ٹھیک کہہ رہے ہیں نرگس کے ابو! اتنا عرصہ ہم ان کے گھر میں رہے، اب ان کے حوالے کریں۔ بڑی تکلیف اٹھائی انہوں نے۔ ہم گلبرک والی کوٹھی میں چلے جاتے ہیں اور جو کچھ ان کا حساب کتاب بنتا ہے، ان کے حوالے کرو۔ انصاف نہ کرنے والوں اور دوسروں کا حق مارنے والوں کی بخشش نہیں ہونے والی اور ہم نے اتنا جمع جوڑ کر کیا کرنا ہے۔ بچے سب سیٹ ہیں تو ہم کیوں دوزخ کی آگ سے پیٹ بھریں۔" سعادت نے سنجیدگی سے کہا تو خیر دین کی آنکھیں اور چہرہ ایک دم چمک اٹھا۔

"خوش رہ سعادت پروین! آج دل خوش کردیا تو نے اور اللہ کا شکر ادا کر عبدالستار کہ اس نے تجھے ہیرا دیا ہے، میں ایویں ہی اسے پتھر سمجھتا رہا۔ میری بہو تو ہیرا ہے ہیرا۔"

سعادت کے رخساروں پر اس عمر میں بھی سرخی بکھر گئی۔ عبدالستار نے دلچسپی سے اسے دیکھا تو اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر سعادت کے لبوں پر شرمگیں سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ٹھیک ہے ابا جی! آپ جس طرح کہیں۔" عبدالستار نے نظریں سعادت کے چہرے سے ہٹائیں۔ "میں گلبرک والی کوٹھی کے کرائے داروں کو خالی کرنے کا نوٹس بھجوا دیتا ہوں۔"

"جیتا رہ پتر! ویسے مجھے تم سے اس اچھائی کی توقع نہیں تھی۔ یہ سب تیری گھر والی کا کمال ہے۔" خیر دین ایک دم خوش ہو گیا تھا۔

"یہ آج اپنی بہو کو اتنا مکھن کیوں لگا رہے ہیں۔ خیر ہے نا۔" عبدالستار بھی پہلی بار ذرا ریلیکس ہو کر بیٹھ گیا تھا اور شریر نظروں سے سعادت کو دیکھنے لگا تھا۔

"میری بہو ہے ہی لاکھوں میں ایک۔ میں ہی کوتاہ نظر تھا اور یہ تو مسلسل میری بہو پر نظریں کیوں جمائے ہوئے ہے، دیکھ رہا ہوں، نظر نہ لگا دینا۔"

خیر دین کی بات پر دونوں ہی جھینپ گئے تھے۔

"اب بتائیں کیا کرنا ہے ابا جی! کیا محی الدین کاروبار دیکھیں گے۔" عبدالستار نے پوچھا۔

"اوہ نہیں۔ انہیں کہاں کاروبار کا تجربہ۔ میں تو چاہتا ہوں مارکیٹ ویلیو کے حساب سے جو کرایہ بنتا ہے۔ ہر ماہ تم محی الدین صاحب کو دے دو۔ تم بدستور کاروبار کرتے رہو۔ آج سے انارکلی والی دکانوں کا کرایہ بھی مہرین کے اکاؤنٹ میں ڈالو یا محی الدین کو دو۔ پچھلا حساب جو تھا وہ ختم سمجھو۔"

"پر ابا جی! انصاف تو یہ تھا کہ بیتے سالوں میں ان کے پیسوں سے جو انہوں نے کمایا، اس میں سے جو حصہ ان کا بنتا ہے وہ بھی دے دیا جائے۔" سعادت پروین آج زیادہ ہی اچھی بن رہی تھی۔

"مجھ سے ہضم نہیں ہو رہی تیری گھر والی کی باتیں۔ اگرچہ سولہ آنے صحیح کہہ رہی ہے پر میں بھی تیرا

باپ ہوں نا، اندر سے تھوڑا خود غرض اور کمینہ...... میں تجھے فقیر کر کے چورا ہے پر تو نہیں بٹھا سکتا اب۔ پر دل سے چاہتا ہوں کہ پورا نہ سہی تھوڑا انصاف تو ہو جائے۔ آہ وہ جو محلوں میں رہتے تھے، جھونپڑوں میں آ بسے اور ہم کچے گھروں میں رہنے والوں کو محل...... یہ سب میں نے اپنی طرف سے کہا ہے عبدالستار! ورنہ بڑی دلہن تو کہتی تھیں کہ جہاں ساری زندگی گزاری، جنازہ بھی اب وہاں سے ہی اٹھے گا۔ لیکن خیر منا لیں گے انہیں کسی نہ کسی طرح۔ پہلے ایک بار جا کر سب کو یہاں تو لے آئیں۔ باقی معاملات طے ہوتے رہیں گے۔"

خیر دین عبدالستار کی بات سن کر خوش ہو گیا تھا۔

"جی ابا جی! اب تو انہیں یہاں لے کر ہی آئیں گے، چاہے پاؤں پڑنا پڑے۔ جب اپنا گھر ہے تو غیروں کے در پر کیوں پڑی رہیں۔ بہت دکھ اٹھا لیے، بہت تکلیفیں سہہ لیں۔" آج سعادت پروین خیر دین کو مسلسل حیران کر رہی تھی۔

"ارے جب سوچتا ہوں سعادت پروین کہ جن کے گھروں میں دسیوں نوکر ملازم تھے، جن کے نام کے دن رات صدقے دیے جاتے تھے وہ جوتیاں بنا کر گزارا کرتے رہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔" خیر دین کی آواز بھرا گئی تھی۔

"آپ فکر نہ کریں ابا جی! آپ جو کہیں گے اور جیسا محی الدین صاحب نے چاہا ویسا ہی ہوگا۔" عبدالستار کھڑا ہو گیا۔

"میں پوری کوشش کروں گا کہ انصاف کر سکوں۔ پھر بھی کوئی کمی کوتاہی ہو گئی تو اللہ مجھے معاف کرے۔"

عبدالستار جو اتنے دنوں سے بے چین تھا کہ سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا یک دم ہی پرسکون اور مطمئن ہو گیا تھا۔

"ابا جی مجھے ضروری کام سے جانا ہے، سو چلتا ہوں۔"

"ہاں ہاں جیتا رہ، خوش رہ۔ جا پر میری ایک اور بات سن جا...... محی الدین اور بڑی دلہن سے یہ بھی درخواست کرنی ہے کہ شادی جتنی جلدی ہو سکے کر لیں۔ اسی سال میری عمر ہو گئی ہے اور بڑی دلہن بھی چار پانچ سال مجھ سے چھوٹی ہوں گی اور کتنے برس جئیں گے ہم، بچوں کی خوشیاں دیکھ لیں۔"

"ٹھیک ہے ابا جی! مہرین کی پڑھائی تو مکمل ہو چکی، اب شادی ہی تو کرنا ہے۔ سو چار دن پہلے کر لیں یا چار دن بعد کیا فرق پڑتا ہے۔ اب تو گھر کی بات ہے، کوئی لمبی چوڑی تیاری بھی نہیں کرنی پڑے گی۔ آپ کہیں تو کل ہی نکاح پڑھا دیتے ہیں مہرین اور شجاع کا۔" عبدالستار نے آج سعادت مندی کے سارے ہی ریکارڈ توڑ دیے تھے۔

"تو بس پھر کل صبح ہی چلتے ہیں۔" خیر دین نے حقے کی نے پھر منہ میں ڈالی۔

"لیکن ابا جی! مجھے نہیں کرنی اتنی سادگی سے اپنی مہرین کی شادی...... سب سے چھوٹی ہے۔ سارے ارمان نکالنے ہیں۔ کم از کم ایک ماہ بعد کی تاریخ لیجیے گا۔ کہہ رہی ہوں میں۔" سعادت نے جیسے وارننگ دی۔

"تو پھر کل صبح کا پروگرام پکا ہے ابا جی! میں ابھی تک اپنے داماد سے بھی نہیں ملا ہوں۔ ملاقات بھی ہو جائے گی۔" عبد الستار نے باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

"ہمارا داماد تو شہزادہ ہے شہزادہ......!" سعادت چہکی۔

"شہزادہ تو ہے پر ہے جفت ساز کا بیٹا امی جان!" مہرین اندر آتے ہوئے ہنسی۔ سعادت نے دیکھا، چند دنوں میں مہرین کا چہرہ نکھر گیا تھا اور آنکھوں کی چمک لوٹ آئی تھی۔

"وہ تو ہے۔"

سعادت نے قہقہہ لگایا تو عبدالستار بھی مسکرانے لگا۔ خیر دین حقہ گڑگڑاتے ہوئے مہرین کو دیکھ رہا تھا جو سعادت کے پاس بیٹھ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیا ہوا امی جان! ابی جان کا داماد جفت ساز کا بیٹا ہے پر ہے تو کھرا اصلی سید نجیب الطرفین۔" وہ خیر

دین کی طرف دیکھ کر ہنسی، اب کے خیر دین کا قہقہہ اتنا بلند تھا کہ سب کی ہنسی اس میں مدغم ہوگئی۔

☆☆☆

نیل گروں کی گلی میں آج بڑی رونق تھی کہ آج شجاع محی الدین کی بارات لاہور جا رہی تھی۔ سب تیار ہوکر چوک میں اکٹھے ہو رہے تھے۔ بس کا انتظام چائنا سلک والے ملک صاحب نے کیا تھا۔ جن کے بہنوئی کی بسیں چلتی تھیں۔ سو وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے بیٹے کو آواز دے کر کہتے۔

"سعید! ذرا اپنے مامے کو فون ملا۔ ایوبے (ایوب) نے کوچ بھجوائی ہے یا نہیں۔"

گلو کچھ دیر پہلے ہی دولہا کے لیے حاجی صاحب کی کار کو سجوا کر لایا تھا اور ہر ایک کو فخر سے بتاتا پھر رہا تھا۔

"لو جی ہادی بھائی! جب مجھ کو حاجرہ آپا سے ساری اسٹوری پتا چلی تو میں بھاگا بھاگا گیا شاہ جی کے پاس، ان کے گھر۔ حاجرہ آپا نے بتایا تھا مجھے کہ شاہ جی کے والد کتنے بڑے باپ کے بیٹے تھے۔ محلوں، جاگیروں، حویلیوں والے اور کیسی عاجزی کی زندگی گزاری، اس چھوٹی سی گلی کے چھوٹے سے گھر میں اور اب تو ظاہر ہے انہوں نے اپنے شان دار گھر میں چلے جانا تھا تو بس میں نے کہا...... شاہ جی بھلے آپ اپنے گھر چلے جائیں پر اپنے شجاع بھائی کی بارات تو یہاں سے ہی جائے گی لاہور...... اور دلہن کی ڈولی بھی ادھر ہی اترے گی۔ تو بس آپا جی کہنے لگیں...... دلہن کی ڈولی ہی نہیں آئے گی، شجاع کا ولیمہ بھی یہاں ہی ہوگا۔ جہاں سب گلی والوں کے ہوتے ہیں۔ قناتیں لگا کر۔" (چھوٹے بڑے سب ہی کلثوم فاطمہ کو آپا جی ہی کہتے تھے۔)

"اور میں نے تو ابھی سب سے کہہ دیا کہ اتوار کو ادھر کوئی ریڑھا ٹھیلا نہیں لگے گا۔ اپنے شجاع بھائی کا ولیمہ ہوگا۔"

"شاہ جی تو شادی کے بعد بھی یہ محلہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ کہتے تھے آدھی سے زیادہ ادھر ہی گزر گئی، باقی بھی ادھر ہی گزر جائے گی۔" ہادی نے بھی سب کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"پر اپنے حاجی صاحب نے سمجھایا کہ آپ کی تو گزر گئی پر شجاع کی تو ابھی پوری زندگی ہے۔ اسے اس کے حق سے محروم نہ کریں۔ وہ آپ کے والد کے گھر کا حقیقی وارث ہے۔ وارثوں کو ان کی وراثت سے محروم کرنے پر روز محشر آپ کی بھی پرسش ہو سکتی ہے۔ تب کہیں جا کر مانے شاہ جی اور آپا جی۔ اب ولیمے کے بعد جائیں گے اور حاجی صاحب سے کہا ہے انہوں نے کہ کسی بے گھر، ضرورت مند کو یہ گھر دے دیجیے گا۔"

"کیسے نایاب لوگ ہیں۔ حویلیاں، باغات، زمینیں سب کچھ پاکستان پر قربان کر دیا۔ کبھی نام تک زبان پر نہ آیا۔"

"اور کیا ہم نیل گروں کی گلی والے نایاب لوگ نہیں ہیں۔" گلو نے فخر سے گردن اکڑائی اور سوچا۔

مہنگے نے بلا اجرت دلہن کے کپڑے سیے، ہادی نے اعلان کیا کہ جو لیس، فیتہ، بٹن، موتی، گوٹا کناری چاہیے اٹھا لیں۔ جو روپے پیسے کا پوچھا۔ حاجی صاحب نے مہنگے سے کہا تھا، تمہارے خیال میں دلہن کے لباس کے لیے جو کپڑا تمہیں مناسب اور اچھا لگا اٹھا لے جاؤ۔

ستار شوز والوں نے کلثوم فاطمہ کے سامنے ایک سے ایک فینسی جوتوں کے ڈھیر لگا دیے۔

"آپا جی ہماری بہو کے لیے پسند کر لیں۔"

عبدالستار اور سعادت نے کچھ بھی بنانے سے منع کیا تھا لیکن گلی والوں کا خلوص اور محبت...... کلثوم فاطمہ کی آنکھیں بھیگ بھیگ گئیں۔

"کیسے لوگ تھے...... کتنے نایاب اور قیمتی۔"

بوسکی کے سوٹ پر سیاہ ویسٹ کوٹ پہنے شہ بالا بنا گلو اتراتا پھر رہا تھا۔ جب طابی جائے والے نے کوچ آ جانے کی اطلاع دی تو گلو فخر سے گردن اکڑاتا "میرا یار بنا ہے دولہا" گنگناتا ہر گھر کے دروازے پر دستک دے کر کوچ کے آنے کی اطلاع دیتا، محی الدین کے گھر کی طرف جا رہا تھا اور طابی چند دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر بھنگڑا اڈالنے لگا۔

☆☆

ماہم اوزلین

حماقت

وہ اپنے نومولود بیٹے کو گود میں لیے اسپتال کے کمرے میں موجود تھی۔ اس کی نظریں اس سفید کپڑے میں لپٹے گلابی وجود سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ اس کے موم جیسے ننھے ہاتھوں کو چھوتے ہوئے وہ اس خوب صورت رشتے کو محسوس کر رہی تھی، جو خوشی کے احساس سے زیادہ پر زور تھا۔

ارمغان دروازہ کھول کر تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہر انداز سے بے صبری اور خوشی واضح تھی۔

اس نے بچے کو ارمغان کی گود میں منتقل کر دیا۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ نرمی سے اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"بالکل۔" وہ مسکرائی۔ اسے اپنی زندگی مکمل لگ رہی تھی۔

"یہ میرے اوپر گیا ہے نا؟" وہ پُرجوش تھا۔

"بالکل نہیں! میری کاپی ہے۔" وہ اترائی۔

ارمغان نے ناک چڑھائی۔

"مجھے لگتا ہے کہ یہ میری طرح ہینڈسم بنے گا۔ میں اس کا نام حسان رکھوں گا۔"

یک دم اس کا پورا وجود ساکت ہو گیا، اس نے نظریں اٹھا کر ارمغان کے چہرے پر کسی قسم کے طنز کے کسی تاثر کو کھوجنا چاہا مگر ناکام رہی۔

☆☆☆

"پھوپھو...... پھوپھو!" وہ ٹرے ہاتھ میں پکڑے سہج سہج کر چلتی ہوئی لان سے ہی آوازیں دیتی آ رہی تھی۔ "کہاں ہیں آپ؟" لاؤنج میں پہنچ کر اس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور چار سو گردن گھما کر دیکھا۔

"یہاں ہوں۔" گھر کے کسی کونے سے آواز آئی اور اریبہ تو اس گھر کا ایک ایک کونا جانتی تھی سو پھرتی سے ٹرے ہاتھ میں پکڑے اسٹور روم کی جانب چلی آئی۔

"میں آپ کے لیے یہ لائی...... ہائے کیا کر رہی ہیں آپ؟" اس نے منہ پر دوپٹا رکھا۔

پھوپھو نے جھاڑن سے اسٹور روم کی چیزوں کو جھاڑا تو فضا میں پھیلی گرد کے باعث اسے کھانسی کا

دھکا سا لگ گیا۔

''صفائی کر رہی ہوں۔'' پھوپھو نے بے نیازی سے کہہ کر دوبارہ جھاڑن کاٹھ کباڑ پر ماری۔ فضا میں پھیلی گرد میں یک دم اضافہ ہوا اور اریبہ سے یہ اضافی حملہ بالکل نہ سہا گیا وہ الٹے قدموں باہر کی جانب دوڑی چلی آئی۔

کچن میں پہنچ کر اس نے ٹرے پٹخنے کے انداز میں رکھی اور فریج سے پانی کی بوتل نکال کر منہ لگالیا۔

''کچھ لائی تھیں تم؟'' پھوپھو پیچھے کھڑیں معصومیت سے بول رہی تھیں۔

''ہاں!'' اریبہ نے اپنے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھا اور آگے بڑھ کر ٹرے پر ڈھکا دستر خوان ہٹایا۔ مسالے کی اشتہا انگیز خوشبو فضا میں پھیلنے لگی۔

''میں نے چکن اسٹیک بنایا تھا، تو آپ سب کے لیے لے کر آگئی۔'' اس نے دو منٹ پہلے کے دردناک حملے کو بھلا کر خوش دلی سے کہا۔

''چکن کو سینک کر تم نے کون سا تیر مارلیا۔'' پھوپھو ناک پر سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہتی لاؤنج کی جانب چلی آئیں۔ انہوں نے اس ٹرے کو شاید نظر بھر بھی نہ دیکھا تھا اور اریبہ نے یہ واضح محسوس کیا تھا۔

''پھوپھو! چکن سینکا نہیں ہے، چکن اسٹیک بنایا ہے۔ یہ ڈش سب کو بہت پسند ہے۔'' وہ ان کے پیچھے پیچھے لاؤنج تک آئی۔

پھوپھو بنا جواب دیے، جھاڑو اٹھا کر ایسے زور زور سے پھیرنے لگیں کہ گویا اس کی محنت پر جھاڑو پھیر رہی ہوں۔

''پھوپھا کہاں ہیں؟'' اس نے اپنے بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے امید سے پوچھا۔ وہ جانتی تھی کہ صبا ابھی تک کوچنگ سے نہیں آئی ہوگی۔

''آئے نہیں ابھی تک۔'' بے مروتی سے کہہ کر وہ تیز تیز جھاڑو لگانے لگیں۔

''حسان؟'' اس نے پوچھا۔ اور نظریں لاؤنج سے لے کر حسان کے کمرے تک دوڑائیں کہ شاید حسان کی کوئی ایسی چیز نظر آجائے جو اس کی موجودگی کی گواہی دے۔ مگر فی الحال کچھ نظر نہیں آیا۔

''تمہیں کیا کام ہے اس سے؟''

''کچھ نہیں۔'' اس کے چہرے پر مایوسی نے رنگ جمایا۔ ''میں جا رہی ہوں۔''

''کون جا رہا ہے؟'' تولیے سے بال رگڑتے حسان نے کمرے سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

اریبہ کے چہرے سے مایوسی رفو چکر ہوئی اور ایک چمک سی پھیل گئی۔

''میں نے یہ اسٹیک بنائی ہے۔'' اس نے جوش سے ٹرے کی جانب اشارہ کیا۔

''ارے واہ! زبردست۔'' اشتیاق سے کہتا وہ ڈائننگ چیئر کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھا۔ ''چمچہ؟ کانٹا؟''

''ابھی لائی۔'' وہ خوشی خوشی لپک کر کچن میں جا کر چمچہ کانٹا لے آئی۔

اریبہ ڈائننگ چیئر گھسیٹ کر بیٹھنے لگی مگر کوئی خیال آنے پر رک گئی۔ کچھ تھا جو وہ بھول رہی تھی۔ اس نے پلٹ کر پھوپھو کو دیکھا تو وہ خشمگیں نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔ اوہ! پھوپھو کا یہی حسب توقع ردعمل ہی تو وہ بھول گئی تھی۔

''تمہیں مرچوں والے کھانے پسند نہیں ہیں۔'' پھوپھو نے حسان کے سر پر پہنچ کر ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

''نہیں تو!'' مزے سے کہتا وہ واپس دلجمعی سے اسٹیک کھانے لگا۔

اریبہ نے صورت حال کو پوری طرح سے سمجھتے ہوئے وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت سمجھی۔

☆☆☆

وہ پھوپھو کے گھر کی لان کی دیوار کے ساتھ بنے دروزے سے گزر کر اپنے گھر میں آئی۔ دادا نے یہ دونوں گھر اپنی اولاد کے لیے بنوائے تھے اور فاصلوں کو کم کرنے کے لیے لان کی دیوار کے ساتھ ایک درمیانی دروازہ بھی بنوایا تھا۔ دونوں گھروں کی بناوٹ تقریباً

ایک سی تھی اور ایک جیسی بناوٹ تو دلوں کی بھی ہوتی ہے مگر یہ سوچ ہوتی ہے جو دلوں میں فاصلوں کا باعث بنتی ہے۔ وہ سر جھٹک کر لاؤنج میں آگئی۔

نوین بھابھی نے اسے دیکھ کر اسٹیک کی پلیٹ لا کر اس کے سامنے رکھی۔

''جب تمہیں پتا ہے کہ تمہاری لاکھ کوشش کے باوجود بھی پھوپھو تم سے خوش نہیں ہوں گی تو کیوں اتنی محنت کرتی ہو؟'' انہوں نے نوٹ کیا تھا کہ جتنی خوش وہ گئی تھی اتنی خوش واپس نہیں آئی تھی۔

''ہمارے اپنے ہم سے جتنا ناراض ہو جائیں مگر ایک امید ہمیشہ بندھی رہتی ہے، کیونکہ وہاں پلس پوائنٹ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمارے خون کے رشتے ہوتے ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولی۔

''تم اس امید کے بل بوتے پر ہمیشہ ثابت قدم نہیں رہ سکتیں۔ جلد ہی تمہیں سمجھ میں آجائے گا کہ تم ایک چکنی چٹان پر چڑھنے کی کوشش کر رہی ہو، تم پھسل کر واپس وہیں آتی رہو گی جہاں سے سفر شروع کیا تھا۔'' وہ تاسف سے بولیں۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ آپ میری اور پھوپھو کی محبت سے جلتی ہیں۔ آفٹر آل میں آپ کے ساتھ کھانے کے بجائے ان کے پاس اسٹیک لے کر جو چلی گئی۔'' وہ واپس اپنے رنگ میں آتی ہوئی شوخی سے بولی۔

''محبت؟'' وہ تقریباً چلائی تھیں۔ ''کیا سات پردوں میں چھپا کر رکھتی ہیں تمہاری پھوپھو اپنی محبت؟ مجھے تو آج تک نظر نہیں آئی۔ اور مجھے یقین تھا کہ تم ان کے ساتھ اسٹیک کھانے ضرور گئی ہو مگر آخر میں منہ لٹکائے میرے ساتھ ہی کھا رہی ہو گی۔'' انہوں نے ناک پر سے مکھی اڑاتے ہوئے کہا۔

اریبہ ان کی بات پر ہنس پڑی، کیونکہ نوین بھابھی کا یقین کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

''میں اماں کے لیے کھانا گرم کر دوں۔'' اریبہ کہہ کر اٹھنے لگی۔

''ارے بیٹھ جاؤ! میں نے کھانا گرم کر دیا اور اماں نے کھا بھی لیا۔ اب بس ہم دونوں نند بھاوج ساتھ بیٹھ کر کھائیں گی۔'' نوین بھابھی نے کہہ کر اسٹیک کا بڑا سا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔

☆☆☆

وہ رات کے کھانے کے بعد ٹیرس پر ٹہلتی ہوئی بھابھی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا اور بھابھی کا معمول تھا کہ وہ رات کے کھانے کے بعد کی چائے ٹیرس پر پیتی تھیں۔

''دھپ!'' یک دم اسے کہیں سے زور سے دراوزہ بند ہونے کی آواز آئی۔ اس نے نظریں گھما کر اپنے ٹیرس کے دروازے کو دیکھا مگر وہ تو گرل کا تھا۔ وہ الجھ کر سوچتی واپس ٹہلنے لگی کہ اس کی نظر ریلنگ کے ساتھ کھڑے کالے کپڑوں میں ملبوس ایک وجود پر پڑی۔ اس وجود نے اس کی جانب پیٹھ کی ہوئی تھی اور رخ ریلنگ کی طرف تھا۔ وہ بے پاؤں چلتی اس وجود کی جانب آئی۔

''حسان؟'' وہ آہستہ سے ریلنگ کے پاس جا کر بولی۔

''اوہ تم؟ یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ اسے دیکھ کر بولا۔

''تم اس وقت ہمارے ٹیرس پر کھڑے ہو۔''

''ہاں۔ وہ سامنے والے گھر میں شاید نئے لوگ شفٹ ہوئے ہیں، ابھی میں نے دو حسین لڑکیوں کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔ ہمارے ٹیرس سے منظر واضح نہیں تھا تو میں تم لوگوں کی چھت پر کود گیا۔'' وہ شوق سے بولا۔

''تمہیں نہیں لگتا کہ یہ چیپ حرکتیں تم پر زیب نہیں دیتیں؟'' وہ تنک کر بولی۔

''ہاں زیب تو نہیں دیتیں، مگر مجھ جیسے حسین لڑکے کا دل بہت اچھا اور محبت کرنے والا ہے اس لیے میرے خیال میں اس دل سے تھوڑا تھوڑا تو سب کو فیض یاب ہونا چاہیے نا؟'' وہ پوری طرح سے منہ میاں مٹھو بنا۔

''جاؤ ہمارے ٹیرس سے، یہ ایسے کاموں کے لیے نہیں ہے۔'' اس نے اسے باقاعدہ پکڑ کر اس

کے ٹیرس کی دیوار تک پہنچایا۔ ''دوبارہ یہاں نظر نہ آنا۔'' اس نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی اور تیز تیز قدموں سے پلٹ گئی۔

''ارے رکو! سوری یار۔ میں تنگ کر رہا تھا۔ اصل میں تو میرا پورا دل ہی تمہارا ہے۔ سن تو لو۔'' اس نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

سڑھیوں تک جاتی اریبہ کے کان میں اس کا جملہ پڑا مگر وہ رکی نہیں۔ اب اس کی حرکت کی اتنی سزا تو بنتی ہی تھی۔

☆☆☆

''اریبہ! تیار کیوں نہیں ہو رہی ہو تم۔ وہ لوگ انتظار کر رہے ہیں۔'' بھابھی اسے تیسری بار بلانے آئی تھیں اور اسے وہی گھریلو حلیے میں دیکھ کر زچ ہو گئیں۔

''میں نہیں جاؤں گی ان لوگوں کے سامنے۔ آپ کو سب پتا تو ہے بھابھی پھر آپ کیوں زبردستی کر رہی ہیں۔'' اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں سب جانتی ہوں اس لیے کہہ رہی ہوں۔ تمہاری اماں سے پھوپھو کی پرانی رنجشیں ہیں۔ دادا ابا نے بیٹی ہونے کے ناطے انہیں پسند کی شادی نہیں کرنے دی اور تمہارے ابا کو اجازت دے دی۔ وہ جب سے اس بات کو پکڑے بیٹھی ہیں۔''

''اب تو ان کی شادی ہو گئی، بچے جوان ہو گئے۔ وہ پرانی باتوں کو بھول کیوں نہیں جاتیں؟'' وہ روہانسی ہوئی۔ اس کی اماں کا ایسا کوئی قصور تو نہیں تھا کہ پھوپھو ان سے تاعمر کی ناراضی باندھ کر بیٹھ جاتیں۔

''فی الحال تم یہ مت بھولو کہ تمہاری اماں کو پھوپھو کی جانب سے ملنے والی تکالیف نے انہیں فالج کا مریض بنا دیا ہے۔ تم یقیناً ان کی اس حالت میں ان کے لیے مزید کسی دکھ کی وجہ نہیں بننا چاہو گی۔'' بھابھی نے اسے احساس دلایا۔

وہ اپنی آنسو پیتی چپ چاپ تیار ہونے کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

''ابا! مزید روٹیاں بنا دوں؟'' اریبہ نے کچن میں کھڑے کھڑے لاؤنج میں کھانا کھاتے ابا سے آواز لگا کر پوچھا۔

''نہیں بیٹا، الحمد للہ۔ میں کھا چکا۔'' کھانے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے ابا نے جواب دیا۔

اس نے سن کر سر ہلایا اور توے کی آنچ ہلکی کرنے لگی۔

''مگر میں کھاؤں گا۔'' لاؤنج سے آواز آئی۔

اس نے پلٹ کر کچن سے نظر آتے لاؤنج کو دیکھا تو سامنے ہی حسان کھڑا تھا۔ ڈھیلی ٹائی اور فارمل شرٹ پینٹ پہنے، غالباً وہ ابھی آفس سے لوٹا تھا۔

''دراصل میں آفس سے گھر گیا تو امی اور صبا بازار گئے ہوئے تھے، مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ باہر سے کچھ آرڈر کروانے سے بہتر ہے کہ میں ماموں کے ساتھ بیٹھ کر گھر کا بنا صحت بخش کھانا کھا لوں۔'' وہ ابا کے سامنے کھڑا جھجکتا ہوا بتا رہا تھا۔

''ارے بیٹا! اتنی وضاحت کیوں دے رہے ہو؟ تمہارا جب دل چاہے آؤ۔ کھاؤ پیو، آرام کرو۔ تمہارا پورا بچپن اس گھر میں گزرا ہے تو اتنا تکلف کس بات کا۔'' وہ نرمی سے بولے۔

''اریبہ بیٹا روٹیاں ڈال دو حسان کے لیے۔'' ابا نے اریبہ کو دیکھ کر کہا۔

حسان تابعداری سے ابا کے برابر میں بیٹھ گیا۔

''میں نماز پڑھنے جا رہا ہوں۔'' عشا کی اذان کی آواز سن کر ابا اٹھ کھڑے ہوئے۔

''میں رات کے کھانے میں پراٹھے کھاتا ہوں۔ خستہ، نرم اور گول۔'' حسان نے اریبہ کو آواز لگا کر کہا۔ ابا کے اٹھتے ہی حسان کی ساری تابعداری بھی رخصت ہو گئی۔

''یہاں ہوٹل کھلا ہوا ہے کوئی؟ جو فرمائشیں کر رہے ہو؟'' وہ پراٹھا بیلتے ہوئے بظاہر تنک کر بولی۔ مگر سامنے سے دیکھنے پر اس کے لبوں پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

''مہمان ہوں میں اس وقت یہاں۔ میری ہر فرمائش کا ادب کرنا تمہارا فرض ہے۔'' وہ اسے

چھیڑتے ہوئے بولا۔

''ہمارے گھر میں تواتر سے تمہاری موجودگی میرے اندر میزبان والی کیفیات نہیں پیدا کر پاتی۔''

''وہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے، ورنہ روزانہ آنے کے باوجود بھی گھر والے میری مہمان داری میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔''

''تو ابھی بھی مجھے کیوں آرڈر دے رہے ہو؟ باقی گھر والوں سے ہی بولو نا۔'' اس نے پراٹھے کو چمٹے سے سینکتے ہوئے کہا۔

''یار بنا دو نا۔ قسم سے بہت بھوک رہی ہے۔'' وہ منت کرتے ہوئے بولا۔

وہ مسکرائی اور ہاٹ پاٹ اٹھا کر لاؤنج میں آ گئی۔

صرف دو؟'' وہ ہاٹ پاٹ کا ڈھکن اٹھا کر بولا۔ ''ایک انسان صبح سے بھوکا پیاسا، تھکا ہارا آفس سے گھر آیا ہے اور تمہارے خیال میں اتنے مزے کے کوفتوں کے ساتھ یہ ہتھیلی جتنے پراٹھے میرے لیے کافی ہوں گے؟''

''دس پراٹھے بنا دوں گی آپ کے لیے عالی جاہ؟'' وہ طنز سے بولی۔

''نہیں نہیں، تم ایسا کرو کچن میں جا کر پراٹھے بناتی جاؤ۔ جب میرا پیٹ بھر جائے گا تو بتا دوں گا۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

اس نے بس ایک نظر اسے گھورا اور کچن میں آ کر بقیہ آٹے کے پیڑے بنانے لگی۔

''اور بنا دوں؟'' مزید دو پراٹھے بنانے کے بعد وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''نہیں۔ کافی ہیں۔ تمہاری سروس سے مطمئن ہو گیا میں۔'' اس نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

وہ سامنے رکھے تخت پر بیٹھ گئی۔

''اچھا سنو!''

اریبہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''فرحین اور شرمین نام ہے۔'' وہ آہستہ سے سرگوشی بھرے انداز میں بولا۔

''کیا؟'' وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگی۔

''سامنے گھر میں جو نئی لڑکیاں آئی ہیں ان کا۔'' وہ شرارت سے بولا۔

''حسان! تم چاہ رہے ہو کہ میں تمہیں باہر کا راستہ دکھا دوں؟'' اس نے ہاتھ سے باہر دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

تم جیلس ہو رہی ہو؟'' وہ ہنس کر بولا۔

''تمہیں وہ امینہ یاد ہے؟ بچپن میں ہمارے پڑوس میں رہتی تھی۔ تین بار تم مجھے چھوڑ کر اس کی گڑیا کے ساتھ کھیلنے چلے گئے۔ پھر یاد ہے میں نے کیا کیا تھا؟'' اس نے مطمئن لہجے میں پوچھا۔

''تم نے اس بے چاری کی گڑیا توڑ دی تھی اور پھر اس نے مجھ سے دوستی۔'' وہ بے ساختہ یاد کر کے ہنسا۔

''بالکل!'' وہ مسکرائی۔ ''تم اس کا مطلب جیلسی مت سمجھنا، بس مجھے بچپن سے تمہاری توجہ کی عادت ہے، اس توجہ سے انسیت سی ہو گئی ہے تو اس میں بٹوارا مجھے پسند نہیں۔''

''ہاں میں مطلب سمجھ گیا، تم نے ان ڈائریکٹ مجھ سے اعتراف محبت کیا ہے۔''

''ہرگز بھی نہیں۔'' اس نے بے نیازی سے ہاتھ جھلایا۔

☆☆☆

''مجھے تو اس رشتے میں کوئی خامی نظر نہیں آ رہی، لڑکے کی اچھی جاب ہے، اکلوتا ہے۔ ہماری اریبہ کے لیے بہت اچھا رہے گا یہ ابا۔'' سمی بھیا نے اس کے آنے والے پرپوزل کے بارے میں ابا سے رائے لینی چاہی۔

''ہاں چھان بین کروالی میں نے، کوئی قابل گرفت بات نہیں نظر آئی۔ بس اریبہ سے پوچھ لو۔ یہ راضی ہو گی تو ہی ہم جواب دیں گے ان لوگوں کو۔''

چائے نکالتی اریبہ ابا کی بات پر چونکی۔ سب اس کی رائے جاننے کے لیے اس کی جانب ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے مدد طلب نظروں سے بھابھی کو دیکھا۔ وہ اپنے منہ سے انکار کر کے اپنی پسند کے

بارے میں کیسے بتاتی۔ کاش بھابھی ہی کوئی بہانہ کر کے انکار کردیں۔

''اریبہ جاؤ کچن میں جا کر ہنڈیا دیکھ لو، جل نہ جائے کہیں۔'' بھابھی نے اسے منظر سے ہٹایا۔ اس سے زیادہ وہ اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتی تھیں۔

پانچ منٹ بعد ہی بھابھی کچن میں آگئیں۔

''اگر تم اس رشتے کے لیے سچ میں راضی نہیں ہو تو تم ایک دفعہ حسان سے بات کرلو، اگر وہ پھوپھو کو منا کر رشتہ بھیج دے تو اس صورت میں میں تمہاری مدد کروں گی، ورنہ میں تمہیں ان دیکھی آگ میں جلنے نہیں دوں گی۔''

''وہ اتنی جلدی کیسے منائے گا پھوپھو کو؟'' وہ بھابھی کے آئیڈیے پر مطمئن نہیں تھی۔

''اریبہ! جو جذبوں میں سچے ہوتے ہیں ان کے لیے ہر رکاوٹ اپنے مضبوط ارادوں کے آگے ڈھیر ہوجاتی ہے اور جو جذبوں میں ہی مضبوط نہ ہوں، بہانوں کی فہرست ان کے پاس ہی ہمیشہ پائی جاتی ہے۔''

☆☆☆

وہ خاموشی سے سر جھکائے صوفے پر بیٹھی تھی۔ خالی گھر سے اسے وحشت ہورہی تھی۔ سب اس وقت ہسپتال میں پھوپھو کے پاس موجود تھے۔ کسی نے اسے ساتھ لے جانے کے لیے نہیں پوچھا تھا کیونکہ ابا بھیا کی نظر میں اس سب کی ذمہ دار آخر وہی تو تھی۔ اس کی ہی غلطی تھی کہ اس نے حسان سے محبت کی، اس کی ہی غلطی تھی کہ اس نے حسان کو شادی کے لیے پھوپھو سے بات کرنے کا کہا اور یہ بھی اس کی غلطی ہی تھی کہ حسان کے زور دینے پر پھوپھو کو نیند کی ادویات وافر مقدار میں کھانے کے باعث ہسپتال جانا پڑا۔ ہر چیز کا ذمہ اس کے سر تھا۔ مگر وہ پھر بھی ہسپتال فون کر کے پھوپھو کی خیریت پوچھنا چاہتی تھی، وہ سب کو بتانا چاہتی تھی کہ وہ اپنی پھوپھو سے بہت محبت کرتی ہے، وہ انہیں اس حال تک نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ وہ بتانا چاہتی تھی کہ جیسا پھوپھو سمجھ رہی ہیں ویسا نہیں تھا، اس کی ماں نے بے شک پسند کی شادی کی تھی مگر اپنی بیٹی کی تربیت بُری نہیں کی تھی۔ وہ سب بتانا چاہتی تھی مگر بتا نہیں سکتی تھی۔ ایک زہر تو وہ تھا جو پھوپھو کے وجود میں دوڑ رہا تھا اور ایک زہریہ سوچوں کا تھا جو اس کے ذہن کو مفلوج کررہا تھا۔

پھوپھو کے گھر میں گاڑی آنے کی آواز آئی تو وہ فوراً درمیانی دروازہ عبور کر کے ان کے لان میں پہنچی۔ سامنے حسان عجلت میں گاڑی سے اتر رہا تھا، اس کے ساتھ صبا بھی تھی۔ صبا اسے دیکھ کر اندر کی جانب بڑھ گئی، حسان رک گیا۔

''مجھے معاف کردینا اریبہ! میں نے...... میں نے سچے دل سے تم سے محبت کی تھی مگر......'' وہ رکا تھا۔ ''میں اپنی ماں کو نہیں کھوسکتا۔'' اس کا لہجہ بہت ٹوٹا ہوا تھا۔

''تم نے صحیح فیصلہ کیا ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں کہتی واپس مڑگئی۔ اس کے قدم تیزی سے اپنے گھر کی جانب بڑھ تھے۔ یوں جیسے وہ بھاگنا چاہتی ہو، دور جانا چاہتی ہو، ان حالات سے، اس تکلیف سے، حسان کے کہے جملے سے۔

☆☆☆

فجر پڑھ کر اس نے سلام پھیرا۔ اور وہیں سستی سے جائے نماز پر بیٹھی رہی۔ لان میں چلتی ٹھنڈی ہوا اسے راحت بخش رہی تھی۔ پھوپھو کے تین دن پہلے صحت یاب ہو کر گھر آنے کے باوجود بھی وہ ان سے ملنے نہیں گئی تھی، وہ ان کا سامنا نہیں کرسکتی تھی، یا شاید وہ حسان کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس دن کے بعد سے اس نے حسان کو نہیں دیکھا تھا نہ دیکھنے کی کوئی کوشش کی تھی۔ وہ اپنے ماضی کو حال کا حصہ نہیں بنانا چاہتی تھی۔ ابا اور بھیا نے اگلے مہینے اس کی شادی ارمغان کے ساتھ طے کردی تھی مگر وہ اس بھٹکے ہوئے ڈسٹرب ذہن کے ساتھ کسی نئے رشتے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر بہت دل سے اپنے لیے بہتری کی دعا کی۔ بارش کی بوندیں پھوار کی صورت اس پر گریں۔ اس نے سر اٹھا کر گلابی آسمان کو دیکھا۔ لمحوں میں بارش کی بوندوں میں تیزی

آگئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ان بوندوں کو محسوس کرنا چاہا۔ آہستہ آہستہ ان بوندوں میں اس کے آنکھوں سے نکلتا نمکین پانی بھی شامل ہونے لگا۔ وہ پانی جس میں دکھ تھا، تکلیف تھی، اذیت تھی۔ بارش کی بوندیں اس کے آنسوؤں کو اپنے اندر سموئے زمین میں جذب ہورہی تھیں، اس کے دکھ اپنا وجود کھو رہے تھے۔ بارش کے رکتے ہی اس نے آنکھیں کھول کر صبح صادق کی بکھری نیلی نیلی پھیلی روشنی میں اردگرد بکھری گھاس اور پودوں کو دیکھا۔ سب کچھ بارش سے دھل کر نکھر گیا تھا، دھول کی تہ غائب ہونے سے رنگ واضح ہوگئے تھے۔ اس کا دل بھی نکھر گیا تھا، سب کچھ واضح ہوگیا تھا۔ دکھ اور اذیت کی گرد چھٹ گئی تھی۔

☆☆☆

''تم اس سب کے لیے دل سے تیار ہو؟'' بھابھی اس کا دوپٹا سیٹ کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''ایسے رشتے زبردستی بنتے بھی نہیں ہیں۔'' وہ اپنا ٹکا سیٹ کرتے ہوئے مسکرائی۔ آج اس کے نکاح کی تقریب تھی۔

''حسان نہیں آیا۔'' انہوں نے یاسیت سے کہا۔

''میں چاہتی بھی نہیں تھی کہ وہ آئے۔'' اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔

''اریبہ؟ یہ وقت موزوں تو نہیں ہے پوچھنے کے لیے مگر تمہارے دل سے اس کی محبت اتنی جلدی کیسے نکل گئی؟''

''بھابھی محبت ایک جذبہ ہے جو ہمیشہ سے اس دنیا میں موجود ہے۔ مگر ایک احساس انسیت کا بھی ہوتا ہے، سب انسیت کو محبت سے کنفیوز کردیتے ہیں۔ جب تک کوئی نظروں کے سامنے ہوتا ہے تو دل کے پاس ہوتا، جب نظروں سے اوجھل ہوتا تو اس کا وجود بے معنی ہوجاتا ہے۔ یادوں کا جال نہیں جکڑتا، مگر جب کوئی خود ان یادوں میں کھو کر اذیت کو مقدر بنائے اور اس انسیت کو محبت کا نام دے کر دکھوں کا اشتہار لگائے تو اس کے لیے زندگی اندھیری بند گلی کی مانند ہوجاتی ہے۔ مگر جو اس سب سے باہر نکلنا چاہے اسے راستہ اللہ خود فراہم کرتا ہے۔''

بھابھی نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میں تمہارے لیے بہت خوش ہوں۔ اللہ نے تمہیں ارمغان کی صورت راستہ فراہم کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تمہاری زندگی کو خوشیوں کی سیج تک لے جائے گا۔''

☆☆☆

''اگر میں حسان کے بجائے دایان نام کا مشورہ دوں تو؟'' اریبہ نے سامنے کھڑے ارمغان سے کہا۔

''دایان مطلب حاکم یا سردار؟ ہاں یہ نام بھی اچھا ہے۔'' اس نے سر ہلا کر اس کے بتائے نام کو منظوری دی۔

''تھینک یو اس تحفے کے لیے۔'' اس نے محبت سے کہا تھا۔

''تھینک یو مجھے اپنے زندگی میں شامل رکھنے کے لیے۔'' وہ مسکرائی۔

ارمغان یک دم ہنسا۔

''تم ہماری شادی کے دو سال بعد بھی یہ جملہ کہہ رہی ہو؟''

''محبت میں کوئی بھی بات دو سال بعد کہی جائے یا دو سو سال بعد۔ شرط یہ ہے کہ دل سے کہی جائے۔''

''مجھے تمہاری محبت پر کوئی شک نہیں ہے۔'' اس نے اس کا ڈرپ لگا ہاتھ نرمی سے تھاما۔

''مجھے آپ کی محبت پر ہمیشہ سے یقین ہے۔'' اس نے اس کے ہاتھ نرم گرفت کے لمس کو دل سے محسوس کیا۔

''میں ڈاکٹر کے پاس سے آتا ہوں۔'' وہ بچے کو اریبہ کی گود میں ڈالتا باہر چلا گیا۔

اریبہ اپنے بیٹے کو گود میں لیے مسکرا رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ محبت اس دنیا کا ایک نیچرل جذبہ ہے، سب کی زندگی میں آتا ہے مگر ایک وہ محبت ہوتی ہے جو عورت کی حماقت کا نتیجہ ہوتی ہے جب وہ خود کو کسی انسان کی وقتی توجہ کے حصار میں پا کر اسے محبت کا نام دے دیتی ہے اور اسی کے ساتھ خوش نہیں رہ پاتی، مگر ایک محبت وہ ہے جو اللہ عورت کے دل میں ڈالتا ہے، شوہر کے لیے۔ وہ محبت خوشی اور سکون کا دوسرا نام ہوتی ہے۔

☆☆

اے دل بے خبر

صدف ریحان گیلانی

دوسری اور آخری قسط

"مردوں کی جان کیسے ایک پل میں نکالنا ہے۔ خوب جانتی ہو تم لوگ۔ یہ جو اللہ نے ایک ہتھیار دے دیا ہے نا تم سب کو۔ اس کا استعمال بھی کرنا خوب آتا ہے تم سمیت ساری لڑکیوں کو۔ ہنی کا بھی یہی کام ہے۔ وہ بھی ایسے ہی۔" سبطین اعوان کی ہنستی آواز پھر سے سر پر ہتھوڑے کی طرح برسی تھی۔ اس نے دوسرا تکیہ کھینچ کر چہرے پر رکھ لیا۔ مگر کیا اس طرح ان آوازوں سے بچنا ممکن تھا؟ جواب کسی تلوار کی طرح اندر سے کاٹ رہی تھیں۔

یہ محبت اتنی بھی وسیع القلب نہیں جتنا بے خبر لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔ جہاں یہ بہت کچھ دان کرتی ہے وہیں بہت کچھ چھین بھی لیتی ہے۔ کہیں یہ رہبر ہوتی ہے تو کہیں راہزن بھی۔ فاتح سالاروں کا سا مزاج رکھتی ہے یہ محبت۔ مفتوحوں سے خراج لیے بنا نہیں ٹلتی۔ اور اب تابعہ توثیق کو مان لینا چاہیے کہ وہ ان ہی میں سے ہے۔ جنہیں یہ محبت نامی بلاکم بخت بھی اپنے آگے سر اٹھانے کی اجازت نہیں دیتی۔

"مجھے ایک ماہ کا ٹائم چاہیے۔" اس کا حد درجے سنجیدہ لہجہ تابعہ کی جان نکال لے گیا تھا۔

"ایک ماہ۔" اس کے منہ سے یہ دو لفظ نہیں بلکہ ایک چیخ نکلی تھی۔

"ایک ماہ کہا ہے۔ ایک سال نہیں۔ اونچا سنتی ہو کیا؟" اس نے فوراً تنبیہ کی تھی۔

"میرے کان ٹھیک ہیں۔ سن لیا ہے میں نے اور آپ کو بتایا بھی تھا اگلے ہفتے بابا آرہے ہیں۔ ادھر بی جان نے میری جان شکنجے میں پھنسائی ہوئی ہے۔ جس مشکل میں اس وقت میں ہوں۔ آپ کو اندازہ ہی نہیں اس اذیت کا۔ مجھے اس الجھن سے نکالنے کے بجائے آپ ایک ماہ کا ٹائم چاہ رہے ہیں۔ مجھے تو لگنے لگا ہے کہ بی جان سچ ہی کہتی ہیں۔ آپ کو مجھ سے بالکل محبت نہیں آپ کے لیے صرف وقت گزاری کا ذریعہ ہوں میں۔" وہ مارے دکھ کے پھٹ پڑی تھی۔ ادھر وہ بھی کم بیزار نہیں تھا۔

"تمہاری بی جان کے فرمودات کا کوئی جواب نہیں ہے میرے پاس۔ یہ ساری الٹی سیدھی پخ انہی کی لگائی ہوئی ہیں۔ ہنی کو ساتھ لانے کا حکم انہوں نے ہی صادر کیا ہے نا۔ اب بھلا بتاؤ اسے اس حالت میں کیسے لے آؤں؟"

"کس حالت میں؟" اک پل کو اس کے آنسو تھمے تھے۔ ساتھ دھڑکن بھی۔

"اف۔ ایک تو اس عمر میں تمہاری یادداشت کا یہ عالم ہے تو آگے جانے کیا بنے گا۔ میری جان' میری زندگی' میری چاہت اول تمہیں اگر یاد ہو تو میں نے بتایا تھا کہ پاؤں سلپ ہونے سے ہنی کے ٹخنے کی ہڈی نکل گئی ہے۔ ڈاکٹر نے اسے ایک ماہ کا بیڈ ریسٹ ریکمنڈ کیا ہے۔ بے حد تکلیف میں ہے وہ۔ اب کیا اس حال میں اسے اٹھا کر لے آؤں اور وہ بھی کس مقصد کے لیے؟ ہاں ٹھیک ہے میں اس سے وہ محبت نہیں کرتا جو مجھے تم سے ہے۔ مگر پھر بھی۔ انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے یار۔ تابی پلیز تم تو سمجھو اس بات کو۔" اور وہ کیسے نہ سمجھتی جب وہ اتنے پیار بھرے القابات کے ساتھ سمجھا رہا تھا۔

"اوہ ہاں۔ آپ نے ذکر کیا تھا۔ سوری مجھے یاد نہیں رہا۔ لیکن اب ہوگا کیا۔ تین دن بعد بابا پہنچ رہے ہیں۔ مجھے تو ان کے سامنے کا سوچ کر ہی ڈر لگ رہا ہے۔ میں انہیں کیسے فیس کر پاؤں گی۔ میرے تو ابھی سے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ رہے ہیں۔"

"اوہ کم آن ڈارلنگ۔ محبت کرنے والے کبھی بھی ڈرپوک نہیں ہوتے۔ اور تم نے کیا غلط کیا ہے بھلا۔ محبت ہی تو کی ہے۔ اور یہ ہرگز بھی گناہ نہیں۔ سب بہت اچھا ہوگا۔ تم ٹینشن مت لو۔ میں ابھی بات کرتا ہوں بی جان سے سمجھاتا ہوں انہیں اپنا مسئلہ۔" اس کا مخصوص حلاوت بھرا لہجہ کانوں میں رس گھولتا اس کے ہر خدشے کو بھاپ بنا کر اڑا چکا تھا۔

☆☆☆

توثیق احمد نہایت خوش اخلاق' ملنسار اور باغ وبہار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ جب بھی وطن آتے تو خاندان بھر کے علاوہ ان کے دوستوں کا بھی تانتا بندھ جاتا۔ کوئی ملنے آرہا ہے تو کوئی جارہا ہے۔ صبح سے شام تک یہی

سلسلہ چلتا رہتا۔ ان کی آمد کے ساتھ ان سب کی مصروفیات کا گراف بھی انتہائی اوپر چلا جاتا۔ سارا سال صرف پڑھنے لکھنے اور اپنی مرضی سے سونے جاگنے والی تابعہ اور عمارہ بھی ان دنوں ماں کے سنگ کچن کی رونق بڑھا رہی ہوتیں۔ اور توقیر کو تو وہ اپنے پاس سے ہلنے بھی نہیں دیتے تھے۔ وہ بھی سال بھر کی تابع داری کا کوٹہ ان ہی دنوں میں پورا کرلیتا۔ نا کوئی گیم نا بے کار کی آوارہ گردی۔ بس بابا اور ان کے احکام جن کی بجا آوری اس کا فرض اولین بن جاتے۔ بی جان ان دنوں میں اس سے بہت خوش رہا کرتی تھیں۔ اور وہ تو آج کل بھی بے حد مسرور نظر آرہی تھیں۔ صبح جب تابعہ بابا کے لیے چائے لے کر ان کے بیڈ روم میں گئی تو وہ بھی وہاں موجود تھیں۔ دونوں ماں بیٹا سر جوڑے باتیں کررہے تھے۔ اسے آتے دیکھا تو مسکرا کر خیر مقدم کیا۔

"آؤ۔ آؤ تابعہ بیٹا۔ یہاں بیٹھو میرے پاس۔ ماشاءاللہ میری بیٹی تو بہت سگھڑ ہوگئی ہے۔ جب سے آیا ہوں۔ مصروف ہی دیکھ رہا ہوں اسے۔ یہ چائے بھی تم نے بنائی ہے؟" انہوں نے پوچھا تھا۔

"جی بابا جان۔" اس نے سر ہلایا۔

"ہم۔۔۔ اچھی ہے چائے۔ چلو بھئی ڈن ہو گیا۔ اب میں جتنے روز کے لیے یہاں ہوں میری چائے صرف میری بیٹی ہی بنائے گی۔" انہوں نے محبت سے اسے دیکھا۔

"جی ضرور کیوں نہیں اور میں آپ کے لیے کھانے بھی بناؤں گی۔ مما سے آج کل سیکھ رہی ہوں میں۔" اس نے خوش دلی سے اپنی کارگزاری بتائی۔

"گڈ۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ یعنی آج کا کھانا بھی میری بیٹی کے ہاتھ کا۔ کیوں بی جان پھر آج لے لیں یہ رسک؟" وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے ان سے پوچھ رہے تھے۔

"ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ بھئی رسک لینا تو پڑے گا۔ اس کے علاوہ اب چارا جو نہیں۔" انہوں نے بیٹے کی ہمنوائی کرتے اسے پرسوچ نظر سے دیکھا تھا۔

"چلیں جی میرے کھانے کی فکر تو دور ہوئی۔ لیکن آپ ثمرین کو سمجھا دیجیے گا۔ شام میں آنے والے مہمانوں کے لیے کوئی تردد مت کرے۔ ان کے لیے تمام کھانا میں آرڈر کردوں گا۔ بس آپ اپنی بہو سے مشورے کے بعد لسٹ مجھے دے دیں۔ اور بھی کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ بھی بتادیں۔"

"آج کے مہمانوں کے لیے کھانا باہر سے آئے گا۔ لگتا ہے بابا جان آج آپ کے کوئی خاص دوست تشریف لا رہے ہیں۔" کمرے کا پھیلاوا سمیٹتے ہوئے اس نے برسبیل تذکرہ پوچھا تھا اور انہوں نے حیران ہوکر بی جان کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟ کیا آپ نے ابھی تک تابعہ کو بتایا نہیں؟"

"ارے ہاں وہ اتنی مصروفیت رہی کہ بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ ابھی بتا دیتی ہوں میں اسے اور ہاں وہ تم نے کہیں جانا بھی تھا۔ تو پہلے وہاں سے ہو آؤ۔ پھر آکر سارے انتظامات اپنی نگرانی میں ہی کروانا۔" ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد وہ پھر بابا سے بات کررہی تھیں اور اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ یقیناً کوئی غیر معمولی بات تھی۔ کچھ الگ۔ اور کیا؟ یہ اسے اب جاننا تھا۔ بابا کے کمرے سے جاتے ہی وہ لپک کر ان کی طرف آئی۔

"کیا بات ہے بی جان۔ کیا چھپایا ہے آپ نے مجھ سے؟ کون سے مہمان۔ کیسے انتظامات؟ کون آرہا ہے آج۔"

"آئے ہائے لڑکی چھری تلے دم تو لے لو۔ سب بتاتی ہوں تمہیں۔ بلکہ کیا بتاؤں۔ سب کچھ تو جانتی ہو تم۔ میں نے بتایا ہی تھا تمہیں۔ اور تو اور تمہارے باپ نے ٹیلی فون بھی کیا تھا تمہیں۔ بس اسی سلسلے کی پہلی کڑی جوڑ رہے ہیں آج۔" ان کا اطمینان قابلِ رشک تھا اور اس کی کیفیت نا قابل بیان۔ کئی لمحے وہ انہیں دم سادھے دیکھتی رہی۔ پھر مسلسل نفی میں سر ہلاتے پیچھے ہوئی۔

"نہیں۔ نہیں آپ اس طرح نہیں کرسکتیں میرے ساتھ۔ بی جان۔ آپ نے وعدہ کیا تھا مجھ سے۔ آپ نے ایک ماہ کا ٹائم دیا تھا سبط۔۔"

"ششش...... بس یہیں خاموش ہوجاؤ۔ نام بھی مت لینا۔ نہ میں نے کوئی وعدہ کیا تھا اور نہ ہی ٹائم دیا تھا۔ ارے وہ بد بخت تم سے مخلص ہوتا تو ساری مجبوریاں کاٹ کر اب تک آچکا ہوتا۔ تم کیا سمجھتی ہو اس کی بیوی سچ میں انہی دنوں میں معذور ہوکر بستر پر جا پڑی ہے۔ ارے نہیں میری بھولی بچی وہ صرف ٹال رہا تھا تمہیں۔ ایسے آوارہ گردوں نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوتا ہے۔ سب ڈرامے بازیاں آتی ہیں انہیں۔ میں نے تمہیں پہلے ہی سمجھایا تھا یہ سب اس کے لیے صرف دل لگی ہے۔ تم دل سے مت لگانا۔ مگر تم تو لگتا ہے ابھی تک اسی فریب میں الجھی ہوئی ہو۔"

"نہیں بی جان آپ بالکل غلط سمجھ رہی ہیں۔ وہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس نے کوئی جھوٹ نہیں بولا میرے ساتھ۔ کوئی فریب نہیں دیا اس نے مجھے۔ پلیز آپ سمجھیں اس بات کو۔" اس کی روتی ہوئی صورت پر انہیں اک پل کو ترس آیا تھا۔ مگر اگلے ہی پل غصہ عود آیا۔

"سمجھنے کی ضرورت مجھے نہیں، تمہیں ہے تابعہ توثیق۔ خدا کا واسطہ ہے اب تو عقل کے ناخن لے لو۔ اپنے نیک نام باپ کے سر میں خاک مت ڈال دینا۔ کتنے عرصے کے بعد تو وہ بے چارہ گھر آیا ہے۔ اور کیا کیا نہ سوچ رکھا ہوگا اس نے۔ دیکھو کس قدر خوش ہے وہ اور کیا تم چاہتی ہو اس کی تمام خوشی تمہارے ہاتھوں ملیا میٹ ہوجائے۔ ایک نیا فساد اٹھانا چاہتی ہو اس کی پرسکون زندگی میں۔ کیا تمہیں پال پوس کر اس مقام تک لانے والا باپ اس بات کا حق دار ہے کہ تم اس پر کسی غیر کو فوقیت دو؟ ٹھیک ہے اگر تمہارا دل مانتا ہے۔ تم میں ہمت ہے تو جاؤ۔ ابھی جاکر بتاؤ اسے اپنے کرتوت۔"

"آ...... آپ کا کیا دھرا ہے یہ سب۔ آپ ہی نے بابا کو دیے یہ الٹے سیدھے مشورے۔ میں نے جب پہلے ہی بتا دیا تھا کہ مجھے اس رشتے سے صاف انکار ہے تو کیوں آنے دی یہ نوبت۔ آپ نے دھوکا دیا ہے مجھے۔ سب جانتے بوجھتے آپ نے میری خوشیاں برباد کی ہیں۔ آپ تو چاہتی ہی نہیں تھیں۔ اسی لیے اتنی کڑی شرائط رکھیں ان کے سامنے۔ آپ پر اعتماد کرکے غلط کیا میں نے۔" ان کے دوٹوک لہجے پر وہ تو گویا پھٹ پڑی۔ جو منہ میں آیا بولتی چلی گئی۔ بی جان اتنا کچھ سن کر بھی تحمل سے مسکرائیں۔

"بالکل سچ کہہ رہی ہو۔ غلط کیا تھا تم نے۔ تمہیں ایک انجان ہستی پر اعتبار کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ اب انجام دیکھ لیا۔ تم تو شکر ادا کرو اللہ پاک کا۔ جس نے تمہیں ہر طرح کی آفت سے بچائے رکھا۔ وہ تو کرم ہے اس کا جو مجھے اس سارے کھیل کی خبر ہوگئی ورنہ تو جسے تم روشنی سمجھے بیٹھی ہو وہ آگ اب تک ہم سب کے دامن جلا گئی ہوتی۔" اور وہ رو دی تھی۔

"کیا ہوا ہے۔ کیوں رو رہی ہے یہ؟" توثیق احمد اس کی آواز سن کر گھبرائے ہوئے اندر آئے تھے۔

"ارے کچھ نہیں ہے بیٹا۔ یہ وہی رونا ہے جو عموماً لڑکیاں ایسے موقعوں پر رویا کرتی ہیں۔ تم جاؤ باہر میں بات کررہی ہوں اس سے۔" اور وہ شفقت سے مسکراتے پلٹ گئے تھے۔ وہ ان کے پیچھے جانے کے ارادے سے اٹھی تھی کہ بی جان نے کلائی پکڑلی۔

"اگر میرے اتنا سمجھانے کے باوجود بھی تم نے اپنی نادانی کا قصہ باپ کو سنانا ہے۔ تو جاؤ سناؤ جاکر مگر یاد رہے کہیں بھی میرا نام مت لینا۔ اکیلی اپنے سر پر جیت سکتی ہو یہ معرکہ تو جاؤ جیت لو جاکر۔ کیوں کہ تمہارے پیچھے تو وہ بھی نہیں ہے جس کی خاطر یہ جنگ چھیڑو گی۔ باپ تمہارا پہلے ہی بیمار ہوچکا ہے دن رات تم لوگوں کے لیے محنت کرکرکے۔ اب تم اسے اپنے ہاتھوں مارنے کا سوچ چکی ہو تو ٹھیک ہے۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں پھر۔" اور ان کی اتنی بے گانگی پر اس کی سسکیاں چیخوں میں بدل گئی تھیں۔

☆☆☆

لگتا تھا آج سارا عالم ادھر کا ہی رخ کر گیا ہے۔ علامہ اقبال ایئر پورٹ پر بے پناہ رش تھا۔ ہشاش بشاش چہرے تو کوئی اداس۔ کوئی ہنستا ہوا تو کوئی روتا ہوا۔ کئی منزل تک آ چکے تھے تو کچھ سفر پر روانگی کے لیے تیار۔ بی جان اور بابا کا شمار بھی انہی آخرالذکر مسافروں میں تھا۔ بی جان کی تو خوشی دیدنی تھی۔ آج وہ من چاہے سفر پر جو جا رہی تھیں۔ ان کے تو لبوں سے مسکراہٹ ہی جدا نہ ہو رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تیر رہے تھے۔ یونہی ہنستے روتے وہ کبھی ثمرین کو نصیحتیں کرنے لگتیں تو کبھی توقیر کو پکڑ لیتیں۔

"توبہ ہے بی جان آپ تو ایسے سبق رٹا رہی ہیں جیسے کہ ایک ماہ کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں۔" عمارہ ہنستے ہوئے کہہ گئی۔

"اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ میں تو چاہتی ہوں اپنے رب کے گھر جاؤں تو کبھی واپس ہی نہ آؤں۔ وہیں رہنے کا ٹھکانا مل جائے، چاہے اک کونا ہی سہی۔ پوری دنیا میں اک وہی تو جگہ ہے جہاں جا کر واپسی کی آرزو نہیں رہتی۔" ان کا لہجہ جذب و عقیدت سے معمور تھا۔

"ارے بی جان مت بھولیں آپ کو وہاں ایک ماہ کا ٹھکانا مل رہا ہے۔ آپ وہاں چاہے جس کونے میں بھی چھپ جائیں۔ لیکن ویزے کی میعاد مکمل ہوتے ہی انتظامیہ آپ کو ڈھونڈ کر لے آئے گی۔ اس لیے دھیان کیجیے گا۔" توقیر کی برجستہ شرارت پر سب مسکرا رہے تھے۔ علاوہ اس کے جو سب سے الگ تھلگ اک طرف ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ یوں گویا ان سب سے خفا ہو۔ (اور اس میں کوئی شک بھی نہیں تھا) وہ تو لگتا تھا اوروں سے ہی نہیں بلکہ خود سے بھی روٹھ گئی ہو۔ بی جان کے تو دل کو ہول پڑا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل بڑی آپا سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے چہرے پر نظر پڑتے ہی ان کے سارے تفکرات بھاپ بن کر اڑ گئے۔ وہ چہرہ کیا تھا گویا ان کی دعا مجسم ہو کر سامنے آ گئی تھی۔ انتہائی خوش شکل اور خوش اطوار احتشم جلال نے تو جیسے ان کی کھوئی ہوئی توانائی بحال کر دی تھی۔ ورنہ تو شاید وہ دھڑکا ان کی جان ہی لے لیتا۔ انہیں اپنے فیصلے پر ناز ہوا۔ انہیں یقین تھا وہ دن دور نہیں جب ان کی عزیز از جان پوتی بھی ان کی دور اندیشی کو سراہے گی۔ مگر فی الحال تو وہ جس طرح منہ بنائے کھڑی تھی۔ وہ ان کے لیے اذیت ناک تھا۔

بڑی آپا کو جب ان کے توثیق کے ساتھ عمرہ پر جانے کا علم ہوا تو انہوں نے بھی جھٹ پٹ تیاری کر ڈالی تھی۔ یوں اب وہ بھی اس بابرکت سفر پر ان کے ہمراہ جا رہی تھیں۔ سارا خاندان انہیں رخصت کرنے آیا ہوا تھا۔ احتشم بڑی آپا کے شانے پر بازو پھیلائے ان سے جانے کہاں کہاں کے قصے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی خوش باش سی ہنستے مسکراتے محو گفتگو تھیں۔ بی جان کو بے اختیار نانی اور نواسے کی محبت پر رشک آیا۔ ان کی فلائٹ کی روانگی کی اناؤنسمنٹ ہو رہی تھی۔ سب ان سے مل رہے تھے۔ اور وہ احتشم کا بازو پکڑے اس کی جانب بڑھیں۔ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم اس اچانک افتاد کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔ گھبرا کر ہاتھ کھینچنا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ مضبوط و توانا انگلیوں اور ہتھیلی کے درمیان اس کا نازک سا ہاتھ مکمل طور پر قید ہو چکا تھا۔

"تم جانتے ہو نا احتشم بیٹا۔ مجھے اپنی یہ گڑیا کتنی پیاری ہے؟ اور مجھے پوری امید ہے تم ہمیشہ میرا مان رکھو گے۔ اسے گرم ہوا سے بھی بچا کر رکھو گے۔ اس کا اتنا ہی خیال رکھو گے جتنا کہ اپنی ذات کا۔ یہ اب تمہارے حوالے ہے بیٹا۔" اور ان کے "بیٹے" نے پہلے بغور اس کی تھرتھراتی پلکوں اور رنگ بدلے چہرے کو دیکھا تھا پھر مسکرا کر انہیں۔

"آپ کو مجھ سے کبھی مایوسی نہیں ہو گی بی جان۔ میں آپ کی گڑیا کا بالکل اسی طرح خیال رکھوں گا۔ جیسا آپ چاہتی ہیں۔ آپ مطمئن ہو کر جائیں۔ اب آپ کی ہر فکر ختم۔" اس کے سنجیدہ و متین لہجے نے بی جان کو سرشار کر دیا۔ فرط محبت سے اسے گلے لگا کر روشن پیشانی چوم لی۔

☆☆☆

چہار سو عجب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بی جان اور بابا کے جانے سے تو لگ رہا تھا پورا گھر ہی خالی ہو گیا ہے۔ ایئر پورٹ سے واپسی کے بعد سب ہی تھک کر سو چکے تھے۔ اک بس وہی بے کل روح بنی ادھر سے ادھر گھوم رہی تھی۔ نیند کا تو کہیں شائبہ تک نہ تھا۔ کتنا بے بس ہے نا انسان بھی۔ اپنی ہی کتاب زیست میں اپنی مرضی کا رنگ نہیں بھر سکتا۔ آخر ایسا ہی کیوں ہوتا ہے؟ جو وہ دل سے چاہتا ہے وہ اسے نہیں ملتا۔ اور جسے وہ چاہتا ہی نہیں وہی اس کے مقدر میں لکھ دیا جاتا ہے۔ جس لڑکی نے کبھی ناپسندیدہ لباس زیب تن نہ کیے ہوں وہ تمام عمر ان چاہے مرد کے ساتھ کیسے زندگی گزارتی ہے؟ کیسے زندہ رہتی ہے وہ؟

"اف۔ بی جان آپ نے بالکل اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔ بالکل بھی نہیں۔ میں ہرگز معاف نہیں کروں گی آپ کو۔ میں آپ سے ناراض رہوں گی۔ آپ نے ایک عورت ہوتے ہوئے میری مشکل کو نہیں سمجھا اور مجھے ایک مسلسل اذیت میں پھنسا دیا۔" تابعہ کو لگ رہا تھا اب بھی اس کا ہاتھ اسی گرفت میں ہے۔ وہ بار بار ہاتھ جھٹک رہی تھی۔ بلکہ اسے تو وہ ہاتھ اپنی گردن کے گرد شکنجہ کستے محسوس ہو رہے تھے۔ زندگی کبھی اس قدر قابل نفرت بھی لگے گی یہ تو کبھی تصور تک نہیں کیا تھا۔

"بی جان مجھے یہ ہاتھ پکڑا کر گئی ہیں۔ میرے حوالے کر گئی ہیں۔ تو کیا ہم انہیں ساتھ ہی نا گھر لے چلیں؟" وہ انتہائی سادہ اور مدبرانہ انداز سے کہہ رہا تھا۔ اس نے بوکھلا کر اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا تھا۔ جبکہ ثمرین اور عاصمہ ہنس پڑی تھیں۔ عاصمہ نے تو اس کے شانے پر اک چپت رسید کی۔

"بی جان کا تمہیں ہاتھ پکڑانے کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ تم ان کی پوتی کو اپنے گھر لے جاؤ۔ ارے لڑکے وہ سب خیریت سے واپس آ جائیں تو پھر پورے تزک و احتشام کے ساتھ تمہاری دلہن کو لے کر جائیں گے۔ ابھی چھوڑو اسے اپنی ماں کے ساتھ جانے دو۔" اور اس نے تابع داری کی اعلیٰ مثال قائم کرتے فوراً گرفت کھول دی تھی۔

"ارے بیٹا اب یہ ہماری کہاں رہی۔ یہ تو ہمارے پاس کچھ وقت کے لیے ہے۔ یہ تو امانت ہے تمہاری۔ جب چاہو لے جانا۔" ثمرین نے پیار سے دونوں کو دیکھا تھا۔ اک ساتھ کھڑے کتنا جچ رہے تھے۔

اسے تو ماں سے بھی گلہ تھا۔ اس روز بی جان نے بابا کو تو ٹال دیا تھا۔ مگر اس کا رونا چلانا سن کر ثمرین بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔

"تابعہ میری جان' میری بچی کیوں رو رہی ہو۔ ارے ایسے تھوڑا روتے ہیں بے وقوف لڑکی۔ توبہ ہے تم نے تو میری جان ہی نکال دی۔ ارے یہ دن تو نصیب والیوں پر آتے ہیں۔ اتنا بہترین بر' اچھا گھر اور کیا چاہیے تمہیں۔ تم تو شکر ادا کرو۔ اللہ نے یہ دن دکھایا ہے۔"

"نہیں کرنا مجھے شکر۔ نہیں چاہیے مجھے یہ گھر۔ اگر ایسا ہی اچھا بر ہے تو آپ عمارہ کا رشتہ کر دیں وہاں۔ مجھے نہیں شادی کرنا اس سے۔ مجھے صرف......" اور روتے چلاتے ہوئے وہ ماں کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ گئی تھی۔ ثمرین کو تو جیسے سکتہ ہی ہو گیا۔ وہ ٹکر ٹکر اس کا منہ تکے جا رہی تھیں۔

"ارے اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو اسے بی بی۔ یہ سب تمہاری دی گئی ناجائز نرمیوں کا نتیجہ ہے۔ اب بھگتو۔ کہتی تھی میں مت دو انہیں وہ آفتی آ لے اور اگر دے ہی رہی ہو تو نظر رکھو ان پر۔ مگر تم نے کبھی بات سمجھی میری۔ اب دیکھ لیا انجام۔" بی جان کا اتنا کہنا غضب ہوا۔ ثمرین نے پھر وہ قیامت مچائی کہ اللہ کی پناہ۔ یہاں تک کہ جب اسے دلہن کا روپ دیا گیا تو اس کے رخساروں پر مصنوعی غازے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ اسی دن اندر سے مر گئی تھی۔ جب اس کے نام کے ساتھ احتشم جلال کا نام جوڑ دیا گیا تھا۔

جانے کتنے پل بیتے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر لاؤنج کے صوفے میں دھنس کر بیٹھی تھی کہ سیل فون کی بیل نے ارتکاز توڑا۔ وہ چونک کر واپس لوٹی۔ بیل ہو ہو کر خاموش ہو گئی اور پھر کچھ توقف سے دوبارہ وہی مدھر دھن بجنے لگی۔ اک گہری سانس بھرتے اس نے میز پر رکھا فون اٹھایا۔ کال سعودیہ سے تھی۔ وہ لوگ پہنچ چکے تھے مگر۔ اسے کئی لمحے لگے تھے اگلی طرف کی بات سمجھنے میں اور جب سمجھی تھی تو اس کی چیخوں نے در و دیوار ہلا دیے تھے۔

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔ میں تو چاہتی ہوں اپنے رب کے گھر جاؤں تو کبھی واپس ہی نہ آؤں۔ وہیں رہنے کا ٹھکانا مل جائے۔ چاہے اک کونا ہی سہی۔ پوری دنیا میں اک وہی تو جگہ ہے جہاں جا کر واپسی کی آرزو نہیں رہتی۔'' بی جان نے کتنے جذب و عقیدت سے کہا تھا۔

''میں جانتی ہوں تمہیں مجھ پر غصہ ہے۔ مگر اک دن آئے گا۔ جب تم مجھے بے اختیار دعاؤں میں یاد رکھا کرو گی۔ چلو چھوڑ دو سارے گلے شکوے۔ آج تو ہنس کر مل لو۔ کون جانے زندگی کے کتنے پل باقی ہیں۔ پھر ملاقات ہوتی بھی ہے یا نہیں۔'' انہوں نے وقت رخصت اس سے کہا تھا۔ اور وہ تب بھی مٹی کا مادھو بنی چپ کھڑی رہی تھی۔ انہوں نے ہی اسے کھینچ کر سینے سے لگایا ماتھے پر بوسہ دیا۔ اف۔ کیا خبر تھی۔ وہ ان کا آخری لمس تھا۔

جدہ ائیر پورٹ سے نکلتے ہی ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا تھا۔ جو اس قدر اندوہناک تھا کہ موقع پر ہی کئی لوگ دم توڑ گئے۔ جن میں سے اک بی جان بھی تھیں۔ توشیق احمد اور بڑی آپا کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا۔ جہاں بدقسمتی سے دو دن بعد زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے اس کے پیارے بابا نے بھی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی۔ ان سب پر تو غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ یہ ایسا صدمہ تھا جس نے سدھ بدھ ہی بھلا دی۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ مگر کسی کے بھی لفظ ان کا درد نہیں بانٹ سکتے تھے۔

اس سانحے کو کئی دن گزرنے کے بعد بھی ان سب کی روحوں پر لگا زخم بالکل ویسا ہی تازہ تھا جیسا کہ پہلے دن۔ اکثر چار افراد کے گھر میں موجود ہوتے ہوئے بھی قبرستان کا سا سناٹا چھایا رہتا۔ ہنسنا بولنا تو جیسے وہ سب ہی بھول بیٹھے تھے۔ ثمرین کے تو آنسو ہی خشک نہ ہوتے۔ شریک حیات کی جدائی کا دکھ ہی جان لیوا تھا کہ بی جان کی یاد بھی ہر لمحہ روح تڑپاتی۔ جب کہ ان کے شوہر ہمیشہ ان سے دور رہے۔ ایسے میں وہ ان کے لیے کیسی چھپر چھاؤں سی ہستی تھیں۔ یہ تو ان کے جانے کے بعد علم ہوا۔ وہ زندگی کے اس موڑ پر کتنے عظیم نقصان سے دوچار ہوئی تھیں کہ جس کا مداوا ہی ممکن نہ تھا۔ وہ اب بھی سوچوں کے سمندر میں اتری ہوئی تھیں جب تابعہ انہیں کھانے کے لیے بلانے چلی آئی اور وہ اسے یک ٹک دیکھے چلی گئیں۔ اکثر بی جان کی باتوں پر وہ ان سے نالاں رہا کرتی تھیں۔ لیکن جاتے جاتے بھی وہ کتنا بڑا احسان کر گئی تھیں ان پر۔ انہیں اک بیٹی کی فکر سے آزاد کر گئی تھیں۔ تابعہ اپنے گھر کی ہو جائے تو کتنا اطمینان ہو گا انہیں۔ بس ہو گیا فیصلہ۔ وہ جلد ہی بڑی آپا کے پاس جائیں گی۔ اب انہیں اس فرض سے سبکدوش ہونا تھا۔

''مما۔ آر یو اوکے۔'' انہیں مسلسل اپنی جانب دیکھتے پا کر تابعہ نے گھبرا کر ان کا شانہ ہلایا۔ اپنی مرضی سے سونے جاگنے والی ان کی بیٹیاں چند ہی دنوں میں کتنی سیانی ہو گئی تھیں۔ اب تو انہیں کچھ کہنا ہی نہیں پڑتا تھا اور وہ سارا گھر سمیٹ لیتیں۔ اس وقت بھی کھانا ان دونوں نے مل کر بنایا تھا۔ انہیں بے اختیار اس پر پیار آیا۔ اس کا ہاتھ آنکھوں سے لگا کر رو دیں۔

''پلیز مما۔ بس کر دیں۔ اور کتنا روئیں گی۔ اب تو رو رو کر تھک گئے ہم۔ مگر نہ بابا واپس آئے نہ بی جان۔ اب ہمیں ان کے جانے کا یقین کر لینا چاہیے اور پھر وہ بہت اچھی جگہ پر ہیں۔ اور آپ کو پتا ہے بی جان کہتی تھیں۔ جانے والوں کے لیے روتے نہیں ہیں۔ اس طرح انہیں تکلیف ہوتی ہے۔ بلکہ ان کے لیے دعا کرتے ہیں۔ جو ان کے لیے نجات کا سبب بنتی ہے۔ ان کی اگلی منزلیں آسان ہوتی ہیں۔ آپ بھی بس دعا کیا کریں۔'' وہ ان کے شانے پر سر رکھے کہہ رہی تھی۔ ثمرین نے آنسو پونچھ لیے اور مسکرا کر اس کے گال تھپتھپائے۔

''بہت سمجھ دار ہو گئی ہے میری بیٹی۔ بی جان دیکھیں تو حیران ہی رہ جائیں۔ یاد ہے نا وہ کہا کرتی تھیں۔ جیسی ثمرین تم ویسی تمہاری بیٹیاں۔ کبھی عقل نہیں آئے گی انہیں۔ سدا کم عقل ہی رہیں گی۔''

''ہاں۔ سب یاد ہے۔ ان کی کوئی بات بھی بھولی نہیں ہے مجھے اور آپ سب باتیں چھوڑیں اور اٹھ جائیں۔ توقیر کو بہت بھوک لگ رہی ہے۔ اس نے شور مچا رکھا ہے کھانے کے لیے۔'' وہ ان کا بازو پکڑے اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

اور انہوں نے عدت سے نکلتے ہی اپنے خیال کو عملی جامہ پہنایا تھا۔ بڑی آپا تو اس حادثے میں معذور ہو کر بستر سنبھالے پڑی تھیں۔ عاصمہ [illegible] کالج میں لیکچرار تھیں۔ گھر، جاب، پھر بیمار ماں کو سنبھالنا ان کے لیے بھی بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہوتا۔ باہمی رضامندی سے قریبی تاریخ طے کر لی گئی۔ وہ مٹھائی لیے گھر لوٹی تھیں بہت خوش خوش۔ مگر تابعہ کو علم ہوا تو واویلا مچا دیا۔

''آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے مما۔ میں ابھی شادی نہیں کر سکتی۔ ابھی بابا اور بی جان کو گزرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ ابھی تو دل اس دکھ سے بھرا ہوا ہے۔ مجھے مزید اذیت میں مت ڈالیں پلیز۔ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ آپ بالکل اکیلی ہو جائیں گی۔ پھر میری تعلیم۔ مجھے ابھی بہت سا پڑھنا ہے۔ آپ کا بازو بننا ہے۔ میں۔۔''

''ارے بس چپ۔ کون کہہ رہا ہے تم اپنی تعلیم چھوڑو۔ احتشم ماشاء اللہ اتنا پڑھا لکھا بچہ ہے۔ وہ پڑھائی میں مدد کر دیا کرے گا تمہاری۔ پھر عاصمہ آپا جیسی ٹیچر کے گھر میں ہوتے ہوئے تمہیں کیا فکر۔ جتنا چاہے پڑھتی رہنا۔ کوئی نہیں روکے گا تمہیں۔ اور میں کیوں ہونے لگی اکیلی؟ خیر سے توقیر اور عمارہ ہیں میرے پاس اور یہ فیصلہ تو تمہارے بابا اور بی جان کا ہی کیا ہوا ہے۔ اس کی تکمیل تو ان کی خوشی کا باعث بنے گی نا اور پھر مجھے بھی تسلی ہو گی۔ تم بالکل مت گھبراؤ۔ کون سا دور جا رہی ہو ہم سے۔ یہ قریب ہی تو گھر ہو گا تمہارا۔ جب چاہے ملنے آ جایا کرنا۔'' ثمرین نے اس کے سارے تفکرات پر پانی پھیرا۔

''مگر مما۔''

''بس اب میں کچھ نہ سنوں۔ ارے اتنے دکھ کے بعد اب میرا ابھی تو حق ہے کہ کسی خوشی کا منہ دیکھ سکوں۔ میرا خیال ہے ایک پریشان حال ماں پر اتنا تو ترس کھاؤ گی ہی تم۔'' انہوں نے اس کی ایک نہ سنی تھی۔

☆☆☆

چہکاریں، کھلکھلاہٹیں، مسکراہٹیں آج بہت دن بعد آنگن میں خوشیاں اتری تھیں۔ عاصمہ تو بہو کی بلائیں لیتے نہ تھک رہی تھیں۔ گو کہ شادی سادگی سے ہی انجام پائی تھی۔ مگر اپنے گھر میں انہوں نے شگن کی ساری رسمیں پوری کیں۔ یہی وجہ تھی جب تابعہ کو اس کے کمرے میں لے جایا گیا تب تک وہ تھک کر بری طرح نڈھال ہو چکی تھی۔ سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان سب سے چھپ کر کہیں دور بھاگ جائے۔ کسی ایسی جگہ جہاں یہ آوازیں نہ ہوں۔ شور نہ ہو۔ یہ چہرے نا ہوں۔ جہاں کوئی ذی نفس نہ ہو۔ بس وہ اکیلی ہو اور ہر طرف سکون ہی سکون۔ مگر آہ۔ یہ خواہشات بھی نا۔ جتنی تیزی سے پنپتی ہیں۔ اتنی تیزی سے بار آور کیوں نہیں ہوتیں؟

جب تک احتشم کی آمد ہوئی تب تک اس کی حالت مزید ردی ہو چکی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں سر

تھامے گہرے گہرے سانس لیتی پہلی ہی نظر میں اسے حواس باختہ کر گئی۔ وہ لپک کر اس تک آیا۔

''تابعہ۔ کیا ہوا ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ آر یو اوکے؟''

''مم...... میرا دم گھٹ رہا ہے۔'' نفی میں سر کو جنبش دیتے وہ بمشکل بول پائی۔ احتشم نے جلدی سے بڑھ کر کھڑکی کھول دی۔ سائڈ ٹیبل پر رکھے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا اور اس کے خشک ہوتے لبوں سے لگا دیا۔ ایک گھونٹ لے کر ہی اس نے گلاس پرے کر دیا تھا۔ اندر تو جیسے کوئلے دہک رہے تھے۔ پانی کے چند چھینٹوں سے دھواں ہی تو اٹھنے لگا۔ اسے محسوس ہوا جیسے دل نکل کر باہر آجائے گا۔ احتشم نے اس کا دوپٹا اتار دیا تھا اب وہ اس کی ہتھیلیاں مسل رہا تھا۔ پھر پیروں کے تلوے۔ وہ تو گہری نیند میں جانے لگی تھی مگر یہ اس کی ہی کوشش تھی کہ چند لمحوں میں ہی تابعہ کو لگا اس کی اکھڑتی سانسیں پھر سے بحال ہو رہی ہیں۔ اس کا زندگی سے ٹوٹا ربط پھر سے جڑا تھا۔ اک جھٹکا کھاتی، بیدار ہوئی۔ مندی آنکھیں پوری کھول کر دیکھا۔ وہ اسے پکارتا اس کے گال تھپتھپا رہا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت تو متغیر تھی ہی۔ وہ بھی متفکر ہو گیا تھا اسے یوں دیکھ کر۔ وہ اس کے بازوؤں کا سہارا لیے بیٹھی تھی۔ تیزی سے سنبھلتے ذرا دور ہوئی۔ حواس یکجا ہوئے تو دوپٹا بھی کھینچ لیا۔

''اف۔ کیا سوچتے ہوں گے یہ بھی۔ کیا ہوا تھا مجھے۔ یا اللہ۔'' وہ سخت پشیمان سی سر جھکا گئی۔ اتنا کہ چہرہ گھٹنوں میں چھپ گیا۔ احتشم کچھ نہیں بولا تھا۔ چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ دماغ خالی سلیٹ سا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ وہ جلد ہی واپس آیا تھا۔ انواع و اقسام کے کھانوں سے بھری ہوئی ٹرالی سمیت۔

''اب کیسا فیل کر رہی ہو۔ اگر اب بھی طبیعت بہتر نہیں تو میں ڈاکٹر کو لے آتا ہوں۔''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں۔ اب بہتر ہوں میں۔'' اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔

''او کے۔ لو یہ جوس پی لو۔ لگتا ہے تم کافی تھک گئی ہو۔ اتنا ہیوی ڈریس' جیولری اور یہ سب۔ پتا نہیں لڑکیوں پر اتنا بوجھ کیوں لاد دیا جاتا ہے۔ سچ میں ہمت ہوتی ہے تم لوگوں کی۔ اینی وے۔ پہلے کچھ کھا پی لو۔ پھر ان سب سے نجات حاصل کر لینا۔ تب تک میں بھی فریش ہو لوں۔'' وہ گلاس اس کے ہاتھ میں تھما کر ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ لب خشک۔ سامنے موجود نعمت کی اسے واقعی ضرورت تھی۔ اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ اور گھونٹ گھونٹ اندر اتارنے لگی۔ احتشم واپس آیا تو آدھے سے زیادہ بھرا گلاس ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔

''اتنا ذرا سا جوس تم سے ابھی تک ختم نہیں ہو سکا۔ تم تو بہت لیزی ہو بھئی۔ اس طرح تو کام نہیں چلتے۔ اچھا اب رکھ دو اسے۔ اور کھانا کھا لو۔ آج ہماری نئی زندگی کی شروعات ہوئی ہے اور پہلے مقام پر پہلا سوال پوچھ رہا ہوں تم سے۔ بالکل سچ بتاؤ کتنے دن سے کھانا نہیں کھایا تھا تم نے؟'' وہ اس کے پاس آ بیٹھا تھا اور وہ حیران ہوئی تھی اس کے درست اندازے پر۔ وقت پر کھانا پینا تو بہت عرصے سے چھوٹا ہوا تھا لیکن پچھلے دو دن سے اس نے غصے اور دکھ میں کچھ نہیں کھایا تھا۔

''ویسے بہت بری بات ہے اگر تم اس طرح کرتی رہی ہو تو۔ ارے بھئی خود کو کون سزا دیتا ہے۔ معاملہ کوئی بھی ہو کھانا پینا تو نہیں چھوڑنا چاہیے نا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے تم یہ شادی ہی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔'' وہ تو نارمل لہجے میں ہی بول رہا تھا۔ مگر اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ بوکھلا کر سر اٹھایا۔

''کیا واقعی ایسا ہی ہے؟'' احتشم نے اس کی پوری کھلی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ وہ گڑبڑا کر نظر چرا گئی۔ اک لمحے کو دل ڈوب کر ابھرا تھا۔ ''یا اللہ کیا جانتا ہے یہ شخص۔''

''تم زندگی کی بہت بڑی بے وقوفی کر چکی ہو ابھی تو شیق۔ اب اگلے ادوار میں تمہارے لیے کہیں بھی غلطی کی گنجائش نہیں ہے۔ یاد رکھنا آئندہ پتے تمہارے اپنے ہاتھ میں ہوں گے۔ سمجھ داری سے کھیلو گی تو ہمیشہ کامیاب رہو گی۔ لیکن اگر کہیں ذرا سی بھی چوک ہوئی نا تو......'' بی جان نے اس کے نکاح کے دن اسے بہت سی باتیں کہی تھیں۔ جو وہ غائب دماغی سے سنتی رہی تھی۔ مگر وہ سب تو لگتا تھا ذہن کی کسی ڈسک میں سیو ہو گئی تھیں۔ جو ان لمحوں میں ایک دم سے چل پڑی تھی۔ اسے جانے کیا کیا یاد آیا۔

''مجھے عمارہ نے بتایا تھا کہ تم ابھی رخصتی پر راضی نہیں تھیں۔ تم پہلے اپنی تعلیم مکمل کرنا چاہتی تھیں۔ اور اگر سچ پوچھو تو میں بھی ایسا ہی چاہتا تھا۔ میں خود ابھی شادی کے حق میں نہیں تھا۔ مگر جیسے ممانی جان کے سامنے تمہاری ایک نہیں چلی ایسے ہی میں ابو اور مام کو نہیں سمجھا پایا۔ یہ ان کی خوشی تھی۔ اور ہمارے لیے ہمیشہ سے ان کی خوشی مقدم رہی ہے۔ اور باقی رہی تمہاری اسٹڈیز تو ہماری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ تم جب تک چاہے پڑھتی رہو۔ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ اور میرا خیال ہے تمہیں اب ساری ضد اور غصہ چھوڑ کر کھانے کی طرف توجہ دینی چاہیے قبل اس کہ کے پھر بے ہوش ہونے کی تیاری کر لو۔'' احتشم کا مقصد اسے شرمندہ کرنا ہرگز نہ تھا لیکن وہ ہوئی ضرور تھی۔ اسی لیے تو پھر خاموشی سے پلیٹ پکڑ لی۔

☆☆☆

افوہ۔ مام میں آپ کو پہلے ہی ساری کنڈیشنز بتا چکا ہوں۔ پھر بھی آپ کا یہ بات کرنا میری سمجھ سے باہر ہے۔'' صبح جب دستک پر اس کی آنکھ کھلی تو احتشم کمرے میں نہیں تھا۔ وہ کس پہر باہر گیا وہ بالکل بے خبر تھی۔ دروازے پر اجالا تھی۔ اس کی اکلوتی نند۔ اس نے اپنی ڈھیر ساری چھوٹی چھوٹی باتوں کے درمیان اسے بہت پیار سے تیار ہونے میں مدد بھی کی تھی۔

''اب آپ جا کر مام کو سلام کریں۔ میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ اسے عاصمہ کے روم کے باہر تک چھوڑ گئی تھی اور ابھی اس نے دستک کے لیے ہاتھ بڑھانا ہی چاہا تھا کہ اندر سے آتی آواز پر وہیں رک گئی۔

''ہاں تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ اسے مستقل ساتھ لے جاؤ۔ بھئی نئے دلہا دلہن کے سو ارمان ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی پسند ناپسند جاننے کی خواہش ہوتی ہے اور وہ تب ہی ممکن ہے نا کہ وہ شروع کے دنوں میں اک ساتھ رہیں۔ اب یہ کیا کہ وہ ہمارے پاس رہے اور تم جا کر اپنی نوکری کرو۔ پھر تم یہ بھی تو دیکھو کتنے بڑے صدمے سے گزری ہے بچی۔ چلو کچھ دن تمہاری سنگت میں رہے گی تو اس کا بھی دل بہل جائے گا۔ پھر یہ اس کا حق بھی ہے۔ اور بھئی کل کلاں کو یہ نہ ہو کہ تمہیں مجھ سے شکوہ ہو کہ میں نے تمہاری نئی دلہن کو تمہارے ساتھ بھیجا نہیں۔''

''کم آن مام۔ ایٹ لیسٹ میں ایسا شکوہ آپ سے کبھی بھی نہیں کرنے والا اور رہی بات نئی دلہن کی تو میرا نہیں خیال کہ اسے بھی ایسی کوئی خواہش ہوگی۔ بلکہ وہ آپ کے پاس زیادہ کمفر ٹیبل فیل کرے گی۔ اور دل بہلانے کا بہترین نسخہ یہ ہے کہ وہ اپنی اسٹڈیز کنٹی نیو کرے۔ پھر آپ سب کچھ تو جانتی ہیں میری نئی نئی جاب ہے اور مجھے کن کن حالات کا سامنا ہے وہ بھی آپ سے ڈھکا چھپا نہیں۔ آپ کے مشورے سے ہی میں نے جس محکمے کا انتخاب کیا تھا۔ میری توقع کے برعکس یہاں بھی کالی بھیڑوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اور مجھے ان سب کے درمیان اپنے حصے کا کام کرتے ہوئے اپنے قدم جمانے ہیں۔ میں ایسے میں کوئی بھی ایسی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا جو میرے ارتکاز میں مخل ہو۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ مجھے کسی ایک محاذ پر تو پوری توجہ سے لڑ لینے دیں۔ آپ کا بھی جواب نہیں۔ ایک اور میدان میں دھکیل دیا۔ جبکہ میں نے کہا بھی تھا کہ ابھی کچھ ٹائم چاہیے مجھے۔'' احتشم بےزار سے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''اب تم یہ زیادتی کر رہے ہو میرے ساتھ۔

اتنے کٹھن حالات میں بھی میں نے کبھی تمہاری کسی خواہش کو پورا کرنے کے لیے تم سے ٹائم نہیں مانگا تھا۔ تمہیں صرف ماں ہی نہیں باپ بن کر بھی پالا ہے میں نے۔ اب اگر میں نے اپنی ایک خوشی تم سے چاہی تھی تو کیا اس کے لیے بھی ٹائم دیتی تمہیں۔" عاصمہ کو اس کی بات بری لگی تھی۔ لہجہ بھیگ گیا۔

"اوہو۔ اچھا نا اب ملکہ جذبات بننے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پوری تو کر دی آپ کی خواہش۔ جیسا نانو اور آپ نے چاہا ویسا کیا نا۔ اب اور کیا چاہتی ہیں۔ مجھے ساری دنیا میں بس آپ کی خوشی ہی تو مقصود ہے۔ اس کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ پلیز اب روئیے گا نہیں۔ مام۔" وہ ان کی منتوں پر اتر آیا تھا۔

"اچھا چلو ٹھیک ہے۔ جیسا تم بہتر سمجھو۔ لیکن اب ہر ویک اینڈ تم گھر آؤ گے۔ گھر سے باہر تم جانو اور تمہاری جاب۔ لیکن اب میں مصروفیت کا کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ سمجھے تم۔"

"جی مادام۔ جو حکم۔ اور ہاں پلیز آج ہی میری پیکنگ ضرور کر دیجیے گا۔ کیونکہ کل صبح سویرے نکلنا ہے مجھے۔" وہ تاکید کر رہا تھا۔

"لو اور سنو۔ ارے اب بھی یہ کام میں نے ہی کرنا ہے۔ اب تو کچھ آرام دے دو میری جان کو۔ جاؤ اپنی بیوی سے کرواؤ۔" عاصمہ کا کورا جواب تھا۔

"ایکسکیوز می۔ میں بیوی کو نہیں جانتا۔ میرا یہ کام تو آپ ہی کریں گی۔ دیٹس اٹ۔ اور آج ناشتا بھی ملے گا یا بھوکا ماریں گی مجھے۔" وہ دہائی دے رہا تھا۔

"ارے دس منٹ ٹھہر جاؤ تمہاری ساس ناشتا لے کر آ رہی ہیں۔ پھر سب مل کر کرتے ہیں۔"

"ہاں تب تک چاہے میرا بھوک کے مارے دم نکل جائے۔"

"ارے اللہ نہ کرے۔ کیوں صبح صبح الٹی سیدھی بکواس کر رہے ہو۔ تم تو بس۔ اچھار کو لے کر آتی ہوں تمہارے لیے کچھ نا کچھ۔" اور تابعہ ست قدموں سے چلتی واپس پلٹ گئی۔

گو کہ ان ماں بیٹا کی گفتگو سننے کے بعد تو اسے مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن اسے عجیب سا محسوس ہو رہا تھا۔ اگر وہ بن چاہے اسے زندگی کا ساتھی بنا بیٹھی تھی تو صاف لگ رہا تھا۔ وہ بھی بن چاہے اسے گھر لے آیا ہے۔ اس سنجوگ پر وہ بھی دل سے راضی نہیں تھا۔ اگر اس نے بی جان اور بابا کی لاج رکھی تھی تو اس نے بھی نانی اور ماں کا مان رکھا تھا۔ اور ان لمحوں میں اسے ایسا ہی لگ رہا تھا کہ یہ تو اس کے ساتھ وہی بات ہو گئی جو کہ اکثر بی جان کہا کرتی تھیں۔ یعنی "جیسا منہ ویسی چپیڑ۔"

☆☆☆

وہ گہری نیند سے کیسے جاگی تھی کچھ لمحے لگے تھے حواس بحال ہونے میں۔ پھر سمجھ میں آیا کہ باہر سے آتا شور بیداری کا سبب بنا ہے اور یہ شور آیا کہاں سے؟ یہی دیکھنے وہ بکھرے بال سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ کل رات خوب جم کر مینہ برسا تھا۔ بہت دن کی گرمی اور حبس کے بعد جیسے کھل کر سانس لیا تھا ہر جاندار نے۔ ساری فضا نکھری ستھری ہو گئی تھی۔ موسم میں اس حد تک تبدیلی آئی کہ اے سی آن کرنے کی بھی ضرورت نہ پڑی۔ پنکھا چل رہا تھا اور کھڑکیاں کھلی ہوئیں اور وہ تو شاید ابھی بھی سوئی رہتی جو کھلی کھڑکی سے آوازیں اندر نہ آتیں۔ چپلوں میں پیر پھنسائی باہر نکل آئی تھی۔ گلشن، نانو کے کمرے سے بڑبڑاتی آ رہی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کر خفیف سی ہو گئی۔

"کیا ہوا یہ کیسا شور تھا؟"

"وہ جی اماں جی نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا۔ آج صبح سے انہیں حرارت بھی ہو رہی ہے۔ بی بی جی کہہ گئی تھیں ان کے لیے دلیہ بنانے کو۔ اور دوا کھلانے کے لیے بھی۔ اب وہی انہیں کھلانے گئی تھی۔ پر جی انہوں نے تو کچھ نہیں کھایا الٹا سب کا سب اٹھا کر پھینک دیا۔ کہتی ہیں تھک گئی ہوں ایسی بدمزا خوراکیں اور دوائیں کھا کھا کر۔ اب کچھ نہیں

کھاؤں گی۔" گلشن نے ساری کتھا کہہ سنائی۔

"اوہ۔ یہ تو اچھی بات نہیں۔ انہیں بخار ہے۔ پھر وہ کچھ کھا بھی نہیں رہیں۔ خدانا خواستہ کہیں زیادہ طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ تم ایسا کرو فوراً جا کر مما کو بتاؤ۔"

"وہ جی باہر گئی ہیں۔" گلشن نے اطلاع دی۔ وہ جو واپس مڑ رہی تھی۔ ٹھٹک کر رکی۔

"کہاں گئی ہیں؟"

"اجالا بی بی کو کچھ چیزیں لینا تھیں انہی کے ساتھ گئی ہیں۔ پھر کہہ رہی تھیں وہاں سے پارلر بھی جائیں گی۔" اس کی اگلی اطلاع نے اسے ٹھیک ٹھاک پریشان کر دیا۔ جمعہ جمعہ آٹھ اور پھر جمعہ ملا کے اسے کل پندرہ دن تو ہوئے تھے "قصر جلال" میں آئے۔ ابھی وہ اتنی بے تکلف نہیں ہوئی تھی کہ کسی کے بھی کمرے میں چلی جائے۔ اور پھر نانو یعنی بی جان کی بڑی آپا سے تو شروع سے ہی اس کی جان جاتی تھی۔ وہ تو ان سے بھی بڑھ کر مزاج رکھتی تھیں۔ ان کی پر رعب شخصیت کے آگے کسی کو پر مارنے کی مجال نہ تھی۔ پھر جو اس وقت انہوں نے بے چاری گلشن کے ساتھ کیا تھا۔ اس کے کپڑوں پر دلیے سے نقش و نگار بنے تھے۔ اگر وہ بھی چلی گئی تو جانے وہ اس کا کیا حشر کریں۔ پہلی سوچ نے اسے ڈرایا تھا۔ مگر وہ ایسی بے حس بھی نہ تھی ایک تو طبیعت خراب اس پر اتنا غصہ۔ اگر ان کی حالت بگڑ گئی تو۔ بس اسی خیال نے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔

"ارے آپ کدھر جا رہی ہیں دلہن بی بی۔ اماں جی بہت جلال میں ہیں اس وقت۔ کہیں باقی کا غصہ آپ پر ہی نہ اتار دیں۔" گلشن نے گھبرا کر اسے خبردار کرنا چاہا تھا۔ مگر تب تک وہ دروازہ کھول چکی تھی۔

"میں نے کہا ہے اب کوئی نہ آئے ادھر۔ میرے کہے کا اثر نہیں ہوتا؟" وہ مخصوص دبنگ لہجے میں چلائی تھیں۔

"السلام علیکم۔" اس نے ہمت کر کے دہلیز پار کر ہی لی۔ مگر دل اندر سے سہم گیا تھا۔ (کہیں کچھ اڑتا ہوا ہی نہ آ جائے) ان کا جھریوں بھرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ ماتھے پر بل۔ آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"آپ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" کرچیوں سے بچتے بچاتے وہ بیڈ کے قریب آن رکی۔

"تمہیں کیا؟ تم جاؤ اپنے کمرے میں۔" ایسا ٹکا جواب کہ اگلے کئی لمحوں کے لیے منہ سل گیا۔ وہ انہیں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ چند ثانیوں بعد پھر ہمت مجتمع کی۔

"گلشن بتا رہی تھی آپ کھانا نہیں کھا رہیں۔ اور آپ کو ٹمپریچر بھی ہے۔ اس طرح تو۔"

"ہاں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ اتنی سی بیماری کیا بگاڑ لے گی میرا۔ ارے مجھ سی ڈھیٹ تو اتنے بڑے حادثے میں نہ مری تھی۔ تو یہ ذرا سا بخار کیا کر لے گا۔ ارے جاؤ ابھی نہیں مرتی میں۔" ان کا مزاج سوا نیزے پر تھا۔ اس کے سینے میں انی سی کھبی۔ جس بڑے حادثے کا وہ ذکر کر رہی تھیں وہ اس کا بہت کچھ بگاڑ گیا تھا۔ بی جان سے وہ لاکھ خفا سہی۔ مگر وہ ایسے اچانک چھوڑ جائیں گی۔ یہ تو گمان میں بھی نہ تھا۔ پھر اس کے پیارے بابا۔ جن کی جدائی کا صدمہ تو تمام عمر کم ہونے والا نہ تھا۔ ابھی تو انہیں بہت ضرورت تھی ان کی۔ مگر آہ۔ یہ تقدیر کے ستم۔ سامنے موجود ہستی بی جان نہیں تھیں۔ مگر تھیں تو بالکل ان ہی کی طرح۔ وہی چہرہ۔ ویسا ہی انداز اور وہ بے اختیار کہہ گئی۔

"خدانا خواستہ ایسا تو مت کہیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ جن کے اپنے ان سے بچھڑ جاتے ہیں نا۔ ان سے پوچھیں اس درد کی اذیت۔ اور پلیز کچھ کھا لیں۔ بلکہ ایسا کرتے ہیں۔ میں اپنے ہاتھ سے آپ کو دلیہ کھلاتی ہوں اور پھر دوا بھی۔ اور مجھے انکار نہیں کریں گی آپ۔ ہے نا۔ اور لائیں پہلے آپ کا ٹمپریچر چیک کرتی ہوں۔" اس نے بڑھ کر ان کی کلائی تھام لی اور اس منظر نے تو بے چاری گلشن کو حیران ہی کر دیا۔ اماں جی تو وہ تھیں جن کی کلائی

تھامنے کے لیے ڈاکٹر کو بھی پہلے آدھا گھنٹہ منت کرنا پڑتی تھی۔

''میں کچھ بھی نہیں کھاؤں گی۔ تم دونوں جاؤ یہاں سے اکیلا چھوڑ دو مجھے۔'' اگلے پل انہوں نے کلائی چھڑائی۔ لیکن اب لہجے میں وہ پہلی سی گھن گرج مفقود تھی۔

''کیا میرے ہاتھ سے بھی نہیں کھائیں گی؟'' تابعہ نے یوں مان سے پوچھا۔ گویا ان سے پرانی یاری ہو۔

''تم کون ہوتی ہو میری۔ جاؤ نہیں کھاؤں گی تمہارے ہاتھ سے بھی۔'' ان کے انداز میں بچوں کی سی ضد تھی۔ بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ گلشن نے گھبرا کر اسے اٹھنے کا اشارہ بھی کیا۔ مگر وہ بھی مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ اب تو تب تک نہیں اٹھے گی جب تک اپنی منوا نا لے۔

''تم جاؤ جلدی سے دلیہ لے کر آؤ۔ میں یہ سب سمیٹ لیتی ہوں۔'' اس نے گلشن کے ہاتھ سے ڈسٹر پکڑ لیا۔ جو شکر مناتی کمرے سے نکل گئی۔ تابعہ نے پورے دھیان سے کرچیاں سمیٹیں۔ کارپٹ صاف کیا۔ وہ بازو تلے کھلی آنکھوں میں خشونت بھرے اسے دیکھے گئی تھیں۔ گلشن پھر بھرا ہوا باؤل لے آئی تھی۔

''پلیز اب آپ کو یہ کھانا ہے اور میڈیسن بھی۔''

''بس میرے کھانے کے لیے یہی ایک خوراک رہ گئی ہے کیا دنیا میں۔ باقی سارے اناج کو آگ لگ گئی ہے کیا۔ جب دیکھو یہ پھیکا سا ملغوبہ لا کر سر پر سوار ہو جاتے ہیں میرے۔'' وہ حد درجہ چڑی ہوئی تھیں۔ باؤل پر اک کڑی نظر ڈالی۔

اچھا چلیں ٹھیک ہے مت کھائیں۔ اس وقت کیا کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ وہ بتائیں مجھے۔ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔''

''چرغہ کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ کیا لے آؤ گی ابھی بنا کر؟'' انہوں نے تیکھے چتون کیے اسے دیکھا۔

''بالکل لے آؤں گی۔ اس میں کیا پرابلم ہے بھلا۔ لیکن صرف ایک شرط پر۔ پہلے آپ تھوڑا سا دلیہ کھا لیں۔ اور دوا۔ پھر بس میں یوں گئی اور یوں آئی'' وہ مسکرا رہی تھی۔ اور چند لمحے وہ اس کا مسکراتا چہرہ دیکھتی رہیں۔ پھر ڈپٹ کر بولیں۔

''لڑکی اپنے میاں والے گیم مت کھیلو میرے ساتھ۔ میں سب سمجھتی ہوں تم لوگوں کی چالاکیاں۔ وہی یہ سارے سبق پڑھا کر گیا ہوگا تمہیں۔ وہ سیانا آدمی بھی یہی کچھ کرتا ہے۔ پہلے جھوٹے وعدے کر کے اپنی مرضی کے کھانے کھلا دیتا ہے مجھے اور جو میں کہوں وہ کبھی لے کر نہیں آتا۔''

''ارے نہیں ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ میں ایسا کچھ نہیں کروں گی۔'' تابعہ نے بوکھلا کر صفائی پیش کی۔

''اچھا چلو ابھی تو تمہارا کہنا مان لیتی ہوں۔ لیکن تم میرا کہا بھولنا مت۔'' اور اس کے لیے اتنا ہی بہت تھا۔ فی الحال وہ مان گئی تھیں۔ انہیں کھانا اور دوا دے کر جب وہ اپنے روم میں آئی تو اس کا سیل فون گنگنا رہا تھا۔ جو اس کے پہنچنے تک چپ ہو گیا۔ کال احتشم کی تھی۔ وہ جس دن سے گیا تھا بوجہ مصروفیت تا حال گھر نہیں آیا تھا۔ ہاں دو چار دن بعد اسے چند سیکنڈ کی کال کر کے خیریت دریافت کر لیتا۔ وہی روٹین کے سوال۔ کیسی ہو۔ کیا کر رہی تھیں۔ گھر میں سب ٹھیک ہیں۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں وغیرہ وغیرہ اور ہر بار اس کے جوابات بھی وہی ہوتے تھے۔ آج بھی اس نے وہی مخصوص باتیں دہرانے کے لیے کال کی ہوگی۔ یا پھر دوسرے لفظوں میں فرض نبھانے کے لیے۔ جیسے نانی اور ماں نے پکڑ کر شادی کروا دی۔ ویسے ہی اس فریضے کی تاکید بھی انہی کی طرف سے ہوتی ہوگی۔ ہونہہ۔ اسے خواہ مخواہ ہی غصہ آ گیا۔ بے دردی سے سیل فون بیڈ پر اچھال دیا۔ یہ اچھا خاصا مہنگا فون تھا۔ جو عاصمہ نے اسے منہ دکھائی میں یہ کہتے ہوئے دیا تھا کہ۔

''مجھے خالہ جان نے بتایا تھا کہ تمہارے پاس اپنا سیل فون نہیں ہے۔ سچ پوچھو بیٹا تو مجھے بہت اچھا لگا تھا یہ جان کر۔ یہ چیز بچوں اور خصوصاً بچیوں کی ضرورت کی ہے بھی نہیں۔ بس جانے کیوں ہم لوگوں نے انہی چیزوں کو اپنی زندگیوں کا لازمی حصہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ جن کے بغیر بھی دنیا ایک وقت میں بہت اچھی چلتی رہی تھی اور لوگ ترقی اور کامیابی کے راستے عبور کرتے رہے۔ مگر خیر اب یہ تمہاری ضرورت یوں ہے کہ احتشم کی جاب کچھ ایسی ہے کہ وہ کبھی کہیں ہوتا ہے اور کبھی کہیں۔ تو ایسے میں تمہارے پاس اپنا سیل فون ہونا لازمی ہے۔ بھئی تم بیوی ہو اس کی اور بیویوں کو ہمیشہ شوہر کی خیر خبر رکھنا چاہیے۔ سمجھ گئیں۔'' اور تب وہ ان کا شرارت سے مسکرانا نہیں سمجھی تھی۔ مگر اب اسے خوب سمجھ میں آ رہا تھا۔ آخر یہ بڑے اپنے بچوں کو سمجھتے کیا ہیں؟ بچپن سے لے کر جوانی تک خود اپنی اولاد کی عادتیں بگاڑتے ہیں۔ ہر چیز ان کی خوشی اور مرضی کی مہیا کرتے ہیں۔ مگر جب وقت آتا ہے ان کی زندگی کے سب سے اہم فیصلے کا تو آہنی دیوار بن کر راستے میں ڈٹ جاتے ہیں۔

☆☆☆

ایک مٹھی دلیہ، ایک مٹھی چاول، دو مٹھی دالیں اور پاؤ بھر مٹن۔ یہ سب ملا کر اس نے نانو کے لیے بہت مزے دار سا کھانا تیار کیا تھا اور جو انہوں نے رغبت سے کھایا بھی۔

''سچ بتاؤ یہ تم نے ہی بنایا ہے یا گلشن کو آج رحم آ گیا مجھ پر۔'' وہ جو انہیں کھاتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ ان کی بات پر منہ بسور گئی۔

''گلشن تو کب کی جا چکی ہے اور خیر سے اس نے آپ کے لیے آج بھی وہی ملغوبہ بنایا تھا۔ جو مجھے اندازہ تھا کہ آپ حسب سابق ریجیکٹ کر دیں گی اور میں نے تو اپنا وعدہ نبھایا ہے۔ میں بہت سارے مسالوں والا چٹ پٹا چرغہ تو نہیں کھلا سکتی آپ کو۔ اسی لیے اس طرح کا کھانا بنا لیا۔ جس میں آپ کو گوشت کا ذائقہ بھی مل رہا ہے۔ اور جو آپ کی صحت کے لیے اچھا بھی ہے اور آپ ہیں کہ مجھے ایسا سمجھ رہی ہیں۔''

''ہائیں۔ بھئی کیسا سمجھ رہی ہوں۔'' پلیٹ میں مزید سالن نکالتے انہوں نے اس کا چہرہ دیکھا۔

''پھوہڑ۔ یہی سمجھ رہی ہیں نا آپ مجھے۔'' اور وہ مسکرا دیں۔

''ارے بھئی میں کیوں سمجھنے لگی تمہیں پھوہڑ۔ لیکن سچ پوچھو تو مجھے بتایا یہی گیا تھا۔ کہ لڑکی ایک نمبر کی ست الوجود ہے۔ کچھ نہیں آتا جاتا اسے۔ نہ سینا نہ پرونا، نہ صفائی نہ دھلائی، نہ کھانا پکانا۔ جو چار جماعتیں پڑھی ہیں سمجھو وہ بھی پڑھ کر گنوا دیں۔ رتی بھر عقل نہیں ہے اس میں۔ ہاں بس اک صورت ہے جس کے بل پر کچھ نمبر دیے جا سکتے ہیں اسے۔ وہ بھی اس لیے کہ دادی سے نقش چرا لیے اگر یہ بھی ماں سے ہی لیتی تو۔'' وہ مزے سے بتاتی جا رہی تھیں اور اس کا منہ کھلتا جا رہا تھا۔

''آ......آپ سے کس نے کہا یہ سب؟'' اسے غصہ ہی تو آ گیا ایسا بھی کون سا دشمن تھا اس کا۔

''مجھ سے کس نے کہنا تھا یہ سب۔ اسی جنت مکانی نے کہا تھا جس نے بڑے مان سے تمہارا رشتہ دیا تھا مجھے۔'' ان کی اگلی بات تو پہلی سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئی۔ تابعہ پر تو حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

''رر......رشتہ......دیا تھا۔مط......مطلب؟'' اس کے گلے میں سانس اٹک گئی۔ جبکہ وہ اس کی حالت سے بے خبر مزے سے بولتی جا رہی تھیں۔

''اللہ غریق رحمت کرے حفصہ کو۔ بڑا ہی پیارا مزاج تھا میری بہن کا۔ شروع سے ہی نہایت سلیقہ شعار اور سمجھدار رہی تھی وہ۔ زندگی کے ہر معاملے میں بڑی فہم و فراست سے چلنے کی عادی تھی اور ہم بہنوں میں آپس کا پیار اور دوستی ہمیشہ سے مثالی رہی۔ بچپن میں بھی ہر بات اک دوجے سے کیے بنا چین نہیں پڑتا تھا۔ شادیاں ہو گئیں۔ اپنے اپنے گھر بسا لیے۔ بچوں کی مائیں بن گئیں۔ پھر بھی یہ عادت نہ گئی۔

جب اس کا دل بھرا ہوتا تھا تو وہ سب مجھ سے کہہ دیتی تھی اور جب میں تنگ پڑتی تو اس کے سامنے دکھڑے رو لیتی۔ میری ہر الجھن کا حل ہوتا تھا اس کے پاس اور اس کے ہر مسئلے کا میرے پاس۔ مانو اک دوجے کا کنواں تھیں ہم تو۔

اک دن وہ بڑی گھبرائی ہوئی آئی۔ اس نے تم سے متعلق کوئی بھیانک خواب دیکھا تھا۔ کہنے لگی۔ بس نہیں چلتا شام سے پہلے پہلے اپنی تابعہ کو کہیں محفوظ ہاتھوں میں دے دوں۔ بے حد پریشان ہوں میں اس کی طرف سے اور یہ بھلا ہو سکتا تھا میری چھوٹی لاڈلی بہن روتی ہوئی میرے پاس آئے اور میں اس کا دکھ دور نہ کروں؟ میں نے جھٹ اس کے مسئلے کا حل نکال لیا۔ ان ہی دنوں میں عاصمہ کی نند اپنی بیٹی سمیت یہاں آئی ہوئی تھی اور اس چالاک عورت کی پوری کوشش تھی کہ کسی بھی طرح سے اپنی اس پھوہڑ اور نکمی بیٹی کا رشتہ احتشم سے کر دے اور میری بھولی عاصمہ۔ وہ تو اس کی باتوں میں بھی آ گئی تھی اور تو اور۔'' انہوں نے ذرا توقف دے کر ادھر ادھر یوں دیکھا گویا کہیں دیواروں کے بھی نہ کان نکل آئے ہوں یا پھر آنکھیں ہی نہ ابل پڑی ہوں۔

''اور تو اور اس چلتر لڑکی نے میرے معصوم سے احتشم کو بھی قابو کر لیا تھا۔ وہ بھی راضی تھا اس سے شادی پر۔ لیکن میں بھلا ہونے دیتی ایسا۔ ارے میرا احتشم بچہ بارہ سال کا تھا جب جلال کا بلاوہ آیا۔ تب ان ظالم لوگوں نے میری بیوہ بچی اور یتیم نواسا، نواسی کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھنے کے بجائے جائیداد کی بندر بانٹ کی اور چپکے سے نکل لیے۔ کبھی کسی نے آ کر پوچھا نہیں تھا کہ بی بی کیسے گزر بسر کرتی ہو اور جب میری عاصمہ نے تن تنہا دن رات کی محنت سے بچوں کو قابل کیا تو یہ حق جتانے آ گئے۔ ارے دفع دور۔ تب میں نے بھی ان دونوں ماں بیٹے کو دھمکی لگا دی کہ اگر ایسا کچھ کیا تو میں چلی جاؤں گی اپنے عبید کے پاس دبئی۔ پھر بجاتے رہنا تم دونوں ڈھول تاشے اور بس ہو گیا کام۔ دونوں میرے قدموں میں آ بیٹھے کہ جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی ہو گا۔ اور میری تو وہی چاہت تھی جو میری حفصہ کی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد ہی بچوں کا نکاح کر دیتے ہیں۔ اور رخصتی ہماری عمرہ کی ادائیگی سے واپسی پر۔ اور مجھے تو بعد میں اندازہ ہوا اسے دراصل جلدی کس بات کی تھی۔ اسے تو جیسے پہلے سے خبر ہو گئی تھی۔ وہ جس سفر کی تیاری کر رہی ہے۔ وہاں سے واپس نہیں آئے گی۔ بڑی ہی بے وفا نکلی۔ مجھے اکیلا چھوڑ گئی۔ ہائے پہلے ہی دکھ کیا کم تھے ستانے کو کہ اس کی جدائی نے تو بالکل تنہا کر دیا ہے مجھے۔'' وہ بہن کا تذکرہ کرتے کرتے اداس ہو گئیں۔ آنکھیں بھر آئیں۔ گلا رندھ گیا۔ اور وہ۔ اس کا تو سانس یوں گم تھا جیسے فضا میں یک لخت آکسیجن کی شدید کمی ہو گئی ہو۔

ان کے کیے گئے انکشاف نے تو اس کے اندر شگاف ڈال دیا تھا۔ جاتے جاتے یہ کس جرم کی سزا دے گئی تھیں بی جان۔ کیا وہ ان پر اتنی بھاری پڑ گئی تھی کہ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں اس کا گلا گھونٹ دیا۔ جو انہوں نے کیا تھا وہ ایسا ہی تو تھا۔ کیا عاصمہ پھپھو اور احتشم ناواقف ہوں گے اس بات سے؟ اُفف۔ میرے اللہ۔ تابعہ نے سر پکڑ رکھا تھا۔

''آئے ہائے۔ میں نے اپنے ساتھ ساتھ تمہیں بھی پریشان کر دیا۔ یہ تو میرا رب ہی جانے اس سب میں کیا مصلحت تھی۔ ہم عاجزوں کو تو اس کے ہر فیصلے پر لبیک کہنے کا حکم ہے۔ رو مت میری بچی۔ میں ہوں نا تمہارے پاس۔'' انہوں نے اسے کھینچ کر خود سے لگا لیا۔ آنسو اس کی پلکوں سے بھی ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ مگر اس کے دکھوں میں اک اور طرح کا دکھ بھی آن ملا تھا۔ جو اتنا ناقابل برداشت ہوا کہ وہ اپنی سسکیاں دباتی وہاں سے اٹھ آئی۔ اپنے بیڈ روم کی تنہائی بہتر جگہ تھی ان سارے صدمات پر نیر بہانے کے لیے۔ اسے کسی کی تسلی نہیں چاہیے تھی۔ نہ کسی کا دلاسا اور نہ ہی اسے کوئی کاندھا میسر تھا جس پر وہ پورے مان سے سر رکھ کر رو سکتی۔ اس کے اپنوں نے ہی اسے اس مقام تک پہنچایا تھا۔

وہی گڑھے کھود گئے تھے اس کے لیے۔ وہی تو تھے اسے بن موت مارنے والے۔ کیا جاتا اگر...... اور اس کی سسکیوں کے علاوہ کمرے میں اک اور آواز بھی گونجنے لگی تھی۔ یک لخت اک شور ہوا تھا۔ جس نے اس کے خیالات منتشر کر دیے۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑے اس کے سیل فون کی اسکرین روشن تھی۔ احتشم کا نام جگمگا رہا تھا۔ وہ اتفاق سے آج دوسرے دن پھر اسے کال کر رہا تھا۔ اس نے اک لمحے کی تاخیر کیے بنا جھپٹ کر فون اٹھایا۔

''بہت شکریہ آپ کے کال کرنے کا۔ میں ٹھیک ہوں۔ مما اور اجالا بھی ٹھیک ہیں۔ نانو کی صحت بھی بہتر ہے۔ آج مما نے اجالا کا فیورٹ قورمہ بنایا تھا۔ دوپہر میں ہم سب نے مل کر کھانا کھایا۔ اب میں اپنے بیڈ روم میں ہوں۔ اور......''

''تابعہ۔ واٹس رونگ ود یو؟ یہ کس لہجے میں بات کر رہی ہو۔ کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے تم سے اور...... اور تم رو رہی ہو؟'' چھوٹتے ہی اس نے جس ٹیون میں بولنا شروع کیا وہ بے چارہ حیران ہی تو رہ گیا۔ گھبرا کر پوچھا۔

''کسی نے کچھ نہیں کہا مجھ سے۔ اور میں کیوں روؤں گی۔ میں بالکل بھی نہیں رو رہی۔ میرے لیے اس دنیا میں اتنی ہنسی ہے کہ میں رو ہی نہیں سکتی۔ مجھے رونا آتا ہی نہیں ہے۔'' وہ صاف مکر گئی۔ اس کے سامنے بھلا کیوں خود کو کمزور ثابت کرتی۔ اس سے ایک کاغذ کا ہی تو رشتہ تھا۔ دل کا ناتا تو نہیں جڑا تھا جو اسے اپنا درد بتا کر جذبوں کا مرہم مانگ لیتی۔ وہ اس کا محرم تو بنا دیا گیا تھا۔ مگر محرم راز ہونے کے لیے جسے شاید ابھی صدیاں درکار تھیں۔ ہتھیلی سے گال رگڑ کر یوں نشانات مٹانے چاہے جیسے وہ اسے دیکھ ہی تو رہا ہے۔

''تم رو رہی ہو تابعہ۔'' وہ اپنے کہے پر مصر تھا۔ وہ پہلے ہی بےزار تھی۔ چیخ گئی۔

''ہاں میں رو رہی ہوں۔ اب کیا آپ کے گھر میں، میں اپنی مرضی سے رو بھی نہیں سکتی۔''

''او کے روتی رہو۔'' اگر وہ بے حوصلہ ہو رہی تھی تو ایسا ہمدرد وہ بھی نہیں تھا۔ جو رک کر اس سے رونے کی وجہ ہی پوچھ لیتا۔ اگلی جانب چھائی خاموشی نے اسے اک پل کو ہک دک ہی کر دیا۔ اف اتنی بے حسی؟ کیا اتنی سی بھی اہمیت نہیں تھی اس کی؟

''اہمیت ان لوگوں کی ہوتی ہے۔ جنہیں مان اور محبت سے زندگی کا حصہ بنایا جائے۔ وہ لوگ ایسے ہی غیر اہم ٹھہرتے ہیں جو کسی کی زندگی میں زبردستی گھس کر بیٹھ جائیں۔ وہ کون سا تمہیں دل سے لے کر آیا ہے جو فکر میں گھلتا رہے۔ اس کی بلا سے ہنسو یا روؤ۔'' کوئی اس کے اندر چلا رہا تھا۔ اور اپنی ذات کی ارزانی کا یہ ایسا احساس تھا جس نے پھر آنسو چھلکا دیے۔ تو کیا اب عمر بھر کا رونا مقدر ٹھہرا؟

☆☆☆

ثمرین چائے لے کر آئیں تو وہ دونوں پیر اوپر سمیٹے بیٹھی تھی۔ گھٹنوں پر سر ٹکائے اپنے ہی کسی دھیان میں۔ آج صبح ہی عاصمہ اسے خود ڈراپ کر کے گئی تھیں۔

''بھئی میں نے سوچا کہیں میری بھابھی یہ نہ کہے کہ ہم اس کی بیٹی پر قابض ہی ہو گئے۔ اتنے دن ہو گئے۔ اسے ملانے ہی نہیں لائے۔ اب احتشم کی مصروفیت کا تو آپ کو اندازہ ہے ہی۔ کیا کریں بچے کی نئی نئی جاب ہے بہت ہی پھنسا ہوا ہے وہ۔ اسی نے مجھے کہا کہ مما آپ تابعہ کو چند دن کے لیے اس کے میکے چھوڑ آئیں۔ وہ سب کو مس کر رہی ہے۔ کچھ دن سب کے ساتھ رہے گی۔ تو دل بہل جائے گا۔ سچ میں بھابھی میرا تو اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ میں خود اتنا بزی رہتی ہوں کیا کروں۔ مگر دیکھ لیں۔ کتنی لکی ہے آپ کی شہزادی۔ دور بیٹھے بھی آپ کے داماد کو اسی کا خیال ہے۔'' وہ ہنس رہی تھیں۔ ثمرین کا دل بھی سرشار ہو گیا۔ اک ماں کے لیے یہ اطمینان کتنی بڑی دولت ہے جسے یہ بے فکری ہو جائے کہ اس کی بیٹی اپنے گھر میں کس قدر چاہی جا رہی ہے۔ انہوں نے بازو کے گھیرے میں بیٹھی

تابعہ کو خود میں بھینچ لیا تھا۔ سارا دن وہ اس کی آؤ بھگت میں لگی رہیں۔ اس کے منع کرنے کے باوجود اس کی پسند کے کھانے بنائے۔ اب کچن کا پھیلاوا سمیٹنے کے بعد چائے لے کر آئیں تو اسے مراقبے میں پایا۔

"تابعہ خیریت تو ہے نا بیٹا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟ ارے کہیں میری شہزادی کا دل اب یہاں آ کر وہاں والوں کے لیے تو اداس نہیں ہو گیا؟" وہ مسکرا رہی تھیں۔ اس نے گڑبڑا کر سر اٹھایا اور نفی میں گردن ہلائی۔ لبوں سے کچھ نہ بولی۔ مگر اندر اک زوردار "ہونہہ" ضرور کیا تھا۔ وہ اداس اور وہاں والوں کے لیے۔ ابھی اتنی فارغ الدماغ نہیں ہوئی تھی وہ۔ اسے تو احتشم جلال کی بے حسی پر حیرانی تھی۔ اس سے آخر کس حد تک بیزار تھا وہ۔ رونے کی وجہ تک نہ پوچھی بلکہ اٹھا کر میکے بھجوا دیا۔ اس کا تو یہی مطلب تھا کہ اب جتنا چاہے روؤ۔ اور ٹھیک ہے وہ بھی مری نہیں جا رہی اس کے گھر میں رہنے کے لیے۔ وہ پہلے بھی کب جانے پر تیار تھی یہ تو اس کے اپنے ہی تھے جو بیری ہوئے تھے۔ اچھی بھلی زندگی کا ستیاناس کر ڈالا تھا اور وہ اس قدر بدگمان ہو رہی تھی کہ اک پل کو جی چاہا۔ ماں کے چہرے پر کھیلتی مسکان بھی اسی طرح کھینچ لے جیسا کہ ان سب نے اسے اس دولت سے محروم کیا تھا۔ مگر پھر جانے کس احساس نے اس امر سے روک لیا۔

"سچ مانو تو آج صبح سے تمہیں دیکھ دیکھ کر میرا دل اتنا مسرور ہے کہ لگتا ہے میری پچھلی ساری تکان اتر گئی ہے۔ یقین کرو تابعہ جب عاصمہ آپا تمہیں لے کر آئیں اور جو کچھ انہوں نے کہا سمجھو میری تو ہر فکر دور ہو گئی۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تمہارے سکھ نے مجھے میرا ہر دکھ بھلا دیا ہے۔ اللہ سدا تمہیں یونہی ہنستا بستا رکھے۔" ثمرین تو اپنی دھن میں دعا دے رہی تھیں جو اس کے دل پر گھونسے کی طرح لگی۔ وہ پھر بھی مسکرا رہی تھی یہ اور بات کہ اس کی مسکراہٹ میں اپنے ہی لیے طنز کا عنصر بھی تھا۔ مگر جو ثمرین کو کہاں سے محسوس ہوتا جبکہ وہ تو سمدھن اور داماد کی تعریفوں کے پل باندھ رہی تھیں۔

"اللہ پاک ہمیشہ اپنی امان میں رکھیں احتشم کو ماشاء اللہ بہت ہی پیارا بچہ ہے۔ پچھلے سارے عرصے میں جس طرح اس کا رویہ رہا ہے۔ اس سے بہت اطمینان ہے میرے دل کو۔ بی جان جاتے جاتے بھی نیکی کر گئیں میرے ساتھ۔ اب احساس ہوتا ہے وہ ہر بار اچھا ہی کرتی تھیں۔ میں ہی بدنصیب تھی جو اس وقت سمجھ نہ سکی۔ سچ ہے ناشکرا انسان ہمیشہ نعمت کھو کر ہی اس کی قدر جانتا ہے۔ ہک ہاہ۔۔" ثمرین کا ٹھنڈی سانس بھرتے کیا گیا اعتراف اسے نوکیلی سوئی کی طرح چبھا تھا۔ کاش بی جان اس کے سامنے ہوتیں اور وہ ان سے ڈھیر سارا لڑ سکتی۔ اسے بے سکون کر کے خود سکون سے چلی گئی تھیں۔

"تم تو میری شہزادی پوتی ہو۔ پھولوں کی رانی۔ میرا جگر۔ میری جان ہو تم۔" ان کا فرمان ہوا کرتا تھا۔ اور کتنی عجیب بات تھی۔ انہوں نے اپنی اسی پوتی کی جان بڑے آرام سے نکال لی تھی۔ سولی پہ لٹکا کر چلی گئیں۔ وہ تو چند دنوں میں ہی ان بھول بھلیوں میں کھو کر ہانپ گئی تھی۔ عمر کیسے تمام کرے گی؟ اس نے فقط اک خواب ہی چاہا تھا اور اس سے بڑھ کر تو کچھ نہیں۔ مگر......

"تابعہ کہاں کھو گئیں؟ چائے لے لو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" ثمرین کی آواز اسے حال کی دنیا میں کھینچ لائی۔ چونک کر کپ اٹھایا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا بیٹا؟ کچھ ابھی ہوئی سی لگ رہی ہو؟" وہ ماں تھیں۔ اس کی چپ نے فکرمند کر ڈالا تھا۔ عمارہ کی توجہ بھی اسکرین سے ہٹ کر اس کی جانب ہو گئی۔ قبل اس کے مزید سوالوں کی بوچھاڑ ہوتی اس نے خود کو سنبھالا۔

"اوہو۔ کچھ بھی نہیں ہے ماما۔ آپ تو ایک دم ہی گھبرا جاتی ہیں۔ چائے بہت اچھی بنائی ہے آپ نے اور یہ توقیر کدھر ہے؟ اب تک گھر نہیں آیا۔ کیا اتنی دیر تک باہر رہتا ہے؟ ابھی تک اس کی عادتیں نہیں بدلیں؟"

"ہاں تو اور کیا۔ بڑا ہی ستایا ہے مجھے تو اس لڑکے نے۔ خواہ مخواہ کی دوستیاں پال رکھی ہیں۔ کتنا سمجھاتی ہوں کہ باپ سر پر نہیں رہا خدا کے لیے اب تو کچھ سمجھ دار ہو جاؤ۔ ایک دو دن میرے کہے کا اثر ہوتا ہے پھر وہی روٹین۔ خود باہر نکل جاتا ہے اور ادھر ہم ماں بیٹی ہولتی رہتی ہیں۔ بس یہ سب میری ہی دی گئی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔ مجھ سے ہی اس نالائق کی تربیت ٹھیک نہ ہو سکی۔ باپ تو تمہارا سدا کا پردیسی ہوا کرتا تھا۔ انہوں نے تو اکلوتے بیٹے سے لاڈ کرنا ہی تھا۔ سال کے ایک ماہ تو وہ گھر آتے تھے۔ باقی کے گیارہ ماہ تو میں ہی ہوتی تھی نا اس کے ساتھ۔ اور جب بی جان اسے کسی غلطی پر ڈانٹ دیتی تھیں تب مجھے برداشت نہیں ہوتا تھا۔ الٹا میں ان سے ناراض ہو جاتی تھی۔ تب وہ کہا کرتی تھیں۔ تم جو آج اس کے آگے ڈھال بن کر کھڑی ہو جاتی ہو تو کل تم اپنے لیے کوئی ڈھال ڈھونڈا کرو گی۔ بیٹی کی تربیت میں کوئی کوتاہی رہ بھی جائے تو اسے سدھارنے کے لیے اگلا گھر ہی کافی ہوتا ہے۔ سارے کس بل سیدھے ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر بیٹے کی شخصیت میں ذرا سی بھی کجی رہ جائے تو مانو موج کی رسی بن جاتی ہے جو اپنے ہی ہاتھ چھیدنے لگتی ہے۔ ارے یہ بیٹا تمہارا۔ کل کو اس نے تمہارا بازو بننا ہے۔ اسے ابھی سے سیدھا رکھو گی تب ہی تو بوجھ سہارنے والا بن سکے گا۔ ورنہ تو ذرا سا ٹیڑھ آ گیا نا تو کسی قابل نہیں چھوڑے گا اسے۔ پھر تم ہی سر پکڑ کر روؤ گی۔ ہاہ۔۔۔ کتنا سچ کہا کرتی تھیں وہ۔" ثمرین کو آج بات بات پر بی جان یاد آ رہی تھیں۔ اک ٹھنڈی آہ بھری۔ تابعہ نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور سرک کر ان کے نزدیک ہوئی۔

"اوہو آپ اتنا ٹینس کیوں ہو رہی ہیں۔ خدانخواستہ یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کا کوئی حل نہ ہو۔ پھر ابھی کوئی ایسی عمر بھی نہیں توقیر کی۔ آہستہ آہستہ حالات کو سمجھ جائے گا اور ایک دن وہ اتنا سمجھ دار ہو جائے گا کہ آپ خود حیران ہو جائیں گی۔ چلیں اب سب فکریں چھوڑیں اور چائے پئیں ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

"یہی تو سارا مسئلہ ہے۔ میں تو فکروں کو چھوڑ دوں مگر وہ مجھے نہیں چھوڑتیں۔ تمہارا باپ جب تک زندہ رہا مجھے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ وہ کھلا پیسہ بھیج دیتے تھے اور میں کھلے ہاتھ سے خرچ کر دیتی تھی۔ تھوڑی بہت جو جمع پونجی تھی وہ کچھ تمہاری شادی پر خرچ ہو گئی اور جو باقی بچ رہا تھا اس سے بمشکل گھر کا گزارا چل رہا ہے۔ مگر وہ بھی کتنے دن تک۔ ارے خرچ کرنے پر آؤ تو قارون کا خزانہ بھی خالی ہو جائے۔ میرا اکاؤنٹ تو پھر وہ ہے جس میں تم لوگوں کے باپ کی خون پسینے کی کمائی آتی تھی۔ اور جسے اب اس دنیا سے گئے کئی مہینے ہو گئے ہیں۔ اس صورت میں بھی میں انتظار کروں کہ میرا بیٹا حالات کو سمجھے گا تو بھلا بتاؤ پھر کیا نقشہ ہو گا ہماری کل کی زندگی کا؟" ثمرین حد درجے پریشان تھیں۔ صاف ظاہر تھا۔ آج کل توقیر نے کچھ زیادہ ہی تنگ کر رکھا تھا انہیں۔

"اوہو مما۔۔ آپ یہ کیا آپی کے سامنے کھاتہ کھول کے بیٹھ گئی ہیں۔ کیوں پریشان کر رہی ہیں انہیں۔" اس کا رنگ بدلتا چہرہ دیکھ کر عمارہ نے بے اختیار ماں کو ٹوکا۔

"لو بھلا اب اسے نہ سناؤں اپنے دکھ تو کیا محلے والوں سے کہوں۔ اپنا دل بیٹی کے سامنے ہی تو کھول سکتی ہوں میں۔ ورنہ آج کل کا تو وہ زمانہ ہے کہ کسی بہن بھائی سے کچھ کہنا چاہو تو اگلے سمجھتے ہیں ان سے کچھ مانگنے لگی ہوں۔ اسی لیے تو فکرمند ہوں اور ایسے برے وقت سے بچنے کو ہی تو ہاتھ پیر مار رہی ہوں۔ توقیر کا تو بچپنا ہی نہیں جا رہا لیکن مجھے تو ماں بن کر سوچنا ہے نا اور وہ میں سوچ چکی ہوں۔ بلکہ اب کہ احتشم آیا تو اس سے بھی مشورہ کروں گی۔"

"کک...... کیا مشورہ کرنا ہے اور احتشم سے کیوں؟ آپ مجھے بتائیں نا۔" وہ جس تیزی سے بول اٹھی تھی۔ ثمرین نے حیران ہو کر دیکھا۔

''ارے بھئی تمہیں تو بتاؤں گی ہی۔ لیکن احتشم سے مشورہ کرنا بھی بنتا ہے آفٹر آل اس گھر کا داماد ہے وہ۔ مانو بڑا بیٹا ہے میرا۔ اور پھر ماشاءاللہ نہایت ہی لائق اور سمجھ دار بچہ ہے۔ مجھے کوئی اچھی صلاح ہی دے گا نا۔ ویسے بھی بہت خیال رکھتا ہے ہمارا۔ ہر دوسرے تیسرے دن کال کر کے پوچھتا ہے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ اللہ سلامت رکھے۔ اس کا پوچھ لینا ہی میرے لیے بہت ہے۔ مارے خوشی کے خون بڑھ جاتا ہے میرا۔ اس بھری دنیا میں کوئی تو ایسا ہے جسے ہماری فکر ہے۔'' اور یہ یقیناً ایک نئی اطلاع تھی اس کے لیے۔ وہ اس حد تک کیئرنگ ہے؟ خود ہی مما کو کال کر لیتا ہے۔ ان کی خیریت پوچھ لیتا ہے اور حیرت ہے کبھی اسے تو نہیں بتایا۔ ثمرین مزید کہہ رہی تھیں۔

''میرا تو خیال ہے میں توقیر کو یہاں سے دور بھیج دوں۔ کیونکہ اس کی عادتیں باپ کی موت بھی نہیں بدل سکیں تو اگلے حالات کیا خاک بدلیں گے۔ تمہارے بابا کے بعد ان کے کفیل کی کال آئی تھی مجھے اور انہوں نے کہا تھا۔ جب بھی کبھی کسی ہیلپ کی ضروت ہو تو بلا جھجک آواز دیجیے گا۔ مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہو گی۔ اور میرا تو خیال ہے۔ میں ان سے ہی کہوں وہ توقیر کو اپنے پاس بلا لیں۔ جب یہاں کے ماحول سے نکلے گا اور وہاں دن رات محنت کرنا پڑے گی تب ہوش ٹھکانے آئیں گے اس لڑکے کے۔''

''ارے واہ مما یہ تو خوب ترکیب سوچی ہے آپ نے۔ واقعی بھائی کو قابو کرنے کا اس سے بہتر حل اور کوئی نہیں ہو سکتا۔'' عمارہ نے جھٹ تائید کرتے انہیں سراہا۔

''ہے نا؟ تم کیا کہتی ہو تابعہ؟'' ان کا رخ اس کی جانب ہوا۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے مما۔ لیکن آپ دونوں اکیلے کیسے رہیں گی؟'' اسے اک نئی فکر لاحق ہوئی۔

''ارے یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کا بھی حل سوچ رکھا ہے میں نے۔ اوپر والا پورشن صاف کر کے ہم ماں بیٹی وہاں شفٹ ہو جائیں گی اور یہ پورشن رینٹ پر دے دیں گے۔ یوں ہماری آمدن کا ذریعہ بھی بن جائے گا اور توقیر جو رقم وہاں سے بھیجے گا اسے میں سیو کرتی رہوں گی۔ آخر کو ان دونوں بچوں کی شادی بھی تو کرنا ہے۔'' ثمرین تو پورا پلان ترتیب دیے بیٹھی تھیں اور وہ ہونق سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ گویا پہچاننے کی سعی کر رہی ہو۔

کیا واقعی یہ اس کی ماں ہیں؟ ہمیشہ سے بے فکر اور آج میں جینے والی وہ عورت جس کے لیے کبھی کوئی بات مسئلہ ہی نہیں رہی تھی۔ بس کھانا اور لٹانا ہی جس کا دل پسند مشغلہ رہا تھا۔ شوہر کی کمائی کو جس نے بے دریغ پانی کی طرح بہایا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھے وہ دن۔ وہ بھولی نہیں تھی۔ تب یہ گھر بہت سادہ سا ہوا کرتا تھا۔ بابا، بی جان کی اولاد تھے اور ان کی طرح ہی بے حد قناعت پسند۔ تھوڑے کو بھی بہت جاننے والے۔ مگر ثمرین ایک کھاتے پیتے گھر سے تھیں وہ تو ان کا نصیب بابا سے جڑا تھا۔ جو اس گھر میں آ گئیں۔ مگر اس گھر کی سفید پوشی سے نبرد آزما وہ جلد ہی تھکنے لگی تھیں۔ روز روز کے لڑائی جھگڑے معمول بننے لگے۔ کبھی یہ تنگی تو کبھی وہ۔ ثمرین میں صبر تو تھا نہیں۔ ذرا سی کمی بھی سہہ نہ پاتیں۔ تب صرف بابا ہی نہیں بی جان بھی ان کی زد پر ہوتیں۔ (کیونکہ اصل قصوروار تو وہی تھیں نا ان کی اچھی بھلی زندگی کو خراب کرنے والی۔ انہیں ہی شوق تھا اچھے گھر کی بہو لانے کا۔ اور جو نصیب کی یاوری سے مل بھی گئی۔) اور تب اپنی غلطی کا خمیازہ انہیں یوں بھگتنا پڑا کہ انہوں نے ہی دل پر پتھر رکھا اور بابا کو ملک سے باہر جا کر قسمت آزمانے پر آمادہ کیا۔ اور یوں ان کے بہت پیار کرنے والے بابا کو ان سب سے دوریوں کا سفر کرنا پڑا اور پھر ثمرین تھیں اور ان کی من پسند زندگی۔ جو چاہا سو کیا۔ کبھی کسی کے دیے مشوروں کو ذرا بھر اہمیت نہ دی۔

اور آج اپنے سے عمر میں کہیں کم ہستی سے مشاورت پر بھی آمادہ تھیں۔ اور وہ بھی اس شخص سے کہ جس سے ان کی بیٹی نے اب تک اپنے دل کی اک بات نہ کہی تھی۔ بلکہ وہ کہنا چاہتی ہی نہیں تھی۔ وہ کر ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ......

''ارے واہ مما۔ آپ تو بڑی دور کی کوڑی لائی ہیں۔ یعنی خوب سیانی ہو گئی ہیں آپ بھی۔'' عمارہ کی چہکتی آواز نے اس کے تخیل کا تار توڑا تھا۔ ثمرین اک آہ بھرتی کہہ رہی تھیں۔

''ارے میں کس بات کی سیانی۔ ساری عمر چھلنی لیے بیٹھی رہی اب آ کے چھاج ڈھونڈنے نکلی ہوں تو اللہ ہی مددگار ہو میرا۔ سر پر پڑے تب سمجھ دار ہوئے تو کیا حاصل۔ بات تو تب بنتی ہے جب وقت ہاتھ میں ہو اور ہم اسے اپنی ترتیب سے چلائیں۔ اب تو جدھر دریا کا رخ لے جائے۔ چلتے جائیں گے اور یہ لو ہماری باتوں میں چائے تو ٹھنڈی ہو گئی۔ عمارہ تم اپنے اور آپی کے لیے تازہ چائے بنا لاؤ۔ میں نماز عشا ادا کر لوں۔ اور ہاں ذرا بھائی کو بھی فون لگاؤ۔ پوچھو کہاں ہے وہ۔ کب تک آئے گا؟ بہت ہی جان کھائی ہے اس لڑکے نے میری تو۔ یا میرے اللہ اسے عقل دے۔'' ثمرین صوفے کے بازو پر ہتھیلی کا دباؤ ڈالتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ تابعہ نے دیکھا ان کا رخ بی جان کے کمرے کی جانب تھا۔ یعنی آج کل وہ نماز بھی ان ہی کی چوکی پر پڑھ رہی تھیں۔ عمارہ برتن سمیٹ کر جا چکی تھی۔ اور وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھی۔

☆☆☆

''آپ جیسی ماؤں کا زور صرف بیٹیوں پر ہی چلتا ہے۔ بیٹوں کو تو آپ نے بنا لگام کے گھوڑے کی طرح چھوڑا ہوتا ہے۔ وہ جہاں چاہے منہ اٹھا کر گھومتے رہیں۔ ساری پابندیاں آپ کو میری دفعہ ہی یاد آتی ہیں۔ میں نے کہا ہی کیا ہے۔ صرف ایک چھوٹی سی بات ہی تو کہی ہے۔ اور آپ اس پر مجھے زمانے کے چلن بتانے لگ گئی ہیں۔ مما آپ کیوں مجھے ابھی تک چھوٹی بچی ہی سمجھتی ہیں۔ خدارا رحم کھائیں مجھ پر میں اب بڑی ہو چکی ہوں۔'' تابعہ لاؤنج میں آئی تو عمارہ جانے کس بات پر بیزار ماں سے بحث کر رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ استفسار کرتی وہیں آ بیٹھی۔ ابھی عمارہ کو گھورتی ثمرین نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ وہ پھر شروع ہو گئی۔

''بی جان چلی گئیں۔ مگر وہ جاتے جاتے ان کو اپنا روپ دے گئی ہیں۔ ایمان سے بالکل انہی جیسا رویہ ہو گیا ہے۔ وہی انداز اپنا لیا ہے مما نے۔ پلیز آپی ان کو سمجھائیں۔ میری تو کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

''بدتمیزی مت کیا کرو۔ اور وہ کیا سمجھائے مجھے۔ سمجھنے کی ضرورت تمہیں ہے لڑکی۔ اب ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کے گھر میں تمہیں نہیں بھیج سکتی۔ اللہ جانے کس طرح کے لوگ ہوں۔ ہمیں کسی کا کیا پتا۔ اللہ بخشے بی جان ہوتی تھیں۔ تو تم لوگوں کے ساتھ خود ہی اٹھ کر چل پڑتی تھیں۔ اور سچ پوچھو تو مجھے اس وقت ان کا وہ طریقہ بہت برا لگتا تھا۔ ایسا بھی کیا کہ ہمیشہ مرغی کی طرح پروں میں سمیٹے رکھنا چاہتی تھیں تم سب کو۔ مگر وہ اپنی جگہ بالکل ٹھیک تھیں۔ آج کل کا دور ہی نہیں ہے کہ بچوں سے اک منٹ کی بھی غفلت برتی جائے۔ توقیر کو بھگت رہی ہوں نا۔ میرے لیے وہی سزا کافی ہے۔ اب تمہاری سہیلی بیمار ہے تو ایسا بھی کوئی طوفان نہیں آ گیا کہ اس کی تیمارداری کو تم اس کے گھر کو ہی چل پڑو۔ جب کالج جاؤ گی تو پوچھ لینا اس کا حال احوال۔''

''دیکھ رہی ہیں آپی۔ پتا نہیں مجھے کالج بھی کس دل سے جانے دیتی ہیں۔ ان کا بس چلے تو مجھے کسی پنجرے میں ڈال دیں۔'' عمارہ رو دینے کو تھی۔

''میرا بس چلے تو سچ میں ایسا ہی کروں۔ کہیں قید کر دوں تمہیں اور باہر کی ہوا بھی نہ لگنے دوں۔ تم کیا جانو اک ماں کی کیفیت۔ جب اس مقام پر آؤ گی نا پھر خبر ہو گی۔ کہ اولاد کو پالنا اور اس کی تربیت کیسے اک عورت کے لیے دنیاوی پل صراط ہے۔

جس پر پل پل چلنا اور سنبھلنا کتنا کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔'' ثمرین کی بھی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ جانے کون سے احساس تھے جو رلانے چلے آئے تھے۔ تابعہ نے ماں سے نظر چراتے عمارہ کا ہاتھ دبا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

''کتنی دور ہے تمہاری سہیلی کا گھر۔ مجھے بھی کچھ ضروری چیزیں لینا ہیں۔ مارکیٹ جانے کا سوچ رہی تھی۔ میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔ جلدی واپس آجائیں گے۔ کیوں مما چلے جائیں ہم۔'' ثمرین نے بس سر ہلا دیا۔

''ارے واہ میں ایک گھنٹے سے سر کھپا رہی ہوں اور میری کوئی شنوائی نہیں ہو رہی اور اپنی لاڈلی بیٹی کو آپ نے اک پل میں اجازت دے دی۔'' عمارہ کو اعتراض ہوا تھا۔

''وہ خیر سے اپنے گھر بار والی ہے۔ اسے اب میری نہیں بلکہ اپنے شوہر کی اجازت کی ضرورت ہے اور تابعہ بیٹا تمہیں جہاں بھی جانا ہے احتشم سے پوچھ کر اور اسے بتا کر جاؤ۔ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں میاں کے دل میں گھر بناتی ہیں۔'' اور اس نے ماں کی تاکید پر تو گردن ہلا دی تھی۔ مگر عمل کرنے کا قطعاً ارادہ نہ تھا۔ اس نے عمارہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

☆☆☆

فلزا کے والد کی گورنمنٹ جاب تھی۔ ان کی ٹرانسفر ہوئی تو وہ فیملی کو بھی لے آئے۔ بیمار آدمی تھے اکیلے رہنا ان کے لیے بہت مشکل تھا۔ یوں فلزا کو بھی مائیگریشن کروانا پڑی۔ وہیں کالج میں اس کی اور عمارہ کی دوستی پروان چڑھی تھی۔

''پہلے کس شہر میں رہتے تھے آپ لوگ۔'' تابعہ نے تو یونہی بر سبیل تذکرہ پوچھ لیا تھا۔ مگر جو نام فلزا نے لیا اس نے دھڑکنیں زیر و زبر کر ڈالیں۔

''فیصل آباد ہے ہمارا آبائی شہر۔ ویسے تو بابا کی جاب کی وجہ سے ہم نے بہت شہر گھومے ہیں۔ لیکن لاسٹ ٹائم ہم اپنے ہی شہر میں اور اپنے ذاتی گھر میں تھے کہ پھر بحکم سرکار دربدری مقدر ہو گئی۔ سچ پوچھیں تو بہت ہی بڑی خجل خواری ہوتی ہے اس طرح کی جابز بھی۔ میں نے تو اماں سے پہلے ہی کہہ رکھا ہے۔ خبردار میرے لیے کسی گورنمنٹ افسر کا رشتہ قبول نہ کیا جائے۔''

''آپی کے ہزبینڈ بھی گورنمنٹ آفیسر ہیں۔'' عمارہ نے فلزا کی معلومات میں اضافہ کیا تھا۔

''اچھا۔ لو بھئی یہ تو ہماری اپنی ہی نکلیں۔ کس محکمے میں ہوتے ہیں ہمارے دولہا بھائی۔''

''محکمہ بیت المال میں ڈسٹرکٹ آفیسر ہیں ماشاء اللہ۔ بس ان کا بھی یہی حال ہے۔ آج کل ان کی پوسٹنگ اٹک میں ہے۔ کافی دور ہے یہاں سے۔ پھر ان جابز کے مسئلے مسائل۔ بس وہ اسی وجہ سے ابھی آپی کو اپنے ساتھ نہیں لے کر گئے۔'' عمارہ نے تو رٹو توتے کی طرح سارا حال کہہ سنایا تھا۔

(ہونہہ کس وجہ سے نہیں لے کر گئے وہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں) فلزا اس کی تائید کرتی جانے کیا کہہ رہی تھی۔ جبکہ وہ اپنے ہی کسی دھیان میں تھی۔ کہتے ہیں محبوب کے تو شہر کے پتھر بھی پیارے لگتے ہیں۔ اور وہ تو اپنی آنکھوں سے اس کے شہر کے لوگ دیکھ رہی تھی۔ ایسے تو اس چہرے میں اس کی صورت تک نظر آنے لگی تھی۔ اففف۔ کیا مقام بے بسی تھا۔ آج بہت دن بعد اس ہستی کی یاد ٹوٹ کر آئی تھی۔ جس سے اس نے خود ہی سارے رابطے بھی توڑ لیے تھے۔ اس دن مارے طیش کے ثمرین نے اس کا سیل فون چولہے پر رکھ کر جلا ڈالا تھا۔ نہ صرف اس کا بلکہ عمارہ اور توقیر کے سیل فونز کی بھی شامت آئی تھی۔ وہ بے چارے چیختے چلاتے اس ظلم و زیادتی کا سبب پوچھتے ہی رہ گئے۔ مگر ان پر تو جیسے جنون سوار ہو گیا تھا۔ وہی تو تھی اصل مصیبت کی جڑ اور جو انہوں نے پکڑ کر کاٹ ڈالی تھی۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔

''یہی تھا نا وہ راستہ۔ جس پر چل کر تم غلط گلی میں جا نکلی تھیں۔ لو اب ختم ہو گیا سب کچھ۔ اب تم مجھے اس طرف جا کر دکھاؤ۔ تو پھر میرا مرا منہ دیکھنا۔'' ثمرین نے اسے چوٹی سے پکڑ کر اتنے زور کا جھٹکا دیا تھا کہ اسے لگا تھا اس کے بال جڑ سے اکھڑ جائیں گے۔ اور اس دن بی جان کیسے لب سیے سارا تماشا دیکھتی رہی تھیں۔ ان کی امیدیں جو بر آئی تھیں۔ یہی سب تو چاہتی تھیں وہ۔ تابعہ کے دل میں ان کے لیے نفرت کا اک سمندر ابلتا رہا۔ اف۔ ان لمحوں میں کیا کیا نہ یاد آ رہا تھا۔ وہ تو فلزا کی والدہ چلی آئیں تو اس کے گرد پھیلتا حصار ٹوٹ گیا۔

''اتنی دیر لگا دی آپ نے کیا آج ہی ساری شاپنگ ضروری کرنا تھا۔'' فلزا ان کے ساتھ آئے تھیلوں میں جھانک رہی تھی۔

''ہاں نا کیا تمہیں پتا نہیں ہے اپنے بابا کا۔ ساری دنیا سے نرالے ہیں وہ تو۔ انہوں نے ڈرائیور بھیجا ہی اس وعدے کے ساتھ تھا کہ آج کے آج ہی سارا کام ختم کر لیا جائے۔ وہ سرکاری ڈرائیور اور گاڑی بار بار نہیں بھیج سکتے ہمارے بے کار کے کاموں کے لیے۔ اور تم نے ان بچیوں کو چائے کا بھی پوچھا ہے یا اب تک باتوں پر ہی ٹرخا رہی ہو۔''

''وہ بھی اک ماں تھیں جو مجال ہے ذرا بھی کسی کے سامنے لحاظ کر جائیں۔ فلزا کا منہ بنتے دیکھ کر عمارہ کو ہنسی آئی تھی۔ جس نے فوراً ہی کچن کا رخ کیا تھا وہ بھی اس کے سنگ ہی اٹھ گئی۔ فلزا کی سادہ مزاج سی امی اب تابعہ کو اپنی ساری شاپنگ دکھا رہی تھیں۔ ڈھیر سارے کھلونے اور رنگ برنگی پیاری پیاری ننھی منی فراکیں۔

''بہت خوب صورت ہے سب۔ لیکن آنٹی آپ کی فلزا تو اتنی بڑی ہے۔ پھر یہ سب کس کے لیے۔'' اور وہ مسکرا دیں۔

''میری بھانجی کو اللہ پاک نے بہت دعاؤں کے بعد بیٹی سے نوازا ہے۔ پہلے ایک بیٹا ہے اس کا۔ اور ساری مائیں تو ہر بار بیٹا ہی چاہتی ہیں۔ لیکن اس نے اللہ سے مانگ مانگ کر بیٹی لی ہے۔ کہ شاید بیٹی کے طفیل ہی اس کا نصیبہ بدل جائے۔ اس کا عقیقہ ہے پرسوں۔ اسی کے لیے لائی ہوں یہ سب۔ میرا تو بالکل دل نہیں تھا وہاں جانے کو مگر کیا کروں۔ صرف اپنی بچی کے منہ پر فیصل آباد جاؤں گی۔ خوش ہو جائے گی وہ۔ عجیب مقدر لائی ہے ہماری وہ بچی بھی۔ کیا بتاؤں بیٹا تمہیں کہ کیا لڑکی تھی وہ۔ اور اب شادی کے بعد کیا ہو گئی ہے۔ سچ ہی کہتے ہیں بڑے۔ بیٹیوں سے ڈر نہیں لگتا مسئلہ تو سارا ان کے نصیبوں سے ہوتا ہے۔ خاندان کی سب سے ذہین ترین لڑکی تھی وہ۔ یونی ورسٹی میں ٹاپ کیا تھا اس نے۔ ماں باپ کا سر فخر سے بلند ہو گیا تھا اس وقت۔ ایک اچھے گھرانے سے رشتہ آیا تو انہوں نے وقت پر شادی کر دی۔ میری بھانجی کی صورت بھی بہت پیاری ہے لیکن بس رنگ ذرا دبتا ہوا ہے۔ لیکن وہ لڑکا تو اتنا خوب صورت کہ جیسے کسی دیس کا شہزادہ۔ سب اس کے نصیب پر رشک کرتے نہیں تھکتے تھے۔ بس آپا اور بھائی صاحب نے بھی اس کی صورت ہی دیکھی اور فدا ہو گئے۔ کاش کہ کچھ اس کے مزاج کی بھی خبر لی ہوتی۔ در اصل اس نے اپنے سے کم صورت لڑکی سے شادی ہی اس لیے کی تھی کہ وہ اس کی سرگرمیوں میں حائل نہ ہو سکے۔ وہ جہاں چاہے بہانے بنا بنا کر منہ مارتا پھرے۔

ایک تو یہ منحوس مارے سیل فونوں کی وجہ سے بھی ہزاروں لوگوں کی زندگیاں متاثر ہو رہی ہیں۔ پتا نہیں کیسی ہوا چل پڑی ہے۔ کسی کو بھی کسی چیز کا پاس ہی نہیں۔ ارے مرد کی تو خصلت ہوتی ہے وہ تو اپنی آوارگیوں کے لیے ہزار تاویلیں گھڑ لیتا ہے۔ مگر اللہ سمجھے ان کم عقل عورتوں کو جو اپنی ہی صنف کے لیے وبال جان بنتی ہیں۔ دعائیں لینے والے عمل ہی کم ہوتے جا رہے۔ بس اک دوجے کی اذیت کا سامان بنے ہوئے ہیں انسان۔ مت پوچھو بیٹا کیا بیتتی ہے ہمارے دلوں پر۔ یہ تو ہماری بچی ہی بڑے ظرف والی ہے ورنہ کوئی اور ہوتی تو کب کا ایسے آوارہ گرد آدمی کے منہ پر تھوک کر چلی گئی ہوتی۔'' وہ سخت کبیدہ خاطر سی اسے سب بتاتی چلی گئیں۔ وہ بے دھیان سی سن رہی تھی کہ ان کے منہ سے اک جانا پہچانا نام سن کر

چونک گئی۔

”کک...... کیا نام لیا آپ نے اپنی بھانجی کا۔“

”ہانیہ۔ ٹھہرو میں تمہیں اس کی تصویریں دکھاتی ہوں۔ تم دیکھ کر یقین نہیں کرو گی۔ ایسی اچھی صورت والا مرد ایسے برے اطوار کا مالک بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ کی مار پڑے ایک وقت میں دسیوں عورتوں سے دوستیاں ہیں اس کی اور سب ہی کو ایک ہی یقین دلاتا ہے کہ وہ ان سے دوسری شادی کرے گا۔ ایک دو تو اسی چکر میں گھر تک آ گئیں۔ اور وہ تو ایسا ڈھیٹ اور پتھر دل ہے نامراد سب قصے چٹخارے لے لے کر خاندان بھر کو بھی سناتا ہے۔ تم خود سوچو کیا بیتتی ہوگی۔ اس بے چاری کے دل پر۔ بس اسی لیے اس کی ایک ہی دعا تھی کہ اللہ اس بار اسے اپنی رحمت سے نواز دے تو شاید وہ بے حس انسان بھی سدھر جائے۔ لو دیکھو یہ ہے ہانیہ اور یہ اس کا شوہر سبطین۔“ ان کے سیل فون کی روشن اسکرین عین اس کے سامنے تھی۔ اور اسے کوئی آرے سے بھی چیر دیتا تو شاید ایسی تکلیف نا ہوتی۔ کرب کا سمندر تھا جس میں وہ سرتاپا ڈوب ڈوب گئی۔ اذیت دراصل ہوتی کیا ہے۔ یہ تو اس نے ان لمحوں میں جانا تھا۔

☆☆☆

”جو شخص نکاحی بیوی کے ساتھ مخلص نہیں۔ وہ کسی اور عورت کے ساتھ کیسے وفادار ہو سکتا ہے؟ تابعہ توثیق اگر تم اس کے لیے اچھا گمان کرتی ہو۔ تو تم احمقوں کی جنت میں رہ رہی ہو۔ ارے یہ محبت نامی دانہ تو شکاری فطرت والے مرد ازل سے بے وقوف عورت کو ڈالتے آئے ہیں۔ جانتے ہیں ایک یہی تو جال ہے جس میں عقل کی کوری اور نصیب کی جلی جلدی پھنس جاتی ہے اور اللہ نہ کرے تم ان میں سے ہو۔

نکاح کے بولوں میں تو بڑی طاقت ہوتی ہے۔ سات سمندر پار رہنے والے بھی اس میں بندھ جائیں نا تو یک جان ہو جاتے ہیں۔ ہائے وہ کیسا کم بخت ہے جسے اپنی بیوی سے تو محبت ہو نہیں سکی پرائی بیٹیوں کو بہکاتا پھرتا ہے۔ اللہ کی مار پڑے اس پر۔ توبہ توبہ۔ ارے اس کی بیوی نے بھی کیا ان ہی دنوں میں بیمار ہونا تھا۔ تم سمجھ جاؤ تابعہ توثیق وہ صرف تمہیں ٹال رہا ہے۔“ کتنا درست تجزیہ تھا ان کا۔ وہ تو بار بار اس کے لیے کسی حفاظتی الارم کی طرح بجتی رہی تھیں۔ وارن کرتی رہیں۔

”میں جانتی ہوں تمہیں مجھ پر غصہ ہے۔ لیکن اک دن آئے گا۔ جب تم مجھے بے اختیار دعاؤں میں یاد رکھا کرو گی۔“ وقت رخصت بی جان نے کہا تھا اور آج اسے ان کی ہر بات پر یقین آ گیا تھا۔ ان کا کہا حرف حرف سچ تھا۔ وہ جواب تک ان سے سخت خفا تھی۔ ان کے لیے دل میں کینہ سمیٹے ہوئے تھی تو اب اشک ندامت میں ڈوبی اپنی نادانیوں پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہی تھی۔

”اللہ سمجھے ان کم عقل عورتوں کو جو اپنی ہی صنف کے لیے وبال جان بنی ہوتی ہیں۔ وہ یہ کیوں نہیں سوچتیں وہ جس کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہیں۔ کیا اس عورت کے دل سے ان کے لیے آہ نا نکلتی ہوگی۔ ارے دکھی روح کی فریاد تو عرش تک جاتی ہے۔“ فلزا کی امی نے کہا تھا اور اس کے سامنے اپنی سب کوتاہیاں آن کھڑی ہوئی تھیں۔ سوال ہی سوال۔ ہاں اب بولو؟ وہ اکیلا تو قصوروار نہیں تھا۔ تم بھی برابر کی خطاکار تھیں۔ انجانے میں کی جانے والی غلطی کی معافی ہوتی ہے۔ مگر جان بوجھ کر اور بار بار کیے جانے والی خطاؤں پر کفارے واجب الادا ہو جاتے ہیں۔ جو چیزیں اور تعلق ہمارے رب تعالیٰ نے ہماری لیے ایک بار ممنوع قرار دے دیں۔ وہ ازل تا ابد حرام ہی رہیں گی اور یاد رکھو اللہ تو کبھی کسی کے ساتھ برا نہیں کرتا یہ تو انسان کے اعمال ہی ہوتے ہیں جو خسارہ بنتے ہیں۔

ہاں یہ اس کی آہیں ہی تو تھیں۔ جو تابعہ توثیق کو بھی اس کے جیسا ہی جیون ساتھی ملا تھا۔ اگر وہ آدھی ادھوری زندگی گزار رہی تھی تو مکمل اسے بھی کچھ

ملے گا۔ وہ بھی اسی طرح ترسے گی۔ بالکل ویسے ہی تڑپتی رہے گی۔ کیکر پر ہمیشہ کانٹے ہی لگتے ہیں۔ گلاب نہیں اگتے۔ جو بوتے ہو وہی کاٹنا پڑتا ہے۔ اسی لیے ہمیشہ اچھی قسم کا بیج کاشت کرو تا کہ اچھا پھل مل سکے۔ بی جان کہا کرتی تھیں۔ اور وہ تو بہت کچھ کہتی رہیں۔ بس وہی ڈھیٹ ہو گئی تھی۔ مجال ہے جو کبھی کان دھرا ہو کسی بات پر۔ اور اس پل ہر اک بات کانوں میں یوں گونج رہی تھی کہ اسے پردے پھٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ دل شق ہو رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہیں سے بی جان آ جائیں اور وہ ان سے لپٹ کر اتنا روئے کہ اس کا وجود پانی بن کر بہہ جائے۔ وہ ان سے اپنی ہر بدتمیزی کی ہاتھ جوڑ کر معافی مانگے اور کان پکڑ کر ان سے وعدہ کرے کہ وہ جو کہیں گی وہ مانے گی۔ آج کے بعد وہ ان کے کسی بھی حکم سے انحراف نہیں کرے گی۔ بی جان کے بیڈ پر ان کے تکیے میں منہ چھپائے وہ ساری رات اس نے روتے کرلاتے ہوئے گزاری تھی۔

☆☆☆

”تابعہ۔ تم نے تو حد کر دی آج۔ دس بجنے کو آ گئے ہیں بیٹا۔ بستر سے ہی نہیں نکلی ہو اب تک۔ اچھا جب جی چاہے اٹھتی رہنا۔ لیکن ابھی تو چل کر گیٹ لاک کر لو۔ میں یاسمین آپا کی طرف جا رہی ہوں۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ذرا خیر خبر لے آؤں اور پھر مارکیٹ کا بھی ایک چکر لگاتی آؤں گی۔ کچن کی بہت سی چیزیں ختم ہو رہی ہیں۔ دو دن سے تو قیر کو لسٹ بھی بنا کر دی ہوئی ہے۔ مگر وہ ایسا نا ہنجار ہے کچھ بھی لے کر نہیں آیا۔“ ثمرین جیسے بولتی ہوئی کمرے میں آئی تھیں۔ ویسے ہی پھر چل دیں۔ تابعہ کے لبوں پر مجروح سی مسکان پھیل گئی۔ وہ تو اب کوسنے بھی بی جان کی طرح ہی دینے لگی تھیں۔

”ہائے۔ بی جان اتنی جلدی کس بات کی تھی آپ کو؟“ اس کے دل سے ہوک نکلی تھی۔ پیروں میں چپل اڑستے وہ ان کے پیچھے ہی آئی۔ لیکن لاؤنج سے گزرتے قدم وہیں جکڑے گئے۔ سامنے ہی آئینے میں دکھائی پڑتے اپنے عکس سے نظر جا ملی تھی۔ یہ تابعہ تھی؟ ایسے بکھرے بال، ویران آنکھیں، ستا چہرہ، مسلا ہوا لباس، اس کے تو پورے وجود پر حزن چھایا تھا۔ اس کے نقش پہلے کیا کم بدلے تھے۔ جو کل کی رات نے رہی سہی کسر بھی نکال دی تھی۔ اف۔ وہ تابعہ کہاں گئی۔ جو ہمیشہ ٹک سک سے درست رہا کرتی تھی۔ یہ تو کوئی اور ہی تھی۔

”اے لڑکی دو چھپاکے پانی کے منہ پر ہی مار لو۔ کہ اس اتنے بڑے گھر میں مجھے بھی لگے کہ میرے علاوہ بھی کوئی انسان ہی ہے۔“ اسے لگا آج بھی بی جان طنز کے تیر چلا رہی ہیں۔ اور آج وہ گھبرا کر بالکل بھی نہیں پوچھے گی۔

”کیا سچ میں میرا چہرہ زیادہ ہی بدلا ہوا لگ رہا ہے بی جان؟“ کیونکہ اسے پہلے سے ہی ان کے جواب کا علم ہے۔ ان کے وہ لفظ وہ بھولی نہیں تھی۔

اسے بالکل بھول گیا۔ وہ گیٹ بند کرنے نکلی تھی۔ اس نے واش روم کا رخ کیا تھا۔ اور جب خوب اچھی طرح رگڑ رگڑ کر منہ دھو کر آئی۔ اور اسی آئینے کے سامنے کھڑی وہ چہرہ خشک کر رہی تھی کہ اپنے پیچھے ابھرتے اک اور عکس کو دیکھ کر بے اختیار گھبرا کر مڑی۔ اک پل کو تو دل ہی رک گیا۔

”تم ڈر گئیں؟ کمال ہے جبکہ یہ کام تو مجھے کرنا چاہیے تھا۔ لیکن پھر بھی کتنے حوصلے سے کھڑا ہوں یہاں۔ کیا میری ہمت کی داد نہیں دو گی؟ میں تو سمجھا گھر میں کوئی نہیں ہے۔ لیکن اب یقین آیا۔ نانو ٹھیک ہی کہا کرتی ہیں۔ خالی گھروں میں اکثر ہوائی مخلوق گھس آتی ہیں۔ ویسے تم تابعہ ہی ہو نا؟“ وہ سہمی سہمی نظروں سے اس کی پشت پر بکھری کالی گھنگھور گھٹاؤں کو دیکھتا پوچھ رہا تھا۔ تابعہ کی رکی ہوئی سانس بحال ہوئی۔ شکر ہے وہ بنفس نفیس احتشم جلال ہی تھا۔ وہ نیند سے جاگی اس وقت بنا دوپٹے کے ہی ثمرین کے پیچھے اٹھ آئی تھی۔ اب اپنے حلیے کا خیال ہی گھبراہٹ دو چند کر گیا۔ غیر محسوس طریقے سے

لانبے بال ہی سمیٹ کر سینے پر ڈالے۔ اور اس کی حرکت نے احتشم کے لبوں پر مسکان بکھیری تھی مگر جسے وہ منہ پھیر کر کمال مہارت سے چھپا گیا۔

”ج..... جی میں تابعہ ہوں۔ آ..... آپ کب آئے۔“ وہ جتنا سنجیدہ تھا۔ مذاق تو کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بوکھلا کر وضاحت دیتے سوال کیا۔

”یقیناً ابھی پہنچا ہوں۔ میں کچھ فاصلے پر تھا جب ممانی جان کو برابر والے گھر میں جاتے دیکھا۔ تو قیر اور عمارہ کالج گئے ہوں گے۔ تمہیں دھیان رکھنا چاہیے تھا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔“

”جی وہ میں جا ہی رہی تھی بند کرنے۔ آپ بیٹھیں میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ اسے کھسکنے کی جلدی تھی۔ احتشم نے شانے پر ڈالا بیگ فرش پر رکھتے نظر بھر کر اسے دیکھا۔

”صرف چائے؟ محترمہ میں بہت دور سے سفر کرتا ہوا سیدھا یہیں آرہا ہوں۔ اخلاقیات بھی کسی چڑیا کا نام ہے۔ انسان ناشتے کا ہی پوچھ لیتا ہے۔“

”سوری۔ میں ابھی لے کر آئی۔“

”ویسے بنانا تو آتا ہے نا۔ کچھ نا کچھ؟“ اس کے پھوہڑپن کے قصے نانو کو ازبر تھے۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس تک نہ پہنچے ہوں۔ وہ خفت زدہ ہوتی بنا کچھ کہے جھپاک سے کمرے میں جا گھسی۔ کچھ ہی لمحوں بعد سیاہ بدلیاں بڑے سے دوپٹے تلے سمیٹے اس نے کچن کا رخ کیا تھا۔ صوفے پر پاؤں پسارے بیٹھے احتشم نے اسے جاتے دیکھا اور خود بھی اسی جانب ہولیا۔ اسے آتے دیکھ کر تابعہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ مگر کچھ دیر قبل وہ جو کہہ چکا تھا اس کے بعد وہ اس پر اپنی کوئی بھی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ سواڑتے اعتماد کو پھر آواز دے کر بلایا۔ یوں بھی وہ اب کوئی ایسی بھی نکمی نہیں تھی۔ ہلکا پھلکا تو بنانا آتا ہی تھا سب کچھ۔ اس نے بڑے سلیقے سے کام کا آغاز کیا تھا۔

”کافی دن ہوئے تمہیں یہاں آئے ہوئے۔ کیا واپسی کا دل نہیں چاہا؟“ اسٹول کھینچ کر بیٹھتے وہ اس کے دھلے دھلائے نکھرے ستھرے چہرے پر نظر جما کر استفسار کر رہا تھا۔ اور اس کے لہجے میں نہ گلہ تھا نہ کوئی شکایت بے ساختہ ہی کہہ گئی۔

”آپ ہی نے بھیجا تھا مجھے یہاں۔“

”ہاں۔ میں نے ہی بھیجا تھا۔ وہ بھی چند ایک دن کے لیے۔ پھر میں نے واپسی سے تو منع نہیں کیا تھا۔ چلی جاتیں تو اب مجھے نانو سے اتنی جھاڑیں تو نہ پڑتیں۔ انہوں نے تو میرا کام کرنا، سونا جاگنا دوبھر کر ڈالا۔ بس ایک ہی رٹ کہ آؤ اور اسے گھر لاؤ۔ وہ تو ٹھیک ٹھاک اداس ہو گئی ہیں تمہارے بنا۔ ایسا کیا جادو کر آئی ہو ان پر۔“ (اوہ۔ تو موصوف کی تشریف آوری بحکم نانو ہوئی ہے۔ ورنہ انہیں کیا ضرورت تھی اتنا سفر طے کرنے کی۔ جانے اپنے کتنے کام موخر کر کے آئے ہوں گے)۔

”سوری مجھے کوئی جادو نہیں آتا۔ اگر وہ مجھے یاد کر رہی ہیں تو یہ ان کی محبت ہے اور آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی۔ مجھ سے کہہ دیتے میں خود ہی چلی جاتی۔“ آملیٹ تلتے وہ معذرت خواہ ہوئی۔

”نہیں۔ زحمت تو نہیں ہوئی۔ لیکن اگر تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا تو میں ابھی واپس چلا جاتا ہوں۔“ وہ کاسنی دوپٹے کے ہالے میں جگمگاتے اس کے صبیح چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا رنگ فوراً ہی بدلا تھا۔

”نن..... نہیں میں نے ایسا تو کچھ نہیں کہا۔ آپ جا کر فریش ہو جائیں۔ ناشتا بس ابھی تیار ہو جاتا ہے۔“ اسے وہاں سے ٹالنے کا اچھا بہانہ سوجھا تھا۔

”اوکے۔ اور ہاں تم بھی ناشتے کے بعد ریڈی ہو جانا۔ اگر تمہیں اس حلیے میں گھر لے کر گیا نا تو نانو ضرور پوچھیں گی۔ بیٹا ہماری وہ تابعہ کہاں ہے؟ جسے ہم لے کر آئے تھے۔ ارے یہ ہوائی مخلوق کہاں سے اٹھا لائے تم؟“ وہ ویسی ہی سنجیدگی سے کہتا کچن سے چلا گیا۔ تابعہ کے گال کچھ اور لال ہوئے تھے۔ وہ تیکھے چتون سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر جیسے اس

کے اندر چھپے بیویانہ جذبات اک جھٹکے سے بیدار ہوئے۔

”ہاں۔ ان کو تو وہ پھپھو کی بیٹی ہی پیاری لگتی ہو گی۔ میں تو سجی سنوری بھی ہوں گی تو بری ہی لگوں گی۔ اس حلیے کی تو بات ہی کیا۔“ اس کی پلکوں پر ڈھیر ساری نمی اتری تھی۔

☆☆☆

لان کی جانب کھلتی کھڑکی سے سامنے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اور ڈھلتی شام کے سایوں میں کین کی کرسیوں پر براجمان وہ دونوں اک دوجے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہنس ہنس کر دہرے ہو رہے تھے۔ اللہ جانے ایسے بھی کیا قصے تھے۔ جو نہ ختم ہو رہے تھے۔ نہ ہنسی رک رہی تھی۔ پلیٹیں ترتیب دیتی تابعہ نے کوئی تیسری بار گردن گھما کر ادھر دیکھا تھا۔ (یہ شخص ہنستا بھی ہے)۔ وہ استعجاب میں گھری تھی اور شاید نوال نے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔ اسی لیے تو مسکراتے ہوئے بولی۔

”تم آج پہلی بار دیکھ رہی ہو نا۔ اس لیے حیران ہو رہی ہو۔ میں ان کی یہ حالت پچھلے دو برس سے دیکھ رہی ہوں۔ جبکہ ان کی دوستی تو بچپن کی ہے۔ دونوں کو ہی اک دوسرے کے بنا چین نہیں پڑتا تھا۔ اب ان کے درمیان ان کی جابز نے دوریاں ڈال رکھی ہیں۔ اس لیے جب بھی کچھ ٹائم بعد ملتے ہیں تو یونہی بے قابو ہو جاتے ہیں۔ تب نہ ان کی باتیں ختم ہوتی ہیں اور نہ ان کے چھت پھاڑ قہقہے۔ یہ شکر ہے لان میں ہیں۔ ورنہ لاسٹ ٹائم تو ان کی ہنسی میں گلاس ٹیبل ہی ٹوٹ گیا تھا۔ آج بھی اللہ خیر کرے۔ مجھے تو شادی سے پہلے ہی سرمد نے احتشم بھائی کا بہت اچھی طرح تعارف کروا دیا تھا۔ کیا انہوں نے تمہیں یہ سب نہیں بتایا تھا؟“ اور اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

شادی کے بعد ان کی آپس میں بات چیت ہی کتنی کی ہوئی تھی۔ اس نے تو اپنے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا تھا کجا کہ دوستوں کے متعلق۔

”کمال ہے احتشم بھائی نے تمہیں بتایا ہی نہیں۔ چلو آج تو تم نے اپنی آنکھوں سے نظارہ کر لیا۔ اب نیکسٹ ٹائم بھی اسی طرح کی سچویشن ہو تو حیران مت ہونا اور کھانا تو لگ چکا ہے۔ میرے خیال میں اب انہیں بلا لیا جائے۔ ویسے تو یہ رات بھر بھی بیٹھے رہیں تو تھکیں گے نہیں۔ لیکن بھئی مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔ تم بیٹھو میں ابھی آئی۔“ وہ باہر کی جانب چل دی تھی۔ تابعہ کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ جہاں اب قصہ گو احتشم تھا اور سرمد بغور اس کی سن رہا تھا کہ نوال کو آتے دیکھ کر دھیان ادھر ہوا۔ وہ اب ان سے کچھ کہہ رہی تھی۔ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

احتشم آگے تھا اور اس کا ہاتھ سرمد کی گرفت میں۔ جس نے اک شرارت کی تھی۔ وہ گلال ہوئے چہرے کے سنگ ہاتھ چھڑاتی جاتے احتشم کو محتاط نظروں سے دیکھتی یقیناً اسے شرم دلا رہی تھی اور وہ ڈھیٹ بنا اسے منہ چڑا رہا تھا۔ تابعہ بے ترتیب دھڑکنیں لیے کھڑکی سے ہٹ گئی۔ ایک ہنستا مسکراتا جوڑا۔ خوش باش میاں بیوی۔ صاف نظر آرہا تھا۔ سرمد بیوی سے کتنا پیار کرتا ہے۔ احتشم بھی اسی کا دوست تھا۔ اگر اسے بھی من پسند بیوی ملتی تو۔ تو کیا عالم ہوتا؟ اور اس کی سوچوں کو بریک لگی تھی۔ احتشم اس کے سامنے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ انہی سنجیدہ تیوروں سے جو شاید اس کی شخصیت کا خاصہ تھے۔

”آؤ بیٹھو۔“ ڈائننگ چیئر پیچھے کو کھسکاتے وہ اسے دعوت دے رہا تھا۔ اور وہ اس پروٹوکول پر حیران ہوئی تھی۔

”آ..... آپ بیٹھیں۔ میں بیٹھ جاتی ہوں۔“ وہ دوسری چیئر کی جانب بڑھی تھی۔ اور وہ شانے اچکاتا اسی چیئر پر بیٹھ گیا تھا۔ نوال اور سرمد بھی آگئے۔ خوش گوار ماحول میں کھانا شروع کیا گیا۔

”ماشاء اللہ۔ زبردست۔ بھابھی آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ سچ میں سب کچھ ایک دم پرفیکٹ۔ مزا آگیا۔“ احتشم دل کھول کر تعریف کر رہا تھا۔

''تجھے تو پتا ہے یار۔ میں اچھا کھانے کا کتنا شوقین ہوں۔ میں نے اسے شادی سے پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ میرا ایک ہی جنون ہے اور وہ ہے اچھا کھانا۔ جس دن تم نے برا کھانا بنایا نا تو یاد رکھنا۔ اس کی اگلی صبح ہی میں دوسری بیوی لے آؤں گا۔ جو کم از کم اچھا کھانا بنانا جانتی ہو اور دیکھ لو میرے دھمکانے کا اثر۔'' سرمد نے اونچے سروں میں اک قہقہہ لگایا۔ نوال نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ اور احتشم کا تو منہ کی طرف چمچہ لے جاتا ہاتھ وہیں ساکت ہوا تھا۔ اک نظر ہنستے سرمد پر ڈال کر اس نے چمچہ واپس پلیٹ میں رکھ کر پانی سے بھرا گلاس اٹھا کر لبوں سے جوڑ لیا۔ اس کے بعد اسے تو جیسے صرف کھانے سے ہی مطلب رہ گیا تھا۔ بس سرمد ہی ہنستا بولتا رہا۔ کھانے کے بعد تابعہ نوال کی مدد کرنے لگی۔ دونوں نے مل کر برتن سمیٹے۔

''تم یہ ٹرے لے کر چلو۔ میں چائے لے کر ابھی آئی۔'' نوال نے ڈرائی فروٹ سے بھری ٹرے اس کے حوالے کرتے کہا۔ وہ سر ہلا کر چل پڑی۔

''او کیا ہے یار۔ تیری بتی کس بات سے گل ہوئی ہے۔ اچھا بھلا موڈ تھا تیرا۔ آخر ہوا کیا؟'' ابھی وہ ڈرائنگ روم سے دو قدم پیچھے تھی۔ جب سرمد کی آواز کان میں پڑی۔

''بے حیا آدمی۔ بکواس کر کے پوچھ رہا ہے آخر ہوا کیا؟ دل تو کر رہا ہے ایک پنچ مار کر تیرے یہ پیلے دانت توڑ دوں۔ تجھے ذرا شرم نہیں آئی۔ کتنی بے غیرتی سے بتا رہا ہے کہ شادی سے پہلے ہی بیوی کو دھمکا دیا تھا۔ در فٹے منہ ہے تیری مردانگی کے۔ جو ایک عورت کو عورت کے نام کی ہی دھمکی دے رہا ہے۔ لعنت بے شمار۔''

''ہاں تو کیا کروں۔ ہمیشہ سیانوں سے سنتا آ رہا ہوں۔ جیسے لوہے کو لوہا کاٹتا ہے بالکل ایسے ہی عورت کو عورت کا نام لے کر ہی دبایا جا سکتا ہے۔ بیوی کو پہلے دن سے قابو رکھنا چاہتے ہو۔ تو یہی نسخہ آزماؤ۔ وار کبھی خالی نہیں جائے گا۔ تو بس پھر میں نے بھی۔۔''

''تم جیسے مرد ہی سیدھا جہنم رسید ہوں گے۔ جو اللہ تعالیٰ کے احکامات کا غلط مطلب لیتے ہیں۔ اس نے مردوں کو چار کی اجازت اس لیے نہیں دی کہ وہ ساری زندگی اس کے حکم کی آڑ لے کر اس کی دوسری خلق کو ذہنی طور پر ٹارچر کرتے رہیں۔ تم نے تو اپنی مفت کی بدمعاشی میں غور نہیں کیا ہوگا۔ لیکن میں نے دیکھا تھا۔ اس وقت بھابھی کا چہرہ ایک دم رنگ بدل گیا تھا۔ انہیں کتنا آکورڈ فیل ہوا ہوگا۔ تم ہمارے سامنے اس قسم کی بکواس کرنے سے پہلے کچھ تو سوچ لیتے۔ بے ہودگی کی انتہا کر دی۔ تم تو بالکل ہی فضول انسان ہو۔ شیم آن یو۔'' احتشم تو انگارے چبا رہا تھا۔ اتنا غصہ بھرا تھا اس کے لہجے میں کہ جس سے سرمد بھی فوراً ہی دبک گیا اور لگا معافیاں مانگنے۔

''اچھا یار چل پہلی غلطی سمجھ کر معاف کر دے۔ میری توبہ جو کبھی دوبارہ تیرے سامنے یہ بکواس بھی کر گیا تو۔''

''واٹ۔ کیا مطلب ہے تمہارا۔ میرے سامنے ہی نہیں تم آئندہ کسی کے سامنے بھی اپنی بیوی سے ایسا سلوک نہیں کرو گے۔ کتنا حق مہر ادا کیا تھا تم نے بھابھی کو؟''

''شرعی حق مہر ہی تھا یار یعنی میری ایک ماہ کی انکم۔ لیکن اس وقت یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔'' سرمد کو اس کے اک قطعی غیر متعلق سوال پر حیرانی ہوئی تھی۔

''تمہارا رویہ تو ایسا ظاہر کر رہا ہے جیسا کہ تم نے انہیں خرید لیا تھا۔ شرم سے ڈوب کر مر جاؤ۔ تف ہے تم پر۔ اگر مجھے بھابھی کا خیال نہ ہوتا نا تو میں کب کا چلا گیا ہوتا۔ شکر مان ان کا جن کی وجہ سے میں تجھے ٹھنڈا مار کر نہیں گیا۔''

''اچھا میرے باپ اب یہ لعن طعن کا سیشن بند کر دے۔ وہ ابھی آتی ہے تو تیرے سامنے پیر پکڑ لیتا ہوں۔ اپنے الفاظ واپس لے لیتا ہوں۔ جو کہو گے سرکار وہی کروں گا۔ پر اب اپنا موڈ ٹھیک کر لے۔ اور شرم سار نہ کر۔ ویسے میں دیکھ رہا ہوں تابعہ بھابھی کی صحبت نے کافی مثبت اثر ڈالا ہے تم پر۔ میرا تو خیال ہے تمہاری جانب گنگا الٹی بہہ رہی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں حسن کے ساتھ نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ تو تیرے اندر بھی شادی کے بعد شرافت آ ہی گئی ہے۔'' سرمد کے لہجے میں شرارت بھری تھی۔

''بکو مت۔ میں شروع سے ہی شریف النفس انسان ہوں اور مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے ایک عورت کو عورت کی ہی دھمکیاں لگا لگا کر قابو کرنے کی۔ میں ایسے مردوں کو مرد ہی نہیں سمجھتا۔ مرد تو وہ ہوتا ہے۔ جس کی شخصیت ہی ایسی بردبار ہو کہ عورت خود ہی اس کے حصار میں بندھ جائے اور ایسی کہ کبھی نکل ہی نہ سکے۔''

''واہ۔ واہ کیا بات ہے شہزادے۔ لگتا ہے آج کل کوئی ناول شاول پڑھ رہا ہے تو۔ بڑے ڈائیلاگ بولنے آ گئے ہیں۔ اچھا چل چھوڑ یہ بتا۔''

''ارے تم ابھی تک یہیں کھڑی ہو؟'' نوال چائے لیے آ رہی تھی۔

''اوہ۔ ہاں وہ بس ایسے ہی۔'' وہ گڑبڑا کر اس سے پہلے ہی دروازے کی جانب بڑھی۔ اور اس دن اس کی پلکیں بار بار بھیگ رہی تھیں اور نظریں بھٹک بھٹک کر احتشم کے خوبرو چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ لگ رہا تھا آج پہلی بار اسے دیکھا ہے۔ وہ عام مرد نہیں تھا۔ اس کی سوچ بہت خاص تھی۔ وہ خود بہت خاص تھا اور یہ انعام قدرت کی طرف سے اس کے لیے؟ کیا وہ ان خوش نصیبوں میں سے تھی جن کی توبہ قبول کر لی جاتی ہے۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

''جی نانو آپ نے بلوایا تھا۔'' وہ عجلت میں دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی کمرے میں آئی تو انہوں نے کتاب سے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

''یہ کیا کر رہی تھیں۔''

''میں کچن میں تھی۔ آپ کو بتا کر تو گئی تھی۔'' وہ پھر ان کے پاس ہی آ ٹکی۔

''میں ابھی سٹھیائی نہیں کہ چار گھنٹے پہلے کی بات بھول جاؤں۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ آج تمہاری پھپھیا ساس گھر آئی ہوئی ہیں اور تمہاری ظالم ساس نے تمہیں ان کی خدمت کے لیے لے جا کر کچن میں جوت دیا ہے۔ ارے میں تو یہ پوچھ رہی تھی جو تم کمرے میں دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی آ رہی تھیں۔ میری بھولی بچی دوپٹے یا دامن سے ہاتھ منہ کبھی نہیں پونچھتے۔ بھولنے کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ کیا تمہاری بی جان نے کبھی نہیں بتایا تھا تمہیں؟''

''اوہ۔ سوری نانو میں بھول گئی تھی۔'' وہ فوراً ہی نادم ہوئی۔

''اس کا مطلب تم نے اپنی بی جان کی اور بھی بہت سی باتیں بھلا دی ہوں گی۔'' انہوں نے بالکل بی جان اسٹائل میں اسے گھورا تھا۔ اس نے پورے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

''بالکل بھی نہیں۔ اب ہی تو مجھے ان کی ساری باتیں یاد آتی ہیں اور کبھی کبھی تو اتنی شدت سے کہ میرا دل ان کی یاد سے پھٹنے لگتا ہے۔ وہ مجھے کیوں چھوڑ کر چلی گئیں نانو۔ ابھی تو مجھے ان کی بہت ضرورت تھی۔'' اس کی پلکوں پر اک دم ہی منوں بوجھ اترا تھا۔ بھیگتے لہجے میں کہتی وہ ان کا دل بھی تڑپا گئی۔

''ہائے میں صدقے۔ نہ میری جان جانے والوں کے لیے روتے نہیں ہیں۔ اللہ کا مال تھا اس نے واپس لے لیا۔ اس کا اتنا ہی وقت تھا اس دنیا میں اور یہ تو بہت اچھا ہے کہ تمہیں اس کی باتیں یاد ہیں۔ اور اب تمہاری محبت کا ثبوت یہ ہونا چاہیے کہ تم اس کی کہی ہر اچھی بات پر عمل بھی کرو۔ یہ اس کے لیے صدقہ جاریہ بھی ہوگا۔ اچھا یہ بتاؤ احتشم کو گئے آج کتنے دن ہو گئے۔'' انہوں نے یقیناً اس کا دھیان بٹانے کے لیے یہ سوال کیا تھا اور اس نے گزشتہ عرصے میں حساب رکھا تھا یا نہیں لیکن اس بار تو انجانے میں ہی انگلی کی پوروں پر گنتی کرتی رہی تھی۔

نکاح کے دو بولوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے یہ تو سات سمندر پار رہنے والوں کو ایک کر دیتی ہے۔'' یہ بی جان نے ہی کہا تھا نا۔ اور اس قول کو سچ

ہوتے وہ خود دیکھ رہی تھی۔ جس شخص سے کچھ دن پہلے وہ سخت بیزار تھی۔ اب اسی کا انتظار رہنے لگا تھا۔ اس کے کمرے میں رہتے رہتے وہ اس سے مانوس ہو رہی تھی یا اس سے محبت کی پہلی کڑی جڑ گئی تھی۔ فی الحال تو وہ خود بھی انجان تھی۔ لیکن بس ہر پل اس کا دھیان رہنے لگا تھا۔ سو جھٹ بتایا۔

''پورے پندرہ دن ہو گئے۔''

''اور ان دنوں میں اس نے فون کتنی بار کیا؟''

''صرف تین بار۔'' اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ جسے نانو نے بغور دیکھا۔

''بڑا ہی بے مروت ہے یہ لڑکا۔ کام اور کام تو جیسے اس کے لیے ہی فرمایا گیا تھا۔ یہ آئے تو سہی اس بار۔ پھر دیکھنا کیسے کان لمبے کرتی ہوں میں اس کے۔ تم بالکل فکر مت کرو۔ ویسے سچ بتاؤ اداس تو نہیں ہونا اس کے لیے۔'' نانو کی آنکھوں میں شرارت مچل رہی ہے۔ وہ جھکے سر سے بھی بخوبی پہچان رہی تھی۔ عاصمہ کو ان کی جاب مصروف رکھتی تھی۔ اجالا کو اس کی اسٹڈیز۔ احتشم یہاں ہوتا نہیں تھا۔ لے دے کے گھر میں وہی بچتی تھی۔ جس کا اب نانو کے ساتھ دن رات کا واسطہ تھا۔ اسے ان کی صورت بی جان مل گئی تھیں تو انہیں اپنی بچھڑی بہن۔ یوں دونوں کی خوب نبھ رہی تھی۔ بلکہ جب سے وہ ان کے قریب ہوئی تھی ان کی صحت میں بھی خاطر خواہ بہتری آئی تھی۔ وہ خود سے زیادہ ان کا خیال رکھتی تھی۔ اب بھی اچانک یاد آیا۔

''میں نے آپ کے لیے بالکل لائٹ سا نمک مرچ ڈال کر کباب بنائے ہیں۔ یقیناً آپ کو پسند آئیں گے۔ میں بس ابھی لائی۔'' وہ ہوا کی طرح اڑتی کمرے سے نکل گئی تھی۔ پیچھے نانو اس کی تیزی پر مسکرا رہی تھیں اور ساتھ ہی احتشم کی کلاس لینے کا بھی پکا ارادہ باندھ چکی تھیں۔ اس مرتبہ تو واقعتاً اس کی خیر نہیں تھی۔

اور وہ پلکوں پر اتری نمی کو تیز تیز جھپک کر اندر دھکیلتی اپنے ہی دھیان میں آ رہی تھی کہ سامنے آن کھڑے ہوئے پہاڑ کے ساتھ ٹکراتے ہوئے بمشکل بچی۔ سنبھل کر نگاہ اٹھائی تو حیران رہ گئی۔ کہیں یہ نظر کا دھوکا تو نہیں۔

اف۔ تابعہ اب یہ حالت ہو گئی تمہاری۔ اس کے تذکرے ہوں تو چہار سو دکھائی بھی دینے لگتا ہے۔ اوہ میرے اللہ۔ اس نے اک بار پھر پلکیں جھپکی تھیں اور وہ اس پر اک ترچھی نظر ڈالتا آگے بڑھ گیا تھا۔ یوں جیسے ان کے درمیان کوئی شناسائی ہی نہ ہو۔ وہ تو سچ میں بڑا ہی بے مروت تھا۔ اتنا درد تو اس کی یاد نہیں دیتی تھی جتنی تکلیف اس کے رویے نے دی۔ وہ کئی پل اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ اندر اک شور برپا ہوا تھا۔ اس کی اچانک آمد نے سب کو مسرور کر دیا تھا۔ سب سے اونچی آواز مہوش کی تھی۔ جو ہنستے ہوئے جانے کیا کہہ رہی تھی۔ وہ پوری جان سے سلگی۔ اس کا اچانک آنا خوب اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا۔ جو ابھی کچھ لمحے قبل اندر اتار رہی تھی۔ وہ پھر سے [illegible]تی رخسار بھگوتی چلی گئی۔

''دلہن باجی کافی وقت ہو گیا ہے میرا خیال ہے اب بریانی کا دم کھول کر دیکھ لیتے ہیں۔ کہیں زیادہ نہ بیٹھ جائے۔'' گلشن کہہ رہی تھی۔ وہ جلدی سے کچن کی جانب مڑی۔ اور پھر وہ یوں ہو گئی تھی جیسے سماعت اور بصارت کہیں گروی رکھ آئی ہو۔ اگرچشمے کے پیچھے سے جھانکتی اس کی آنکھوں سے اجنبیت جھلک رہی تھی تو وہ بھی یوں ہو گئی تھی جیسے پہچانتی نہ ہو۔ کھانے کی میز پر وہ سب سے گپیں لگا رہا تھا۔ خاص طور پہ مہوش۔ جو اس کی برابر والی کرسی سنبھالے بڑے ٹھسے سے بیٹھی تھی۔ اور سر سے سر جوڑے جانے کیا کیا قصے کہے جا رہے تھے۔ وہ کچن سے ڈائننگ اور پھر وہاں سے کچن تک ہی گھوم رہی تھی۔ ڈھنگ سے کھانا بھی نہ کھایا۔ (حلق سے کچھ اترتا تو تب نا۔ اس میں تو جیسے کانٹے پڑ رہے تھے۔ جس تجربے سے وہ پہلی بار گزر رہی تھی۔ لگ رہا تھا یہ بے دم ہی کر دے گا۔)

کھانے کے بعد مہوش کا جی چاہا تھا لان میں بیٹھ کر

کافی پینے کو اور یہ کیسے ممکن تھا کہ مہمان کی فرمائش رد کی جاتی۔

وہ سب ہی اٹھ گئے تھے۔ اور اس نے بیڈ روم کا رخ کیا۔ اب اس سے زیادہ خود کو اذیت میں رکھنے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ سب پان کھانے جا رہے تھے۔ اجالا اسے بلانے آئی تھی اور وہ سوتی بن گئی۔ اور یونہی روتے سلگتے کب آنکھ لگی وہ بے خبر تھی۔ احتشم رات گئے روم میں آیا تھا۔ وہ سر تک چادر تانے ہوئے تھی۔ اک کینہ توز نظر تنبو پر ڈالتے اس نے کوٹ اتار کر صوفے پر پھینکا تھا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ سیل فون اور والٹ سائڈ ٹیبل پر رکھے تو وہیں پڑا اس کا سیل بھی نگاہ کی زد میں آ گیا۔ جسے جانے کس خیال کے تحت اٹھا لیا۔ روشن اسکرین بتا رہی تھی۔ سیل کو بہت ٹائم سے ہاتھ نہیں لگایا گیا۔

''اوہ۔'' بے اختیار اس کی انگلیاں اپنے گھنے بالوں میں جا الجھی تھیں۔ آنے سے پہلے اس نے تابعہ کو کال کی تھی جو اس نے پک نہیں کی تو پھر ٹیکسٹ کر دیے۔

''میں ایک گھنٹے تک پہنچ رہا ہوں۔ تم تیار رہنا۔ آج ڈنر ہم باہر کریں گے۔'' لیکن گھر آنے پر جس حلیے میں وہ دکھائی دی تھی۔ اس نے احتشم کا اچھا بھلا موڈ خراب کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی جو وہ اس سے منہ پھلائے رہا۔ وہ جانتا تھا وہ اکثر ریپلائے نہیں کرتی مگر ٹیکسٹ دیکھے تو ہوں گے۔

''میری تو کل سے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ جب مہوش نے مجھے کال کی کہ مامی ہم آ رہے ہیں تو بس میں نے تابعہ کو بتا دیا۔ اس کے بعد سب کچھ اس نے خود ہی مینج کر لیا۔ ماشاء اللہ بہت سلیقہ شعار ہے میری بیٹی۔ تمام چیزیں اسی نے بنائی ہیں۔ میں نے تو کچن میں جھانک کر نہیں دیکھا۔'' کھانے کے دوران عاصمہ بڑی محبت سے مریم پھپھو کو بتا رہی تھیں۔ تابعہ کے لیے کتنا پیار تھا ان کی آنکھوں میں اور ایک وہ تھا کہ اس سے آتے ہی بدگمان ہو گیا۔ اٹ گڈ۔ اسے کم از کم اتنی تھڑدلی کا ثبوت نہیں دینا چاہیے تھا۔ ایک بار اس سے بات تو کرتا۔ کتنا ہرٹ ہوئی ہو گی وہ۔ اور وہ اتنا بے چین ہوا کہ جی چاہا ہاتھ بڑھا کر اسے جگا دے۔ مگر پھر بے آرام کرنے کو دل نہ مانا۔ سارا دن وہ بے چاری کچن میں کھپتی رہی تھی کہ اس نے بھی آ کر تنگ کر دیا۔ وہ نادم سا اب اسی تنبو کو بڑی نرم نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

''میاں صاحبزادے تم پر صرف نوکری ہی فرض نہیں ہو گئی۔ تمہارے ذمے کچھ اور بھی فرائض قدرت نے ڈال رکھے ہیں۔ جن سے پہلوتہی کرو گے تو گناہ گاروں کی فہرست میں شمار ہونے لگو گے۔ تم اپنے دفتر کی فائلیں ترتیب و توازن سے رکھتے ہو گے نا؟ تو پھر گھر کو کیوں ویسی ہی اہمیت نہیں دے رہے۔ کیا وجہ ہے اس کے پیچھے؟ کل تمہاری پھپھی اور وہ پھپھی کی بیٹی آئی ہوئی تھیں نا تو اسی لیے دوڑے دوڑے چلے آئے تھے؟'' وہ تو نانو کی خیریت پوچھنے ان کے روم میں آیا تھا۔ کیا پتا تھا وہ اسی کی خبر لینے لگیں گی۔ وہ اس الزام پر تڑپ ہی تو گیا۔

''کیا بات کر رہی ہیں نانو۔ بائے گاڈ۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ پھپھو اور مہوش گھر پہ آئی ہوئی ہیں۔''

''ارے رہنے دو یہ صفائیاں کسی اور کو دینا۔ کیا مجھے پتا نہیں وہ بی بی مہوش ہر بات کی اطلاع زمانے بھر میں سب سے پہلے تمہیں دیتی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے اس نے تمہیں بتایا ہی نہ ہو؟'' اور وہ پھر سے صفائی دینے کو تھا کہ دروازے کے باہر لہراتے گلابی آنچل کو دیکھ کر بیان بدل گیا۔

''بجا فرمایا نانو۔ آپ کتنا پہچانتی ہیں مجھے اور مہوش مجھے کوئی بات نہ بتائے، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ کیا کریں پرانی عادتیں پڑی ہوئی ہیں۔ کوئی آج کی بات تو نہیں۔ وہ میری کزن ہے۔ پھر دوست بھی۔ پھر میں ایسا بے مروت بھی نہیں کہ وہ کچھ کہے اور میں نہ مانوں۔ بس میں تو اسے بہت دیر سے منا رہا ہوں۔ آپ دعا کریں وہ مان جائے۔'' عجب مان

بھرے لہجے میں اس نے اتنی مان مان کی گردان کی کہ نانو نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ اور وہ سامنے ہی آئینے میں دکھائی پڑتے عکس کو دیکھ رہا تھا۔ نانو کے لیے ناشتا لیے آتی تابعہ انہی پیروں پر واپس پلٹ گئی تھی۔ وہ زیرلب مسکرا دیا۔

"کیا کہا تم نے۔ کیا مان جائے وہ؟" ان کے تیور کڑے ہو چلے تھے۔ اور احتشم اب کچھ اول فول بول کر اپنی شامت کو آواز نہیں دے سکتا تھا۔ سو اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔

"بہت تعریفیں کرتی ہیں آپ اپنی نواسی کی۔ یہ خیال رکھتی ہیں وہ آپ کا۔ صبح سے جاگی ہوئی ہیں اور وہ محترمہ ابھی تک آپ کا ناشتا لے کر نہیں آئی۔ آپ کو بھوک لگی ہوگی۔ اور اسے احساس تک نہیں۔ ٹھہریں میں خود ناشتا لاتا ہوں آپ کا۔" اور ان کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ چھپاک سے باہر تھا۔ گلشن نانو کا ناشتا لیے آرہی تھی۔ اور وہ کچن کاؤنٹر پر دونوں ہتھیلیاں ٹکائے جھکی کھڑی تھی۔ آہٹ پر جلدی سے سیدھی ہوئی۔

اسے دیکھ کر برتنوں میں بے مقصد الٹے سیدھے ہاتھ مارنے شروع کر دیے۔ پلکوں کے کناروں پر اتری نمی وہ پہلی نظر میں ہی دیکھ چکا تھا۔

"مجھ ناچیز کا بھی کچھ حق ہے یا پھر میں گھر سے باہر چلا جاؤں۔" وہ خواہ مخواہ بارعب بنا۔

"آ...... آپ چلیں۔ میں بس ٹیبل لگا رہی ہوں۔" وہ گڑبڑا کر کہہ گئی۔

"میں بیڈ روم میں ہوں۔ ناشتا وہیں لے آؤ۔" حکم دیتا وہ پلٹ آیا تھا۔ جس کی تعمیل جلد ہی ہوگئی۔ وہ پیچھے ہی آئی تھی۔ ٹرے اس کے پاس ہی بیڈ پر رکھ کر جانے لگی کہ اس نے کلائی تھام لی۔

"میں جہاں رہتا ہوں۔ وہاں اکیلے ہی کھاتا پیتا ہوں۔ لیکن اگر گھر آکر بھی مجھے تنہا بیٹھ کر ہی ناشتا کرنا ہے۔ تو اس سے بہتر ہے کہ میں واپس وہیں چلا جاؤں۔ ویسے آج تم مجھے بتا ہی دو۔ تمہیں مجھ سے مسئلہ کیا ہے؟" وہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔ تابعہ نے اسے یوں دیکھا گویا پوچھ رہی ہو۔

"مجھے؟ یا آپ کو مجھ سے کوئی مسئلہ ہے؟" اور وہ بن کہے ہی اس کی آنکھوں کی زبان جان گیا تھا۔ اس لیے ٹرے ہٹا کر اسے کھینچ کر پاس بٹھا لیا۔

"آئی سوئیر مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے تو نانو نے حکم دیا تھا کہ احتشم جلال میں تمہارا نکاح تابعہ توثیق سے کر رہی ہوں۔ اینڈ بلیو می میں نے کوئی ردوکد نہیں کی تھی۔ جبکہ چاہتا تو کوئی نکتہ اعتراض اٹھا سکتا تھا۔ میں کہہ سکتا تھا کہ بی جان کی وہی پوتی نا جو سوکھی چرخ سی ہے؟ (ہائیں اس کی اچھی بھلی اسمارٹنیس کو وہ کیا نام دے رہا تھا۔ تابعہ ہک دک ہی ہو گئی) جو ہنستی ہے تو اس کا چہرہ مثل ماہتاب ہو جاتا ہے (یہ اشارہ اس کے ڈمپلز کی جانب تھا۔ یعنی اک اور جھٹکا) جس کی زلفیں دیکھ لو تو بے اختیار مکلی کے ویرانے یاد آنے لگتے ہیں۔ (اف کیا بہترین استعارے تھے اس کے پاس۔ وہ تو ٹکر ٹکر اس کا منہ ہی دیکھے گئی)۔

لیکن نہیں میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ بلکہ ایک فرماں بردار بچے کی طرح سر جھکا دیا تھا۔ وہ تو جب تمہیں نکاح کے روز دیکھا تو میں نے مما کے سامنے اعتراض اٹھایا کہ انہوں نے صرف نکاح ہی کیوں تجویز کیا تھا۔ آج ہی رخصتی کیوں نہ رکھی؟ تم دلہن بنی سنجیدہ سے تیوروں کے ساتھ بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ سچ میں میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں اسی روز اٹھا لاتا۔ (اور گیلی آنکھوں سے اسے دیکھتی تابعہ کے دل نے اک بیٹ مس کی تھی۔ ہونہہ نرا جھوٹ۔ ابھی نانو کے سامنے کیا دکھ روئے جا رہے تھے)۔ پھر میں نے تمہیں ایئرپورٹ پر دیکھا۔ سب ہنس بول رہے تھے اور تم الگ تھلگ منہ پھلائے کھڑی تھیں۔ بالکل اس بچی کی طرح جس کی بھرے میلے میں چاکلیٹ گم ہو جائے۔ اور بی جان نے جاتے جاتے تمہارا ہاتھ مجھے پکڑایا تھا۔ جسے تم بار بار کھینچ رہی تھیں۔ اور میرے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ دل تو اسی دن غنیمت جانتے تمہیں ساتھ لے آتا۔ مگر

بھلا ہو مما اور ممانی کا جو آڑے آ گئیں۔ اور میں پھر دل مسوس کر رہ گیا۔ میں تمہارے چہرے کی سنجیدگی کو تو اداسی مان لیتا۔ لیکن مجھے تمہارا اس دن کا وہ بے چینی سے ہاتھ کھینچنا بھلائے نہیں بھول رہا تھا۔ پھر جس کے لیے مجھے عمارہ سے رابطہ کرنا پڑا تھا۔ (تابعہ کی دھڑکن تیز تر ہو گئی۔ یہ عمارہ کی بچی کتنی غدار نکلی۔ مجال ہے کبھی کوئی تذکرہ بھی کیا ہو۔) اور اس نے مجھے جو بتایا اس کے مطابق تمہیں مجھ پر سرفہرست دو اعتراضات تھے۔ جن کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ اس سے پہلے تم ہماری شادی کا احوال سن لو جب تم نے میری جان نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ تو میں ہی مضبوط اعصاب کا مالک ہوں جو سہہ گیا۔ وگرنہ جس طرح تم نے ہاتھ پاؤں چھوڑے تھے وہ کم اذیت رساں نہیں تھا۔ بہت دکھ ہوا تھا مجھے۔ تم نے خود کو تکلیف دی۔ کھانا پینا ہی چھوڑ دیا۔ میں نے تب ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ تم سے اس وقت تک دور رہنے کا جب تک کہ تم مجھے اپنی زندگی کا لازمی حصہ نہ سمجھنے لگو۔ یا پھر میرے چشمے اور لمبے قد پر تمہیں کوئی اعتراض نہ رہے۔ یہی دو اعتراضات تھے نا تمہارے؟ ایک تو میں چشماٹو تھا۔ دوسرے لم ڈھینگ۔ وہ مزے سے ہنستا ہوا کہہ رہا تھا۔ (اور تابعہ نے اتنی سرعت سے پلکیں میچیں کہ پلکوں پر ٹھہرا پانی چھلک گیا)۔ اب تمہارے اس چشماٹو والے اعتراض کو تو میں لینس لگوا کر جلد ہی دور کر دوں گا۔ مگر جو اگلا ایشو ہے۔ اس کے لیے معذرت۔ کیونکہ سائنس نے بے تحاشا ترقی کرنے کے باوجود تاحال کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں کی جو بڑھے ہوئے قد کو گھسا سکے۔ ہاں اگر اس کے علاوہ کچھ اور ہے تو وہ تم خود مجھے بتا دو۔"

اور اس کے پاس تو کوئی اعتراض رہا ہی نہیں تھا۔ جو ایک تھا اس کی حقیقت تو قدرت کی مہربانی سے کب کی اس پر پوری طرح عیاں ہو چکی تھی۔ جس پر وہ جی بھر کر شرمسار بھی تھی۔ اور اپنی اس خطا پر رب کے حضور معافی کی خواستگار بھی۔ اب اسے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا تھا۔ مگر کیا کرتی آگے دیکھنے پر اک اور منظر دکھائی دے رہا تھا بلکہ سنائی بھی۔ وہ خود ہی تو نانو سے کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے دعا کریں وہ مان جائے۔ تو کیا وہ مہوش کو بھی اپنی زندگی میں لانا چاہ رہا ہے۔ یا اللہ۔ یہ خیال ہی روح میں چھید ڈالنے والا ہے اگر جھیلنا پڑ گیا تو؟" اس کے آنسو بہے چلے جا رہے تھے۔

"میں کل کے رویے پر شرمندہ ہوں۔ مجھے لگا تم میرے ساتھ جانا ہی نہیں چاہ رہی تھیں۔ مگر تم نے تو سیل فون چیک ہی نہیں کیا تھا۔ خیر اب روؤ تو مت یار۔ میرا روتی ہوئی لڑکیوں کو ہنسانے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ویسے بھی جو یہ تم لڑکیاں ہوتی ہو نا ان کے دماغی پیچ قدرتی طور پر ڈھیلے ہوتے ہیں۔ جتنا بھی کسنا چاہو یہ فٹ نہیں ہو پاتے۔ اپنی جگہ سے ہلے ہی رہتے ہیں۔ اب تم خود کو ہی لے لو۔ کب سے سمجھا رہا ہوں۔ مگر مجال ہے جو ذرا سا بھی ٹس سے مس ہوئی ہو۔ بالکل یہی حال اس بے وقوف مہوش کا بھی ہے۔ اسے بھی کب سے سمجھا رہا ہوں۔ لیکن اس نے بھی ڈوب کے مرنے کی قسم کھا لی ہے۔ کچھ سمجھنے سوچنے پر آمادہ ہی نہیں۔ بس ایک ہی ضد پکڑ رکھی ہے۔ اوہ گاڈ۔ کہاں جاؤں میں۔" احتشم نے کلستے ہوئے سر تھام لیا۔ صاف دکھ رہا تھا۔ وہ کتنا پریشان ہے۔

دو کشتیوں کا مسافر اسی طرح تذبذب کا شکار رہتا ہے۔ کبھی ادھر تو کبھی ادھر۔ ڈوبنے کا امکان تو اس کے لیے بھی ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس نے اپنے لیے کوئی ایسا ہی راستہ چن لیا تھا۔ تو وہ کون ہوتی تھی اسے مشورہ دینے والی۔ ہاں وہ اتنا ضرور کر سکتی تھی کہ اسے اپنی فکر سے آزاد کر دے۔ اسی لیے جی کڑا کر کے کہہ گئی۔

"آپ کو پہلے ہی مجھ سے شادی کی ہامی نہیں بھرنا چاہیے تھی۔ کیا ہو جاتا۔ نانو اور مما تھوڑے سے دن ناراض ہی رہتیں نا۔ پھر من جاتیں۔ لیکن ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آپ مہوش کو منا لیں۔ میری پروا

مت کریں۔ میں یہیں اسی کونے میں پڑی رہوں گی۔ کبھی آپ کو تنگ نہیں کروں گی۔''

''واٹ۔ کک...... کیا کہا تم نے؟ تم سے شادی نہ کرتا۔ مہوش کو منا لوں۔ مطلب۔ یار کیا سمجھ رہی ہو تم۔''

''وہی جو اس وقت آپ نانو سے دعا کروا رہے تھے۔'' انگلی پر دوپٹا لپیٹتے اور کھولتے وہ بولی تو لہجہ بھیگا ہوا تھا۔ احتشم کو ہنسی آنے لگی۔ یعنی کہ تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔ اس نے تو صرف ایک شرارت کی تھی۔ یونہی دل چاہا تھا اسے تنگ کرنے کو یا پھر وہ دیکھنا چاہ رہا تھا۔ اس کی بیوی کا ایسی کسی بات پر کیا ردعمل ہوتا ہے اور اب اسے سر جھکائے نیر بہاتے دیکھ کر دل مارے خوشی کے جھوم رہا تھا۔ بے اختیار ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے چھو لیا۔

''افف۔ ایک تو تم جیسی بیویاں بھی نا۔ جنہیں ایسا ہی لگتا ہے کہ ان کا شوہر ہر دوسری لڑکی سے شادی کرنے بھاگا جا رہا ہے۔ کتنی جھلّی اور شکی ہوتی ہو تم خواتین۔ اللہ معاف کرے۔ ہاں میں دعا کروا رہا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ کہاں سے نکلتا ہے کہ تم یہیں کسی کونے میں پڑی رہو۔ اور مجھے تنگ نہ کرو گی۔ یہ جو تم ہمارے نکاح کے دن سے اب تک میرے ساتھ کر رہی ہو۔ کیا وہ سب تنگ کرنے کے زمرے میں نہیں آتا؟ تابعہ احتشم ڈرو اس وقت سے جب میں تمہیں تنگ کرنے لگوں۔ ویسے اگر مجھ سے کچھ اگلوانا ہی چاہ رہی ہو۔ تو تمہاری تسلی کے لیے بتا دیتا ہوں۔ مہوش میرا تیسرا کرش ضرور تھی۔ لیکن آخری نہیں۔ اس سے شادی کی خواہش بھی میری نہیں بلکہ یہ تجویز مریم پھپھو کی تھی۔ جس پر میں نے مما کا بھی ارادہ جاننے کے بعد صرف ان کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ مگر جب یہ سارا سلسلہ مہوش کے علم میں آیا تو وہ صاف انکاری ہو گئی۔ ان فیکٹ وہ کہیں اور انٹرسٹڈ تھی۔ اور اب بھی ہے۔ مگر مصیبت یہ کہ وہ کہیں اور کمیٹڈ ہے۔ اور یہ اس کے پیچھے پاگل۔ وہ تو یہاں تک کہتی ہے کہ وہ جہاں چاہتا ہے۔ شادی کر لے یہ اس کی دوسری بیوی بھی بننے کو تیار ہے۔ ہے نا کم عقلوں والی بات۔ بھلا بتاؤ ہوتا ہے کہیں ایسا۔ میں تو اس لڑکی کو سمجھا سمجھا کر تھک چکا ہوں۔ وہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ میری کزن ہے۔ مجھے اس کی فکر ہے وہ اپنے اس پاگل پن میں کہیں اپنی زندگی نہ تباہ کر بیٹھے۔ اب ایسے میں بھی اس کے لیے دعا نہ کرواؤں تو کیا کروں۔'' احتشم نے ساری رام کہانی کہہ سنائی تھی اور وہ گنگ۔ ہائے یہ دل بے خبر کے قصے۔

آخر یہ لڑکیاں ہی کیوں خود اپنی ذات کی بیرن بن جاتی ہیں۔ ان کی آنکھوں پر خوش گمانیوں کی ریشمی پٹی اس قدر کس کے کون باندھ دیتا ہے جو یہ دیکھ ہی نہیں پاتیں۔ کہ بظاہر اطلس و کمخواب سی نظر آتی محبت کلف لگے کھدر سی بے رونق ہے۔ جو ذرا سی دیر کے لیے بھی کلفتوں کے پانی میں ڈوبی رہے تو سب رنگ اتر جاتے ہیں۔ چمک گم ہو جاتی ہے۔ پیچھے بچتی ہے تو وہ حقیقت۔ جو پھر خود سے نظر ملانے کے قابل بھی نہیں چھوڑتی۔ وہ اس تلخ تجربے سے گزر چکی تھی۔ وہ تو بی جان جیسی معاملہ فہم ہستی میسر تھیں اسے۔ جن کی بروقت کوششوں نے اسے بچا لیا تھا۔ ورنہ جانے وہ بھی کیا کیا عذاب بھگت رہی ہوتی۔ اس تصور نے ہی تابعہ کو پوری جان سے لرزا دیا تھا۔ مہوش کے لیے دل میں ڈھیر ساری ہمدردی امڈ آئی۔

''لڑکیاں تو ہوتی ہی نادان ہیں۔ سیاہ اور سفید میں فرق نہیں کر سکتیں اور چل پڑتی ہیں اپنی زندگی کے فیصلے کرنے۔ یہ بھی اک مرض ہے جو اکثر اس عمر میں لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے لیے صرف دعا کارگر نہیں ہو گی۔ بلکہ اس کی بیماری جس اسٹیج تک پہنچ چکی ہے اب تو دوا بھی کرنا ہو گی۔ مریم آنٹی کو چاہیے فوراً اس کی شادی کر دیں۔'' احتشم کے بازو پر ہاتھ رکھے وہ بے تابی سے کہہ رہی تھی۔

''فوراً شادی کے لیے بھی ایک لڑکا درکار ہو گا ان کو اور اتنی جلدی میں تو میں ہی ہاتھ لگ رہا تھا ان کے۔ مگر وہ تو......''

''ہاں تو آپ اسے پسند بھی تو کرتے ہیں۔ کر لیں شادی۔'' وہ پھر روانی سے بول اٹھی۔ احتشم نے بھنویں سکیڑ کر دیکھا۔

''واہ بہت دیالو ہو تم تو۔ یعنی میں اس سے دوسری شادی کر لوں۔ تمہیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟''

''آپ ایک اچھے انسان ہیں۔ اس کا خیال تو رکھیں گے۔ اس طرح اک لڑکی کی زندگی برباد ہونے سے بچ جائے گی۔ اس شخص کا کیا بھروسا کیسا سلوک روا رکھے۔''

''واہ بہت خوب۔'' احتشم نے داد دینے کو تالی بجائی۔

''تمہاری اس بات سے کم از کم مجھے یہ تو علم ہوا کہ تم مجھے ایک اچھا انسان سمجھتی ہو۔ بہت نوازش۔ شکریہ آپ کی اس کرم فرمائی کا۔ کتنے عمدہ مشورے دیتی ہیں آپ۔ ارے احمق لڑکی اگر اسے دوسری بیوی ہی بننا ہے تو پھر اسی سے شادی کر دیتے ہیں۔ جس کے لیے وہ جان تک دینے کو تیار ہے۔ مجھ غریب کے گلے بلا ضرور ڈالنا ہے۔ مجھے تو پہلے ہی ایک نے الجھا رکھا ہے۔ دوسری تو میری موت کا سبب بنے گی۔ خیر کلوز دس ٹاپک۔ ہم کیا اپنی کوئی بات نہیں کر سکتے؟'' اس کے لہجے کی بیزاری آخری فقرے تک آتے دل نوازی میں بدل چکی تھی۔

''ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' اس نے آہستگی سے ہاتھ چھڑانا چاہا جو ابھی تک اس کی گرفت میں تھا۔ احتشم نے اور کس دیا پوری طاقت کے ساتھ۔ اسے تو جیسے تابعہ کی کوشش پر غصہ ہی آ گیا تھا۔

''نہیں کرنا مجھے ناشتا۔ ہوتا رہے ٹھنڈا میری بلا سے۔ تمہارے یہ ہاتھ میرے ہیں۔ لیکن تمہیں برداشت نہیں ہوتے میرے ہاتھوں میں۔ چلو آج یہ فیصلہ بھی ہو ہی جائے۔ اب یہ چھڑا کر دکھاؤ مجھے۔'' اور وہ ایسی بھی بے وقوف نہیں تھی کہ اس طرح کی کوئی کوشش جاری رکھتی۔ وہ کیوں چھڑاتی بھلا اس سے اپنا ہاتھ۔ انہی ہاتھوں کی لکیروں میں تو اس کے مقدر کے ستارے جگمگا رہے تھے۔ اس نے دلی آمادگی سے اپنا دوسرا ہاتھ بھی ان ہاتھوں پر رکھ دیا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کے مثل چاند سے چہرے پر وہ دل ربا سی مسکان اس قدر خوب صورت لگ رہی تھی کہ وہ مبہوت سا دیکھتا رہ گیا۔

''بس اب خوش؟'' وہ راج ہنس سی گردن اٹھائے کچھ ایسے انداز سے پوچھ رہی تھی۔ جیسے بہت بڑا احسان کر رہی ہو۔ وہ بھی کون سا کم تھا۔ اتنے کم پر بھلا کیوں راضی ہوتا۔ نفی میں سر کو دائیں بائیں ہلاتے دونوں بازو پھیلا دیے۔ وہ محجوب سی سینے سے جا لگی۔ اس کے گرد محبتوں نے حصار باندھ دیا تھا۔ سرشاری و طمانیت رگ رگ میں اتر رہی تھی۔

''احتشم۔'' اس کی شرٹ کے بٹنوں سے کھیلتی تابعہ نے نہایت مدھم سروں میں پکارا تھا۔

''ہوں۔'' احتشم کی انگلیاں اس کی ریشمی زلفوں میں الجھی تھیں۔

''آپ سے اگر کچھ مانگوں تو کیا دیں گے مجھے۔''

''جان احتشم تمہارے لیے سارا جہان حاضر ہے۔ بولو کیا چاہیے؟'' اور وہ جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی۔

''مجھے بی جان بہت یاد آ رہی ہیں۔ ان کی کتنی خواہش تھی کہ اللہ کے گھر کی کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ لیکن پتا نہیں کیوں ایسا ہوا۔ وہ اس گھر کے قریب پہنچ کر جان کی بازی ہار گئیں۔ وقت آخر کیسی حسرت ہو گی ان کے دل میں۔ مجھے جب بھی یہ خیال ستاتا ہے میری روح نکلنے لگتی ہے۔ اور پھر نانو بھی۔ تو وہ بھی کتنے ارمانوں سے جھٹ پٹ تیاری کر کے گئی تھیں۔ مگر۔ احتشم کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں بی

جان کی وہ خواہش پوری کرسکوں۔ آپ مجھے لے کر جائیں گے وہاں۔ میں ان کے اور بابا کے نام کا عمرہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ ہم نانو کو بھی ساتھ لے کر جائیں گے۔ میں......" وہ پرجوش سی بولے چلی گئی۔

اسے پتا بھی نہ تھا کہ اس خواہش کا اظہار کرتے اس کی آنکھوں سے اک آنسوؤں کی لڑی سی اس کے رخساروں کو بھگوتی جا رہی ہے۔ اسے جیسے آج ہی موقع ملا تھا اور وہ سب کہہ دینا چاہتی تھی۔ احتشم کی نظروں میں محبتوں کا اک جہان بسا تھا۔ وہ تو اک لمحے کو ڈر ہی گیا تھا۔ پہلی بار وہ اس سے کچھ ڈیمانڈ کر رہی تھی۔ جانے کیا مانگ لے۔ مگر اس کے شنگرفی لبوں سے پھولوں سے جھڑتے لفظوں نے اس کا دل مہکا دیا تھا۔ ہتھیلی سے اس کے گیلے عارض صاف کیے مسکرا کر اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"تم نے پہلی فرمائش ہی اتنی خوب صورت کی ہے تابعہ کہ میں تو اس سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔ بس طے ہو گیا۔ اب میری پہلی کوشش ہی اسی بارے میں ہو گی۔"

"شکریہ احتشم۔ مجھے پتا تھا آپ ضرور مان جائیں گے۔ آپ بہت۔ بہت اچھے ہیں۔" وہ حد درجے ممنون تھی۔

"یس آئی نو۔ لیکن میں تو حیران ہوں کہ تم کتنی اچھی ہو۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا بیویاں اتنی اچھی بھی ہوتی ہیں۔ ایمان سے تابعہ اس وقت تمہیں دیکھ دیکھ کر دل چاہ رہا ہے۔ بالکل تمہارے جیسی ایک اور بھی ہو۔ پھر میری زندگی اور خوب صورت ہو جائے۔ ہے نا۔" احتشم بھی ایک مرد تھا اور اسی دنیا سے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بیوی کو نہ چڑائے اسی ایک وجہ سے جس سے کہ سو فیصد مرد ازل سے اپنی بیویوں کو تپاتے آئے تھے۔ مگر وہ بھی تابعہ تھی۔ بجائے برا ماننے کے ہنس دی۔

"کچھ دن پہلے سرمد بھائی کی اک بات پر اتنے انگریسو ہونے والے احتشم جلال اگر آج خود بھی اسی طرح کی بات کر رہے ہیں تو بلیو می مجھے کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ یہ سب آپ مردوں کی جینز میں شامل ہے۔ آپ کی نہ کبھی فطرت بدل سکتی ہے اور نہ ہی نیت سیر ہو سکتی ہے۔ آپ کا تو وہ حال ہے کہ جب دوسری بھی اتنی ہی اچھی نکل آئی تو پھر آپ کہیں گے۔ ون مور۔ آپ یوں کریں۔ ایک ساتھ ہی تین، چار اکٹھی لے آئیے گا۔ تاکہ آپ کی زندگی مکمل حسین ہو جائے۔ کہیں کوئی حسرت باقی نہ رہے۔ بلکہ ایسا کریں ابھی ڈھونڈنے نکل جائیں۔"

"ہاہاہا۔ بالکل سچ کہا تم نے ایسا ہی ہے۔ لیکن تم اتنی چالاکی سے مجھے گھر سے نہیں نکال سکتیں۔"

"جی نہیں میں کیوں نکالنے لگی۔ خدانخواستہ۔ آپ کو ہی شوق ہے گھر سے باہر رہنے کا۔" اس کے الزام کا ترنت جواب آیا تھا۔

"مجھے تو اور بھی بہت سارے شوق ہیں۔ تم نے کبھی پاس بیٹھ کر سنے ہی نہیں۔ ہائے کیا کیا حسرتیں ہیں دل میں۔ جو تم ہی پوری کر دو تو مجھے کیا ضرورت کہیں اور جانے کی۔ یہ اتنی لمبی زلفیں کس لیے سنبھال رکھی ہیں۔ باندھ لو نا مجھے۔ میں تو پہلے ہی تمہاری ان دل فریب آنکھوں پر فدا ہوں۔ تم ان میں چھپا کر رکھ لو مجھے تو میں بس تمہارا۔ اور ادھر آؤ نا ذرا آج سارے شوق بتاؤں تمہیں۔" احتشم نے لپک کر پھر ہاتھ تھاما تھا اور کچھ دیر پہلے وہ خود ہی تو اسے خوش کر رہی تھی۔ اب بھلا پھر سے ہاتھ کھینچ کرنا خوش کیسے کرتی۔ وہ دوسرا ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھاتی وہیں ٹھہر گئی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کی زندگی کے افق پر بہار نے قدم اتارے تھے۔ اور اب یہ بہار سدا یونہی ٹھہری رہے۔ یہ اس کے دل کی دعا تھی۔ اور دل سے نکلی دعائیں ضرور فلک تک جاتی ہیں اسے یقین تھا۔

منشا محسن علی

وقت کی گھڑی

میرا نام نجیلہ بانو ہے میرے گھر والے مجھے پیار سے "سجو" کہتے ہیں اور میری شہری سہیلیاں مجھے "سج" کہہ کر بلاتی ہیں۔ اور میں فخر سے ہنس کی طرح گردن تان کر "سج" بن جاتی ہوں جس شہر کی سڑکوں پر آزادی سے گھومتے ہوئے ہاتھوں میں کچھ تھامے اپنے آپ کو کافی ماڈرن اور گلیمرس پاتی ہے۔ کبھی کبھی گھر والوں کے دیے گئے لفظ "سجو" سے میں شدید اکتاہٹ اور اضطراب کا شکار ہو جاتی ہوں۔

"بھلا یہ بھی کوئی نام ہوا...... سجو...... گجو۔"

گاؤں کے لوگوں کی زندگیوں میں وقت جامد اور "چپی" اوڑھے خربوزے کی گنجل بیلوں میں اٹکا ہوا ہوتا ہے۔ میرے گاؤں کا نام "للتن" ہے، دور دور تک حد نگاہ تک پھیلی ریت ہوا اور ریت کی دشمنی ازل سے ہے۔ ہوا ریت کے سکون کی دشمن ہے ادھر ہوا انگڑائیاں لیتی ہے اور ادھر ریت کے ٹیلے اپنی جگہ سے دوسری جگہ کی طرف سرکنے لگتے ہیں۔ ریت کی ہتھیلیوں پر اونٹ اور تیتروں کی نشانیاں ملتی ہیں۔ سفر کی...... ہجرت کی...... ہجرتوں میں بڑی روحانیت ہوتی ہے اور اونٹوں کے غولوں میں روحانیت اور بزرگی۔

تارکول کی کئی چھوٹی سڑکیں ملکہ کوہسار مری کے بڑھ پن کو بھی مات دیتی نظر آتی ہیں۔ سڑکوں کے گرد پھیلے قطار در قطار کھگل کے درختوں کے نیچے چٹائیاں ڈال کر ہم چار سہیلیاں قطار گوٹی کھیلتی تھیں۔ میں، سندس، شانو اور الماس، کوئی اکا دکا موٹر سائیکل گزرتی تھی تو گرد ٹھہر جاتی تھی۔ گرد کے بادل چھٹتے تو وہی میلوں پھیلی ریت۔

قطار گوٹی کھیلتے ہوئے ہم چاروں پاس ہی رکھے کسی کے مٹکے سے اسٹیل کے گلاسوں میں لسی انڈیل کر غٹاغٹ پی جاتے۔ الماس زمانے بھر کی بے ایمان لڑکی تھی گوٹ چلتے ہوئے بے ایمانی کرتی تھی ہم چلا اٹھتے۔

"بے ایمان...... الماس۔" وہ گھاگھرے کو جھاڑتی اٹھتی ہوئی آنکھوں کے آگے ہاتھوں کا چھپر

تان کر دور تک دیکھتی تھی۔

"دھواں اٹھ رہا ہے اماں نے تندور سلگا لیا ہے مجھے جانا چاہیے۔" شانو اسٹیل کے گلاسوں کو ایک دوسرے سے ٹکراتی غصے ہوتی تھی۔ پھینی ناک پر غصہ بڑا جچتا تھا۔

"ہر بار یہ ایسے ہی کرتی ہے۔" سکون سے شروع ہونے والی محفل انتشار کے ساتھ برخاست ہوتی تھی۔

ہم لتن کے اکلوتے مڈل اسکول میں پڑھتے۔ آٹھویں جماعت میں پیاسا کوا اور لالچی کتا جیسی کہانیاں ہم نے ریت کے ٹیلوں پر ریت کے گھر بناتے ہوئے یاد کی تھیں...... دور تک پھیلی چنوں کی فصلیں آنکھیں کو سکون بخشتی تھیں۔ چنوں کو بارشیں راس آتی تھیں۔ لتن کی ریتیلی زمینوں پر بارشوں کی آمد گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چراغوں کے جلنے سے پھیلنے والی روشنی کے مشابہ ہوتی تھی۔ ادھر بارش کی بوند راستے میں ہوتی تھی اور ادھر اونچے ٹیلوں پر ہمارا عارضی کچی اینٹوں کا چولہا بن جاتا تھا۔ کچے چنوں کا "تریڑہ" لگا کر کھاتے ہم ہاتھ منہ کالے کر لیتے۔ آخر لمبی اوڑھنیاں کس کام آتی تھیں بھلا۔ کدو کا حلوہ اور آم امرود کی چٹنیاں بنانا بھی ہمارے پروگرام کا حصہ ہوتا تھا...... چٹخارے لے لے کر کھاتے ہم اپنی زندگی میں مست تھے۔

جوانی میں تو ہواؤں میں زعفران گھلے ہوئے لگتے ہیں۔ شیر۔نہہ کے اونچے درختوں کی چوٹیوں پر چڑھ کر اوڑھنیوں میں خربوزے باندھے ہم رسیلے خربوزے کھاتے، سارے لتن کی چغلیاں کرتی تھے۔ چغلیاں بھی کبھی کبھی کسی چٹخارے دار کھانے کی طرح لگتی ہیں۔ لذت اور کھٹاس۔

شانو اپنے ابا کا پرانا ریڈیو اٹھا کر لے آتی تھی جو ہم ٹیوب ویل کی کوٹھی کے طاق میں رکھ کر پاس سر جوڑے بیٹھ کر سنتے۔ سہ پہر کے ٹھنڈے اور پر کیف وقت میں ریڈیو پاکستان سے دوہڑے ماہیے نشر ہوتے تھے۔ "چھلا میڈا اجی ڈھولا"، "اک پھل موتیے دا" اور چٹی کرولا" تو ہم نے لکھ لکھ کر رٹ لیے تھے۔

لتن میں ہونے والی شادیوں کے "میل" میں ہم چاروں گلوکارائیں اپنے فن کا مظاہرہ پیش کرتی تھیں۔

آٹھویں کے پرچے دینے جب ہم ڈارسن پر سوار، شہر پیر رکھ کر کھڑی ہوئی تھیں تو ہم چاروں کو ایک ساتھ "چپ" لگی تھی ہم تو ریت کی وادیوں کی غزال تھیں، ریت نے ہمیں ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت بھی نہ دی تھی اور یہاں پکی سڑکیں۔ ٹی اسٹال، فروٹ چاٹ، رنگ برنگے فیشن، اردو، انگریزی بولتے لوگوں نے ہمیں گنگ کر دیا تھا۔ پکی اینٹوں والی اونچی دلکش، فلک بوس عمارتوں کو سر اٹھا کر دیکھنا پڑتا تھا۔ ہمیں اپنے گھر کی کچی اینٹوں سے لیپی ہوئی کوٹھیاں یاد آئی تھیں جن پر ہم پڑھی لکھی لڑکیوں نے اقوال زریں چونے سے لکھے تھے۔

"اللہ ایک ہے۔"

"زندگی املی کی گولی ہے۔"

"دوستی پودینے کی ٹکیا ہے۔"

شہر والوں کو وقت نے آگہی عنایت کی تھی اور ہم ریت کے بے خبر باشندے۔ ڈارسن پر واپسی کے سفر میں ہچکولے کھاتے ادھر ادھر لڑھکتے ہوئے یہ پہلی بار تھا کہ ہم چاروں خاموشی کے کنویں میں دھکا لگا گئے۔

آنے والے دنوں میں سرسوں کے رنگ ہمارے لیے پیلے نہیں ہوئے۔ لتن کی سڑکوں کے کنارے بوڑھے کھگل کے درخت ہمارا انتظار کرتے رہ گئے۔ ریت اونٹوں اور تیتروں کے پیروں کی نشانیاں ہمارے لیے رکھے لیٹی رہی۔ شیر۔نہہ کی چوٹیاں خالی رہ گئیں۔ خربوزے کے کھیتوں کی جڑوں کو کنڈیلے چوہوں نے کتر کھایا تھا۔ عصر کے میٹھے پہر میں شانو کے ابا کے ریڈیو سے ابھرتے دوہڑے بھی ہمیں واپس نہیں لا سکے تھے۔ الیاس کے ٹی وی پر پی ٹی وی سے نشر ہونے والے بانو قدسیہ کے ڈرامے، حسینہ معین کی کرن کہانی اور رؤف خالد کے لاگ تک ہم بھول گئے۔ الفا براؤ چارلی کے فوجی ہیروؤں نے بھی ہمارے خوابوں میں آنا چھوڑ دیا تھا......!!!

وقت ابلیس کے چیلوں سا شرارتی، لتن کی گرم دوپہروں میں ننگے پاؤں گلیاں گھومتا رہا...... مگر آبلے ہمارے پیروں پر پڑ گئے۔ بورڈ میں آنے والی پوزیشن ہی آگے میرے لیے راہ ہموار کر گئی تھی۔ منتوں، جتنوں کے بعد اور پرائیویٹ اداروں کی بار بار آمد اور لفظ "مفت تعلیم" نے ابا کو مجھے شہر پڑھنے بھیجنے کے لیے آخر راضی کر ہی لیا تھا۔ پھر بوڑھے کھگل کے درخت کے سائے تلے دری بچھائی گئی تھی اور وہ تینوں آس و نراس، حسرت کی تصویر بنی چپ چاپ مجھے دیکھتی رہی تھیں۔

"تو واقعی سجو شہر پڑھنے جا رہی ہے؟"

"ہاں ہاں...... بالکل اب میں شہر میں ہی پڑھوں گی۔ وہاں تو میری ٹور ہی اور ہو گی۔"

"ہم کیوں نہیں جا سکتے شہر......؟"

"ارے تم لوگوں کی پوزیشن تھوڑی آئی ہے بھلا......" چنوں کے تریڑے جیسی کالک ان کے چہروں پر چھا گئی تھی۔

"سجو...... تو ہمیں بھول تو نہیں جائے گی۔"

"زندگی بہت مصروف ہوتی ہے شہر کی الماس۔ یادیں تو فراغت کا کام ہیں۔"

وہ تینوں لسی کا مٹکا اور بغیر کسی شور کے اسٹیل کے گلاس اٹھا کر جاتے ہوئے سمجھ گئی تھیں۔ دوستی کی مستطیل بکھر گئی تھی۔

☆☆☆

شہر میں وقت بانہیں کھولے میرا منتظر تھا اور یہاں کی جنگ جیتنے کے لیے مجھے بس ایک ہی کام کرنا تھا اور وہ میں نے کیا تھا۔ محنت دن رات محنت، بغیر تھکے، بغیر رکے...... لتن کی سجیلہ بانو "سج" بن گئی۔ سرسوں کے رنگ شہر کی روشنیوں میں ڈھل گئے چائے کا رنگ "کافی" میں بدل گیا۔ چٹنیاں کیچپ بن گئیں۔ یونٹ پلاؤ ہولے ہولے "بریانی" ہو گیا۔ آلو کی بھجیا "پٹیز" بن گئی۔ آٹے کے وڑے کاٹن کینڈی بن گئے۔ گھاگھرے، کرتا اور لانگ شوز کا روپ اختیار کر گئے۔ میں اپنے فرینڈ سرکل میں "سج" بن گئی تھی۔ اسٹائلش اور گلیمرس گرل جسے پہننے، اوڑھنے کا سلیقہ آتا تھا...... جو تعلیمی میدان میں بھی سب سے آگے آگے تھی۔

"زندگی، تھوڑا اور...... تھوڑا اور...... ہی کیوں ہوتی ہے؟؟ مٹھی بھر آسمان پر قناعت کیوں نہیں کی جاتی اور سب کو پورا آسمان ہی کیوں چاہیے ہوتا ہے......؟؟"

"پورے آسمان کی خواہش کبھی کبھی بہت تھکا دیتی ہے ناں...... سفر...... سفر...... اور بس...... آسمان سے لگی خواہشوں کی بلند ترین سیڑھی پر قدم رکھتے جاتے...... رکھتے جاتے ہیں...... آسمان ہاتھ آتا ہی نہیں...... کبھی آیا ہی تو نہیں......!!!

اپنا جامنی ہڈ سر پر گرائے جب میں یونیورسٹی کی راہداریوں سے گزر رہی ہوتی ہوں تو یونہی کبھی کبھی راہداری کی دیواروں پر شر۔نہہ کی چوٹیاں ابھرنے لگتی ہیں۔

"سجیلہ بانو...... ہمیں بھول گئیں کیا......؟"

میں تیز تیز قدم بڑھاتی نیم تاریک راہداری سے گزرتی شش شش کرتی ہوں۔

"شش...... آئی ایم سج" (میں سج ہوں) شر۔نہہ کی چوٹیاں تڑاخ تڑاخ کر کے ٹوٹتی چلی جاتی ہیں......!!!

"تجربے گاہ کی ساری شیشیوں میں پڑے محلول سفید ہونے لگتے ہیں۔ ان پر مکھن کا کھردرا بور آنے لگتا ہے...... لسی کی باس ساری طرف پھیل جاتی ہے۔ لسی کی کھٹی مہک سے میرا جی الٹنے لگتا ہے۔ میں کانپتی ہوئی بیسن کی طرف بھاگتی ہوں۔ اسٹیل کے گلاسوں کا شور...... اُفف......!!!

بلیک بورڈ پر چلتا چاک اچانک چونے کا گیلا ٹوٹا بن جاتا جس سے لیپی ہوئی دیواروں پر اقوال زریں لکھے جاتے تھے۔ لیڈی گاگا اور شکیرا کی دھنیں ہولے سے "چھلا میڈا اجی ڈھولا۔" کی تان میں ڈھل جاتیں۔

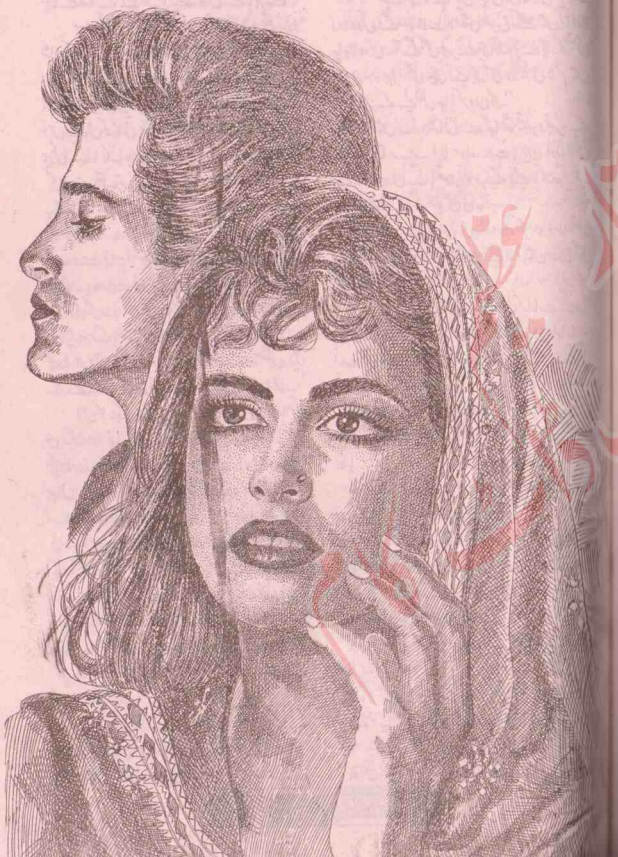

مکمل ناول

فرح بخاری

کنارِ خواب جو

سوار حسن کو کچھ عجیب سے حالات میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑنا پڑا اور وہ اپنی خالی جیب اور منتشر دماغ لیے بنا سوچ کوسٹر میں سوار ہو کر مری آ گیا۔ ایک معمولی ڈھابے کے مالک میاں نذرا سے یہاں پہلے مہربان ساتھی کی صورت میں ملے۔ انہوں نے سوار کو ایک ہوٹل میں مہینے بھر کے لیے ریسپشنسٹ کی جاب لگوا دی۔

ثمامہ ابراہیم ایک خوب صورت، طرح دار جوان بیوہ ہے۔ مرحوم شوہر سے ملنے والی جائیداد سے جس نے مری میں ایک فائیو سٹار ہوٹل کا آغاز کیا ہے۔ وہ اپنے چار سالہ بیٹے، ماں اور بھائی کے ساتھ ہمیشہ کے لیے مری سیٹل ہوئی ہے۔

کنعان رفیق اس دوسرے ہوٹل کے منیجر رفیق احمد کی بیٹی ہے جس میں ایک ماہ کے لیے سوار کو نوکری ملی ہے۔ کنعان ایک خاموش طبع شرمیلی سی لڑکی ہے جسے ماضی کے ایک حادثے کی بدولت لفظ محبت سے سخت گلے ہیں لیکن سوار سے پہلی ملاقات نے اس کے خیالات میں ادھم مچا دیا ہے۔

شازمہ کی چند ماہ پہلے وقاص سے شادی ہوئی ہے۔ اس کے شوہر کا لکڑی کا کارخانہ ہے، کچھ خاندانی دشمنیوں کی بنا پر اسے رات بھی کارخانے میں گزارنا پڑتی ہے جس کی وجہ سے شازمہ کو گھر پر اکیلا رہنا پڑتا ہے، اور یہ اکیلا پن شازمہ پر ایک خوف بن کر سوار ہے۔

دوسری قسط

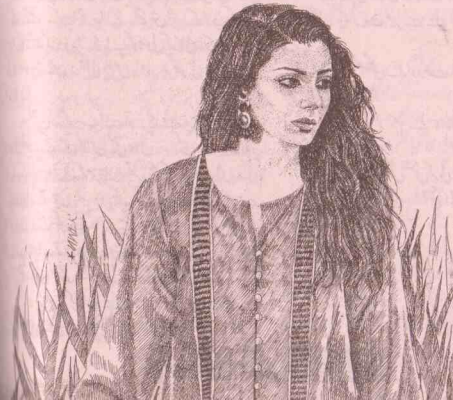

"نانا جی۔ سوار بھیا آگئے۔" فخری نے دُور سے ہی سوار کو روڈ کی چڑھائی سے اُتر کر ڈھابے کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ نذر حسین بھی کندھے پر رکھے صافے سے منہ پونچھتے جوش سے باہر نکلے۔

سوار پچھلی صبح کا یہاں سے گیا آج اگلے روز شام کو واپس آرہا تھا۔ مشتاق خان کی دکان سے ازمیر ہوٹل پہنچتے اور انٹرویو وغیرہ سے فارغ ہوتے اُسے دوپہر ہوگئی تھی۔ ہوٹل کے منیجر رفیق احمد نے اُس سے مل کر کافی خوشی اور تسلی کا اظہار کیا تھا۔ لیکن ہوٹل کے مالک جاوید صاحب کی آمد چار بجے متوقع تھی۔ تب تک وہ یونہی اِدھر اُدھر گھومتا رہا تھا۔ پانچ بجے جاوید صاحب نے اوکے کرکے اُسی وقت کام پر رکھ لیا۔ تب سے رات گئے تک وہ رفیق سر اور صدیق کی مدد سے تمام اُمور ساتھ ساتھ سمجھتا اور انجام دیتا رہا تھا۔ وہ رات اُس نے صدیق کے کمرے میں گزاری تھی۔ ورکرز کی رہائش کے لیے گراؤنڈ فلور پر کوریڈور کے اختتام پر اسٹور روم سے ملحقہ وہ ایک چھوٹا کمرا تھا جہاں صدیق اور قاسم کے دو سنگل بیڈ لگے تھے۔ قاسم کی آمد تک اب یہی اس کا ٹھکانا تھا۔

اس کا بیگ اول روز سے میاں جی کے پاس ہی رکھا ہوا تھا۔ ایک ایکسٹرا ڈریس وہ احتیاطاً ہی پچھلے روز ساتھ لے گیا تھا۔ آج اُس نے اپنا سامان یہاں سے اُٹھانا تھا۔ لیکن یہ کام نہ بھی ہوتا تو اخلاقاً اُسے واپس آنا ہی تھا۔ میاں جی کی کوششوں اور فخری کی دعاؤں سے عارضی سہی بالآخر ایک ماہ کے لیے ایک اطمینان تو نصیب ہوا تھا۔ میاں جی اور رب نواز کے لیے مٹھائی اور فخری کے لیے چاکلیٹ خرید کر وہ یہاں پہنچا تو خوب جوش اور خوشی کے ساتھ اس کا پُرتپاک استقبال ہوا۔ رب نواز نے کڑک چائے کا کپ حاضر کیا اور اب ہنسی مذاق کے ماحول میں گپ شپ ہو رہی تھی۔

"اللہ تمہیں اور ترقی ...... اور کامیابی عطا کرے بیٹا، موقع ملنے پر مزید اچھے کام کی تلاش بھی ساتھ ساتھ جاری رکھنا، ایک مہینہ تو یوں چٹکی بجاتے نکل جائے گا۔ تم اس سے کہیں زیادہ اچھی نوکری کے مستحق ہو۔ فارغ وقت میں نکل جایا کرو۔" میاں جی حسب عادت سمجھانے بھی لگے تھے

"ٹھیک کہہ رہے ہیں میاں جی۔ بس یہ ہفتہ ذرا ہوٹل کے معاملات کو اچھی طرح سمجھنے میں گزارنا چاہتا ہوں۔ آگے بھی میرے ہی کام آئے گا۔ کوشش اور اِرادہ میرا بھی یہی ہے کہ کسی ریلیکس ٹائم میں گھنٹہ بھر کے لیے نکل جایا کروں گا۔"

"میں نے مشتاق سے کہا تھا منیجر وغیرہ کے لیے دیکھتا رہے۔ اپنا سوار بہت ذہین اور لائق ہے۔" اُنہوں نے ہاتھوں کو سر کے پیچھے باندھ کر تکیہ سا بناتے ہوئے کمر سیدھی کی۔

"بس کریں میاں جی۔" سوار شرمندہ سا ہنس پڑا۔ "اتنے جلدی اِس مقام کو پہنچنے کا تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"لو۔ اب اس میں سوچنے والی کیا بات ہے۔" میاں جی برا منا گئے۔ "تم بتا رہے تھے ناں، سارا ایم اے، بی اے کر چکے ہو، بتاؤ بھلا کیسے نہیں ملے گی منیجری۔"

"جی جی۔" سوار ہلکا سا مسکرا کر چپ ہوگیا لیکن فخری نے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے زور سے قہقہہ لگایا۔

"نانا جی تو ایسے کہہ رہے ہیں، ایم اے، بی اے جیسے گلوکوز ہو، گھولا اور پی گئے۔"

"ارے سب پتا ہے مجھے۔" میاں جی خفت زدہ سے فخری کو گھورنے لگے۔ "ساری اچھی نوکریاں ایم اے بی اے کرنے پر ہی ملتی ہیں۔ انسان کا پڑھا لکھا ہر حال میں کام ہی آتا ہے۔"

"لیکن یہاں مجھے لگ رہا ہے کہ فی الحال......" سوار نے فی الحال پہ زور دیا۔ "تعلیم سے زیادہ تجربے کی ضرورت ہے۔ اِس حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ایک مہینہ میرے لیے بہت اہم ہے۔"

"ہوں۔" میاں جی کسی خیال سے مسکرائے۔

"جوان ہو لیکن جلد باز نہیں ہو۔ اچھی علامت

ہے۔"

"ٹھہراؤ" سیکھ رہا ہوں، پیدائشی ہوتا تو ٹھوکر ہی کیوں لگتی۔" وہ بھی میاں جی کو دیکھتے مبہم سا مسکرایا۔ میاں نذر کے دوست دار لہجے کا اثر تھا۔ سوار ایک ان ہی کے سامنے عیاں ہوتا، وہ بھی بے فکر ہوکر بلا جھجک میاں جی نے آگے بڑھ کر کندھا تھپکا۔

"اچھی سیکھ کا اچھا ہی نتیجہ نکلے گا۔ ہمت نہ ہارنا۔"

"آپ ساتھ ہیں میاں جی۔ اپنا آپ اکیلا محسوس نہیں ہو رہا۔"

"ساتھ کیسے نہیں ہوں۔" وہ مسکرائے۔ "تم ایسے آئے ہو سوار۔ جیسے کبھی بچھڑ گئے تھے اور ہم تمہاری ہی راہ دیکھ رہے تھے۔ حیران مت ہونا۔" میاں جی نے ہنس کر اضافہ کیا۔ "کچھ لوگوں سے مل کر ایسا احساس زندگی میں بہت کم لیکن جاگا ہی کرتا ہے۔"

"اچھا؟" سوار کی آنکھوں میں تعجب اور ہونٹوں پر شرارتی ہنسی بیک وقت چمکی۔ "ویسے آپ کے مری میں یہ جھٹکے زیادہ تو نہیں لگتے؟"

"کیا خبر لگتے ہوں۔" وہ بھی محظوظ ہوکر ہنسے۔ "میرے ساتھ تو پہلی بار ہوا ہے، دیکھو تمہارے ساتھ کیا کیا ہوتا ہے۔"

"فی الحال ایک ہی کافی ہے۔ بیٹھے بٹھائے "ابا جی" مل گئے اور کیا چاہیے۔" وہ اپنی مسکراہٹ کو اجازت طلب رنگ میں ڈھالتے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "صدیق نے جلدی آنے کی تاکید کے ساتھ بھیجا تھا۔"

"پھر کب آئیں گے بھیا؟" فخری ذرا دور کتاب کھولے اپنا سبق یاد کررہا تھا۔ اُسے کھڑا ہوتے دیکھ کر بھاگ آیا۔

"جلدی آؤں گا ان شاء اللہ۔ اور تم لوگ بھی ہوٹل دیکھنے ضرور آؤ گے۔ کیا سمجھے؟"

"ہاں بھیا ضرور۔" اُس نے جوش سے سر ہلایا۔ "نانا جی سے کہتے جائیں۔ کہیں لے کر ہی نہیں جاتے۔"

"ٹھہر جا۔" میاں جی مارنے لپکے۔ "میرے سامنے کھڑا میری برائیاں کر رہا ہے۔"

سوار ہنستے ہوئے بیگ کندھے پر ڈال کر روڈ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ہلکی ٹپ ٹپ صبح اذانوں سے جاری تھی۔ کنعان کی عادت تھی کہ وہ نماز کے لیے الارم لگاتی اور فجر پڑھ کر ایک گھنٹے کے لیے دوبارہ سو جاتی۔ کالج جانے کے لیے اماں یا ابو اُٹھا دیا کرتے۔ لیکن اِس بارش کی متواتر رِم جھم نے آج کیفیت میں عجیب سا اضطراب پیدا کردیا تھا۔ نماز کے بعد بجائے سونے کے وہ بے چینی سے برآمدے میں ٹہلنے لگی۔ اکثر ہی یوں ہوتا کہ اذانوں یا رات سے شروع ہونے والی ہلکی بارش صبح دن روشن ہونے تک مزید تیز ہوجاتی ایسی صورت میں دیا اور وہ کالج جانے کا اِرادہ ترک کرتے ہوئے دوبارہ بستر میں گھس جاتیں اور پھر قباحت ہی کیا تھی بستر میں دبک کر دوبارہ سوجانے میں، ایسی خوشی کوئی روز روز تھوڑی ملا کرتی ہے۔

لیکن آج انگلیاں چٹخاتے، یہاں سے وہاں چکر کاٹتے وہ بری طرح بادلوں سے شکوہ کناں تھی، اب حالانکہ خود سے ہمکلام ہونے میں اُس لمحے بڑی شرم، بڑی جھجک مانع تھی لیکن لاشعور میں پلنے والی ایک کم بخت خواہش اُسے جلے پیر کی بلی جیسا گھمائے جارہی تھی۔ آج کی چھٹی اُسے قطعی نامنظور تھی اور فی الحال وہ بس یہی سوچے جارہی تھی کہ بارش بجائے تیز ہونے کے یہیں رُک جائے۔ چوبیس گھنٹے پہلے کے انقلاب پر سوچنے کا اس کے پاس وقت ہی کہاں تھا۔ دل نے تو آناً فاناً سارے کھڑکیاں دروازے ایک اجنبی کو قید کر لینے کے بعد بند کردیے تھے۔

دن کی روشنی اب ہر سو پھیلنے لگی تھی۔ بارش کا جائزہ لینے کے لیے کنعان تیسری مرتبہ برآمدے کا شیشے والا دروازہ کھول کر باہر صحن میں آئی۔ بارش

اب تقریباً تھم چکی تھی۔ اُس نے بے ساختہ اُمڈ آنے والی ہنسی روک کر بادلوں کو سیلوٹ کیا اور تیار ہونے کے لیے اندر بھاگ گئی۔

"تم م م...... ٹھیک تو ہوناں؟" دیا نے پہلی کھوجتی نگاہ ڈالتے ہی سوال داغا۔

"کیوں۔ مجھے کیا ہوا ہے؟" کنعان نے بیچ راستے میں رُک کر پیروں تک اپنا جائزہ لیا۔ سفید یونیفارم کے اُوپر سی گرین کڑھائی والی سفید کاٹن کی ہاف چادر لپیٹے وہ صاف دُھلے چہرے کے ساتھ صبح جیسی روشن، گلاب کی پتیوں سی ملائم لگ رہی تھی۔ دیا اس کے انداز پر ہنس دی۔

"بھئی میں نے سوچا شاید رات نیند پوری نہ ہوئی ہو۔" شرارت سے لب دبا کر اُس نے جملہ پھینکا، کنعان نے سخت کڑی نظروں سے دیکھ کر دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔

"اب یہ نیند کہاں سے آگئی۔"

"ارے۔" وہ میم رابعہ کے ٹیسٹ سے اتنا ڈرتی جو ہو، اسی لیے کہہ دیا۔ بظاہر دیا نے بات بدلی تھی پر آنکھوں میں ہنوز وہی شرارت چھپی تھی۔ کنعان کی البتہ توجہ نہیں تھی۔

"کمپیوٹر کا ٹیسٹ...... کون سا...... کب ہے؟" وہ بری طرح بدکی اور چڑھائی چڑھتے ہی دوبارہ رُک گئی۔

"او ہاں۔ تمہیں کیسے پتا ہوگا۔ تم تو کل ہمارے ساتھ تھیں ہی نہیں۔" وہ کھلکھلائی اور کنعان کے اپنی حالت کے بارے میں سوچ کر پہلی بار کچھ ہوش اُڑے۔ اُسے واقعی کمپیوٹر کے ٹیسٹ کا کچھ پتا نہیں تھا

"اب تم چپ چاپ قدم تیز کرو اور دیکھو راستے میں مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔ فی الحال میرا اور دماغ مت خراب کرنا۔" کنعان نے خود کو سنبھال کر قدم تیز کیے۔

"ہاں، پر یہ تو تم مانتی ہوناں کہ کل تم کہیں اور پہنچی ہوئی تھیں۔" وہ ایسی کمینی تھی پھر بھی باز نہیں آئی۔

"فتور ہے تمہارے دماغ کا اور کچھ نہیں۔ نری بے ہودگی اور...... اور...... خباثت۔" وہ بری طرح سلگ رہی تھی۔

"تو ٹھیک ہے۔ ابھی پتا چل جاتا ہے۔" دیا نے بے نیازی سے شانے اُچکائے اور کنعان کی بے ترتیب دھڑکنیں مزید کچھ آگے پیچھے ہوئیں۔ از میر ہوٹل کا دروازہ...... اور دیا کی گل افشانیاں۔

"کیا مطلب؟"

"چابی دے کر نکلو۔ پھر بتاتی ہوں۔" وہ اُس سے پہلے ہی آگے بڑھ گئی۔

کاؤنٹر کے پیچھے آج رفیق احمد خود بیٹھے تھے۔ اُن دونوں کو دیکھا تو مسکراتے ہوئے رجسٹر بند کیا۔

"آؤ بچوں۔ تمہاری ہی راہ دیکھ رہا تھا۔"

"کہیں جانا ہے ابو؟" کنعان نے چابی سامنے رکھی۔

"کہیں باہر تو نہیں۔ بس ہوٹل کا راؤنڈ لینا تھا۔"

"ہم بھی چلتے ہیں۔ اللہ حافظ ابو۔" وہ کہہ کر مڑ بھی گئی۔

"انکل۔ وہ قاسم بھائی کی شادی کب ہے؟" دیا کو چین ہوتا تو وہ دیا ہی کیوں ہوتی۔ فی الفور سوال پھینکا۔

"کارڈ تو آیا رکھا ہے بیٹا، میرا خیال ہے آج ہی شادی ہے۔"

"تو وہ واپس کب آئیں گے؟"

مہینے بھر کی چھٹی پر ہے، ابھی تو آج چوتھا دن ہے۔ رفیق احمد خوش اخلاقی سے دیا کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔ کنعان شیشے والے دروازے کا ہینڈل تھامے دیا کے آنے کی منتظر تھی جب سیڑھیوں سے آتی ایک آواز نے سکون سے چلتی سانسوں کا سارا ردھم بگاڑ دیا۔

"سر! پانی کی ٹینکی کو صفائی کی فوری ضرورت ہے، ہو سکے تو ایک دو، دنوں میں۔" سوار سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا تو یہاں کا منظر کچھ یوں تھا کہ پہلی صاحبہ کمرے سے کاؤنٹر پر کہنیاں ٹکائے رفیق سر سے ہم کلام تھی اور دختر صاحبہ باہر روڈ کی جانب منہ کیے دروازے کا ہینڈل تھامے کچھ ساکت صامت سی کھڑی نظر آئیں۔

"السلام علیکم سوار بھائی۔" دیا نے خوش اخلاقی کے سارے ریکارڈ بھی غالباً آج ہی توڑنے تھے۔ پہلی مرتبہ سوار سے مخاطب ہوتے بھی کیا برسوں پرانی پہچان کا انداز تھا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ سادہ سی مسکراہٹ لیے اندر کاؤنٹر میں داخل ہوا۔

"اچھا انکل خدا حافظ۔" سارے استقبالی، الوداعی کلمات ادا کرتے وہ بھی کنعان کے پیچھے آئی جہاں وہ ہینڈل تھامے ایک ہی اینگل پہ کسی مورتی سی ایستادہ تھی۔

"چلو بھی۔" دیا نے دروازے کے ساتھ اسے بھی باہر کو دھکیلا اور وہ اپنی انا، مروت جھجک سمیت پوری باہر آگئی۔ پیچھے مڑ کر کسی کو دیکھ لینے کی چاہ اندر کیوں جاگی اور کنعان نے اُسے اندر ہی اندر کیسے مارا، ایک وہی جانتی تھی۔ اُس نے خواہ مخواہ ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجالی۔

کالج پہنچنے پر معلوم ہوا کہ میم رابعہ نے تو کوئی ٹیسٹ نہیں دیا تھا اور یہ سن کر کنعان مزید شرمندہ ہوئی۔ اب دیا پر غصہ بھی نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اگر وہ اس کی کالج میں "ذہنی موجودگی" کا امتحان لے رہی تھی تو اس طرح بھی کنعان غیر حاضر ہی ثابت ہو رہی تھی۔ دونوں کا دن خلاف معمول خوب مصروف گزرا۔ ایک بھی فری پیریڈ دن بھر میں میسر نہیں آیا، چھٹی تک مسلسل ہی پڑھائی میں سر دیے رکھا لیکن اب کالج سے نکلتے ہی اس سے قبل کہ دیا اپنی قینچی جیسی زبان کے جوہر دکھاتی، کنعان نے ہوشیاری دکھاتے باسط کا ذکر چھیڑ دیا۔ گفتگو کا دھارا بدلنے کی یہ کوشش صرف اس لیے تھی کہ فی الحال وہ اپنی ذات کو نشانہ بننے سے بچانا چاہتی تھی۔ اور

"باسط" وہ واحد موضوع تھا جس کے سامنے لازمی دیا نے ہتھیار ڈال دینے تھے اور ہوا بھی یہی۔ وہ اب آس پاس سے بے نیاز پوری تندہی سے "باسط نامہ" کھول چکی تھی۔ کنعان نے دل ہی دل میں شکر پڑھا۔

ہوٹل نظر آنے لگا تھا، اور وہ سانس تک روکے دیا کو بولنے کا موقع فراہم کرتی جلد از جلد وہاں سے گزر جانا چاہتی تھی۔ دیا ایک تواتر سے اپنی اور باسط کی کسی ناراضی کا قصہ سناتے اپنی دھن میں مگن آگے بڑھ رہی تھی...... تو پھر ہونا یوں چاہیے تھا کہ "جس" کے موضوع پر بات کرنے سے وہ بچ رہی تھی، ہوٹل کے سامنے سے گزرنے پر چوری چوری اُدھر نگاہ ڈال کر ڈھونڈنے کی کوشش بھی نہ کرتی اور یہ چوری چھپے کی منطق بھی عجیب نرالی تھی۔ ابو کے ہوٹل کے سامنے سے گزر کر اسکول، کالج آنا جانا تو برسوں کی روٹین تھی۔ آنے جانے کے مواقع پر بطور خاص ہوٹل کو اندر تک دیکھنا بھی جیسے ایک معصوم سا حق اور فطری سی عادت بن گیا تھا کہ دیکھیں ابو کے ہوٹل میں کیا چل رہا ہے۔ پر آج پہلی مرتبہ وہ دیا کی نظر بچا کر چپکے سے کچھ کھوج لینا چاہتی تھی۔ خواہش کا حاصل اگرچہ فقط مایوسی اور ڈھیر سارا اضطراب نکلا۔ ہوٹل کے دروازے اور شیشے پار کے منظر میں اُسے نہ پا کر بے ساختہ کنعان نے سڑک کی مخالف سمت والے جنگلے کی طرف دیکھا جہاں وہ پچھلے روز کھڑا تھا، پر اب نہیں تھا۔ ہوٹل کے فوراً بعد گھر کو جانے والی ڈھلان آجاتی جس سے اُتر کر پہلے کنعان کا گھر آتا اور دس بارہ قدم بعد دیا کے گھر کو مڑنے والا راستہ۔ کنعان کا بچا کھچا جوش بھی سخت نا اُمیدی کی نذر ہو گیا تھا۔ صبح بارش ٹل جانے پر انتہا درجے کی خوشی بھی بے کار گئی تھی۔ صبح صرف آواز سن پائی تھی اور اب...... وہ بھی نہیں۔ کل دوپہر سے وہ ایک مسکراتا ہوا پل جب کالج سے واپسی پر وہ کسی سے بات کرتا دکھائی دیا تھا۔ وہ مسکراہٹ اور ایک اُڑتی پڑتی نگاہ کسی قیمتی موتی کی طرح مٹھی میں دبے تھے۔ پر آج کا دن

نہایت برا ثابت ہوا تھا۔

کنعان نے خدا حافظ کہنے کے انداز میں دیا کو ہاتھ ہلایا اور اس سے پہلے کہ اماں دروازہ کھولتیں اور کنعان اندر داخل ہو جاتی۔ دیا گلی کے سرے تک جا کر رُکی۔

''سنو۔'' اس کے لبوں پر میٹھی، شرارتی مسکان پھیلی تھی۔

''ہوں۔'' کنعان پیر اندر رکھتے چونک کر رُکی۔

''صبح جب وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا تب ہوٹل کی مخصوص ڈریس میں تھا۔ سفید رنگ بلاشبہ اس پر بہت جچتا ہے۔ تم دیکھ نہیں پائیں، سوچا بتا دوں۔'' وہ کھلکھلا کر ہنستی گلی میں غائب ہو گئی۔ کنعان کی پلکوں پر ستارہ سا چمکا، جسے آنکھیں جھپک کر زائل کرنے کی کوشش کرتے وہ اندر داخل ہو گئی۔ اماں دروازہ کھول کر دوبارہ کچن کی طرف چلی گئی تھیں۔ وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کی چٹخنی چڑھا کر الماری سے کپڑے نکالے لیکن اُنہیں ہاتھوں پر لیے ہی پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئی۔ ایک نہ سمجھ آنے والا بوجھ گزشتہ روز سے کسی بھاری پتھر کی طرح وجود پر دھرا تھا لیکن جس کی سختی اب اچانک بہت شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ پلکوں پر آئی نمی بتاتی تھی کہ بنا برسے یہ بوجھ سرکنے والا بھی نہیں۔

ایک آہ بھر کر کنعان نے نچلا لب دانتوں میں دبایا۔ کبھی طویل مسافت انسان کو تھکا دیتی ہے تو کبھی ذمہ داریوں کے بوجھ اور عمر کی مجبوریاں۔ پر وہ نجانے کیسی مسافر تھی زندگی کی راہوں کی۔ جس نے اب تک نہ تو سفر آغاز کیا تھا، نہ راستوں کا تعین نہ منزل کا پتا۔ پھر جانے کیوں پہلے قدم پر ہی دم پھولنے لگا تھا، کوئی سیاہ بگولا تھا جو کسی عفریت کی طرح سینے پہ چڑھا چلا آ رہا تھا، اور ایک اُجاڑ ویران دشت کی وہ اکیلی مسافر تھی جسے اس عفریت کا سامنا تھا۔ نہ بھاگنا ممکن تھا نہ خود کو بچانا۔ کاش قدرت اس بگولے کا رخ موڑ دے تو نجات ممکن ہے......

نجات۔ اُس نے لحظے کو رُک کر سوچا۔ کیا یہ نجات صرف قدرت کے ہاتھوں میں ہے۔۔ اور وہ خود۔ کیا وہ اپنے لیے آپ کچھ نہیں کر سکتی۔ نفس کے اس آزاد جنگلی حیوان کو کیا یونہی بے لگام چھوڑ دیا جائے...... کیا اس آوارہ دل کی باگیں وہ اپنے دماغ کے حوالے نہیں کر سکتی؟

''یا اللہ۔'' کنعان نے تھک کر ہاتھ اپنی گود میں گرائے۔ ''کون لوگ ہوتے ہیں جو ایسی وارداتوں کے منتظر رہتے ہیں، مجھ سے کوئی پوچھے تو کسی بد دُعا سے کم نہیں ہوتی یہ محبت وحبت۔۔۔ اور یہ بد دعا سوائے دانیہ رباب کے کون دے سکتا ہے۔'' وہ کرب سے ذرا سا مسکرائی، جس کا یہ فلسفہ بھی ثابت ہوا تھا کہ محبت ''وارد'' ہوتی ہے، کبھی کبھی اُن پر بھی۔ جنہیں اس کا نام بھڑ کی طرح کاٹتا ہے۔

اچانک کنعان خود پر ہنسنے لگی اور ہنستے ہنستے اتنا روئی کہ دل پر پڑا سارا بوجھ آنسوؤں میں بہہ گیا اور کسی قدر خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے اُس نے خود سے تہیہ کیا کہ اِن نئے نئے نہ سمجھ آنے والے منہ زور جذبوں کے آگے اُسے آپ بند باندھنا ہو گا۔ یہیں پہلی اسٹیج پر اِس طوفانِ بلا خیز سے نمٹنا ہو گا۔ لوگ جسے محبت کہتے ہیں، وہ اگر یہی ہے تو بس پھر اس کے لیے نہیں ہے۔

☆☆☆

''میں سوچ رہی تھی ثمی۔ آج شام بیگم لطف اللہ کو کھانے پر بلا لیتے۔'' ثمامہ اپنے کمرے میں صوفہ کم بیڈ پر پاؤں لمبے کیے بیٹھی تھی جب امی اپنا چائے کا کپ لیے اس کے پاس آ بیٹھیں۔

''ابھی نہیں امی۔ پلیز۔'' ثمامہ نے ٹیب سے سر اُٹھا کر التجائیہ انداز اپنایا۔ ''کسی قسم کی دعوت، گلے کا قطعاً کوئی موڈ نہیں ہے۔''

''موڈ کو دفع کرو اور میری بات سنو۔'' آخری جملے پر ان کا لہجہ سرگوشیانہ سا ہو گیا۔ ثمامہ نے اُلجھ کر سے ابرو سمیٹے۔

''مسز لطف اللہ کے میکے والے آئے ہوئے ہیں ان دنوں۔ اللہ جانے کب واپس چلے جائیں، بلا لیتے ہیں ایک بار۔''

''ارے میری ماں۔'' ثمامہ نے مسکراتے ہوئے ٹیب بند کیا اور توجہ مکمل اُن کی جانب مبذول کی۔ ''مجھے سوشل ضرور بننا ہے، لیکن اتنا بھی نہیں کہ اب پڑوسیوں کے میکے والوں کی بھی دعوتیں کروں۔''

''تم ناں۔ بالکل ہی بدھو ہو ثمی۔'' شمسہ ابراہیم کو اس کی عقل پر سخت افسوس ہوا۔ ''سوشل بننے کو تھوڑی کہہ رہی ہوں۔ پاگل لڑکی۔ ناجیہ بیگم کا ایک کنوارا بھائی ہے، کیپٹن ہے۔۔ اُس کے لیے لڑکی کی تلاش جا رہی ہے آج کل...... اور......''

''اوہو۔'' ثمامہ نتیجہ نکلنے پر خوب محظوظ ہو کر ہنسی۔ ''توبہ امی آپ بھی کن چکروں میں پڑی ہیں اور آپ کی اطلاع کے لیے۔ مجھے کیپٹن کی نہیں کُک کی تلاش ہے۔ وہ بھی بہت شدت سے۔''

''ہائے ہائے۔ کُک سے شادی کرو گی۔'' وہ تو اُچھل ہی پڑیں۔

''ہاہاہا۔۔'' ثمامہ اپنا قہقہہ نہ روک سکی۔ ''جی نہیں۔ بلکہ فی الحال جو ایک شادی ہوٹل سے کیے بیٹھی ہوں، اُسے اچھی طرح سے نباہنے کی کوششوں میں ہوں۔''

''تمہارا تو دماغ چل گیا ہے لڑکی۔'' وہ اب غبارے سے ہوا نکل جانے والی کیفیت میں تھیں۔ خواہ مخواہ مسز لطف اللہ اور اس کی بہنوں کی دعوت کے خیال سے اتنا آگے تک ہو آئی تھیں۔ ثمامہ کی طرف سے حامی بھرنے کا تو دُور دُور تک امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

''ابھی تو ہوٹل کا افتتاح بھی نہیں ہوا اور تمہاری یہ حالت ہے۔ اوپن ہو گیا۔ تمہیں تو پہچاننے سے بھی جائیں گے۔'' وہ سخت آف موڈ کے ساتھ چائے کے کپ سمیٹ کر باہر چلی گئیں۔

''افتتاح ہو گیا تو سب خود بخود اچھا ہوتا جائے گا۔ ان شاء اللہ۔'' ہلتے پردے کو دیکھتے ثمامہ کی گہری کالی آنکھیں مستقبل کے حسین تصور سے چمکنے لگیں۔

☆☆☆

اس روز پھر صبح سے ہلکی ہلکی بارش تھی۔ موسم چھٹی کرنے جیسا تو نہیں تھا، لیکن کالج پہنچنے تک کپڑے بھیگ سکتے تھے۔ کنعان نے تیار ہونے کے بعد چھتری ہاتھ میں لے لی۔۔ ایک آخری بار خود کو آئینے میں دیکھا۔ آج اُس نے بنا کسی قسم کی مانگ نکالے سبھی بالوں کو پیچھے کر کے کیچر میں باندھ دیا تھا۔ لپ گلوز ہونٹوں سے مَس کر کے اُس نے اپنی ہاف چادر اپنے گرد اوڑھی۔ سرمے کاجل سے پاک صاف شہد سی آنکھیں اور قدرتی طور پر جُوی جُوی سی پلکیں اس کی آنکھوں کو باربی ڈول جیسا دکھاتی تھیں۔ کالج میں اکثر لڑکیاں اُس سے سوال کرتیں کہ وہ ہر وقت مسکارا کیوں لگائے رکھتی ہے۔ اس طرح تو وہ اپنی پلکوں کا ستیاناس کر دے گی اور وہ آگے سے خوب چڑ کر وضاحت دیتی کہ مسکارا وہ واحد بیوٹی آئٹم ہے جس کی اُس نے لائف میں کبھی شاپنگ ہی نہیں کی تھی۔ اس کی جڑی جڑی پلکیں اگر قدرت کا عطیہ تھیں تو ہیزل براؤن آنکھیں اس کی شہابی رنگت سے میچ کرتے اس کے چہرے کی بشاشت کو اور بڑھا دیتیں۔

دیا نظر پڑتے ہی مسکرا دی۔

''بھئی صبح سویرے تمہارا تو چہرا دیکھ کر ہی بندہ فریش ہو جاتا ہے۔ اُوپر سے کم بخت یہ خوب صورت سفید دانتوں کی لڑی، ہنسی تو پھر ٹھاہ کر کے دل پہ لگتی ہے۔''

''بس کرو جل ککڑی۔ نظر لگاؤ گی کیا۔'' چھاتہ کھول کر اُوپر لیتے وہ ہنستے ہوئے ڈھلان چڑھنے لگی۔ شروع کے چند روز کی نسبت، آج کل وہ قدرے الگ خیالات کے زیر اثر تھی۔ اپنے آپ کو مضبوط کرتے اب وہ بالکل الگ انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس دن رونے سے طبیعت خوب ہی ہلکی پھلکی ہوئی تھی، پھر خود سے باندھے عہد بھی

بڑے جوشیلے تھے۔ وہ پُریقین تھی کہ اب اپنے دل سے جیتنا مشکل نہیں، نہ وہ اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کرے گی، نہ اُس کے متعلق سوچ سوچ کر اپنا وقت برباد کرے گی۔ دیا سے ہنس ہنس کر باتیں کرتے بھی خود کو بڑی حد تک لاپروا ظاہر کر چکی تھی۔ پھر بھی نجانے کیوں ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھتے دل شدت سے سکڑ کر پھیلا کرتا تھا۔ دھڑکنیں بھی بے ربط ہوتے خوب ادھم مچانے لگتیں۔ اُوپر سے آج کا منظر۔ آگے بڑھ کر شیشے کا دروازہ دیا نے کھولا اور استقبال شوخ، کھنکتی ہنسی سے ہوا۔ ہاتھوں اور کندھوں پر ہلکے پھلکے بیگ سنبھالے وہ تین انتہائی ماڈرن، شوخ، میک اپ زدہ لڑکیاں تھیں جو کاؤنٹر پر جمے سوار سے محوِ گفتگو تھیں۔

ڈھیلے سست ہاتھوں سے کنعان نے چابیاں سوار کے سامنے رکھیں جو اُس نے بِنا نظر اُٹھائے ہاتھ بڑھا کر اُٹھائیں اور دراز میں ڈال دیں۔

”پتریاٹہ جانے کا بیسٹ ٹائم کیا ہوسکتا ہے؟“ یلو چھوٹی قمیص کے ساتھ بلو جینز پہنے وہ کرلی بالوں والی پوری کاؤنٹر پہ جھکی تھی۔

سوار نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور بس یہیں تک دیکھنے کے بعد کنعان واپسی کے لیے رخ پھیر چکی تھی۔ کان البتہ ابھی بھی باتوں پر لگے تھے۔

”یہی ٹائم سب سے اچھا ہے، ناشتے کے فوراً بعد نکل جائیں رش نہیں ہوتا۔“

سوار کی آواز سنائی دی۔

”ایکچوئلی ہم پہلی بار مری آئے ہیں۔ آپ پلیز گائیڈ ضرور کیجیے۔“

دوسرے جملے پر کنعان نے آگے بڑھتے تھوڑا سا ترچھی نظر سے دیکھا وہ ایک نیلی پری تھی۔ گلے میں دوپٹے کی جگہ ایک سرخ رومال اور ٹائٹس کے ساتھ نیلا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ شولڈر تک آئے اسٹریٹ سلکی بال اور شوخ پنک لپ اسٹک لگائے وہ سوار کی بھرپور توجہ لینے کے چکر میں تھی اور بلاشبہ بہت حسین تھی۔

سوار نے مسکرا کر شیور میم کہتے اُسے بھی مایوس نہیں کیا تھا۔

”پہلی مرتبہ مری آئے ہیں ہونہہ۔“ کنعان دل ہی دل میں نقل اُتارتی سخت پیچ و تاب کھاتی باہر نکلی۔ ”ابھی بھی نہیں آنا تھا۔ اور آ بھی گئی تو ایک یہیں مرنا تھا...... اور ہوٹل دکھائی نہیں دیتے۔ اور وہ سوار۔ ہنس کیسے رہا تھا۔“ اندر ایک نئے تنازعے نے جنم لیا۔ ”حد ہے بے مروتی کی، یعنی ایک بندہ آپ کے سامنے چابیاں رکھ رہا ہے، آپ کے پاس سر اُٹھانے کی فرصت نہیں۔“

”واؤ یار۔“ دیا دیر تک اُن پہ غور کرنے کے بعد اب سیدھی ہوئی تھی۔ ”کیا زبردست فیشن تھے ان کے۔ لاہور سے لگتی ہیں۔ مجھے تو وہ بلو کرتے والی بڑی پسند آئی، اس کی بلیک ٹائٹس اور دوسری کی بلو جینز...... اور وہ یلو......“

”یہاں نہیں ملتیں کیا یہ سب چیزیں؟“ کنعان سخت چڑ گئی۔ ”کیسے پینڈوؤں جیسا بی ہیو کر رہی ہو دیا!“

”یہاں بھی ملتی ہیں۔ پر ہم نے تو کبھی نہیں پہنی ناں۔“

”مجھے تو اچھی ہی نہیں لگتیں۔“ کنعان نے خوب بُرا سا منہ بنایا۔ ”ورنہ میرے ابو کوئی منع تھوڑی کریں گے۔“

”اب تک تو مجھے بھی پسند نہیں تھیں۔ پر آج تو مزا ہی آ گیا دیکھ کر۔ کیسی پیاری لگ رہی تھیں سب کی سب...... پریوں جیسی...... اور وہ بلو شرٹ والی بالکل سجل علی لگتی تھی۔ بلکہ اس سے بھی ذرا زیادہ پیاری۔“

”اچھا بس بھی کرو۔“ کنعان کی برداشت کا پیمانہ بھی چھلک پڑا۔ جن کی وہ تعریفیں کیے جا رہی تھی وہ اب بھی سوار کے سامنے ٹکی ہوں گی۔ یہ سوچ کر تو دل چولہے پہ رکھے پانی جیسا اُبل رہا تھا۔ اور یہ کم بخت جیلسی کس بلا کا نام ہے، آج ہی صحیح معنوں میں اندازہ ہو رہا تھا۔

”آدمی مسافر ہے۔۔ آتا ہے جاتا ہے۔۔“ دیا نے لہک لہک کر گانا شروع کیا۔

کنعان نے بجائے بُرا ماننے کے پہلی مرتبہ دل میں سکون اُترتا محسوس کیا۔

”شکر ہے ایک دو روز میں چلی جائیں گی، لیکن یہ سوار۔ پتا نہیں آج اُنہیں کیسے گائیڈ کرے گا۔ کہیں ساتھ ہی نہ چل پڑے، اور جو نمبر ایکسچینج کیے تو......“

”ٹیکسی میں آ جاؤ جی۔۔ بھیگ جاؤ گے۔۔“

وہ دونوں جی پی او چوک سے ابھی تھوڑا پیچھے تھیں جب ایک ٹیکسی والے نے بالکل نزدیک بریک لگاتے دونوں کو بدک کر ہٹنے پر مجبور کیا تھا۔ گرین آنکھوں اور کھنچے جبڑوں والے اُس ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھ کر کنعان کی ایک دم سانس رُکی۔ جانے کتنے عرصے بعد دیکھا تھا اُس نامراد کو۔۔ وہ بھی اس طرح دیا کی موجودگی میں۔۔ کنعان کی آواز اندر ہی کہیں دب کر رہ گئی۔۔ دیا نے دائیں بائیں ہاتھ ہلاتے انکار کر دیا۔

”باجی سے پوچھ لیں۔“ بے ہودگی سے ابرو چڑھاتے وہ کنعان کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر آشنائی کی چمک دیتی شیطانی سی مسکراہٹ تھی۔ دیا نے تعجب سے کنعان کو دیکھا جو سخت گھبرائی صورت لیے فوراً آگے بڑھ گئی تھی۔ دیا بھی دو قدموں میں اس کے ساتھ پہنچی۔ جب اُنہیں ضرورت ہی نہیں تھی ٹیکسی وغیرہ کی۔ بلاوجہ بحث کیا کرنا۔

”کون تھا یہ۔۔ تم جانتی ہو؟“ دیا کو اگر ٹیکسی والے کا انداز کھٹکا تھا تو کنعان کی گھبراہٹ بھی نظر انداز کیے جانے والی نہیں تھی۔

”دفع کرو۔ یونہی کوئی فضول آدمی تھا۔“ اُس نے خود کو سنبھالا۔

”لیکن تم اتنا گھبرا کیوں گئیں۔ کوئی بات ہے کنعان؟“ دیا اس کے گریز پہ کچھ اور بھی پریشان ہوئی۔ اُن دونوں کا تو بچپن کا ساتھ تھا۔ ایک دوسرے سے کچھ چھپا نہیں تھا پھر......

”نہیں بھئی۔ ایسا کوئی سیریس ایشو نہیں ہے۔“ وہ ہنس کر کالج روڈ پر چڑھی، اب وہ خود کو مکمل سنبھال چکی تھی حتیٰ کہ ایک معقول بہانہ بھی اُسے سوجھ گیا تھا۔ ”کچھ عرصہ یہ ماہین باجی کو کالج لے جاتا رہا تھا۔ باجی کو ٹائیفائڈ ہوا تو امی ابو انہیں پیدل نہیں جانے دیتے تھے۔ اب پتا نہیں ابو کو یہی ٹیکسی والا ہی کیوں ملا۔ فضول بولنے کی بہت عادت تھی اِسے۔ مجھے بس ماہین باجی کے حوالے سے جانتا ہے۔ جب بھی کہیں دیکھ لے خواہ مخواہ فری ہونے لگتا ہے۔ شاید وہ چاہتا ہے کہ میں بھی کالج جانے کے لیے اس کو ہائیر کروں۔ ابو کو بتاؤں گی اس کا۔“ آخر میں تسلی دینے کے لیے کنعان نے اتنا بھی کہہ دیا تو دیا مطمئن ہو گئی۔

”کبھی مت بیٹھنا اِس کی ٹیکسی میں، شکل سے ہی بے ہودہ لگتا ہے۔“

”ہاں بھئی میرا کیا دماغ خراب ہوا ہے۔“ وہ بظاہر ہنستے ہوئے تب تو اس کی بات کو ٹال گئی، لیکن اِس معاملے میں اپنے آپ سے نظریں چُرانا اس کے لیے کبھی ممکن نہیں رہا تھا۔ گزرے تین برسوں میں اُس نے خود سے کیے سب ہی وعدے بڑی کامیابی سے نبھائے تھے اور اب عرصہ ہوا وہ اپنی شخصیت کے بارے میں بڑی پُراعتماد ہو چکی تھی۔ وہ مطمئن تھی کہ کنعان رفیق کی ذات اپنے خاندان اپنی فیملی کے لیے کبھی انگلی اُٹھانے کا باعث نہیں بن سکتی۔

اُس رات کمرے کی کھڑکی میں کہنیاں ٹکائے اُوپر آسمان پر دیکھتے وہ آج ایک مرتبہ پھر خود سے شکوہ کناں تھی۔ جو کچھ بھی گزرے چند دنوں میں اس کے دل پر بیتا، وہ کیوں سختی سے اب تک خود کو سرزنش نہیں کر پائی تھی۔ عہد جوڑنے سے توڑ دینے کے بیچ کیوں وہ ایک چہرا حائل ہو جاتا تھا۔۔ حالانکہ سوار کا بھی بھلا کیا قصور تھا۔۔ یہ محبت ایسی کہاں تھی کہ مقابل کو موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا۔ محبت میں گرفتار ہونے کے چند عمومی تصورات میں سے ایک یہ بھی تھا

کہ مرد اپنی سنہری باتوں کے جال میں معصوم سیدھی سادی لڑکیوں کو پھانس کر ان کو ورغلا دیا کرتے ہیں۔

"لیکن۔۔" وہ ایک جھرجھری لے کر کھڑکی سے دور ہٹتے اپنے حالات کے رُوبرو آئی۔ ایک معمولی سے جھگڑے کے نتیجے میں وہ کیا مصیبت مول لے بیٹھی تھی۔ اپنے مقابل کے سر الزام دھر کر بری الذمہ بھی نہیں ہوسکتی تھی، اُلٹا وہ تو اس کی بے رُخی سے شکوہ کناں تھی۔ وہ جو اُس کی طرف ایک نظر اُٹھا کر دیکھنے کا روادار نہ تھا، وہ کیوں اس کی خاطر کبھی عہدوپیماں بھولے بیٹھی تھی۔

کسی کے ایک عمل نے لفظ "محبت" کو کنعان کی نظر میں اس قدر نامعتبر کر دیا تھا کہ دل میں پنپتے اس حسین فطری جذبے سے شدید خوف محسوس کرتے وہ اپنے آپ سے بھی کہیں دُور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ جبکہ درحقیقت حالت یہ تھی کہ سوار کے بارے سوچنا شروع کرتی تو سوچتی ہی چلی جاتی، وہ دکھائی نہ دیتا تو بے کلی اور اضطراب محسوس کرتے اندر ہی اندر گُھٹنے لگتی، نظر نہ اُٹھائے تو غصہ اور جھنجلاہٹ، دوسروں سے ہنس کر بولے تو حد درجہ حسد اور......

یونہی لمحے بھر کو سوچتے سوچتے اپنے ہی ایک خیال پر وہ لرزتے ہوئے حال میں واپس آئی۔ اُس کی توجہ نہ ملنے کا شکوہ کرتا یہ بے چین دل فرض کرو اُس محبوب کی محبت اور توجہ بھی پالے تو۔۔ وہ سختی سے لب بھینچے پلنگ کے کنارے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ تب تو شاید بغاوت کو راستہ ہی مل جائے گا اندھادھند بھاگنے کا، اور اِن اندھے فیصلوں کا نتیجہ۔ نہیں۔ اُس نے گھبرا کر ہاتھ اپنے منہ پر رکھا۔ یاسمین کی کیاریوں سے آتی مہک میں کافور کا رنگ گھلنے لگا۔۔ تیز ہوا نے کفن سے کپڑا ہٹایا اور امی کا پھولوں میں سے جھانکتا سرد پرنور چہرا۔۔ کنعان نے سر اپنے ہاتھوں پہ گرایا

کیا کرے۔۔ کیا نہ کرے کی اُلجھن میں اپنا آپ ہی داؤ پر لگ گیا تھا۔ ایک بار پھر اپنے آپ کو سمجھاتے، اپنی مجبوریوں کو دیکھتے وہ خود سے سراپا سوال تھی۔

☆☆☆

حبیب اللہ نے استری شدہ کپڑے کاؤنٹر پر رکھے۔ سوار نے کچھ لکھتے سر اُٹھا کر دوسرے پیپر پر دیکھا۔ کپڑے روم نمبر سولہ میں دینے تھے۔ پین پر کیپ چڑھا کر اُس نے عصمت علی کو آواز دی اور رجسٹر بند کیا

"یار حبیب اللہ۔ یہ سامنے سے گولڈ لیف کے دو پیکٹ لے آؤ۔ آٹھ نمبر والے وہ دو پنجابی صاحب ہیں ناں۔ ان کو دے دینا۔" سوار، حبیب اللہ کے ہاتھ میں رقم دینے لگا جب صدیق کی چیختی سی آواز نے بوکھلا کر اُسے مڑنے پر مجبور کیا۔ آواز سیڑھیوں کی طرف سے آئی تھی

"سوار۔۔۔ جلدی اُوپر آؤ۔۔" وہ گھبرائی آواز میں اُسی کو پکار رہا تھا۔

سوار کپڑے کاؤنٹر پر پھینکتے فوراً اُوپر کی جانب لپکا۔ صدیق کی آواز میں گھبراہٹ ہی اتنی شدید تھی۔ وہ دل ہی دل میں سب خیر کی دعا کرتا اُوپر آیا لیکن یہاں بالکل خیریت نہیں لگ رہی تھی۔ رفیق سر سیڑھیوں کے بیچوں بیچ گرنے کے انداز میں بیٹھے تھے۔ صاف لگ رہا تھا کہ پیر میں موچ آئی ہے۔ چہرے پر بھی شدید تکلیف کے آثار تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ صدیق کو لیے اُوپر ٹینکی چیک کرنے گئے تھے۔ کچھ روز پہلے جس کی طرف دھیان بھی سوار نے ہی دلایا تھا۔ آج صبح ہی صبح اُس نے پھر یاد دہانی کرائی تو وہ صدیق کے ساتھ خود دیکھنے چل پڑے حالانکہ سیڑھیاں وغیرہ وہ بہت کم کبھی چڑھتے تھے اور وجہ ان کا بھاری وجود اور گھٹنوں کی تکلیف تھی۔

سوار نے صدیق کی مدد سے سہارا دے کر اُنہیں اُٹھانا چاہا لیکن وہ تو ہل بھی نہیں پا رہے تھے۔ سوار کو تب صحیح معنوں میں چوٹ کی نوعیت کا اندازہ ہوا۔ ٹینکی صاف کروانے کی اپنی ضد پر بھی شرمندگی/ندامت محسوس کی۔ حبیب اللہ کے آنے پر وہ تینوں

اُٹھا کر رفیق سر کو نیچے لے آئے تھے۔ اور سوار ہی ٹیکسی میں اُنہیں نزدیکی کلینک لے آیا۔ ڈاکٹر نے درد کا انجکشن لگا کر فوری طور پر ڈریسنگ بھی کر دی لیکن خدشہ یہی ظاہر کیا کہ موچ نے ہڈی کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ کسی آرتھوپیڈک کو دکھانا اور ایکسرے بہت ضروری تھے۔ البتہ یہ مشورہ بھی دیا کہ فوری طور پر گھر لے جانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں آرتھوپیڈک کو اگلے روز بھی دکھایا جاسکتا ہے۔ فی الوقت انجکشن کی وجہ سے صرف آرام کی ضرورت ہے۔ رفیق احمد بھی اب گھر جانا چاہتے تھے۔ ان کی مرضی دیکھتے سوار کو بھی یہی مناسب لگا۔ وہ اُنہیں ٹیکسی میں سیدھے ان کے دروازے پر لے آیا۔

یہ دوپہر دو بجے کا وقت تھا۔ اماں کھانا کھانے کے بعد ستا رہی تھیں، کنعان نے آہستہ آواز میں ٹی وی لگا رکھا تھا۔ ڈور بیل کی آواز پر ریموٹ صوفے پر پھینکتی وہ تیز قدموں سے دروازے پر آئی تھی۔ عموماً اس ٹائم ابو لنچ کرنے گھر آیا کرتے تھے۔ اُس نے بہرحال عادتاً پوچھ لیا

"کون؟"

"جی میں سوار ہوں۔۔ آپ دروازہ کھولیے، میرے ساتھ رفیق سر ہیں۔"

"س...... سس......" کنعان کے لبوں سے سرگوشی نما آواز بھی پوری نکل نہیں پائی۔ دل بے اختیار بڑی شدت سے دھڑکا تھا۔ اچانک اُس دشمن جاں کی آواز اپنے گھر کے دروازے پر سننے کا تو گمان ہی کبھی نہیں کیا تھا۔ اگلے ہی پل وہ یہ سوچ کر متعجب ہوئی کہ ابو اگر ساتھ ہیں تو خود کیوں بات نہیں کر رہے

"سر کے پیر میں چوٹ آئی ہے۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھے ہیں۔ آپ دروازہ کھولیں تاکہ میں سہارا دے کر اُنہیں اندر لے آؤں۔" کنعان کی طرف سے کوئی رسپانس نہ ملنے پر سوار نے خود ہی وضاحت دینا مناسب سمجھا۔

"اوہ۔۔" کنعان نے بھی اس مرتبہ فوراً دروازہ کھول دیا اور وہ پہلی نظر جو سوار کے چہرے پر پڑنی تھی اُس کی پشت پر گئی۔ کنڈی کھلنے کی آواز پر ہی جو مڑ کر ٹیکسی کی طرف بڑھ چکا تھا۔ کنعان نے اگلی نظر ذرا پیچھے کو کھڑی ٹیکسی کی طرف ڈالی، جس میں ابو بیٹھے نظر آرہے تھے۔ سوار نے ٹیکسی ڈرائیور کی مدد سے سہارا دے کر ابو کو باہر نکلنے میں مدد دی، تب ابو کے چہرے پہ نظر آنے والی تکلیف اور پیر پہ بندھی پٹی سے کنعان کو سنجیدگی کا اندازہ ہوا۔ ٹیکسی ڈرائیور اور سوار ابو کو لیے گھر میں داخل ہوئے تو کنعان نے بھاگ کر برآمدے کا دروازہ کھولا اور ہاتھ سے ابو کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

"یااللہ خیر۔" اُس نے گھبرا کر خیر طلب نظروں سے اُوپر دیکھا۔ "میرے ابو بالکل ٹھیک ہوں مالک۔"

ٹیکسی ڈرائیور اس کے قریب سے گزر کر باہر چلا گیا تو وہ دوپٹا سر پر ٹھیک سے درست کرتی اندر آگئی۔ سوار نے تکیے پیچھے جما کر انہیں آرام دہ حالت میں بیٹھنے میں مدد دی۔ سوار کی موجودگی میں اُس سے بولا بھی نہیں گیا، خاموشی سے ایک سائیڈ پہ رُک گئی

"اب کیسا محسوس کر رہے ہیں سر؟"

"کافی بہتر ہوں۔" اُنہوں نے مسکرا کر تشکر بھری نظروں سے سوار کو دیکھا۔ "بے فکر ہو کر ہوٹل جاؤ، صدیق سے کہنا جاوید صاحب کو بتا دے گا۔"

"جی میں کہہ دوں گا لیکن پہلے یہ دوائیاں آپ کو فارمیسی سے لے کر دے دوں۔" اُس نے بات کے دوران شاید ڈاکٹر کا نسخہ جیب سے نکالا تھا۔ "آپ اس دوران گرم دودھ پی لیں سر! تاکہ دوا شروع کی جاسکے۔"

"تم تکلیف مت کرو سوار۔ میں صدیق سے کہہ دوں گا۔" رفیق احمد نے بے ساختہ تکلف برتا تو سوار مسکرا دیا

"کوئی فرق ہے مجھ میں اور صدیق میں۔ آپ بس آرام سے لیٹے رہیں سر۔ میں ابھی لے آتا

ہوں۔" وہ اُن کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دیتا باہر کی طرف بڑھا پھر کسی خیال سے رُکا، ہلکا سا ترچھا ہوا لیکن پورا مُڑ کر کنعان کی طرف نہیں دیکھا۔ انداز البتہ اُسی کو مخاطب کرنے جیسا تھا۔

"سر کو گرم دودھ میں ہلدی مکس کر کے پلا دیں، تاکہ دوائیوں کا آغاز کیا جا سکے۔" اور بنا جواب کا انتظار کیے کمرے سے نکل گیا۔ کنعان فوراً ابو کی طرف لپکی۔

"کیا ہوا تھا ابو۔ آپ کو چوٹ کیسے لگی؟"

"سیڑھیاں اُتر رہا تھا بیٹا۔ کولڈ ڈرنک کا خالی کین نچلے اسٹیپ پر کسی نے پھینک دیا تھا۔ بے دھیانی میں میرا پاؤں پڑا اور توازن برقرار نہیں رکھ پایا۔"

"لیکن آپ تو سیڑھیاں چڑھتے ہی نہیں۔" کنعان کو تعجب ہوا۔ "ایسا کیا ضروری کام تھا۔ کم از کم کسی کو ساتھ تو لے جاتے؟"

"صدیق پیچھے آرہا تھا۔ پر اُس غریب کو کیا پتا تھا کہ پھسلنے والا ہوں۔"

"لیکن آپ گئے ہی کیوں ابو۔ ان ہی کو بھیج دیا کریں ناں۔" وہ اب سخت بے چینی محسوس کرنے لگی تھی ان کے چہرے کا کرب دیکھ کر۔

"کام تو یہی بے چارے کرتے ہیں بلکہ گیا بھی سوار کی اطلاع پر ٹینکی چیک کرنے تھا، حالانکہ ضرورت نہیں تھی ایسا کرنے کی، اچانک پتا نہیں کیا سُوجھی کہ خود دیکھنے کے لیے پہنچ گیا۔ نیا لڑکا سمجھ کر میں نے بھروسا نہیں کیا۔" وہ اب اپنی غلطی پر نادم سے نظر آرہے تھے۔ کنعان کو ہنسی آگئی۔

"آپ کو لگا لڑکا نمبر بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

"ہاں۔" رفیق احمد بھی کھسیا کر ہنس پڑے۔ "سمجھنے میں غلطی کر دی۔ بڑا ہونہار بچہ ہے۔ پوری جان لگا دی میرا پیر بچانے کے لیے۔ ہوٹل کی سیڑھیوں سے یہاں گھر کے بیڈ تک مجال ہے جو لمحہ بھر کو میرے متاثرہ پیر پر دباؤ آنے دیا ہو۔ بہت مستعد اور سمجھ دار لڑکا ہے۔"

"اور اُس کی رپورٹ؟ ٹینکی سے متعلق؟" کنعان نے شوخی سے استفسار کیا۔ اور شوخی جو سوار کی تعریف سنتے ہی خود بخود لہجے میں در آئی تھی۔ رفیق احمد نے اس کی شرارت سے محظوظ ہوتے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔

"خوب شیطان ہو۔ بھئی رپورٹ بھی اُس کی سولہ آنے درست تھی۔ ٹینکی چونکہ سیمنٹ کی ہے اس لیے دیواروں اور تہہ میں کائی سی جمنے لگی تھی۔ ڈھکن اُٹھاتے ہی جوہڑ کے ٹھہرے پانی جیسی ناگوار بو آرہی تھی۔ فوری صفائی کی بہت ضرورت تھی۔ اصل میں بات یہ ہے نین۔" انہوں نے کھنکار کر گلا درست کیا۔ کنعان توجہ سے سننے لگی۔ "ہماری ازلی روایت پرستی ناں۔۔ کبھی کبھار بری طرح ہمارے کام بگاڑ دیتی ہے۔ نئے لوگوں کو انڈر اسٹیمیٹ کرنا بھی کچھ اِسی زمرے میں آتا ہے۔ حالانکہ وہ جگہ جہاں آپ نے برسوں جان کھپائی ہو اور جس کی ایک ایک اینٹ سے آپ باخبر ہوں، نیا آنے والا سیکنڈز میں کسی ایسی بات کو پالیتا ہے جو آپ برسوں میں بھی جان نہیں پاتے۔ اب میرے، صدیق یا قاسم کے حساب سے ہوٹل کا انتظام بالکل پرفیکٹ چل رہا ہے لیکن سوار ایسا نہیں سمجھ سکتا۔ وہ آتے ہی چند ایسی باتیں فوراً نوٹس کر لے گا جنہیں ہم دیکھ کر بھی اپنی روٹین میں شامل کر چکے ہیں۔" اب وہ اپنی تکلیف بھلائے پوری ایمان داری سے اپنا محاسبہ کر رہے تھے۔

کنعان نے بے ساختہ آگے بڑھ کر ان کا ماتھا چوما۔

"فی الحال آپ صرف اپنے آرام کے بارے میں سوچیں اور......" دروازے کی دستک پر وہ چونکی اور دوپٹا ایک بار پھر سر پر جماتے صحن عبور کر کے دروازے تک آئی۔ کنڈی ابھی تک کھلی ہوئی تھی صرف کواڑ بھڑا تھا۔

"کون؟" اُس نے احتیاطاً ہی پوچھ لیا ورنہ

پورا یقین تھا کہ سوار ہی آیا ہوگا۔

"یہ...... سر کی دوائیاں لے لیں۔" اُس نے صرف ہاتھ آگے بڑھا کر ایک شاپر اندر کیا لیکن کنعان نے دروازہ پورا کھول دیا۔

"اندر آجائیں۔ ابو کو سمجھا بھی دیں۔" وہ نظریں جھکائے سائیڈ پر ہوگئی اور سوار اندر کی طرف بڑھ گیا۔ پیچھے آتی کنعان نے پہلی مرتبہ ایک دھیان کی نظر اُس کی پشت پر ڈالی۔ پہلے جب وہ آیا تو کنعان خود سے کیے وعدے کے تحت مسلسل دیکھنے سے گریز کرتی رہی تھی، لیکن ایسے وعدوں کے ٹوٹ کر بکھرنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ابو نے چند جملے اس کی تعریف میں بولے اور وہ سوائے اُن کے باقی ہر بات بھول گئی۔

اُوپر سے آج دیا کی تفتیشی نگاہوں کا پہرا بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے ابو کو مقدار وغیرہ سمجھا رہا تھا جب چوری چھپے اسے دیکھتی وہ بھی اندر چلی آئی۔

"سر آپ نے دودھ پی لیا ہو تو یہ ایک ٹیبلٹ ابھی لینی ہے۔" اُس نے نام پڑھ کر ایک پیکٹ ابو کی طرف بڑھایا۔

"دودھ تو ابھی نہیں پیا۔" رفیق احمد نے پیکٹ اُس سے لے لیا۔ "چلو خیر میں لے لوں گا۔" ان کا انداز تسلی آمیز تھا۔ ادھر سوار نے جس شکوہ بھری نظر سے بے ساختہ کنعان کو دیکھا تھا شرمندگی سے وہ تو زمین میں ہی گڑ گئی تھی۔

"اچھا سر! میں چلتا ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو کال کر کے ہمیں بلا لیں۔" وہ اجازت لے کر باہر نکل گیا اور کنعان سخت شرمندگی کے جذبات لیے کچن میں آگئی۔

"اُف توبہ۔ یہ تو بڑا ہی غصہ ور ہے۔ بنا کسی رشتے تعلق کے بھی یوں گھور رہا تھا جیسے اس کی بات نہ ماننا قانون کی خلاف ورزی کے مترادف ہو۔ کاش میں نے ابو کو دودھ گرم کر کے دے دیا ہوتا۔ پہلی مرتبہ اس نے ڈائریکٹ میری آنکھوں میں دیکھا وہ بھی۔ اتنے غصے سے۔ سراسر میری کوتاہی ہے۔"

آوارہ سوچوں نے پھر چپکے سے انگلی تھام کر اُسے ساتھ لگایا اور کنعان ملی جُلی کیفیت کے زیرِ اثر ابو کے لیے دودھ گرم کرنے لگی۔

☆☆☆

دن قدرے لمبے ہوگئے تھے۔ نئی مصروفیت اگرچہ مہلت نہیں دے رہی تھی لیکن بہت دنوں بعد سوار نے میاں جی کے پاس چکر لگانے کا وقت نکال ہی لیا تھا۔ پچھلی رات اس کی ڈیوٹی تھی۔ ساری رات جاگنے کے بعد صبح چھ سے دن گیارہ تک اُس نے آرام کیا تھا اور پھر فریش ہو کر ناشتا کرنے کے بعد میاں جی سے ملنے نکل گیا تھا۔ اور اب اُن سے مل کر واپس ہوٹل کی طرف آتے اُس نے ایک فروٹ شاپ میں اماں اور کنعان کو داخل ہوتے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ کنعان نے اُسے نہیں دیکھا تھا وہ پوری تندہی سے سیب، کیلوں کا بھاؤ تاؤ کر رہی تھی۔ سوار نے ذرا دیر رُک کر کچھ سوچا پھر آگے بڑھ گیا۔

"رفیق! سر کو فون کیا آج۔ طبیعت کیسی ہے ان کی؟" صدیق اور وہ اس وقت ریسیپشن ایریا میں فارغ بیٹھے تھے۔

"نہیں یار آج تو بالکل ٹائم نہیں ملا۔" صدیق صوفے کے بازو پر سر رکھ کر نیم دراز ہوگیا۔

"سر کے علاوہ کوئی اور آدمی بھی ہے گھر میں؟ آئی مین کوئی بیٹا وغیرہ۔"

"نہیں۔ اُن کی صرف دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی بیٹی کو ہالہ بیاہی ہوئی ہے اور دوسری یہ کنعان بی بی۔"

"تو گھر کے کام کاج کیسے مینج کرتے ہیں سر؟ خصوصاً باہر کے۔" سوار مسلسل ایک ہی نہج پر سوچ رہا تھا۔ "کوئی لڑکا وغیرہ نہیں رکھا ہوا کام کے لیے؟"

"نہیں۔" صدیق نے سر نفی میں ہلایا۔ "باہر کے سارے کام سر خود کرتے ہیں۔ دن بھر کے دوران جب بھی اُنہیں فرصت میسر آئے وہ بازار وغیرہ کا چکر لگا آتے ہیں۔ گھر کے کام کاج کے لیے ایک بزرگ خاتون البتہ رکھی ہوئی ہے۔"

"یعنی آج کل تو اُنہیں خوب مشکل پیش آرہی

ہوگی؟'' سوار نتیجے پر پہنچا اور صدیق بھی پہلی مرتبہ جیسے اس پہلو پر غور کرنے لگا۔

''ہاں یار۔ یہ تو میں نے بھی نہیں سوچا۔'' اس کے چہرے پر بھی حقیقی تفکر پھیلا تھا۔

''اچھا تم سر کو فون لگاؤ۔ پہلے ان کی طبیعت پوچھتے ہیں۔ پھر کام وغیرہ کی بات بھی کرلیں گے۔'' سوار نے فی الفور اسے اُٹھنے کا مشورہ دیا وہ بے چارہ بھی سعادت مندی دکھاتے فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا اور موبائل جیب سے نکال کر نمبر ملا دیا۔

''ہیلو۔'' ماؤتھ پیس سے اُن کی دھیمی سی آواز اُبھری۔ صدیق نے اسپیکر آن کر رکھا تھا۔

''السلام علیکم سر۔ آرام تو نہیں کر رہے تھے؟'' صدیق کو آواز سن کر لگا شاید نیند سے جاگے ہوں۔

''بس یار۔ میں تو مکمل آرام پر ہوں۔'' وہ ہنسے۔ ''ویسے سو نہیں رہا تھا۔ تم سناؤ۔ سب خیریت ہے؟''

''اللہ کا شکر ہے سر۔ آپ سنائیں طبیعت کیسی ہے اب؟''

''بہت بہتر ہوں۔ درد تو اب بالکل نہیں ہوتا۔ بس یہ پلاسٹر کی اُلجھن ہے۔ اس سے نجات مل جائے تو اللہ کا شکر پڑھوں۔''

''ابھی کہاں سر جی۔'' صدیق ہنسنے لگا۔ ''ابھی تو تیسرا دن ہے۔ یہ تو پانچ دن مزید بھی لگا رہے گا۔'' تین روز پہلے صدیق ہی اُنہیں آرتھوپیڈک کے پاس لے گیا تھا۔ سوار نے پیچھے جاوید صاحب اور حبیب اللہ کی مدد سے ہوٹل کا کام دیکھا تھا۔ صدیق ڈاکٹر اور کلینک سے ذاتی طور پر واقف تھا اس لیے وہ ان کے ساتھ گیا تھا۔

''سر کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ لیا کریں۔'' صدیق نے سوار کے اشارے پر دہرایا۔

''شکریہ صدیق۔ تم لوگ میرے ہوٹل کے معاملات دیکھ رہے ہو۔ یہی کیا کم ہے۔'' اُنہوں نے فوراً آگے سے مروت نباہی۔ سوار نے ہاتھ کے اشارے سے موبائل مانگا۔

''سر۔ یہ سوار آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔'' اُس نے عجلت میں کہہ کر موبائل سوار کی طرف بڑھایا۔

''السلام علیکم سر۔ کیسے ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔ پہلے سے بہت بہتر محسوس کر رہا ہوں۔''

''چلیں شکر ہے سر۔ جتنا زیادہ ریسٹ کریں گے ریکوری اتنے جلدی ہوگی۔ اچھا اور...... پانچ بجے گھر کے سامان کی لسٹ تیار رکھیے گا۔ ہم میں سے کوئی آکر چیزیں لے دے گا اور آپ روزانہ صبح سویرے گھر میں پوچھ کر لسٹ بنوالیا کریں۔ ہم لے آیا کریں گے۔''

''لیکن سوار اِس کی کیا......'' رفیق احمد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔

''ابھی پانچ بجے سر۔ اللہ حافظ۔'' سوار نے کہہ کر فون آف کر دیا

''ہائیں۔'' صدیق جو حیرت سے منہ کھولے بیٹھا تھا ایک دم سے ہنس پڑا۔ ''تمہاری محبت بھری دھونس تو لاجواب ہے بھائی۔ میری آپ جناب تو بالکل ہی بے کار نکلی۔'' وہ ابھی بھی ہنسے جا رہا تھا۔

''جی ہاں۔'' سوار نے سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''اور اب تم......'' سوار نے بطور خاص ''تم'' پہ زور دیا۔ ''پانچ بجے جا کر سر کے ہاں سے لسٹ بھی لو گے اور سامان بھی خرید کر دے آؤ گے۔''

''اررے۔۔۔'' سوار کے اضافے نے صدیق کے چودہ طبق روشن کیے۔ ''مجھ پر بھی دھونس؟''

''حامی بھر لو۔ فائدے میں رہو گے۔'' سوار دلکشی سے مسکرایا۔ ''دوسری صورت میں چار بجے کلینر آرہا ہے، ٹینکی کی صفائی کرنے، چاہو تو اُس کے ساتھ......''

''نہ بابا۔'' صدیق نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''یہ بکھیڑا تو تم ہی سنبھالو۔۔۔ کہ بہرحال تمہارا

ہی پھیلایا ہوا ہے۔'' وہ اب کہیں جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر رُکا۔

''یار اپنا موبائل نمبر کسی وقت جاوید صاحب کو نوٹ کروا دو۔ ابھی خوب ڈانٹ پڑی ہے مجھے۔ وہ مجھے کسی کام سے کال کر رہے تھے لیکن نمبر مسلسل بزی آرہا تھا۔ لینڈ لائن ٹھیک ہونے میں تو کچھ دن لگیں گے۔''

''تو جناب کا نمبر یعنی کہ بزی ہی رہا کرے گا؟'' سوار نے شرارت سے اضافہ کیا، صدیق سے اب اس کی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ ایک کمرے میں رہتے تو چوبیس گھنٹوں میں بہت سی باتوں کا پتا چل جاتا ہے۔ اُنہیں تو ہفتے بھر سے کچھ اُوپر ہو گیا تھا۔

''تم کیا جانو منگنی شدہ زندگی کی مجبوریاں۔'' صدیق نے مصنوعی آہ بھری۔

''بجا فرماتے ہیں محترم۔ لیکن میرے ایسا سمجھنے سے جاوید صاحب کی مشکل پھر بھی حل نہیں ہوسکتی۔''

''یعنی؟'' بات صدیق کے کچھ پلے نہیں پڑی۔

''ارے بھائی۔ موبائل نامی سہولت سے قطعی طور پر محروم ہوں اور فی الحال تنخواہ ملنے تک چانس بھی نہیں ہے۔''

''اچھا؟'' صدیق اپنی بے خبری پر حیران ہوا۔ واقعی اُس نے تو غور ہی نہیں کیا تھا۔ ''لیکن کیوں یار۔ میرا مطلب ہے......''

''مری آتے ہوئے کہیں راستے میں گم ہوا ہے اور ملا بھی یقیناً کسی ''شریف'' آدمی کو ہے۔'' سوار نے بے بسی سے کندھے اُچکائے۔

''سمجھ سکتا ہوں۔'' صدیق معنی خیزی سے مسکرایا۔ ''ہمارے ہاں شریف اور بدمعاش کے معاملات ویسے بھی اُلٹے چل رہے ہیں۔''

وہ ہنستا ہوا آگے بڑھ گیا اور اُس کی پشت کو دیکھتے سوار کی نظروں میں ایک منظر گھوم گیا۔

''خبردار جو رابطے کی یہ آخری کڑی بھی اپنے ساتھ رکھی۔'' ابا نے غضب ناک نگاہوں سے گھورتے موبائل سامنے سیمنٹ کی دیوار پر دے مارا۔

''تم جیسے نیچ انسان کی یہاں آواز بھی کوئی سننا نہیں چاہتا۔ دفع ہو جاؤ ہمیشہ کے لیے۔۔۔''

اور تب چپ چاپ گھر سے نکلتے سوار نے خود سے تہیہ کیا کہ کبھی گھر والوں کو اپنی آواز بھی نہیں سنوائے گا۔ بھلے ابا اس بات سے شاید ناواقف تھے کہ موبائل توڑ دینے سے رابطہ ہمیشہ کے لیے منقطع نہیں ہو جاتا۔ وہ چاہے تو اپنی سم کی ڈپلی کیٹ نکلوا سکتا ہے۔ لیکن اس طرح تو ابا کا مان مجروح ہو جاتا۔ وہ اگر نہیں چاہتے کہ سوار کبھی پلٹ کر ان کی دنیا میں واپس آئے تو اُسے اُن کی خواہش کو یقینی بنانا تھا۔ پھر سم کے آؤٹ آف آرڈر ہونے سے جہاں ابا کی خواہش کی تکمیل ہو رہی تھی وہاں سوار بھی ایک بہت بڑے خطرے کو دعوت دینے سے محفوظ ہو رہا تھا۔ تبھی مصمم ارادہ یہی کیا کہ کچھ اچھی رقم ہاتھ میں آجانے پر وہ ایک سستا موبائل اور بالکل نیا نمبر اپنے نام پر ایشو کروائے گا۔

''میرا نیا نمبر۔'' اُس نے مسکرا کر کچھ سوچا۔ ''جس میں چند ایک نئے کانٹیکٹس ہوں گے، چند ایک نئے لوگ...... اور بس...... اِس چھوٹی سی پُرسکون دنیا میں پھر سب کچھ اچھا ہوگا۔ جیون کی اِس نیا کو اب کسی طوفان کسی ہنگامے سے ٹکرانے نہیں دوں گا۔ سوار علی نے اپنے اندر کی سبھی بے چینیوں کو ابدی نیند سُلا دیا ہے۔ پھر حرج ہی کیا ہے ایک ایسی لائف جینے میں جس کی ترجیحات محض کھانے، کمانے اور چند فارمل ریلیشنز تک محدود ہوں...... کیونکہ سوار علی نے بائیں کونے میں پمپ کرتے خون اور گوشت کے مٹھی بھر ٹکڑے کو اب ''دل'' سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔ اُس نے تھکے تھکے انداز میں صوفے کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ بائیں کونے میں موجود اُمنگوں سے خالی دل۔

شرمندگی کی چادر اوڑھے کچھ یوں دبکا بیٹھا.

تھا۔ جیسے کہتا ہو، میں شرمندہ ہوں سوار۔۔ جنون کی جن موجوں کے حوالے کر کے تمہاری زندگی برباد کر ڈالی، تم سے نظریں ملانے کے قابل نہیں ہوں اب...... اور تم بھی حق بجانب ہو مجھے ''دل'' نہ سمجھنے میں۔

☆☆☆

چندا بھی دیکھا، تارے بھی دیکھے
دیکھا سورج برسوں،
لیکن جس دن تجھ کو دیکھا
من میں پھولی سرسوں......
ہائے رے جوگی،
ہم تو لٹ گئے تیرے پیار میں
جانے تجھ کو خبر کب ہوگی۔۔ جوگی ہم تو لٹ گئے۔

دھیما دھیما گنگناتے وہ پائپ سے کیاریوں میں پانی دے رہی تھی۔ جب ڈور بیل نے سُر تال کا توازن ہی بگاڑ دیا۔ اِس وقت تو لڑکے سامان پہنچانے آیا کرتے تھے۔ بلکہ لڑکے ہی کیا۔ مسلسل کئی دن سے صرف صدیق ہی آ رہا تھا۔ سوار نے تو پہلے دن ٹیکسی سے اس کے ابو کو گھر کے اندر پہنچانے کے بعد سے ادھر جھانکا بھی نہیں تھا۔ حالانکہ ابو نے خوب محظوظ ہو کر کنعان کو یہ قصہ سنایا تھا کہ کیسے سوار نے رعب ڈال کر ان سے سامان وغیرہ منگوانے کی بات منوائی تھی۔ لیکن وہ رعب ڈالنے والا اب خود آنے کے بجائے روز ہی صدیق کو بھیج دیتا تھا۔ حتیٰ کہ کنعان نے اُس روز کے بعد سے دوبارہ اسے دیکھا تک نہیں تھا۔ تین روز تو وہ ابو کی وجہ سے کالج ہی نہیں گئی تھی۔ اور جب جانا شروع کیا تو ابو کے گھر پر ہونے کی وجہ سے ہوٹل میں چابی دینے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ آتے جاتے ہوٹل کے سامنے سے گزرتے بھی سامنا نہیں ہوا۔ اب بھی یقیناً صدیق بھائی ہی ہوں گے۔ وہ اپنی ہلکی بھیگی آستینیں اور پائنچے درست کرتی دروازے تک آئی۔

''کون؟''

''یہ...... سامان لے لیں۔'' آواز بلاشک و شبہ سوار کی تھی۔

کنعان کا دل صحیح معنوں میں اُچھل کر حلق میں آ بیٹھا تھا۔ دھڑکنیں اگلے ہی پل خوش گوار سا راگ الاپنے لگیں۔ دوپٹا سر پر رکھتے اس نے دروازہ کھولا اور بجائے سامان کے لیے ہاتھ آگے بڑھانے کے ایک سائیڈ پہ ہو کر راستہ دیا۔ صدیق بھائی بھی برآمدے کی ڈائننگ ٹیبل تک آ جاتے کیونکہ بل ان سے لے کر وہ ابو کو دیتی اور وہ فوراً پے منٹ کر دیتے۔

''سر جاگ رہے ہیں؟'' سوار بھی بنا تکلف میں پڑے فوراً اندر آ گیا تھا جیسے اپنا بھی یہی ارادہ ہو۔ ہمیشہ کی طرح آج بھی بنا کنعان کی طرف نظر اُٹھائے اس نے سوال کیا تھا، جس پر ایک مرتبہ پھر اُسے شدید تپ چڑھی لیکن بمشکل کنٹرول کرتے آگے بڑھ گئی۔

''معلوم نہیں۔'' جالی اور شیشے کا دروازہ کھول کر وہ اندر آئی۔ سوار بھی پیچھے پیچھے آتے برآمدے میں داخل ہوا۔ ہاتھ میں پکڑا سامان ڈائننگ ٹیبل پر رکھا اور خود ہی درمیانی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازہ کھلا تھا اور آگے پردہ پڑا ہوا تھا جسے ہلکا سا سائڈ پر سرکاتے اس نے پہلا قدم اندر رکھا لیکن سر پر نظر پڑتے ہی بیچ راہ میں قدم واپس کھینچ لیا۔ سر سامنے بیڈ پر گہری نیند میں نظر آئے۔

کنعان نے اس دوران سامان میں سے بل کی پرچی ڈھونڈی اور پیچھے پیچھے اندر آنے کی کوشش کی۔

''شش......'' سوار نے ایک انگلی اپنے منہ پر رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے دوسرے ہاتھ سے دوبارہ پیچھے جانے کو کہا۔

''سو رہے ہیں۔'' اُس نے اپنی آواز سرگوشی سے بھی نیچے رکھی اور باہر نکلنے کے ارادے سے قدم برآمدے کے دروازے کی طرف بڑھائے۔

''تو یہ بل؟'' کنعان نے ہاتھ میں پکڑا پرچا سامنے لہرایا اور سوار کی آنکھوں میں یک لخت خفگی کا رنگ اُترا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلنے کا ارادہ ترک کرتے وہ واپس مڑا۔۔ اور اس مرتبہ۔۔ بلکہ پہلی ہی مرتبہ۔۔ وہ اب ڈائریکٹ کنعان کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

''میں سر کی خیریت دریافت کرنے یہاں اندر تک آیا تھا۔'' اُس نے ''یہاں'' پر زور دیا۔ اِسے اپنے پاس ہی رکھیں۔ بل پر کسی تیل جیسی غضب ناک نگاہ ڈالتے وہ صحن میں نکل گیا اور کنعان نے بے اختیار اپنا ماتھا پیٹا۔

''یا خدا۔ پھر اُسے ناراض کر دیا، جس نے پہلے ہی قسم کھا رکھی ہے کہ مجھے تو ایک بس غصے کی نظر سے ہی دیکھے گا۔'' وہ دروازہ بند کرنے کے لیے خود بھی باہر آ گئی۔ سوار تب تک خارجی دروازے تک پہنچ چکا تھا۔

''سوری۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' کنعان کی اعتماد سے خالی، گھٹی گھٹی سی آواز بمشکل حلق سے برآمد ہوئی، جسے معلوم نہیں سنا بھی گیا تھا کہ نہیں۔

''کل صبح دس بجے سر کو کلینک لے جانا ہے۔ پلاسٹر اُترے گا۔'' اُس کی سوری کو نظر انداز یا شاید قبول کرتے ہوئے پہلا قدرے دوستانہ جملہ ادا کیا گیا۔ وہ بھی اِس بار بجائے غصے کے معمول کی نگاہ ڈال کر۔ کنعان مارے خوشی کے بس گونگوں کی طرح سر ہلا کر رہ گئی۔ سوار اس ''جامع'' جواب پر اکتفا کرتے ہی باہر نکل گیا۔ اور کنعان کا دل مارے خوشی کے سارا دن ہی ناچتا رہا۔

☆☆☆

کنعان نے رات کو ہی فون کر کے دیا کو اطلاع دے دی تھی کہ صبح وہ کالج نہیں جائے گی۔ ابو کا پلاسٹر اُترنا ہے۔

''تم کیا کلینک جا رہی ہو ساتھ؟'' چھٹی کا سن کر دیا کا سخت موڈ خراب ہوا۔

''ساتھ نہیں جا رہی لیکن چھٹی تو کرنی ہی چاہیے۔''

''تم بھی ناں یار۔'' دیا کا ذہن نہیں بن رہا تھا شاید۔ اتنا ہی کہہ پائی۔ ''کل مجھے ضروری جانا تھا۔''

''ارے بھئی تم سے کون چھٹی کرنے کو کہہ رہا ہے۔ چلی جانا خود ہی...... اور......'' وہ رُکی۔ ''کون سا ضروری کام؟''

''ہی ہی ہی......'' جواباً دیا سخت پھیکا سا ہنسی۔ کنعان کے کان کھڑے ہوئے۔ ''یعنی...... کیا کرنے والی ہو؟''

''دفع ہو جاؤ، بھلکڑ، نکمی...... کل ایک اتنا خاص دن ہے اور تم......''

''خاص دن۔'' کنعان نے رُک کر سوچا۔

''اووو...... تو جس دن دانیہ رباب نے اپنا بھاری بھر کم پیر دھرتی پہ جمایا۔'' مسکراہٹ کنعان کے چہرے پر یک لخت بکھری۔

''بھاری مت کہنا۔'' وہ فون کے اندر سے کاٹ کھانے کو دوڑی۔ دیا کا وزن عمر کے حساب سے تھوڑا سا زیادہ تھا اور پتلی پتنگ بننے کے چکر میں اکثر ہی وہ نت نئے ٹوٹکے آزما کر خود کو ہلکان کرتی رہتی تھی۔

''بھاری کی جگہ ایک ''اور'' لفظ استعمال کر دیا تو کہیں خون ہی نہ کر دو میرا۔'' کنعان خود ہی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ بھاری سے زیادہ دیا کو لفظ موٹی سے چڑ تھی۔

''اچھا اب مرو پھوٹو۔ کل آ رہی ہو کالج؟''

''نہیں بابا۔''، ''کل'' کے احساس سے وہ بلاوجہ ہی مسکرانے لگی تھی۔ ''تمہیں وش کرنے تو میں شام کو آیا کرتی ہوں ناں۔'' کنعان نے یاد دلایا۔ ہمیشہ ہی وہ گفٹ لیے سیکنڈ ٹائم اس کے گھر جاتی۔ جہاں دیا کی بھابھی اسما اور امی نے گھر پر ہی اہتمام کر رکھا ہوتا۔ کنعان ہی ان کی واحد مہمان ہوتی اور سب ہنسی خوشی کے ماحول میں کیک کاٹ کر چائے سے لطف اندوز ہوتے۔

''صبح کوئی اور بھی وش کرنا چاہتا ہے۔'' وہ بہت دھیرے سے منمنائی تھی۔ کنعان کے پلے بس ایک دو لفظ ہی پڑے۔

''ہیں...... کیا؟''

''ارے باسط آئے گا صبح، مجھے دیکھنے اور......'' وہ کنعان کے مزاج کو دیکھتے دانستہ ہی خاموش ہو گئی تھی۔

''اور......؟'' کنعان کی آنکھیں ایڈوانس میں پھیلنا شروع ہوئیں۔ ''کیا کرنے والی ہو کمینی؟''

''تمہارے ہوتے تو بندہ خود پہ جبر ہی کر سکتا ہے۔'' دیا نے بھی دانت کچکچائے۔ ''کوئی تیر نہیں

مارنے والی۔ وہ بس مجھے گفٹ دینا چاہتا ہے۔“

”گفٹ۔۔ کہاں؟“ کنعان کا دماغ دوڑنے سا لگا۔ ”ارے بیچ میں تو مال روڈ ہے، ادھر اُوپر کالج روڈ پہ لڑکیاں ہی لڑکیاں۔۔ اتنے رش میں۔۔“

”نہ مال روڈ نہ کالج روڈ۔“ دیا مسکرائی۔ ”یہیں اپنے ازمیر ہوٹل کے بعد، جنگلے کے ساتھ ساتھ چلتے کتنے سنسان موڑ آتے ہیں۔ یہیں بلاؤں گی۔“

”پھر تو میں بالکل بھی نہیں جا رہی۔“ کنعان نے صاف ہاتھ کھڑے کیے۔

”کوئی بات نہیں۔“ دیا اب مستحکم انداز میں مسکرا رہی تھی۔ جیسے تصور میں کچھ مزید اچھا سوجھ گیا ہو۔ ”تم نہیں جا رہیں تو اور بھی اچھا ہے، ہمیں اکیلے چند قدم ساتھ چلنے کا، دو چار باتیں کرنے کا موقع میسر آجائے گا۔“

”اور پیچھے سے اشفاق انکل بینک جانے کے لیے نکل آئیں گے۔“ کنعان نے اُسے نیچے لانے کی کوشش کی۔

”ابو نو بجے بینک جاتے ہیں۔ سڑیل۔۔ اب سوجاؤ آرام سے۔۔ اور مجھے بھی میٹھے میٹھے سپنے دیکھنے دو۔“ دیا نے ہنستے ہوئے فون رکھ دیا۔

اور اب...... کنعان نے وال کلاک پہ نظر ڈالی۔ صبح کے نو بج چکے تھے۔ دس بجے سوار نے آنا تھا۔ ابو کی فون پر اُن سے بات ہوگئی تھی اور اب وہ ناشتا کرنے کے بعد تیار ہو کر بیٹھے تھے۔ اماں صبح اپنے کام پر چلی گئی تھیں۔ کنعان نے ناشتے کے بعد کچن سمیٹ کر برتن بھی دھو لیے تھے۔ اب جوں جوں وقت قریب آرہا تھا وہ اپنا دھیان کسی بھی کام میں ٹھیک سے نہیں لگا پا رہی تھی۔ ٹھیک دس بجے دروازہ بجا تو دھڑکتا دل لیے وہ دروازے پر آئی۔

”کون؟“ آواز کی لرزش پر قابو پانے میں وہ بری طرح ناکام رہی تھی۔

”عصمت علی ہوں باجی۔“

”او۔۔“ بگڑے سسٹم میں تواتر آیا۔ لہجے کا اعتماد بھی بحال ہو گیا لیکن کمرے سے یہاں تک آتے قدموں کے ساتھ جو اُمید کی ڈوری بندھی چلی آئی تھی وہ البتہ ٹوٹ کر یہاں وہاں بکھر سی گئی۔ جانے وہ آنے کا کہہ کر آتا کیوں نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ وعدوں کو اُس طرح یاد ہی نہیں رکھتا تھا۔ پھر پادر کھنے کے لیے کوئی وجہ بھی چاہیے۔ وہ میری طرح نہیں سوچ سکتا۔۔ کبھی نہیں۔ وہ ازحد مایوس سی واپس کچن میں لوٹ آئی۔

”کنعان۔“ کچن میں خود سے اُلجھتے وہ یہ بھول ہی گئی کہ ابو نے کلینک جانا تھا۔

”جی ابو۔“ وہ بھاگ کر باہر آئی۔ عصمت علی انہیں اُٹھنے میں سہارا دے رہا تھا۔

”کنعان بیٹا وہ کرسی گھسیٹ لانا جس کے سہارے باتھ روم تک جایا کرتا ہوں۔“

”جی ابو۔“ وہ فوراً برآمدے سے کرسی نکال لائی۔

”سر اِس طرح کافی مشکل ہو جائے گا۔“ عصمت علی نے کرسی نزدیک کرتے انہیں وہیں بیٹھنے میں مدد دی۔ ”سوار ٹیکسی لے آئے تو ہم دونوں مل کر آپ کو وہاں تک لے جائیں گے۔“

اور سوار کے آنے کا سن کر ایسی لطف سچویشن میں بھی کنعان نے عجیب انداز میں دل کو کھلتے محسوس کیا۔ رفیق احمد بھی تائید میں سر ہلاتے وہیں کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ چند منٹ بعد ہی دروازہ دوبارہ بجا۔ عصمت علی نے دروازہ پورا کھول کر سوار کو اندر آنے کو کہا اور باہر جھانک کر ٹیکسی والے کو مزید دروازے کے قریب آنے کو کہا۔ کچھ ہی منٹوں کے اس منظر نامے میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس کے انتظار میں کنعان نے پوری رات آنکھوں میں کاٹ کر گزار دی تھی۔

وہ اندر آیا تو اس کی توجہ کا مرکز مکمل طور پر رفیق احمد کی ذات تھی۔ کنعان کو اُن سب کے جانے کے بعد اپنے آپ سے سخت شرمندگی محسوس ہوئی۔ لمحے بھر کو بھی وہ ابو کے متعلق سوچ نہیں پائی تھی۔ دو غیر لڑکے پریشان صورت لیے اس کے باپ کو سنبھال رہے تھے اور یہ شیطان مردود۔ کیسے اس کو بہکا کر اپنے راستے لگا رہا تھا۔

سوار نے تو نظر اُٹھا کر اسے ایک بار دیکھنے کی بھی توفیق نہیں کی تھی۔

”ایک میرا ہی دماغ خراب ہے، میں تو اپنے ساتھ بھی مخلص نہیں۔ اپنے وعدوں کو آپ توڑ کر نری خود سے دشمنی کرنے والی۔ وعدہ خلاف، بری لڑکی۔“ نچلا لب شرمندگی اور خجالت سے دانتوں میں دباتے وہ آنکھوں میں تیر آئی نمی کو ضبط کرنے میں لگی تھی۔

☆☆☆

ریسیپشن پر سیاحوں کا رش کچھ دیر پہلے ہی قدرے کم ہوا تھا۔ اب تو بس انہی سیاحوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا جو پہلے سے یہاں رہائش پذیر تھے۔ صدیق نے ڈنر آرڈر کیا اُسے شدید بھوک لگی تھی۔ عصمت علی کھانا لینے گیا اور پیچھے رفیق سر کی کال آگئی وہ سوار اور صدیق میں سے کسی ایک کو بلا رہے تھے۔ صدیق چونکہ کچھ دیر پہلے ہی ڈیوٹی پر آیا تھا اِس لیے سوار نے خود جانے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی کام رفیق سر کا ہو تو وہ بہانے بازیوں سے کام نہیں لیتا تھا۔ اس لیے فوراً ہی نکل پڑا۔

آج ریسیپشن پر نائٹ ڈیوٹی صدیق کی تھی۔ سوار نے گھنٹہ بھر پہلے ہی نہا کر دن بھر کے استعمال شدہ یونیفارم سے نجات حاصل کی تھی۔ اب وہ گھر کی سادہ براؤن شلوار قمیص میں تھا۔ ڈیوٹی آف ہوتے ہی اس کی طبیعت بجائے نیند اور سستی کی طرف مائل ہونے کے ایک دم زیادہ چست اور فعال ہو گئی تھی۔ بلکہ وہ تو نائٹ ڈیوٹی کے بعد بھی بجائے اگلا پورا دن سونے کے محض گیارہ ساڑھے گیارہ تک نیند پوری کر کے صدیق کے ساتھ آبیٹھتا تھا۔ اس کی مکمل نیند ہمیشہ سے پانچ گھنٹوں تک محدود رہی تھی۔ اس سے زیادہ سونا اسے پسند نہیں تھا۔ صدیق البتہ نیند کا خوب رسیا تھا۔ نائٹ ڈیوٹی کے بعد وہ اگلی صبح سے تین چار بجے تک آرام سے سوتا رہتا۔

اپنے کسی دھیان میں مگن سوار ڈھلان اتر کر رفیق سر کی گلی میں داخل ہوا۔ گھر ابھی پچیس تیس فرلانگ دور تھا جب گھر سے بھی کچھ قدم آگے بائیں جانے والی گلی سے ایک لڑکی نکلی۔ گلی کے اُس کونے میں قدرے اندھیرا تھا۔ پھر بھی جانے کیوں سوار کو سامنے سے آتی اُس لڑکی پر کنعان کا گمان ہوا اور کچھ قدم آگے آنے پر روشنی میں یہ شک یقین میں بدل گیا۔ وہ واقعی کنعان تھی لیکن آج ذرا بدلے ہوئے سے حلیے میں۔۔ سرخ رنگ کے شوخ سے کپڑوں میں سر پر ڈھیلا سا دوپٹا اس انداز میں کیے ہوئے کہ کھلے بال کنپٹیوں اور کانوں سے پھسل کر آگے آرہے تھے۔ ہاتھ میں اس نے ایک ٹرے پکڑ رکھی تھی۔ دونوں ہاتھ بزی ہونے کی وجہ سے بھی بال سنبھالنا مشکل تھا۔ چہرے پر ہلکا ہلکا میک اپ کیے کافی کلرفل لگ رہی تھی، خصوصاً یونیفارم والی کنعان سے بہت ہٹ کر۔

سامنے سے آتے سوار کو وہ بھی دیکھ چکی تھی اور ہمیشہ کی طرح آج بھی ایک دم نروس سی ہو گئی تھی۔ سوار ایسے موقعوں پر ہمیشہ ہی خود کو کوس کر رہ جاتا۔ پہلے روز کے اُس جھگڑے کا کچھ اتنا برا امپریشن پڑا تھا کہ کنعان اسے دیکھ کر ہمیشہ ہی بری طرح گھبرا جاتی تھی۔ آج بھی اس کے نروس ہو جانے پر سوار کے جی میں آیا آگے بڑھ کر اپنے پہلے دن کے رویے پر معذرت کرلے۔ لیکن بھلا، کن لفظوں میں۔ ہر بار کی طرح وہ پھر سوچ کر رُک گیا، پھر فائٹ تو دونوں طرف سے خوب زوردار ہوئی تھی۔

”جھگڑا کرنے میں تو اُس نے بھی کیا بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ معذرت کرنے میں لحاظ آڑے آرہا ہے۔ مجال ہے جو آج تک کبھی سلام بھی کیا ہو۔ ابا جی کے نوکر لگے۔“ وہ سوچتے سوچتے رُکا۔

”کسی حد تک چلو مان لیا کہ ابا جی کے انڈر کام کرتے ہیں۔ لیکن سلامتی بھیجنا تو اسلامی فریضہ ہے اور وہ دیا بی بی کیسے اہتمام سے سلام دعا فرماتی ہیں۔“ سوار بڑی روانی اور جوش سے سوچتا دروازے تک آیا، کنعان بھی عین اسی وقت دروازے پر پہنچی۔

”السلام علیکم۔“ بالآخر سوار نے قسم توڑنے کا اِرادہ کیا کہ سلامتی بھیجنے میں پہل تو وہ بھی کرسکتا ہے۔

”وا...... وعلیکم السلام۔“ وہ بے چاری تو اس غیر متوقع سلام پر بھی غوطہ کھا گئی تھی۔ سوار کا دل چاہا

آج پوچھ ہی لے۔ شکل سے کہیں ٹیررسٹ تو نہیں لگتا۔ لیکن سب ہی جملے اُسے اندر ہی دبا لینے پڑے۔ آخر کو محترم سر کی قابل احترام بیٹی تھی۔ اگرچہ ہمیشہ ہی وہ اُس سے ایسے پیش آیا تھا گویا ہیڈ ماسٹر لگا ہو بے چاری پر۔

"مجھے سر نے بلایا ہے۔ اندر آجاؤں؟" سوار کا لہجہ ایک مرتبہ پھر سپاٹ تھا، کنعان نے رُک کر راستہ چھوڑا۔

"جی آجائیں۔" وہ ہاتھ سے دروازہ پورا کھولتی اندر بڑھ گئی۔ رفیق سر آج برآمدے میں ہی بیٹھے تھے۔ سوار دروازہ کھول کر اندر آیا۔ کنعان کچن میں چلی گئی تھی۔

"السلام علیکم سر۔" اُس نے آگے بڑھ کر مصافحہ کیا۔ "کیسا لگ رہا ہے سر! پلاسٹر اُترنے کے بعد؟" وہ جھک کر بغور پاؤں دیکھنے لگا۔

"زیادہ دباؤ تو میں نے ڈالا ہی نہیں۔ عجیب سی جھجک ہو رہی ہے یار۔"

"ہوں۔" سوار سیدھا ہوا۔ "اور یہ اسٹک؟" صبح ڈاکٹر نے اس کے سامنے سر سے کہا تھا کہ فی الحال کچھ عرصہ وہ اسٹک کی مدد سے اس پیر پر زور ڈالیں۔ سوار نے دیوار کے ساتھ کھڑی اسٹک کو دیکھا۔

"ہاں۔ اسی کے لیے بلایا ہے۔ بیٹھو۔" سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کرتے انہوں نے اسٹک اپنے ہاتھ میں لی۔ "یہ تو سامنے والے رضوی صاحب کی والدہ کی ہے۔ تمہیں یہی دکھانے کے لیے بلایا ہے۔" انہوں نے چھڑی سوار کی طرف بڑھائی۔ اُوپر سے بظاہر سنگل نظر آنے والی اُس چھڑی کے نیچے جا کر چار چوڑے پائے تھے۔ دیکھنے میں ہی خاص اور خوب آرام دہ لگ رہی تھی۔

"بھاری جسامت والوں کے لیے بڑی کارآمد چیز ہے۔" رفیق سر خود ہی وضاحت کرنے لگے۔ "لیکن رضوی صاحب نے تو اسلام آباد سے لی تھی۔ یہاں......" وہ دانستہ رُک گئے۔

"مِل جائے گی سر۔" سوار نے تسلی سے سر ہلایا۔ "ابھی ڈھونڈ لاتا ہوں۔"

"نائٹ آف ہے آج؟" انہوں نے کپڑوں سے اندازہ لگایا۔

"جی سر۔ بس ابھی فری ہوا ہوں۔" وہ چھڑی کو اوپر نیچے غور سے دیکھتے کوئی لکھائی یا اسٹکر وغیرہ ڈھونڈ رہا تھا جب کنعان نے سامنے کی چھوٹی میز پر کچھ سامان لا کر رکھا۔

"ارے واہ بھئی۔ فروٹ کیک۔" رفیق سر نے خوشی سے نعرہ لگایا سوار نے مسکرا کر ایک نظر میز پر ڈالی۔ کیک کے علاوہ پزا بھی تھا۔ دیکھ کر اس کے بھی منہ میں پانی آگیا۔

"دیا بیٹی کی آج برتھ ڈے تھی۔ اُسی نے بھیجا ہے۔" وہ پلیٹ سوار کے آگے رکھنے لگے۔

"آپ لیں سر۔ میں چلتا ہوں۔" وہ باقاعدہ اُٹھنے لگا، دل میں یہ سوچتے کہ دیا نے تو ظاہر ہے انکل یا اماں کے لیے حصہ بھیجا ہوگا۔

"ارے بیٹھو یار۔" رفیق سر نے بازو سے کھینچ کر دوبارہ بٹھایا۔ "سامنے رکھا کھانا چھوڑ کر نہیں جاتے، میں تو سوچ رہا ہوں ساتھ چائے بھی ہونی چاہیے۔"

"جی بن رہی ہے۔" کنعان نے کچن کی کھڑکی سے اطلاع پہنچائی۔

"لو یار۔ مجھے تو یہی کیک پیس ہی کافی ہے۔ یہ پزا وزا تو میں نہیں کھایا کرتا۔"

"اور اماں بھی نہیں کھائیں گی۔" کنعان نے ایک اور اضافہ کرتے سوار کو پزا کھانے کی کھلی دعوت دی اور اس مرتبہ مزید مروت نہ دکھاتے اس نے دونوں پیس ہی اپنی پلیٹ میں رکھ لیے۔ پزا سے اس کی شدید محبت کو بنا کہے ایک مہربان خاتون نے سمجھ لیا تھا۔ زیادہ تحمل کا مظاہرہ تو اب پزا کے ساتھ زیادتی ہوتی۔

اور پھر کھانے سے سیر ہو کر وہ سیدھا بازار چلا گیا۔ مطلوبہ چھڑی اُسے باآسانی مال روڈ کی ایک دکان سے ہی مل گئی تھی جو اُس نے اسی وقت ہی آکر سر کو دے دی تھی کیونکہ اگلی صبح سے انہوں نے ہوٹل آنا تھا۔

☆☆☆

ثمامہ مصروف تو بہت تھی، کچھ پورے، کچھ ادھورے کام اور چھوٹے موٹے ساتھ ساتھ چلتے مسائل بھی۔ لیکن کوئی بھی کام اب اُسے بوجھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ بڑی بڑی ذمہ داریوں کا بوجھ آناً فاناً اپنے کندھوں پر اُٹھا لینا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ کھڑا ہونے سے پہلے ہی گرنے کا خطرہ تھا۔ پر وہ مست بھی تھی، مگن بھی تھی اور سب سے بڑھ کر بہت ہلکی پھلکی بہت پُرسکون تھی، کیونکہ پہلی بار وہ "آزاد" تھی۔ روپے پیسے کی ریل پیل اور پروٹوکول کے تڑکے کے ساتھ۔ حالانکہ پروٹوکول تو تب سے ملنا شروع ہو گیا تھا جب علیم الدین سے شادی ہوئی تھی۔ لیکن وہ دور آزادی کے حسن سے خالی تھا۔ زندگی نے چند ہی برسوں میں عجیب رنگ بدلے تھے۔ آج اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھتی تو شاید خود کو بھی پہچان نہ پاتی۔

ثمامہ ابراہیم کی زندگی...... جس کا پہلا پھیکا اور بے رونق چیپٹر غربت، افلاس اور ڈھیر ساری نہ پوری ہونے والی ضرورتوں سے تعبیر تھا۔ یہ ایک طویل چیپٹر تھا جس کا دورانیہ اس کی پیدائش سے اُنیس برس کی عمر تک محیط تھا۔ اس کے ابا ریلوے میں ملازم تھے اور زندگی ریلوے اسٹیشن کے ایک بوسیدہ کوارٹر میں گزر رہی تھی۔ انیس برس کی عمر میں جبکہ وہ تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی اس کے ابو کا انتقال ہو گیا۔ تب ماں اور بہن بھائی کی محرومیاں ختم کرنے کا تہیہ لیے اُس نے عملی زندگی میں قدم رکھ دیا۔ بھائی ابھی بہت چھوٹا تھا اور بڑی بہن بدقسمتی سے زیادہ پڑھ نہیں پائی تھی۔ دبوسی آصفہ باجی گھر میں امی کے ساتھ کاموں میں لگی رہتی اور ثمامہ نے ٹائپنگ، شارٹ ہینڈ اور چند ایک چھوٹے موٹے کمپیوٹر کورسز سیکھ کر دفتروں کے دھکے کھانے کی پریکٹس شروع کر دی جو کہ ایسا کوئی خاص اچھا تجربہ ثابت نہیں ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اسے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ بنا ٹیلنٹ اور بڑی ڈگری کے نوکری حاصل کرنے کے دو ہی طریقے ہیں۔ پہلا...... کسی بڑے آدمی کا ریفرنس، دوسرے اپنی شخصیت کو کسی حد تک پُرکشش بنانا۔ اب ریفرنس تو ثمامہ کے پاس تھا کوئی نہیں۔ دوسرا حربہ استعمال کرنے میں البتہ کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس کوشش میں کامیاب ہونے کے لیے ثمامہ نے چند ایک چکر بیوٹی پارلر اور مارکیٹ کے لگائے۔ عمدہ ڈریس اور حسین لُکس کے ساتھ قدرتی حسین چہرے کا امتزاج لیے اس نے دفتروں کی نئی دوڑ شروع کر دی اور اس بار اس کا جلدی نوٹس لے لیا گیا۔

یوں تو وہ ایک چھوٹی صابن فیکٹری تھی اور تنخواہ بھی بس عام سی تھی لیکن یہاں سے شروع ہوا تھا ثمامہ کی زندگی کا دوسرا دور...... یعنی خود کما کر کھانا اور پورے کنبے کو کھلانا۔ دو سال تک ثمامہ اسی فیکٹری میں جمی رہی لیکن اب اس کا وہاں جی اوبنے لگا تھا۔ فیکٹری کے مالک رانا بصیر تھے تو شفیق اور خدا ترس قسم کے آدمی۔۔ لیکن ثمامہ کی زندگی میں شفقت اور خدا ترسی کی نہیں، روپے پیسے کی کمی تھی۔ گزشتہ دو سال سے وہ ایک ہی تنخواہ پر کام کر رہی تھی۔ جبکہ ساتھ کی لڑکیاں دیکھتے ہی دیکھتے کہاں پہنچ گئی تھیں۔ ثمامہ کی زندگی میں سہولیات کا بھلے ہی فقدان تھا لیکن مشاہدے کی آنکھ اللہ نے خوب وسیع دی تھی۔ تیز طرار زمانہ شناس لڑکیوں سے اُس نے غیر محسوس طریقے سے کئی گُر سیکھ لیے تھے۔ ایسی لڑکیاں جن کے لیے جگہ، ماحول، آفس اور حیثیت تبدیل کروانا چٹکیوں کا کام تھا، ثمامہ کو خوب متاثر کرتیں۔ تب ہی بالا ہی بالا اُس نے بھی دوسری جگہوں پر کام حاصل کرنے لیے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیے اور تب اس کی نظرِ انتخاب ولید جہانگیر پر جا ٹکی۔

لندن پلٹ، ہینڈسم، نوآموز بزنس مین ولید۔ ایک مشہور گارمنٹس کمپنی کا اونر تھا۔ ثمامہ جاب کے لیے انٹرویو دینے آئی تو جہاں وہ خود پہلی نظر میں ولید کی پُرکشش شخصیت سے بری طرح مرعوب ہو گئی وہیں ولید کو بھی ایسی ایکٹیو، پارہ سی، زندگی سے بھرپور، پُرکشش لڑکی میں خاص دلچسپی محسوس ہوئی۔ بلاشبہ وہ آنکھوں سے بولتی تھی۔ تیکھے نقوش اس کی سانولی رنگت پر خوب جچتے تھے۔ ایسا فُل آف ایکسپریشن چہرا ولید نے شاید ہی

اپنی پوری زندگی میں کبھی دیکھا ہو۔

"گارمنٹس کے متعلق چند جملوں میں کیا بتا سکتی ہیں؟" یہ ولید کا اس سے پہلا سوال اور دونوں کی باضابطہ گفتگو کا پہلا جملہ تھا جس کے جواب میں بولنے سے پہلے وہ نازک سی لڑکی بے ساختہ ذرا سا مسکرائی تو ولید کو بری طرح چونکا گئی۔

ٹیبل کے دوسری جانب بطور ایمپلائی بیٹھنے والوں کو ولید نے تھوک نگلتے، انگلیاں مروڑتے، بلاوجہ ہینڈ بیگ کی زپ سے الجھتے، گھبراتے، حواس باختہ ہوتے یا بہت ہوا تو بلاوجہ خود کو اوور کانفیڈنٹ ظاہر کرتے تو بہت دیکھا تھا لیکن مسکراتے؟ وہ خاص دلچسپی سے اس کے جواب کا منتظر ہوا۔

"ایسی شاندار کمپنی کی مہنگی گارمنٹس کے بارے میں پوچھ رہے ہیں سر۔۔ تو بس اتنا ہی کہہ سکتی ہوں کہ ڈسپلے میں سجے ایسے مہنگے کپڑوں سے ہمیشہ ہی نظر بچا کے گزرنا پڑا کیونکہ میری والدہ کہتی ہیں کہ جس چیز کو خریدنے کی استطاعت نہ ہو اسے دیکھ کر جی برا نہیں کرتے۔ خود پہ ترس آنے لگتا ہے۔"

"او۔۔ انٹرسٹنگ۔۔" ولید محظوظ ہو کر ہنسا۔

"یہی تو المیہ ہے ہمارے معاشرے کا سر۔ غریبوں پر عذاب کی طرح مسلط یہ زندگی امیروں کے لیے محض انٹرسٹنگ ہوتی ہے۔" وہ اچانک ہی سخت برا مناتے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اوہ سوری۔۔ مس ثمامہ۔۔" ولید گھبرا کر خود بھی کھڑا ہو گیا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میرے لیے آپ کی سچائی اور صاف گوئی انٹرسٹنگ تھی، خدانا خواستہ آپ کی مجبوریاں نہیں۔۔ آپ پلیز تشریف رکھیے۔" ولید نے وضاحت دے کر اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ ناراض چہرا لیے ٹک گئی۔

"مجھے اپنی کمپنی کے لیے ایسی ہی جرأت مند اور پراعتماد ورکر کی ضرورت ہے۔ آپ کل سے کام پر آسکتی ہیں۔" ولید نے سوچنے کے لیے انتہائی مختصر وقت لیا۔ یعنی انٹرویو شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا۔ اختتام البتہ کافی انٹرسٹنگ تھا۔ ثمامہ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو پاتے بظاہر متانت سے شکریہ ادا کرتے باہر آ گئی۔ ولید کو سوچوں میں گم چھوڑ کر اگلے مرحلے کی تیاری کے لیے۔

☆☆☆

بڑے دنوں بعد میاں جی کے ڈھابے سے میوزک کی آواز آتی سنی تھی۔۔ روڈ سے اتر کر نیچے آتے سوار کے لب اپنے آپ میں مسکرانے لگے۔ جانے کس کی پنجابی والی رگ پھڑکی تھی۔ نور جہاں کی دبنگ آواز میں سلطان راہی دور کا گانا سنتے سوار نے تصور میں خود کو کسی سرکس میں پایا۔

پیار دی اگن۔۔ ساڑے تن من۔۔
چھپیا نہ حال۔۔ کدی توں سجن۔۔
تک ترسے ملن کو نین۔۔ نین۔۔
وے جا۔۔ جاوے جا۔۔ جھوٹیا

"ارے آؤ۔۔ سوار بھائی۔۔" رب نواز نے کسی اچھے بچے کی طرح والیوم کم کرتے سوار کا سواگت کیا۔

"کیسے ہو رب نواز۔ تمہیں بھی مشکل سے کبھی فارغ دیکھتے ہیں۔" کھانے وغیرہ کا ٹائم نہ ہو تو وہ بے چارہ چائے ہی بناتا نظر آتا یا برتن دھوتا۔

"تمہارے کنجوس مالک کو کم از کم کھانا پکانے کے لیے دو بندے تو رکھنے ہی چاہئیں۔" چارپائی پر اطمینان سے لیٹتے سوار نے علی الاعلان اعتراض کیا۔ رب نواز جواباً دانت ہی نکال کر رہ گیا کیونکہ میاں جی اسی وقت چھوٹے کمرے سے باہر آئے تھے، وہ بھی سوار کا مکالمہ سنتے ہوئے۔

"تمہیں نہ رکھ لوں۔" انہوں نے باقاعدہ سوار کا کان مروڑا۔ نتیجتاً وہ کراہتا ہوا دوبارہ اٹھ بیٹھا۔

"ایک ماہ کی عارضی نوکری پہ اتراتے ہو۔"

"بندہ "کمانے" کے لیے ذلیل ہو میاں جی۔ تو سمجھ میں بھی آتا ہے۔ اب ہوا کھانے کے لیے کون صبح سے شام تک خوار ہو۔" سوار نے رب نواز کی سخت محنت اور کم اجرت پر چوٹ کی، جواباً رب نواز نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور میاں جی اس بار کھسیا کر ہنس پڑے۔

"بڑے خوش دکھائی دے رہے ہو۔ تنخواہ مل گئی ہے کیا؟"

"قاسم کے آنے میں ابھی آٹھ دس دن ہیں۔ مہینہ پورا ہونے پر ہی تنخواہ بھی ہاتھ آئے گی۔" سوار کا چہرا ایک دم سنجیدہ ہوا۔ میاں جی نے اس کی بدلتی کیفیت کو بہت شدت سے فوراً ہی محسوس کیا تھا۔

"وقت کے پیروں میں کس شدت کی تیزی ہے ناں۔" میاں جی ہلکا سا ہنس پڑے "جیسے پہاڑ کی چوٹی سے پتھر کو لڑھکا دو تو وہ سرپٹ زمین کی طرف بھاگتا ہے۔ بیس دن گزر گئے، پتا بھی نہیں چلا۔

"دس دن بھی پلک جھپکتے نکل جائیں گے۔"

سوار کچھ مایوس و دل گرفتہ سا نظر آنے لگا۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔" میاں جی نے آگے بڑھ کر اس کا کندھا تھپکا۔ "وہاں سے فارغ ہو کر یہیں آنا۔ ویسے تو مجھے کہنے کی ضرورت بھی نہیں۔ آرام سے یہاں رہنا اور تسلی سے نئی جاب تلاش کرنا۔"

"اصل میں میاں جی میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔" سوار نے ایک دم سنجیدہ ہو کر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

"کہو بیٹا۔" میاں جی بغور سننے لگے۔ رب نواز کا چھلنی دھوتا ہاتھ بھی رکا۔

"مجھے لگتا ہے یہاں شیف...... مطلب کک کی بڑی ڈیمانڈ ہے۔ پھر کام اور انسان کے بیچ دوری تو صرف سیکھنے تک کی ہوتی ہے۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو کام میرے پیچھے پڑا ہے اور میں اس کے آگے آگے بھاگ رہا ہوں۔ وسیلۂ روزگار کو ٹھوکر ماردی تو چوٹ خود میرے ہی پیر پر لگے گی۔ ایم اے، بی اے کی اہمیت اپنی جگہ۔" اس نے قطعیت سے میاں جی کی آنکھوں میں دیکھا۔ "لیکن میرے نزدیک اس وقت رب نواز مجھ سے زیادہ بہتر ہے۔ آپ کے ہوٹل پر آنے والے پچیس تیس مزدوروں یعنی ایک طرح سے مستقل گاہکوں کی ذمہ داری بخوبی اٹھائے ہوئے ہے۔ مجھے پتا کروانا ہے کسی ایسی جگہ کا جہاں کوکنگ کی باقاعدہ کلاسز لگتی ہوں۔ میں ٹریننگ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ آخر کام تو سیکھنے سے ہی آتا ہے ناں۔"

اپنے حتمی لہجے پر ذرا دیر کو سوار بھی حیران ہوا۔ شاید چند ہی ہفتوں میں بڑی لمبی مسافت طے کر لی تھی۔ اب اس کی لغت کا سب سے ناپسندیدہ لفظ "وقت کا زیاں" اور پسندیدہ ترین لفظ "کام" تھا۔ کوئی بھی اچھا، نیا اور جائز کام۔

"ہوں۔" میاں جی نے گہری نظر خلا میں جمائی۔ "بات تو ٹھیک ہے سوار! لیکن جگہ ایسی ہو جہاں سے باقاعدہ کاغذ ملتا ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں؟"

"جی جی۔ سند......" سوار نے سر ہلا کر تائید و تصحیح کی۔

"ہاں وہی۔ چلو ٹھیک ہے میں پتا کرتا ہوں۔" انہوں نے فوراً ہی موبائل جیب سے نکالا۔ سوار نے دوبارہ ٹانگیں چارپائی پر لمبی کیں۔ معاملہ میاں جی کے ہاتھ میں دے دیں تو کوئی نہ کوئی حل وہ نکال ہی لیا کرتے تھے۔ یہ سوار کی میاں جی کے متعلق چند روزہ آبزرویشن تھی اور ایسی کچھ غلط بھی نہ تھی۔

☆☆☆

ولید جہانگیر کی فیکٹری میں بطور سیکریٹری ثمامہ کے کام اور مشن کا آغاز ہو چکا تھا۔ "کام" سے پیسہ ملنا تھا تو "مشن" سے ولید کے دل تک رسائی۔۔ اور جو پکی رسائی ثمامہ کا مقصد تھی اس تک پہنچنے کے لیے بڑے حوصلے اور استقامت کی ضرورت تھی۔ سو استقامت کا پلو تھام کر اس نے بڑے سلجھے، باوقار اور ریزرو انداز میں اپنی ڈیوٹیز نباہنا شروع کر دیں۔ لب اسے سامنے پا کر آپوں آپ مسکرانے کو بے تاب ہونے لگتے لیکن وہ سختی سے انہیں بھینچ لیتی۔ آنکھوں کے چمکتے دیوں کو فائلوں کی آڑ میں چھپا لیتی کیونکہ وہ کسی امیر زادے کے لیے محض وقت گزاری کا ذریعہ نہیں بننا چاہتی تھی بلکہ اسے ولید کا دل اس کا بھروسا جیتنا تھا۔

ان کا آفس فیکٹری سے ہٹ کر تھا۔ ثمامہ آفس میں رہتی تھی، جبکہ ولید کا فیکٹری اور آفس دونوں جگہ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ آفس کے سب ہی کام ثمامہ نے اس خوبی سے سنبھال لیے تھے کہ ولید کی غیر موجودگی میں وہ منیجر سے بھی زیادہ اچھے طریقے سے معاملات کو ہینڈل

کرلیا کرتی۔ اُس کی معاملہ فہمی اور ذہانت کو تو پہلے دن ہی ولید نے جانچ لیا تھا۔ پرکھنے اور ثابت ہونے پر وہ اُس پہ انحصار بھی کرنے لگا۔ بلا جھجک وہ کسی بھی معاملے میں ثمامہ سے مشورہ طلب کر لیتا۔ ثمامہ بھی پوری ایمان داری سے اُسے مفید مشوروں سے نوازتی۔

اور پھر اچانک ایک دن ولید نے اُسے ڈنر کی دعوت دے ڈالی۔ اس کے بدلے ہوئے انداز تو وہ کئی دنوں سے نوٹ کر رہی تھی اور دل ہی دل میں اس بڑی کامیابی پر خود کو داد دے رہی تھی۔۔ ڈنر کی دعوت قبول کرنے کی صورت میں آج ثمامہ کا وہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا جو اُس نے کھلی آنکھوں پہلے دن سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ پھر اپنی طرف سے مکمل ریزرو رہ کر ولید کے بہت سے بوجھ بانٹ لینے کے پیچھے بھی یہی مقصد کارفرما تھا۔ وہ جانتی تھی کہ "عجلت" بندے کے معاملات کو کبھی بھی سُدھار کی طرف نہیں لے جا سکتی۔

ولید کے ساتھ وہ پہلا ڈنر آغاز ثابت ہوا اُس دوستی اور تعلق کا جو بالآخر بہت جلد محبت پر منتج ہوئی۔ ثمامہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ولید اُس سے اتنی بے پناہ محبت کرتا ہوگا۔ اور حال تو ثمامہ کا بھی یہی تھا۔ ولید جیسے حسین امیر زادے کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لینے کی تمنا میں وہ خود اپنے دل پر اختیار کھو بیٹھی تھی۔ ولید نے پورے اعتماد کے ساتھ اُس سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ ثمامہ بھی پُر یقین تھی کہ سوائے اس کے اب ولید کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی محبت کا جادو وہ ولید کے سر پر چڑھا خوب دیکھ رہی تھی۔ نتیجہ سوائے شادی کے دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا

ولید جہانگیر کے والدین لندن میں تھے۔ دو بڑے بھائی وہیں پر کامیابی سے اپنا اپنا بزنس چلا رہے تھے۔ لیکن ولید نے اپنے والد کی خواہش پر ایک برانچ پاکستان میں کھولی تھی۔ اس کے والدین اب ہمیشہ کے لیے پاکستان آنا چاہتے تھے۔ اور ان کی مرضی یہ تھی کہ چھوٹا بیٹا ان ہی کے ساتھ رہے۔ ولید کا ذاتی رجحان بھی کچھ ایسا تھا۔

پھر ایک روز اُس نے ثمامہ کو بتایا کہ والدہ اُسے چند دنوں کے لیے لندن بلا رہی ہیں۔ لہٰذا یہاں کے معاملات وہ منیجر کی مدد سے خود اچھے طریقے سے دیکھتی رہے۔ جاتے وقت وہ یہ وعدہ بھی کر کے گیا کہ اپنے پیرنٹس سے اس کے بارے میں بات کرے گا۔ ثمامہ نے خوشی خوشی ولید کو لندن روانہ کیا کہ دُرِ مراد اب بہت جلد اس کی مٹھی میں آنے کو تھا۔ ولید کی محبت کے نشے میں چُور وہ اس کی آمد کی منتظر تھی جب ٹھیک ایک ہفتے بعد اسٹاف کے لوگ ایک دوسرے کا منہ میٹھا کرواتے اور مبارکیں دیتے نظر آئے۔

ولید کے والدین نے دراصل اُسے شادی کے لیے وہاں بلایا تھا۔ آفس کے لوگوں میں سے کسی نے وہاں یہ اطلاع پہنچائی تھی کہ ولید آفس کی ایک معمولی سیکریٹری کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ شادی کا وعدہ بھی کر چکا ہے۔ والدہ نے اپنی بڑی بہو کے میکے میں پہلے ہی ایک لڑکی پسند کر رکھی تھی۔ اب ولید کو انہوں نے کیسے راضی کیا اور وہ ہفتے بھر میں ہی اتنی آسانی سے کیسے مان بھی گیا، یہ سب ثمامہ کے لیے معمے سے زیادہ دُکھ اور صدمے کا باعث تھا۔ شدید رنج اور تکلیف کی وہ اُن انتہاؤں پر تھی کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بھی صفر ہونے لگیں۔

ولید کو ریموٹ کنٹرول کی طرح استعمال کرنا اس کی بھول ثابت ہوا تھا۔ اس کے سپنوں کا آدھا ادھورا محل کھڑا ہونے سے پہلے ہی دھڑام سے زمین بوس ہو چکا تھا۔ بے وفائی کرنے والے نے تو صفائی دینے اور معذرت کرنے کے لائق بھی نہیں سمجھا تھا۔ وہ چھوٹے گھر کی غریب لڑکی آج بھی وہیں کھڑی تھی جہاں سے سفر آغاز کیا تھا۔ ولید کے لیے وہ تنہائی اور اکیلے پن کی تکلیف دور کرنے کے لیے وقت گزاری کا ذریعہ ہی تھی۔ جس کے ساتھ بھرپور انداز میں یقیناً اُس نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ تین دن مزید گزرے تو ولید کی واپسی کی اطلاعات آنے لگیں...... اور پھر جس روز ولید کی فلائٹ تھی، ثمامہ اپنا استعفیٰ اس کی میز پر چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے وہ آفس چھوڑ آئی۔

ولید کی دھوکا دہی ایک ایسا جذباتی جھٹکا تھا جس

سے جلدی باہر آنا ثمامہ کے لیے انتہائی کٹھن تھا۔ لیکن نوکری کو اچانک ٹھوکر مار دینے سے گھریلو حالات جس طرح شدید بحران کی زد میں آئے اُنہوں نے مجبوراً اگلے ہی روز سے ثمامہ کو نئی نوکری کی تلاش میں نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اپنے غموں پر رونے کے لیے رات ہی کافی تھی۔ دن پھر نئے جھمیلے لیے طلوع ہوتا اور وہ ایک نئے عزم کے ساتھ خود کو شہر کے اژدہام کے حوالے کر دیتی۔ ولید کے آفس میں کام کرنے سے بھلے جذباتی طور پر وہ انتہائی ناکام رہی تھی لیکن کام کے حوالے سے اُس تجربے نے ثمامہ کی بڑی مدد کی اور دو ہی ہفتوں کی محنت کے بعد اُسے علیم الدین کی جوس بنانے والی فیکٹری میں جاب مل گئی۔

ایک بار پھر وہی سیکریٹری کی جاب اور وہی ثمامہ۔ لیکن دل اس بری طرح بجھ چکا تھا کہ ریزرو رہنے کے لیے اب نہ خود پر کسی قسم کا خول چڑھانے کی ضرورت تھی، نہ دن بھر کام میں مصروف رہنے کے لیے کسی ذاتی جدوجہد کا دخل۔ چپ چاپ، گم صم وہ گھنٹوں کام میں لگی رہتی۔ ایک دوسرے میں سختی سے پیوست دو نازک لبوں نے ہنسنا تو جیسے فراموش ہی کر دیا تھا۔

اِدھر بیوی کی طویل علالت سے عاجز ستاون سالہ علیم الدین آفس کے شیشے سے ایک نازک اندام محنتی لڑکی کو دلچسپی سے دیکھتے مختصر عرصے میں ہی اس کی زلف کے اسیر ہو گئے۔ ثمامہ کو یہاں کام کرتے تین ماہ ہی ہوئے تھے کہ ایک دن علیم الدین نے آفس بلا کر اُسے باقاعدہ پرپوز کر دیا اور جواباً حیرت سے ایک ٹک انہیں دیکھتی ثمامہ شرم اور جھجک سے سر بھی جھکانا بھول گئی۔ علیم الدین کے آفس سے وہ ماؤف دماغ لیے کسی روبوٹ کی طرح گھر پہنچی۔ لیکن آہستہ آہستہ جب حواسوں نے کام کرنا شروع کیا تو کچھ زیادہ ہی فعال اور ایکٹیو ہو گئے۔

تین تین فیکٹریوں کے مالک علیم الدین کے پاس ہرگز اُس دولت کی کمی نہ تھی جسے دونوں مٹھیوں میں بھر لینے کے کبھی ثمامہ نے خواب دیکھے تھے۔ پھر مسز علیم بن کر وہ ایک دن ولید کی بیوی سے کندھا ملا کر کھڑی ہو سکتی تھی۔ وہ امیر زادی۔۔ جسے شریک حیات چن کر ولید جہانگیر نے اس کی غریبی کا مذاق اُڑایا تھا۔ دولت کے ڈھیر پہ بیٹھ کر اب وہ اُس بے وفا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا تمسخر اُڑا سکتی تھی۔ ولید کو نیچا دکھانے کے لیے علیم الدین کا پرپوزل قبول کرنا ثمامہ کے لیے دہرے مفاد کا باعث تھا۔ اُس نے اگلے ہی روز علیم الدین کو اپنے جواب سے آگاہ کر دیا۔ بعد میں پیش آنے والے حالات نے اگرچہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ زمینی حقائق، ہمارے تصورات سے قدرے مختلف ہوتے ہیں۔

علیم الدین کو اپنی جوان اولاد کی وجہ سے ہر حال میں یہ شادی پوشیدہ رکھنی تھی۔ ولید کا غرور توڑنے کے لیے اب وہ مسز علیم بن کر میدان میں تو نہیں اُتر سکتی تھی، البتہ علیم کی فیاضی اور مہربانی سے بھر بھر کر فائدے ضرور اُٹھا رہی تھی۔ علیم نے اُسے ایک اچھے علاقے میں نیا گھر لے کر دیا تھا جہاں امی، عادل اور آصفہ باجی سمیت شفٹ ہونے کے بعد سب سے پہلے آصفہ باجی کی ماموں زاد جبران کے ساتھ خوب دھوم دھام سے شادی کی گئی۔ ہر قسم کی سہولت سے مزین اس نئے گھر میں نہ صرف اُن سب کو غربت کے کیبل سے نجات حاصل ہوئی بلکہ یہاں گزرے چند سال انتہائی پُرمسرت اور پُرسکون گزرے۔ ثمر کی پیدائش بھی اسی گھر میں ہوئی۔ اس کی شادی کو اب دو سال گزر چکے تھے۔ جب ایک دن علیم کے بیٹے بلال نے اس خفیہ شادی کا راز پا لیا۔ ثمامہ تو فوری طور پر بہت گھبرا گئی تھی لیکن علیم الدین کے اطمینان نے اس کے حوصلے بڑھائے۔ وہ خوف کے حصار سے نکل آنے پر بہت خوش تھا اور دل سے یہی چاہتا تھا کہ ثمامہ کو بطور اپنی بیوی دنیا کے سامنے متعارف کروائے۔ بنا بلال اور باقی گھر والوں سے ڈرے اور گھبرائے اُس نے ثمامہ کے لیے پوش علاقے میں ایک بنگلا خریدا اور اب وہ خود بھی اُس کے ساتھ رہنے لگا تھا۔ اگلے ایک سال کے دوران ثمامہ نے دولت کے ساتھ ساتھ نام اور عزت

کا مزا بھی خوب چکھا۔ ولید جہانگیر البتہ پھر کبھی اُس کے سامنے نہیں آیا تھا۔ شاید وہ اِس ملک یا شہر میں تھا ہی نہیں۔ سال بھر بعد ہی علیم الدین کے پیٹ کا کینسر سامنے آیا جو کہ چھ ہی ماہ میں ہی اس کی جان لے گیا۔ اور علیم الدین کی موت کے ساتھ ہی زندگی کے ایک اور دور کا بھی اختتام ہو گیا۔

☆☆☆

وہ ایک شانت سی نرم ٹھنڈی صبح تھی۔ اپریل کا وسط چل رہا تھا۔ پچھلے کئی دنوں سے چمکیلی دھوپ مسلسل مری کی راہ دیکھے ہوئے تھی، ایسے میں گھرے بھرے بھرے بادلوں والے اُس دن میں ہر چیز کچھ سوئی سوئی ٹھہری سی لگ رہی تھی۔ آس پاس کے ماحول میں کہیں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا صبح ہونے میں ابھی بھی کچھ وقت باقی ہے۔

آج کنعان کو بھی موسم کا یہ رنگ اچھا لگ رہا تھا۔ کئی دن کی لگاتار دھوپ سے دل اُوب گیا تھا۔ اماں ڈھلانِ چڑھ کر بائیں ہاتھ مُڑ گئیں اور وہ دیا کی سنگت میں دائیں جانب ہوٹل کی طرف۔۔ لیکن آج جونہی وہ دونوں اُوپر آئیں آنکھوں کو نظر آنے والا پہلا شخص سوار تھا جو ہوٹل کی مخالف سمت میں سامنے کے جنگلے پر دونوں ہاتھ ٹکائے نیچے درختوں بھرے جنگل کو دیکھ رہا تھا۔ اور دور دور تک اُس منظر میں سوائے سوار کے کہیں کوئی نہیں تھا۔ ڈیوٹی بھی آج شاید آف تھی کیونکہ یونیفارم کے بجائے وہ بلو جینز اور لائم کلر کی بہت شاندار جدید طرز کی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور یہ وہی ڈریس تھا جس میں سوار پہلے روز مری آیا تھا۔ کنعان نے البتہ پہلی بار اسے اتنے ماڈرن روپ میں دیکھا۔ اور اُس دراز قامت، حسین لڑکے کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اس ہوٹل کا ریسپشنسٹ ہوگا۔ مری میں نئے آئے کسی سیاح کی طرح وہ وادی کے نظاروں میں گم جانے ایسا کیا سوچ رہا تھا کہ سائیڈ رُخ سے لب مسکراہٹ کا تاثر دے رہے تھے۔

دیا اُس سے پہلے ہی بجائے ہوٹل کا رُخ کرنے کے سوار کی طرف بڑھ گئی اور نیم رضامندی سی کیفیت میں کنعان نے بھی ادھر قدم بڑھا دیے کہ دل تو ویسے بھی کہاں ایسے موقعوں پر اس کی سنتا تھا۔ لائم شرٹ والے کو قریب سے دیکھنے کی بے چینی خود بخود وہاں کھینچ لے گئی۔ سوار نے تبھی ذرا دور کسی اور کے ہونے کو محسوس کرتے رُخ پھیرا تھا۔ نظر کنعان اور دیا پر پڑی تو جنگلے سے ہاتھ اُٹھاتے وہ سیدھا ہو کر مسکراتے ہوئے مُڑا۔

"کسی کا ویٹ کر رہے ہیں سوار بھائی۔" دیا نے دوستانہ مسکراہٹ پھینکتے گفتگو میں پہل کی۔

"جی۔۔ بالکل۔۔" سینے پر ہاتھ باندھتے نرم مسکراہٹ چہرے پر لیے وہ اب پورا ان کی طرف متوجہ تھا۔

"اچھا۔۔ اتنی صبح صبح کس کی آمد ہے؟" دیا کے لہجے میں تعجب اُبھرا۔

"وہ...... جسے وقت سے کچھ سروکار نہیں۔" اُس نے اُوپر آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ "بارش کی راہ دیکھ رہا ہوں۔"

"اوہ۔۔" دیا کھلکھلائی تو کنعان بھی مسکرانے لگی۔ تو آج اِس لیے اسے بھی صبح اتنی حسین لگ رہی تھی۔

"آپ کو بارش پسند ہے؟"

"جی۔ بہت زیادہ۔"

"مجھے بھی بہت پسند ہے۔۔ لیکن یہ اپنی کنعان یہ تو دھوپ کی دیوانی ہے۔" دیا کو کالج یکسر بھول گیا۔

"وہ بھی ٹھیک ہیں اپنی جگہ۔۔" سوار نے بس لحظے کو کنعان کی طرف دیکھا۔ "انہوں نے ہمارے میدانی علاقوں کی دھوپ جو نہیں دیکھی، اب مری کی تو دھوپ بھی حسین ہے۔"

"بارش تو خیر مجھے بھی بہت پسند ہے اور دھوپ بھی بس سرما کی اچھی لگتی ہے۔" کنعان کو مخالف گروپ بننا گوارا نہ ہوا بے ساختہ ہی حصہ لے بیٹھی۔

"اچھا اب چلو بھی۔۔ دیر ہو جائے گی۔" دیا کی باتیں تو کبھی ختم نہ ہوتیں۔ وہ خود ہی آگے بھی بڑھ

گئی۔ لامحالہ دیا کو بھی بھاگ کر ہم قدم ہونا پڑا۔

سوار نے یونہی نظر پھیر کر اُن دونوں کو جاتے دیکھا اور پھر جانے کیا ہوا کہ بنا سوچے بے ساختہ اسے آواز دے ڈالی

"کنعان بی بی۔۔"

"ہوں۔۔" وہ از حد حیرانی سے چونک کر پلٹی۔ چمکتی براؤن آنکھوں میں ڈھیر ساری حیرت اُمڈ آئی تھی۔ سوار ہمیشہ کی طرح متعجب ہو کر رہ گیا۔ معلوم نہیں وہ اتنی حواس باختہ کیوں ہو جاتی تھی۔ شاید صورت سے پہچان گئی ہے کہ سوار کتنی بڑی مصیبت کا نام ہے۔ اس بار بنا کچھ کہے سوار نے اپنا ہاتھ آگے پھیلا دیا۔ وہ پریشان سی اس کے بڑھے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی

"چابی۔"

"جی؟" کچھ نہ سمجھتے وہ اس کی آنکھوں میں دیکھے گئی۔ سوار نے اس کی غائب دماغی محسوس کرتے کمر سے لٹکتے کالج بیگ کی طرف ابرو سے اشارہ کیا۔ بلو گٹار کے کی چین والا چابیوں کا گچھا بیگ کی بیرونی جیب سے آدھا باہر کو لٹک رہا تھا۔ بجائے کاؤنٹر پر چابی چھوڑنے کے وہ ساتھ لیے کالج کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کنعان نے ابرو کا اشارہ سمجھتے بیگ کی طرف دیکھا۔

"آپ کچھ بھول رہی ہیں۔"

"اوہ۔۔" سخت خفت زدہ سی ہو کر وہ مسکرائی اور چابیاں بیگ میں سے کھینچ کر سوار کی طرف بڑھیں۔ جس نے ہتھیلی ہنوز اسی انداز میں آگے کی ہوئی تھی۔ کنعان نے چابیوں کا گچھا سوار کے ہاتھ پر رکھنا چاہا تبھی بارش کی چند بوندیں بیک وقت دونوں کے ہاتھوں پر گریں۔ ایک ساتھ دونوں نے بے ساختہ اوپر دیکھا۔

"تو آپ کا انتظار رائگاں نہیں گیا۔" وہ اچھے موڈ میں ہنس کر کہہ گئی۔ سوار نے سر اثبات میں ہلایا۔

"لیکن آپ نے تو آج چھتری بھی نہیں لی۔ بارش تیز نہ ہو جائے۔" سوار کے لہجے میں ہلکی سی تشویش تھی۔

"کوئی بات نہیں، ہم کہیں سائیڈ پہ رُک جائیں گے۔" وہ تسلی کے انداز میں کہتی واپس مُڑ گئی۔

"واہ بھئی۔ بڑیاں گلاں شلاں۔" دیا نے کچھ دور جانے پر ٹہوکا دیا۔

کنعان بجائے برا منانے کے مسکرا دی۔

"تمہاری لمبی چوڑی بکواس کے آگے کیا چیز ہیں ایک دو جملے؟"

"ہمارے ہاں اسے سوسنار کی ایک لوہار کی کہا جاتا ہے۔" وہ کیا کم تھی کسی سے۔

"چل پاگل۔۔" وہ تو بس اتنا کہہ رہا تھا کہ آپ کے پاس چھتری نہیں ہے۔ کنعان ابھی بھی مسکرا رہی تھی۔ موسم اور ماحول کا جادو ابھی اُترا نہیں تھا۔

"اوہو۔۔ تو "وہاں" بھی فکریں شروع ہو رہی ہیں۔"

"تم تو رائی سے پربت کھڑا کر سکتی ہو۔ اللہ بچائے ایسے فتنہ پرور دوستوں سے۔" کنعان نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"ناں ویسے...... تم کیا سمجھیں جب سوار نے ہاتھ آگے بڑھایا۔" دیا کچھ یاد آنے پر کھلکھلائی کنعان کا دل چاہا بیگ بجائے اس کے سر پر۔

"کچھ نہیں کمینی۔" وہ بدستور ہنس رہی تھی۔

"مجھے تو قسم سے یوں لگا جیسے ہیرو چلتی ٹرین سے ہاتھ باہر نکالے ہیروئن کو اوپر بلانا چاہتا ہو۔" دیا کے نقشے پر کنعان کا بے ساختہ قہقہہ بلند ہوا تبھی تیز بارش شروع ہو گئی۔

"بھاگ سمرن بھاگ۔" دیا شوخی سے چلاتے بیگ سر پر رکھ کر دوڑنے لگی۔ دونوں کے قہقہوں سے وادی میں نقرئی گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔

☆☆☆

گھر کے کام کاج نمٹا کر شازمہ نے گلے میں پڑا دوپٹا کھول کر سر اور جسم کے گرد لپیٹا۔ تالا چابی ہاتھ میں لے کر باہر آئی۔ ارادہ تو سامنے والی شاہین باجی کے ہاں جانے کا تھا۔ انہوں نے کسی کے ذمے لگایا تھا کام والی کے لیے۔ لیکن ان کے گھر پر تالا پڑا

دیکھ کر شازمہ اپنی گلی سے گول گھوم کر نیچے کی گلی میں اترتی پچھلے محلے میں آ گئی۔ بہت دنوں سے مولوی صاحب کے ہاں جانا نہیں ہوا تھا۔ آمنہ بھابھی پچھلے دنوں ہی اس کی دوست بنی تھیں۔ اِس سے پہلے شازمہ کی جان پہچان صرف اپنی گلی کی خواتین کے ساتھ تھی۔ آمنہ بھابھی سے تعارف بالکل ہی اتفاقاً ہوا تھا اور وہ پہلی ملاقات میں ہی اُن کی پرکشش شخصیت سے مرعوب ہو گئی تھی۔ اپنی چھت پر کھڑے اُس شام وہ معمول کے مطابق آس پڑوس کے مناظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دوسری گلی کے تمام گھر ذرا سی ڈھلان اُتر کر آتے تھے اس لیے پچھلے محلے کی تمام چھتیں کافی نیچے تھیں، البتہ اس گلی کے گھروں سے سب کی پشت ملتی تھی۔

آمنہ بھابھی خشک کپڑے تار سے اُتار کر اپنے بازو پہ ڈھیر جمع کرتی جا رہی تھیں۔ شازمہ نے انہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ اسی نے ہی سلام دعا میں پہل کی۔ دونوں تقریباً ہم عمر بھی تھیں اس لیے جلد دوستی ہو گئی۔ آمنہ نے اُس کے اکیلے پن کا سن کر اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اور شازمہ اگلے ہی روز ان سے ملنے چلی گئی۔ وہ مولوی فیض الحسن کی بہو اور عمار علی کی بیوی تھیں۔ ان کے دو بچے تھے۔ سسر صاحب حکیم بھی تھے اور ان کا اپنا دواخانہ تھا۔ شہر میں ان کے مطب کا بڑا نام تھا۔ ہر قسم کے شربت، عرقیات اور دیسی دوائیں ان کے ہاں تیار ہوتیں۔

محلے میں مولوی صاحب کے گھرانے کی بڑی عزت اور قدر تھی۔ وہ نہ صرف مسجد کے پیش امام تھے بلکہ شادی بیاہ کے موقع پر نکاح بھی پڑھواتے۔ آمنہ بھابی کے شوہر البتہ کسی پرائیویٹ کمپنی میں اچھی جاب کرتے تھے۔ ایک دیور تھا عبدالعلی جسے محلے میں سب آدی کے نام سے بلاتے تھے۔ وہ شاید یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔

شازمہ کو آمنہ بھابھی اور ان کے گھر کا ماحول بہت پسند آیا تھا۔ بھابھی دن کے وقت اکثر اکیلی ہی پائی جاتیں اس لیے شازمہ کو اس وقت ملنے جانے میں خاص دقت پیش نہ آتی۔ وہ گھر کے کام بھی ساتھ ساتھ کرتی رہتیں اور شازمہ کی باتیں بھی سنتی رہتیں۔ وہ محلے میں بنا کسی خاص موقع کے کبھی آتی جاتی نہیں تھیں۔ اس لیے شازمہ کے آ جانے پر ان کا بھی دل بہل جاتا۔

شاہین بھابھی کے دروازے پر تالا پڑا دیکھ کر شازمہ کے قدم مولوی صاحب کے گھر کی طرف بڑھ گئے۔ بھابھی اس وقت دوپہر کے لیے سبزی کاٹ رہی تھیں۔ کام کاج کے لیے انہوں نے آیا رکھی ہوئی تھی جو باقی سارے کام نمٹا کر اب لاؤنج کا پوچا لگا رہی تھی۔

''آؤ شازمہ۔ بھئی آج تو تمہاری طرف کسی کو بھیجنے والی تھی۔'' انہوں نے ڈائننگ ٹیبل کی کرسی شازمہ کے نزدیک کی

''ہاں بس۔ مجھے ہی بلواتی رہیں۔ خود نہیں آئیں گی۔'' شازمہ نے منہ بنایا۔

''کسی دن ناشتے سے رات کے کھانے تک پورا دن میرے گھر رہو۔ میری مصروفیت دیکھ کر کانوں کو ہاتھ لگاتی بھاگو گی۔''

''مجھے بلا لیا کریں بھابھی۔ سارا دن بور ہوتی رہتی ہوں۔ آپ کی کچھ مدد ہی کر دیا کروں گی۔'' شازمہ نے پورے دل سے آفر دی۔ آمنہ اسے محبت سے دیکھ کر رہ گئیں۔

''فی الحال آج تو تم اپنا نمبر یہاں چھوڑ جاؤ۔ ابھی میں شکیلہ سے یہی پوچھ رہی تھی کہ شازمہ کا گھر دیکھا ہوا ہے تو اسے بلا لاؤ۔ لیکن وہ تمہارے گھر سے واقف نہیں ہے۔'' آمنہ نے دور کام کرتی شکیلہ کی طرف اشارہ کیا۔

''میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔'' شازمہ نے مسکراتے ہوئے پاؤچ سے اپنا موبائل نکالا۔ ''میں بھی آج آپ کا نمبر سیو کرتی ہوں۔''

''اور تمہارے کام کا کیا بنا؟ کسی عورت کا بندوبست نہیں ہوا ابھی؟''

''نہیں بھابھی۔'' شازمہ کا ایک دم چہرا اُتر گیا۔ ''گھر سے آج نکلی ہی اسی لیے تھی کہ شاہین بھابھی سے بات کروں۔ انہوں نے کسی عورت کا کہا تھا۔ لیکن وہ گھر پر نہیں تھیں۔''

''میں نے بھی۔ یہ اپنے آدی کا دوست ہے ناں کاشی۔۔ اس کی امی سے بات کی تھی۔ وہ ذرا سوشل قسم کی ہیں۔ یہاں کئی لوگوں سے جان پہچان ہے۔ لیکن برا نہ ماننا شازمہ۔'' آمنہ بھابھی کچھ خفا سی لگیں۔ شازمہ حیرت سے دیکھنے لگی۔

''تمہارا میاں بھی کچھ کم لاپروا نہیں ہے۔ اُسے تو تمہارے یہاں آنے سے پہلے اِن تمام چھوٹے موٹے مسائل کو حل کرنا چاہیے تھا۔ پہلے سکینہ کا بندوبست بھی تم نے خود بھاگ دوڑ کے کیا اور اب مہینے بھر سے پھر اکیلی ہو، لیکن اسے کوئی فکر ہی نہیں۔''

''وہ تو اُلٹا مذاق اُڑاتے ہیں کہ میں اتنی ڈرپوک کیوں ہوں۔'' شازمہ ہنس کر ٹال گئی۔

''حد ہے غیر ذمہ داری کی۔'' وہ ہاتھ نیپکن سے صاف کرتی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''تم بھی آ جاؤ کچن میں، چائے بنا لیتی ہوں۔''

''میرے لیے نہ بنائیں بھابھی۔ ابھی بہت دیر سے ناشتا کیا تھا۔''

''ارے بس بھی کرو۔ موسم بدل رہا ہے اب تو ناشتے کے دو گھنٹے بعد ہی دوبارہ چائے کو دل کرنے لگتا ہے۔'' وہ ان سنی کر کے آگے بڑھ گئیں۔ شازمہ بھی ہنستے ہوئے پیچھے ہو لی۔

''اچھا تو کیا کہا پھر...... وہ......'' شازمہ یاد کرنے کے لیے رُکی۔ ''کاشی کی امی نے؟''

''ہاں۔ کہہ رہی تھیں بہت لوگ مل جائیں گے۔ بس تھوڑا ٹائم لگے گا۔''

''چلیں۔'' شازمہ نے ایک تھکی تھکی آہ بھری۔ ''جہاں اتنے دن دیکھ لیا کچھ وقت اور سہی۔'' بظاہر لہجے کو نارمل رکھتے اس نے کہہ تو دیا لیکن ایک وہی جانتی تھی کہ بھاری پتھر جیسی رات کو صبح تک سرکانا اس کے لیے کس قدر عذاب ناک ہوتا ہے۔

''اللہ تمہاری پریشانیاں حل فرمائے۔'' آمنہ بھابھی اتنی حساس تھیں کہ لہجے سے ہی اس کے کرب کا اندازہ لگا لیا۔

''کہاں ہو آمنہ؟'' بھاری مردانہ آواز پر شازمہ نے بے ساختہ گردن موڑی۔ باہر سے آواز لگاتے وہ آدمی اب کچن کے دروازے میں آ گیا تھا۔ اجنبی حسین چہرے پر نگاہ پڑتے جس نے ٹھٹک کر وہیں خود کو روک لیا تھا۔

آمنہ بھابھی دو قدم آگے آ کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگیں جو شاید شازمہ کو دیکھ کر اپنی بات بھول گئے تھے۔

''یہ شازمہ ہے۔ ابھی کچھ ماہ پہلے یہیں پچھلی گلی میں آئی ہے۔'' آمنہ نے گڑبڑا کر تعارف کروایا۔

''السلام علیکم۔'' شازمہ نے مسکرا کر باقاعدہ ہاتھ ماتھے پر لے جاتے کورنش بجائی جس پر عمار کچھ اور حیران ہوا۔

''وعلیکم السلام۔'' وہ خود کو سنبھال کر اب آمنہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''آج جمعہ ہے۔ آدی سے کہنا اباجی کی طرف ذرا جلدی چکر لگا آئے۔''

''جی میں اس کو جگا دیتی ہوں۔'' وہ باہر نکلنے کا اشارہ کرتے میاں کو برآمدے میں لے آئیں۔ معلوم نہیں اُن کے تاثرات کچھ عجیب یا شاید کچھ غلط ہونے کا تاثر کیوں دے رہے تھے، بیوی ہونے کے ناطے آمنہ نے خطرے کی بُو سی اٹھتی محسوس کی اور اِسی خیال سے شازمہ کو کچن میں چھوڑ کر وہ عمار کو لیے باہر نکل آئی تھیں۔

☆☆☆

''مما مجھے بھی بالکل ویسی گاڑی لینی تھی۔'' ثمر نے منہ بسور کر کار چلاتی ثمامہ کو مخاطب کیا۔ جس نے ڈرائیونگ سے توجہ ہٹا کر مسکراتے ہوئے ذرا دیر کو اُسے دیکھا۔

''واپسی پر لے لیں گے بیٹا۔ ابھی آپ فرینڈ کی برتھ ڈے پارٹی انجوائے کرو۔ گڈ بوائے۔'' اس نے ثمر کا نرم گال ہلکے سے چٹکی میں لیا۔

''لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں۔ میں تو نہیں جانتا کسی فرینڈ کو۔'' اس کا ننھا دماغ ابھی تک

ریموٹ کار میں الجھا تھا۔

''جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں آپ کے جیسے بہت سارے بچے ہیں، جھولے ہیں۔ آپ کو بہت مزا آئے گا۔ پھر جب ثمر کی برتھ ڈے آئے گی تو ہم بھی ایسے ہی منائیں گے۔'' وہ اُسے باتوں سے بہلاتے اور ساتھ ساتھ سمجھاتے مال روڈ پر کافی آگے تک آ گئی تھی۔

کلب کی ایک دوست نے اسے اپنے بیٹے کی برتھ ڈے پارٹی پر انوائٹ کیا تھا، اور اس تاکید کے ساتھ کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لائے گی۔ ثمامہ بھی جانتی تھی کہ ثمر ایسی پارٹیز کو بہت پسند کرتا ہے۔ سویرا کے تین سالہ بیٹے کے لیے گفٹ پیک کرواتے وہ اب کشمیر پوائنٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سویرا کا بنگلا اس نے کلب آتے جاتے بہت بار باہر سے دیکھا تھا۔ جی پی او سے تھوڑا پہلے عین اُس جگہ جہاں پہلے روز مری داخل ہوتے اُنہیں کچھ دیر رُکنا پڑا تھا اور وہ ثمر کا جوس لینے باہر نکلی تھی۔ اُسے ایک مرتبہ پھر وہ نفیس داڑھی والا خوب صورت لڑکا دکھائی دیا۔ وہ اس کے سامنے جی پی او سے بائیں جانے والے راستے پر مُڑا تھا۔ نجانے اسے دیکھ کر اچانک ثمامہ کو کیا ہوا۔ اُس نے اپنی کار بجائے سامنے لے جانے کے اُس طرف موڑ دی۔ گلی نما اس راستے سے گزر کر وہ جس کھلی جگہ پر آئے تھے اس کے دائیں ہاتھ پہ ایک ہوٹل تھا اور بائیں جانب کہیں مکان تو کہیں کہیں دیوار جیسی ساتھ ساتھ چلتی چٹان، تھوڑا آگے آنے پر دائیں ہاتھ پہ نیچے گہری وادی اور گھنا جنگل سا دکھائی دے رہا تھا۔ اور کنارے کنارے دور تک جنگلا بنا ہوا تھا۔

وہ اپنی بے چین نگاہیں دور تک ڈالتی اس نوجوان کو ڈھونڈنے لگی جو کچھ ہی دیر پہلے اسی راستے پر مڑا تھا۔ یہ وہی لڑکا تھا جسے اس نے جوس والا سمجھ کر اس کے کندھے پر پاؤچ مارا تھا۔ لیکن اب وہ کہیں نہیں تھا اور اس تاریک سنسان راستے پر مزید آگے بڑھنے کے خیال نے ثمامہ کو ایک دم ہی خوف زدہ سا کر دیا۔ وہ یہ راستہ پہلی بار دیکھ رہی تھی جو معلوم نہیں کہاں کو جاتا تھا اور معلوم تو اُسے یہ بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں تک کیوں آ گئی تھی۔ شام کے گہرے پڑتے سایوں کو دیکھ کر ثمامہ کا دل ڈوبنے سا لگا۔ جانے وہ اُس لڑکے کو کیوں دیکھنا چاہتی تھی۔ اُس کی تلاش میں بِنا سوچے اُس نے ایک انجان راستے پر گاڑی ڈال دی تھی۔

''مما آپ راستہ بھول گئی ہیں؟'' ثمر نے ماں کے گھبرائے چہرے پر نظر ڈالتے سوال کیا تو بدقت مسکراتے اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ زیادہ پریشانی کی بات ویسے بھی نہیں تھی۔ اُسے یہاں سے واپس مال روڈ پر ہی تو چڑھنا تھا، لیکن ریورس کرنے کے لیے کھلی جگہ ضرور چاہیے تھی۔ کچھ آگے چند ہوٹل تو نظر آ رہے تھے۔ لازمی وہاں پارکنگ یا کھلی جگہ کا امکان تھا لیکن بجائے مزید آگے جانے کے ثمامہ نے گاڑی کو ریورس میں چلاتے پیچھے جانے کو ترجیح دی۔ جسے دیکھنے کی چاہ میں یہاں تک آئی تھی وہ تو معلوم نہیں کہاں گم ہو گیا تھا۔ بہرحال یہ سوچ کر نجانے کیوں نامعلوم سی خوشی محسوس ہوئی کہ وہ ابھی تک مری میں تھا۔ اور اگر اتنے دنوں بعد بھی یہیں تھا تو زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ کوئی سیاح یا مسافر نہیں ہو سکتا۔ لاشعور میں ایک خواہش، ایک اُمید سی جاگی کہ کبھی نہ کبھی ضرور دوبارہ سامنا ہو گا۔ اور فوری طور پر ثمامہ خود بھی اپنے آپ کو یہ سمجھا نہیں پائی کہ آخر اِس خواہش اِس بے چینی کو کیا نام دے۔ کیا ایک بار پھر وہ کسی نئے جذبے، نئے احساس کو اپنے دل میں جگہ دینے جا رہی تھی۔

کوئی فریاد تیرے دل میں دبی ہو جیسے
تو نے آنکھوں سے کوئی بات کہی ہو جیسے
جاگتے جاگتے اک عمر کٹی ہو جیسے
جان باقی ہے مگر سانس رکی ہو جیسے

گاڑی میں ہلکی آواز میں بجتی اُداس غزل نے اُس کی توجہ اپنی جانب کھینچی اور وہ ایک سرد آہ بھر کے گاڑی کو بیک میں لے جانے لگی۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عائشہ تنویر

اک نار البیلی سی

اوائل جنوری کے یہ دن کراچی میں ہر سال کی طرح خوش گوار تھے۔ گو موسم سرد نہیں تھا مگر روشن دھوپ کی حدت اچھی لگ رہی تھی۔ صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے زیادہ تر طلبہ لیکچر روم میں تھے۔ یونیورسٹی کے روڈ، باغ اور پارکنگ میں زیادہ چہل پہل نہ تھی۔ لیکن کینٹین اور اس کے اطراف میں دھوپ سینکتے طلبہ کافی تعداد میں موجود تھے۔ اپنی بہن ماورا کے ساتھ وہ کئی بار یونیورسٹی آ چکی تھی، ڈیپارٹمنٹ کا راستہ کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اسی لیے ہاتھ میں فولڈر پکڑے اپنی سوچوں میں مگن تیزی سے چل رہی تھی۔ خوبصورت گلابی رنگ کے ڈھیلے سے کرتے اور چوڑی دار پاجامے کے ساتھ بڑے سادہ دوپٹہ طریقے سے اوڑھے فروا سادگی میں بھی دلکش لگ رہی تھی۔ یہ اور بات کہ انداز سے جھلکتے اعتماد کے باوجود دل میں ہیجان برپا تھا۔ یونیورسٹی کا پہلا دن سب ہی طلبہ کے لیے یادگار ہوتا ہے۔ گو نئی کلاسز شروع ہوئے تین، چار دن گزر چکے تھے لیکن وہ مصروفیت کی وجہ سے یونیورسٹی نہیں آئی۔ آج پہلے دن بھی اس کا پوائنٹ مس ہو گیا تھا لیکن اب وہ مزید چھٹی نہیں کرنا چاہتی تھی سو پبلک بس میں ہی چلی آئی۔

گرلز کیفے ٹیریا کی سائیڈ سے ڈم ڈم کی باڑ کے درمیان بنے راستے سے نکلتی وہ سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ کے سامنے آئی تھی۔ جب اچانک ایک بلند شوخ آواز میں گانے کی آواز نے اس کی توجہ کھینچی۔

''آڑا پاجامہ، ریشم کا کمر بند
سیاں کہاں گئے تھے''

بے اختیار اس کی نظر اٹھی تھی۔ چھ، سات لڑکے، لڑکیوں کا وہ گروپ آرام سے سرکولیشن ڈیپارٹمنٹ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ بھوری آنکھوں میں شریر چمک لیے وہ لڑکا اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اتنے لوگوں کو ہنستے ہوئے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس کا سارا اعتماد بھک سے اڑا۔

"یہ ادا، یہ ناز، یہ انداز آپ کا۔" چینل بدل چکا تھا۔ پیچھے سے گاتے، ہنستے مسکراتے جملے اچھالتے گروپ میں سے کسی لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"بس کردو اب پولیس!"

عجلت میں آگے نکلنے کی کوشش میں اس کا پاؤں بری طرح مڑا، درد کی شدت سے بے اختیار "اوہ" منہ سے نکلا لیکن اس نے رفتار کم نہ کی۔ جلدی سے ان کے سامنے سے گزرتی وہ تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ کی طرف آئی تھی۔

"اف...... جاہل لوگ۔ لوفر لڑکے تو سنا تھا کہ چھیڑتے ہیں، یہاں تو لڑکیوں کو بھی شرم نہیں۔"

اپنا غصہ نکالنے کو وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی وہ ڈیپارٹمنٹ کے باہر ہی نیم کے درخت کے نیچے بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر پاؤں سہلاتے اس نے ان نے دل ہی دل میں ان تمام گانے والوں اور ہنسنے والے لڑکے، لڑکیوں کو خوب سنائیں۔ دل ٹھنڈا ہوا تو اندر ڈیپارٹمنٹ میں جا کر نوٹس بورڈ دیکھا، ٹائم ٹیبل اتارا۔ رول نمبر کے حساب سے اپنا سیکشن چیک کیا۔ آفس سے اپنے کلاس کی لوکیشن معلوم کر کے اس کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ کلاس تو نکل ہی گئی تھی لیکن کلاس فیلوز سے تعارف اور شناسائی تو آج کرنی ضروری تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد سبز گاؤن میں ملبوس ٹیچر کلاس سے باہر نکلتے اس پر اچٹتی نظر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ پیچھے کلاس روم میں شور بڑھ گیا تھا۔ لڑکے، لڑکیوں کا ایک ریلا سا باہر نکلا تھا۔ تیزی سے جاتے اس ڈھیر سے قطع نظر بہت سے طلبہ آرام سے کلاس میں چیزیں سمیٹ رہے تھے، باتیں کر رہے تھے یا ویسے ہی اس کی طرح سب کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ وہ کلاس میں داخل ہو کر رجسٹر پر جھکی دو لڑکیوں کی طرف آئی۔ غالب گمان تھا کہ یہ پڑھائی میں از حد دلچسپی رکھنے والی تھیں، جواب تک لیکچر کھولے بیٹھی تھیں۔ ایسی دوستیں ہی اس کے پچھلے لیکچر مکمل کروا سکتی تھیں۔

"مجھے دیر ہو رہی ایرج! کیمسٹری کی کلاس شروع ہونے والی ہے، میں تمہیں تصویریں لے کر واٹس ایپ کر دوں گی۔"

اس کے پاس آتے آتے ایک لڑکی بیگ کندھے سے لٹکا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے تیزی میں نکلتے طلبہ کی عجلت کا سبب سمجھ آیا اور بے ساختہ بولی۔

"کیمسٹری تو میرے پاس بھی ہے۔"

"تو چلو نا، پہلے لیکچر میں ہی دیر سے جاؤ گی۔ یاد نہیں لاسٹ ٹائم اورینٹیشن میں کیا ہوا تھا۔"

جلدی جلدی بولتے وہ لڑکی باہر کو لپکی۔

فروا کی جانے بلا کہ پہلے کیا ہوا تھا لیکن وہ بھی جلدی سے اس کے پیچھے گئی۔

"میرا نام فروا ہے، آج فرسٹ ڈے آئی ہوں۔ تم پلیز میرے پچھلے لیکچر پورے کروا دینا۔"

ساتھ چلتے اس نے اپنا تعارف کرواتے، لگے ہاتھوں مدد بھی مانگ لی۔

"میں سماویہ ہوں، پریشان مت ہو، سوائے میجر سبجیکٹ کے پچھلا کوئی خاص کام نہیں ہے۔ ابھی تک تو تعارفی کلاسز ہی ہو رہی تھیں اور تیز چلو۔ کیمسٹری کی میڈم نے اورینٹیشن والے دن ہی کہہ دیا تھا کہ میں کلاس کا دروازہ بند کر دیتی ہوں۔ کلاس رہ نہ جائے۔"

وہ کہتے کہتے بھاگنے لگی تھی۔ فروا نے کچھ سمجھے بغیر اس کا ساتھ دیا۔ وہ دونوں کلاس میں وقت پر پہنچ گئی تھیں۔ دو تین ڈیپارٹمنٹ کے طلبہ کی وجہ سے کلاس بھری ہوئی تھی۔ انہیں آخر میں جگہ ملی۔ میڈم کافی سخت مزاج محسوس ہو رہی تھیں، ان کا خوف تھا کہ کلاس میں غیر ضروری گفتگو نہیں ہو رہی تھی۔

میڈم تعارفی اسباق بتاتے انہیں یاد دلا رہی تھیں کہ وہ کیا کچھ پڑھ کر آ چکے ہیں، اب اگلے لیکچرز میں طلبہ کو پچھلا سب یاد ہونا چاہیے تا کہ سمجھنے میں مشکل نہ ہو۔ فروا توجہ سے انہیں سن رہی تھی لیکن دھیان کے گھوڑے ادھر ادھر بھی بھاگتے جا رہے تھے۔ کن انکھیوں سے سماویہ کے روانی سے چلتے قلم کو دیکھتے وہ سوچوں میں مگن تھی۔

"اگر سارے ٹیچر ایسے ہوئے تو گئے کام سے، ہمارا دوست بھی پڑھاکو لگتی ہے۔ بس نام بدنام ہے یونیورسٹی کا،

اس سے زیادہ تو کالج میں مزے کرتے تھے۔"

دفعتاً ایک کاغذ اس کے سامنے آیا، وہ ذرا سا چونکی۔ سماویہ بدستور سامنے دیکھتی سر ہلا رہی تھی۔

"اتنا کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، فوٹو اسٹیٹ شاپ سے کورس آؤٹ لائن اور ہینڈ آؤٹ مل جائیں گے۔"

"اوہ!" وہ کچھ ریلیکس ہو کر بیٹھی۔ کاغذ پر قلم گھسیٹا۔

"کتنی دیر کی کلاس ہے؟"

یوں ہی سامنے دیکھتے، باتیں کرتے انہوں نے لیکچر سن لیا تھا۔

پھر کلاس ختم ہونے تک وہ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھیں۔ سماویہ پڑھائی کے معاملے میں سنجیدہ ضرور تھی لیکن خشک مزاج نہ تھی۔ تمام مضامین کی کورس آؤٹ لائن سے لے کر کتابیں تک نہ صرف وہ خرید چکی تھی بلکہ تعارفی اسباق دیکھ چکی تھی۔ کلاس سے نکل کر کینٹین جاتے جاتے فروا پر اس کی ذہانت کے ساتھ ساتھ، بذلہ سنجی اور خوش خوراکی بھی کھل گئی تھی۔ یہ جان کر کے ان کے اختیاری مضامین بھی یکساں ہیں، سماویہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔

"ایرج سے دوستی ہوئی ہے میری اب تک، بہت اچھی لڑکی ہے لیکن اس نے اکنامکس اور اسٹیٹس لیے ہیں۔ شکر ہے مجھے بھی ساتھ ملا۔"

ایرج شاید وہی لڑکی تھی جو کلاس میں اس کے ساتھ تھی۔ فروا اس کی بھاگتی دوڑتی گفتگو کے سرے پکڑ رہی تھی۔

"میتھس کے علاوہ ابھی کسی سبجیکٹ کی باقاعدہ کلاسز نہیں ہوئیں۔ بس سر کاظم نے چار دن میں پورا ٹاپک کروا کر ایکسر سائز کرنے کو بھی دے دی ہے۔ تم ابھی دیکھ لینا سارا کام، فوٹو اسٹیٹ کروا لینا، گھر لے جانے نہیں دیتی میں۔" وہ صاف گوئی سے بتا رہی تھی۔

"ہاں، وہ تو مسئلہ نہیں لیکن تم مجھے سمجھا بھی تو دو۔ میں نے تو اب تک ایک بھی کلاس نہیں لی۔ اسائنمنٹ کیسے بناؤں گی۔"

فروا نے جلدی سے کہا۔ اسائنمنٹ کا سن کر ہی اس کی جان ہوا ہو گئی تھی۔

"بے وقوف، پہلے کچھ کھا تو لو پھر ڈپارٹمنٹ جا کر پڑھیں گے، تا کہ کسی سے مدد تو لے سکیں۔ تم ابھی سے پریشان مت ہو۔"

سماویہ نے بے تکلفی سے کہا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ دونوں ڈپارٹمنٹ کے لان میں کتابیں لیے بیٹھیں تھیں۔ تمام لیکچر سمجھ کر اب وہ کتاب سے مشق کر رہی تھیں۔ جس سوال پر مسئلہ ہوتا، سماویہ آرام سے کسی نہ کسی گزرتے بندے سے پوچھ لیتی۔ وہ لوگ فرسٹ ائیر کے تھے، اپنے کلاس فیلوز کے سوا پورا ڈپارٹمنٹ ہی ان سے سینئر تھا۔

"اب یہ ایلین گروپ بنے گا؟" فروا پھر ایک سوال لیے پریشان بیٹھی تھی۔ سماویہ نے خود سمجھنے کی کوشش کی، پھر ناکام ہو کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

"اس بلیو عبایا والی لڑکی سے پوچھ لو۔" فروا نے کونے میں کتابوں کے ڈھیر ہاتھ میں لیے کھڑی لڑکی کو متاثر ہو کر دیکھا۔

"نہیں یار! تجربے کی بات ہے، لڑکیاں مدد نہیں کرتیں۔ کوئی کام کا بندہ ڈھونڈو۔"

سماویہ نے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے موزوں شکار ڈھونڈا۔

"ایسے تو نہ بولو، ہم بھی تو لڑکیاں ہی ہیں۔"

فروا نے اس کے انداز پر مسکراتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے واقعی دو لڑکیاں ان کے پوچھنے پر جلدی میں ہونے اور یاد نہ آنے کا کہہ کر معذرت کر کے جا چکی تھیں۔

"تو کیا ہوا، ہم بھی ایسی ہی ہوں گی۔ کل ایک فائنل کی لڑکی کو غلطی سے باجی کہہ دیا۔ مدد تو کیا کرنی تھی، الٹا خفا ہو گئی کہ اب یونیورسٹی میں آ گئی ہو تو ننھی کاکی بننے کی کوشش نہ کرو، سب دوست ہیں، سال، دو سال سے کیا ہوتا ہے۔ میں تو پرائمری اللہ تعالیٰ کے پاس سے پڑھ کر آئی تھی۔ تم سے دو، چار سال چھوٹی ہی ہوں گی۔"

سماویہ کا اندازِ بیاں اتنا دلچسپ تھا کہ فروا کی بے اختیار ہنسی چھوٹی۔

"تمہیں باجی کہنے کا مشورہ کس نے دیا تھا،

بے بی کہہ کر مدد مانگتی نا۔ اب کسی لڑکے سے مدد لے لو، کہاں ہیں سارے بھائی۔"

ہنستے ہوئے فروا نے بھی کوئی خدمت خلق کا شائق ڈھونڈا۔

"سارے لڑکے بھی پڑھنے والے نہیں ہوتے، خواہ مخواہ کوئی چھچھورا پیچھے نہ پڑ جائے۔ فائنل کے نعمان بھائی اور یونس بھائی بہت اچھا سمجھاتے ہیں۔ پتا نہیں یونس بھائی کہاں ہیں آج؟ چلو نعمان بھائی سے پوچھتی ہوں لیکن پکاتے بہت ہیں وہ۔"

خود سے بولتے بولتے ساویہ کو بالآخر ڈپارٹمنٹ میں داخلی دروازے سے۔ اندر آتے لوگوں میں اپنا مطلوبہ فرد ملا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

"السلام علیکم نعمان بھائی! پلیز یہ ذرا سا سوال سمجھا دیں۔"

وہ سلام دعا کرتی خوش اخلاقی سے پوچھ رہی تھی۔ نعمان بھائی مسکرا کر جواب دیتے رکے۔ اگلے دس منٹ انہوں نے ساویہ کو اپنی ذہانت و محنت سے آگاہ کیا، اپنی مصروفیات کے باوجود دوسروں کی مدد کرنے پر خود ہی اپنی پیٹھ ٹھونکی۔ ان کے سیکشن کے ٹیچر کا نام پوچھ کر ان پر مفصل تبصرہ کیا۔ اس کے بعد آخر میں دو منٹ میں بہت اچھے سے پورا سوال سمجھا دیا۔

"اُفف......"

ان کے جانے کے بعد ساویہ نڈھال سی آ کر فروا کے برابر میں ڈھے گئی۔ اس کی حالت پر فروا کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

"ان سے کچھ پوچھنے کا یہی مسئلہ ہے۔ گھنٹہ ضائع کروا دیتے ہیں۔ تم یہاں بیٹھی دانت نکال رہی ہو۔ ساتھ کیوں نہیں آتیں۔" وہ فروا پر بگڑی۔

"میں آ رہی تھی لیکن ساری بکس، تمہارا بیگ سب یہاں پڑا تھا۔" فروا نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

"آئندہ خود بھی ساتھ آنا، تاکہ جو پوائنٹس اس وقت سمجھ میں نہ آئیں تو بعد میں ایک دوسرے سے سمجھ سکیں۔" ساویہ کی تاکید پر اس نے سر ہلایا تھا۔

نعمان بھائی سے سمجھ کر فروا کو سمجھاتے ساویہ بری طرح تھک گئی۔ تب ہی پڑھائی ختم کرنے کا اعلان کیا۔

"اب بس کرو، تھک گئی میں۔ گھر جا کر کریں گے۔ میں تو یونس بھائی سے فون پر بھی سمجھ لیتی ہوں۔ تمہیں بھی مشکل ہو تو مجھے کال کر لینا۔" ساویہ نے کتابیں سمیٹیں۔

"اتنی بار تم یونس بھائی کو یاد کر چکی ہو کہ اب تو مجھے دیکھنے کا اشتیاق ہو رہا ہے۔"

ہنستے مسکراتے، باتیں کرتے فروا کو یاد بھی نہ تھا کہ مشہور زمانہ یونس بھائی سے اس کی ملاقات صبح یونیورسٹی آتے ہی ہو چکی تھی۔ اس ملاقات کا تحفہ پاؤں میں تکلیف کی صورت موجود تھا۔

☆☆☆

"بھائی! یہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" ساویہ نے رجسٹر پر پین زور سے رکھتے ہوئے دہائی دی تھی۔

یونس صوفے پر نیم دراز ریموٹ پکڑے ٹی وی دیکھنے میں محو تھا۔ ساویہ کی پکار اس نے بخوبی نظر انداز کی تھی۔

"بھائی!" اس نے اٹھ کر ٹی وی کا سوئچ آف کیا۔

"کیا ہے یار! ہر وقت تنگ کرتی ہو۔ نہ یونیورسٹی میں چین لینے دیتی ہو، نہ گھر میں۔" وہ منہ بناتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"یونیورسٹی میں تو آج آپ مجھے نظر ہی نہیں آئے، گھر سے تو گئے تھے۔" ساویہ نے یاد آنے پر مشکوک نظروں سے گھورا۔

"وہیں تھا، تم اپنے ننھے سے دماغ پر زیادہ زور مت ڈالا کرو۔" یونس نے اسے ٹالا۔

آج انہوں نے سارا دن اپنی فیئر ویل خود کرنے کے ارادے سے ڈپارٹمنٹ سے باہر ہی گزارا تھا۔ وہ تمام جگہیں جہاں وہ تین سال گھومتے رہے، آج پھر وہاں جا کر انجوائے کیا تھا۔ وہ نصابی و غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں آگے آگے رہتا تھا۔

"آج میری اتنی اچھی دوست بنی۔" ساویہ یاد آنے پر جوش سے بتا رہی تھی۔

"تمہاری تو روز ایک دوست بنتی ہے لیکن یاد ہے نا، یونیورسٹی میں کسی کو بھی، کسی دوست کو بھی میرے بارے میں نہیں بتانا۔" یونس نے زور دے کر یاد کروایا۔

یوں تو وہ یونس ساویہ کے چچا کا بیٹا تھا لیکن وہ دونوں رضاعی بہن بھائی بھی تھے اور بچپن سے ایک ساتھ رہے تھے۔ ساویہ کے والدین نے طویل عرصہ بے اولادی کا دکھ سہا تھا۔ جب یونس دو بھائیوں کے بعد اپنے گھر میں آیا، تب احمد صاحب اپنے منتوں مرادوں سے ملنے والے نوزائیدہ بیٹے کے انتقال کے صدمے سے دوچار تھے۔ یونس کے والد نے بھائی کا دکھ دیکھ کر یونس ان کی گود میں ڈال دیا۔ احمد صاحب نے اسے دل سے لگا کر رکھا تھا۔ ساویہ کی آمد بھی یونس کی اہمیت کم نہیں کر سکی تھی۔ ان دونوں میں بے تحاشا محبت اور دوستی کا رشتہ تھا۔

جیسے ہی ساویہ نے یونس کے ڈپارٹمنٹ میں داخلہ لیا، اس نے سختی سے منع کر دیا کہ کسی کے سامنے مجھ سے شناسائی ظاہر نہیں کرنی۔ ساویہ نے اس کی بات تو مان لی لیکن بچپن کی عادت آسانی سے چھٹتی نہیں۔ وہ اب بھی ہر مسئلے کے حل کے لیے اس کے پاس ہی جاتی۔ یہ بات یوں اتنی محسوس نہ ہوتی کہ یونس سب کی ہی بے لوث مدد کرتا۔ ڈپارٹمنٹ میں اس سے مدد لینے والے لڑکے، لڑکیوں کی کمی نہیں تھی۔

☆☆☆

رات کو کچن کی ذمہ داری فروا کی تھی۔ کھانے کے بعد چائے بناتے بناتے اس نے کچھ برتن دھوئے، باقی چھوڑے اور چائے کپوں میں نکال کر لے آئی۔ ابو جی کا یہ ٹی وی دیکھنے کا وقت تھا۔ امی کمرے میں خالہ سے فون پر باتیں کر رہی تھیں۔ انہیں چائے دے کر اپنی اور ماورا کی چائے وہ کمرے میں لے آئی۔ ماورا اطمینان سے سیل فون ہاتھ میں لیے بیڈ پر نیم دراز تھی۔ چائے کی ٹرے اس کے سامنے رکھ کر فروا اپنا بیگ اور فولڈر اٹھا کر لائی اور بیٹھتے ہوئے اعلان کیا۔

"میں برتن نہیں دھو رہی، مجھے کام کرنا ہے۔"

بے نیاز بیٹھی ماورا نے نظر اٹھا کر گھورا۔

"ایسا کیا کام ہے، جو برتن دھونے کے پانچ منٹ نہیں مل رہے۔" اس کے تیور دیکھ کر فروا نے عاجزانہ انداز اپنایا۔

"اسائنمنٹ بنانا ہے، پچھلے لیکچر سمجھنے ہیں، کافی کام جمع ہو گیا ہے یار۔"

"چار دن میں اسائنمنٹ بھی مل گیا تمہیں۔"

وہ چائے کا کپ اٹھاتے حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ فروا نے برا سا منہ بنایا۔

"اور کیا، تھوڑا سا پڑھا کر سر نے کہا کہ یہ سب آپ نے انٹر میں پڑھا ہوا ہے۔ باقی خود سمجھیں اور مجھے اپنی قابلیت دکھائیں۔"

فروا نے بے چارگی سے ساویہ سے سنے الفاظ دہرا دیے۔ ماورا بے اختیار ہنس دی۔

"اچھے ٹیچر مل گئے۔ مزے کرو، اب پورے سمسٹر، بلکہ جو خاندان کی شادیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی بھگتا لو۔" اب وہ اسے چڑا رہی تھی۔

"میں نے تو سوچا تھا، شروع میں ہلڑ بازی ہو گی، جب تک باقاعدہ کلاسز ہوں گی، چلی جاؤں گی۔ لیکن لیکچر بھی مس ہو گئے اور مذاق الگ بنا۔"

فروا منہ بناتے ہوئے رجسٹر کے صفحات پلٹ رہی تھی۔ پہلے ہی سمسٹر میں وہ خود پر نالائق کا ٹھپا نہیں لگوانا چاہتی تھی۔

"مذاق کس نے بنایا؟ ڈپارٹمنٹ تو تمہیں پتا تھا، فرسٹ ایئر والے بھی اب تک پرانے ہو جاتے ہیں تو سب سینئرز ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔" ماورا نے دلچسپی و حیرت سے پوچھا تھا۔

"نہیں ویسے نہیں، بس میں وہ پنک کرتا، پاجامہ پہن کر گئی تھی، راستے میں ایک گروپ بیٹھا تھا۔۔۔ آڑا پاجامہ اور پتا نہیں کیا گا گا کر مذاق بنایا، میں جلدی سے جانے لگی تو پاؤں بھی مڑ گیا۔" فروا نے قدرے شرمندگی سے قصہ مختصر بیان کیا۔ ماورا زور سے ہنسی تھی۔

"اتنا تو چلتا رہتا ہے اور پہنو تم پاجامے، شرارے، غرارے۔" وہ اسے چھیڑ رہی تھی۔

فروا کو پتا تھا کہ جتنا وہ چڑے گی، اتنا زیادہ مذاق بنے گا سو خاموشی ہی بہتر جانی۔

☆☆☆

اگلے ہی دن سماویہ کی مہربانی سے فروا اور یونس کا تعارف ہوگیا تھا۔ یونس نے اسے صبح ہی سماویہ کے ساتھ دیکھ لیا تھا اور کل کا منظر یاد کر کے بے اختیار مسکراہٹ بھی لبوں پر آئی تھی۔ وہ شوخ ضرور تھا لیکن چھچھورا نہ تھا۔ لڑکیوں کو ہمیشہ عزت واحترام دیتا۔ ان کے اپنے گروپ میں لڑکے، لڑکیاں دونوں ہی تھے لیکن کل ہر وقت جینز چڑھانے والے علی کو سیاہ کرتا شلوار میں دیکھ کر سب نے اس کی خوب واٹ لگائی تھی۔

"اج کالا جوڑا پا ساڈی فرمائش تے۔"

ایک گانا شروع ہوا تو سب ہی ایک دوسرے پر شروع ہوگئے۔ ویسے بھی وہ سب تفریح کے موڈ میں فراغت سے بیٹھے تھے۔ ایسے میں سامنے سے آتی فروا بھی اس کی شرارت کا نشانہ بن گئی۔ اس کے گھبرائے ہوئے تاثرات اور گولی کی رفتار سے بھاگنا یاد کر کے یونس کی آنکھیں مسکرائی تھیں۔ فروا کی نظر اس کی مسکراتی آنکھوں پر پڑی تو وہ بھی فوراً اسے پہچان گئی۔ باقی سب پر اس نے دھیان نہیں دیا تھا لیکن بھوری آنکھوں میں شرارتی چمک لیے گانے والا لڑکا اسے یاد تھا۔

اس نے برا سا منہ بنا کر رخ پھیر لیا تھا۔ فروا کے بچوں جیسے ناراضی والے تاثرات یونس کو بہت دلچسپ لگے۔ اس کا دل چاہا وہ بار بار اسے دیکھے لیکن دل کو ڈپٹتے اس نے نظریں پھیر لیں۔ کل والی شرارت بنا سوچے سمجھے ہوگئی تھی لیکن یوں کسی لڑکی کو ارادتاً دیکھنا یقیناً بہت معیوب تھا۔

سماویہ نے یونس پر نظر پڑتے ہی فروا سے تعارف کروایا لیکن بھائی کی ہدایت کے پیش نظر اپنا رشتہ چھپا گئی۔ کام وہ سارا گھر میں ہی سمجھ چکی تھی سو جانے کی ضرورت نہ تھی۔

یوں ہی کافی دن گزر گئے تھے۔ سماویہ اور فروا کی بہت اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ یونس کا گروپ کلاسز کے بعد ڈپارٹمنٹ کے کاریڈور میں ہی ڈیرہ جمالیتا۔ آتے جاتے نظر پڑتی تو سماویہ تو تمام فائنل والوں سے اچھے سے سلام دعا کر لیتی، جب کہ فروا خاموشی سے ایک طرف سے گزر جاتی۔ سماویہ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے ہنستی، بولتی، پڑھتی اور برے برے منہ بناتی فروا مختلف روپ میں یونس کو نظر آتی۔ دنوں میں وہ لڑکی اس کی توجہ کا محور بن گئی تھی لیکن اپنا تاثر بہتر کرنے کے لیے دانستہ وہ اسے نظر انداز کرتا۔ ڈپارٹمنٹ میں کوئی اور اس کا انداز نوٹ کر لیتا تو سب کو بلاوجہ کا موضوع مل جاتا۔ احتیاط ہی بہتر تھی۔

گھر میں سماویہ کی گفتگو فروا کے ذکر کے بغیر مکمل نہ تھی۔ وہ دونوں مل کر پڑھتیں اور بہت انجوائے کرتیں۔ فروا نامہ سنتے یونس کو خود پر حیرت ہوتی۔ وہ محبت وغیرہ پر ہرگز یقین نہیں کرتا تھا۔ ان کے خاندان میں لڑکیوں کی تعداد کم تھی۔ سماویہ نے کئی بار مذاقاً کہا کہ بھائی کوئی کلاس فیلو ہی پسند کر لو، ہمیں آسانی ہوگی لیکن اس نے کبھی اس بات کو سنجیدگی سے نہ لیا۔ اب اس کٹکھنی بلی کی طرح خفا خفا لڑکی کے بارے میں جاننے کے لیے وہ سماویہ کی بے زار کر دینے والی تفصیلی گفتگو بھی دلچسپی سے سنتا۔ کئی بار وہ سماویہ کو چھوڑنے یا لینے فروا کے گھر گیا لیکن ان کا سامنا نہ ہوا۔

مسئلہ تب آیا جب ایک بار ڈپارٹمنٹ میں ہی کتابیں پھیلائے کسی سوال پر دماغ کھپاتے سماویہ نے سر اٹھایا تو سامنے یونس نظر آیا، اس نے وہیں سے اسے آواز دے دی۔ یونس نے راہداری سے گزرتے سماویہ کی آواز سنی تو چھوٹی سی دیوار پھلانگتے وہیں سے لان میں ان کے پاس چلا آیا۔ فروا نے ناک چڑھا کر اس کے آنے کے انداز کو ناگواری سے دیکھا۔ گریز کا کوئی راستہ نہ تھا۔

"یہ فروا ہے میری دوست، فروا یہ فائنل ائیر

کے یونس بھائی، آنرز میں تھرڈ پوزیشن تھی ان کی۔ بہت اچھا سمجھاتے ہیں۔"

وہ تعارف کرواتی مکھن لگا رہی تھی۔ فروا نے مسکراتے سے گریز ہی کیا جبکہ یونس کا دل نہ جانے کیوں شوخی پر مائل ہوگیا۔ اس نے شرارتی مسکراہٹ سجائے بظاہر سادگی سے کہا تھا۔

"واہ کیا کڑوا نام ہے ان کا، ان کی شخصیت پر پورا اتر رہا ہے۔"

سماویہ نے اس غیر متوقع جملے پر چونک کر اور فروا نے غصے سے دیکھا تھا۔

"آپ خود......آپ کا نام......"

فوری طور پر غصے کی شدت سے فروا کو جواب نہیں سوجھا تھا۔ یونس نے جوابی جملے کو بھانپتے ہی بیچ میں ہی اس کی بات کاٹ دی۔

"کچھ کہنا مت، نبیؐ کا نام ہے پلیز، سوری میں مذاق کر رہا تھا۔"

اس کے احساس دلانے پر فروا لب بھینچ کر خاموش ہوگئی۔ وہ معاملے کو طول دے کر تماشا بھی نہیں بننا چاہتی تھی سو نظر انداز کرنا بہتر تھا۔ سماویہ نے فوراً رجسٹر سامنے کرتے مسئلہ بیان کر دیا۔ اب وہ بالکل سنجیدگی سے پڑھا رہا تھا۔ اس نے پھر کوئی اضافی بات نہیں کی تھی لیکن نازک مزاج فروا کے دل میں گرہ پڑ گئی۔ وہ بگڑے تاثرات کے ساتھ اس کے رجسٹر پر تیزی سے چلتے ہاتھ کو دیکھتی رہی۔ یونس کے جاتے ہی فروا نے غصے سے سر جھٹکا۔

"انتہائی چھچھورے ہیں تمہارے یونس بھائی۔"

سماویہ نے فروا کے چہرے کے تاثرات دیکھے تو فوراً صفائی دی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ یونس بھائی دل کے برے نہیں، ہمارے فیملی ٹرمز بھی ہیں۔ بس ان کی مذاق کی عادت ہے۔"

"تم نے دل کاٹ کر دیکھا ہے۔ میرے کون سے فیملی ٹرمز ہیں ان سے۔ لڑکیوں سے بات کرنے تک کی تو تمیز نہیں، اس دن بھی راستے میں گانے گا رہے تھے۔"

فروا نے استہزائیہ لہجے میں کہا تو سماویہ چپ رہ گئی، اپنی جگہ فروا بھی غلط نہ تھی۔

☆☆☆

"یہ کیا سین تھا بھائی۔" گھر میں موقع ملتے ہی سماویہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

وہ سارا دن دل میں ہوتی کھد بد چھپاتی رہی۔ اسے معلوم تھا کہ یونس ایسا بالکل نہیں کہ لڑکیوں سے بے تکلف ہونے کے بہانے تراشے، اسے بے حد حیرت ہوئی تھی۔ امی، بابا کے سامنے بات کرنا مناسب نہ تھا۔

پھر رات کو اپنے پورشن سے چچا بھی ابو کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ اس کی منگنی یونس کے بڑے بھائی یوسف سے ہو چکی تھی۔ اب وہ مزید تعلیم کے لیے بیرون ملک جا رہا تھا تو سب کا خیال تھا کہ سادگی سے نکاح کر دیا جائے تا کہ آہستہ آہستہ سماویہ کے ویزے کا کام بھی ہو جائے تو سال، دو سال تک آنرز کے بعد وہ بھی رخصت ہو کر اس کے پاس چلی جائے۔ کیونکہ وہ صاف کہہ چکا تھا کہ وہ دو، تین سال باہر ہی جاب کرے گا۔ ان ہی باتوں میں رات گئے تک گھر میں رونق لگی رہی۔ جیسے ہی سب سونے کے لیے گئے۔ وہ یونس کے کمرے میں چلی آئی۔

"کیا سین تھا بھائی۔"

یونس نے ناسمجھی سے سر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھا کام کر رہا تھا۔

"آپ نے بلاوجہ فروا کا نام کیوں بگاڑا، وہ آپ کی دوست تو نہیں۔ ایسے لڑکیوں سے بے تکلف ہونا اچھی بات نہیں ہے۔" سماویہ نے غصے سے بات واضح کی۔

"مذاق کیا تھا یار، کیسے کڑوا سا منہ بنا کر بیٹھی تھی۔" یونس نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

"اس نے تو مجھے یہ بھی کہا کہ آپ نے اسے چھیڑا تھا۔ میں تو شرم سے زمین میں گڑ گئی، ابھی تو شکر ہے اسے پتا نہیں کہ آپ میرے بھائی ہو۔"

سماویہ جذباتی ہو کر تیزی سے بول رہی تھی۔ یونس کا منہ کھل گیا۔

"میں نے اسے کب چھیڑا بھئی۔"

"اس نے کہا کہ آپ گانے گا رہے تھے۔" سماویہ قدرے دھیمی ہوئی۔

"سمسٹر کے شروع کی بات ہے، ہم سب ہی گانے گا رہے تھے، جب وہ وہاں سے گزر رہی تھی۔ اسے چھیڑنے کے لیے تھوڑی گا رہے تھے۔ یونیورسٹی میں تو کتنے لوگ گنگنا رہے ہوتے ہیں۔"

سماویہ کی معلومات اور اس کی جذباتیت نے یونس کو بات پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

"ویسے کمال ہے تمہاری دوست کی یادداشت کو، اتنی پرانی بات دل سے لگا کر بیٹھی ہے۔" اس نے حیرت سے سراہنے والے انداز میں طنز کیا۔

"بس کر دیں بھائی، اصل بات بتائیں۔" سماویہ نے اس کے چہرے پر اللہ جانے کیا کھوجنا چاہا۔ یونس کو بے اختیار ہنسی آئی تھی۔

"اصل بات کیا ہو گی بیوقوف، میں اس کے لیے اجنبی ہوں لیکن تم سے اس کا ذکر سن سن کر میرے تو کان پک گئے نا۔ مجھے اجنبی نہیں لگی تو مذاق کر لیا، معاف کر دو اب بہن۔"

یونس نے جملے کے آخر میں جھنجلاہٹ کا اظہار کیا۔

"ویسے پیاری ہے نا، بھابھی بنانے کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔"

اسے جھنجلاتے دیکھا تو سماویہ نے موضوع بدلتے اپنے دل کی خواہش بیان کی۔

یونس کا چہرہ چمکا، مگر اس نے لاپروائی کا مظاہرہ کرنا چاہا۔

"ہمم...... مزاج کی تیز ہے لیکن لڑکی بری نہیں، قربان ہو جاتا ہوں میں تمہاری دوستی پر۔"

سماویہ نے لمبی سی "اوہ" کے ساتھ فروا کے نام پر اس کے چہرے پر روشن ہوتے چار سو چالیس وولٹ کے بلب دیکھے۔

"اس سے پہلے تو میری پسند پر صاف انکار کرتے رہے، اب قربانیاں دے رہے ہیں۔"

اس نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔

"مجھے پہلے ہی لگ رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ فروا کی باتیں آپ کتنے غور سے سنتے تھے۔ اس کے گھر بھی آرام سے چھوڑ آئے۔ پرسوں اس کی مشکل کا سن کر آپ نے پرانے لیکچر بھی ڈھونڈ کر دے دیے جو مجھے اتنے عرصے سے نہیں دیے تھے کہ میں پڑھا تو دیتا ہوں۔"

سماویہ نے لمبی چارج لسٹ بیان کی تھی۔ یونس سے مسکراہٹ چھپانا مشکل ہو گیا۔

وہ اس کی بہن تھی، اس کا دل پڑھنا جانتی تھی۔ جو بات اس نے خود سے بھی اب تک نہیں کہی تھی۔ وہ سماویہ نے اس کے انداز سے پکڑ لی تھی۔

"میں نے تو اس خیال سے نوٹس ڈھونڈ دیے کہ تمہاری دوست ہے یار، فیل ہو گئی تو اگلے سال تمہیں نئی دوست نہ بنانی پڑے اور تمہاری بے سروپا باتیں سننے اور تمہیں اوٹ پٹانگ دوستوں کے گھر لے جانے کا کام تو میں بچپن سے کر رہا ہوں۔" یونس نے بے نیازی دکھاتے صفائی دی۔

"مجھے تو نئی دوست نہیں بنانی پڑے گی لیکن آپ اپنی فکر کر لیں۔ وہ اچھے خیالات نہیں رکھتی آپ کے بارے میں۔" سماویہ کو فروا کے تاثرات یاد آئے۔

"خیالات بدلنا کیا مشکل ہے ہمارے لیے۔ جب چاہیں کر لیں۔ ابھی تو تم جان چھوڑو، اتنی رات ہو گئی، مجھے یہ کام کر کے سونا بھی ہے۔" کالر اکڑا کر کہتے یونس نے اسے باہر کا راستہ دکھایا تھا۔

☆☆☆

سماویہ نے اب پہلے سے زیادہ فروا سے تعلقات بڑھا لیے تھے۔ وہ اکثر اس کے گھر بھی چلی جاتی۔ فروا کے گھر امی، ابو اور ماورا کے علاوہ کوئی نہ ہوتا۔ فروا کی امی اور ماورا بھی اس سے اچھی طرح واقف ہو گئی تھیں۔ لڑکوں والا گھر ہونے کی وجہ سے

سماویہ کے گھر یوں بھی سہیلیاں کم ہی آتی تھیں۔ فروا کے ابو ویسے بھی کسی کے گھر جانے کی اجازت نہ دیتے۔ اسی لیے سماویہ کے بہت اصرار کے باوجود فروا اب تک اس کے گھر نہیں آئی تھی۔ سماویہ نے بھائی کی راہ ہموار کرنے کے لیے گھر میں اعلان کر دیا تھا کہ وہ اپنی سہیلی کو ہی بھابھی بنائے گی۔ یہ الگ بات تھی کہ کسی نے خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ گھر میں سماویہ کے نکاح کا شور اٹھا تو اس نے بالخصوص فروا کے گھر جا کر اسے نہ صرف مدعو کیا بلکہ ضد کر کے آنٹی سے آنے کا وعدہ بھی لے لیا۔

"سرپرائز کے لیے تیار رہنا۔"

واپس آتے ہوئے اس نے شرارت سے چمکتی آنکھیں لیے فروا، ماورا کو کہا تھا۔ وہ ناسمجھی سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ نکاح کا فنکشن گھر میں ہی ہونا تھا۔ گھر والے انتظام و انصرام میں مصروف تھے۔ بیٹی کے پرایا ہونے کا دکھ دل میں تھا۔ لبوں پر سب کچھ بخیریت ہو جانے کی دعا تھی۔

سماویہ کو اپنے نکاح سے زیادہ فروا کی آمد کا انتظار تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ آج ہی کے دن یونس بھائی کی بھی منگنی ہو جاتی۔ سب اس کی بچکانا خواہش کو ہنس کر ٹال دیتے۔ پھر بھی اس نے زور دے کر امی اور چچی کو اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ فروا کو اس نظر سے دیکھ لیں۔

بالآخر ماورا اور آنٹی کے ساتھ فروا کی آمد ہوئی۔ ماورا اونچی شرٹ اور بیل باٹم کے ساتھ پونی ٹیل بنائے لاابالی سی لگ رہی تھی۔ جب کہ نیٹ کا خوب گھیر والا سرخ فراک پاجامہ پہنے، ریشمی بالوں کو آدھا کیچر میں جکڑ کر پشت پر کھلا چھوڑے فروا سج سج کر چلتی مشرقی حسینہ کا روپ دھارے ہوئے تھی۔

فروا کی امی سے تپاک سے ملنے کے بعد تعارف ہوا تو سماویہ کی امی اور چچی نے بے اختیار توصیفی نگاہ سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ سماویہ کی پسند انہیں بھی پسند آئی تھی۔ وہ آنٹی کو دیگر بزرگ خواتین کے پاس لے گئیں۔ نکاح سادگی سے ہی ہونا تھا سو خاندان کے چیدہ چیدہ افراد کے سوا کوئی نہ تھا۔ چچی نے فروا کی امی سے گپ شپ لگاتے نہ صرف تمام ضروری معلومات لیں بلکہ سرگوشی میں نند کو بھی یونس کی متوقع منگیتر اور اس کی والدہ کی نشاندہی کی۔ وہ بھی شدومد سے ان سے گفتگو میں شامل ہوئیں تاکہ خاندان کا اندازہ ہو۔ اس غیر متوقع پذیرائی پر آنٹی کافی حیران مگر خوش تھیں۔

"اتنے کم مہمان سماویہ!" ماورا تعجب سے پوچھ رہی تھی۔

"چچا لوگ تو سسرال والے ہیں اور پھپھو موجود ہیں لیکن ان کی بھی بیٹی کوئی نہیں، بیٹے ہوں گے باہر لڑکوں کے ساتھ۔ ایک ماموں ہیں جو ملک سے باہر سو ننھیال بھی نہیں۔" سماویہ نے دو جملوں میں تفصیل نمٹائی۔

اتنے میں فروا کے پرس میں امی کا موبائل بجنے لگا۔ ابو کا فون آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے فون نکال کر امی کو دینے لاؤنج میں گئی، جب سامنے سے آتے یونس کی نظر اس پر پڑی تھی۔ معصوم چہرہ آج سنگار کے ساتھ اور حسین لگ رہا تھا۔ وہ بظاہر مسکراتے ہوئے پھپھو کے سوالات کا جواب دے رہی تھی لیکن حیرت چہرے سے مترشح تھی۔

"سماویہ کی پھپھو کو بھلا اس میں اتنی دلچسپی کیوں ہو رہی ہے؟"

نروس ہوتے فروا نے انگوٹھی انگلی میں گھماتے نظر اٹھائی تو چند لمحے نظر وہیں رہ گئی۔ مسکراتی نظروں سے اسے دیکھتا یونس سامنے موجود تھا۔ اس نے گڑبڑا کر سر نیچے کیا، نظریں نازک سینڈل میں مقید پاؤں سے ہوتی پاجامے کی چوڑیوں تک آئی تو یونیورسٹی کا پہلا دن یاد آیا تھا۔ دل ہی دل میں پاجامہ پہننے پر خود کو برا بھلا کہتی، پھپھو کو ٹالتی وہ جلدی سے سماویہ کے کمرے میں گئی تھی۔

"یونس بھائی بھی انوائٹڈ ہیں سماویہ۔" اس نے پوچھا۔ فیملی ٹرمز کا تو سماویہ نے بتایا تھا لیکن وہ یوں بے تکلفی سے گھر کے اندر کھڑا کمپیوٹر ٹرالی سے کچھ

نکلتا زیادہ ہی قریبی رشتہ دار لگ رہا تھا۔ سماویہ نے دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا ورد کیا اور مسکراتے ہوئے دھماکا کیا۔

"دراصل انہیں بلایا نہیں ہے...... بلکہ وہ تو رہتے ہی یہیں ہیں۔ وہ میرے بھائی ہیں نا۔" رک رک کر کہتے سماویہ نے بات مکمل کی۔ فروا کا منہ تو حیرت سے کھلا ہی تھا لیکن ماورا ابھی حیران رہ گئی۔ وہ تمام حالات سے اچھی طرح واقف تھی۔

فروا نے لحاظ بالائے طاق رکھا اور برابر میں پڑا کشن اٹھا کر اسے دے مارا تھا۔

"انتہائی درجے کی بدتمیز لڑکی ہو تم، پوری اپنے بھائی پر گئی ہو۔" سماویہ نے ہنستے ہوئے کشن پکڑا۔

"دھیرج چندا، میرے گھر والے یہ تخریب کاری برداشت نہیں کریں گے۔ بہت لاڈلی ہوں میں۔" وہ اسے چڑانے کو اترا کر کہہ رہی تھی۔

"لاڈ پیار کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔ ایسے ہی نمونے بنتے ہیں بڑے ہو کر۔" فروا چڑ بھی گئی تھی۔

"ہمت ہے تمہاری سماویہ، اتنی برائیاں اپنے بھائی کی سنتی رہیں۔ بتا دیتیں تو ہم کچھ احتیاط ہی کر لیتے۔" ماورا نے خوش دلی سے کہا تھا۔

"بھائی کا پہلا امپریشن فروا پر غلط چلا گیا ماورا، ورنہ میرے بھائی بہت شریف ہیں۔ ڈپارٹمنٹ میں بھی سب ٹیچرز، اسٹوڈنٹس تعریف کرتے ہیں ان کی۔ میرے بتانے، کہنے سے کیا ہوتا۔ فروا تو یہی سوچتی کہ اپنے بھائی کی سائیڈ لے رہی ہے۔ اچھا ہوا اس نے بھڑاس نکال لی۔" سماویہ نے قدرے سنجیدگی سے وضاحت دی تھی۔ تب ہی فضا میں گانے کے بول بلند ہوئے تھے۔

"لال دوپٹا، اڑ گیا رے ترا ہوا کے جھونکے سے۔" فروا نے گھور کر سماویہ کو دیکھا اور بڑبڑائی۔

"شریف بہن کا شریف بھائی۔"

"گانے تو صبح سے چل رہے ہیں۔" مسکراہٹ دباتے سماویہ نے صفائی پیش کی تھی۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں پڑھنے کے سارے شوق پہلے سال میں ہی پورے ہو گئے تھے۔ اب تو ایک دوسرے ڈپارٹمنٹ تک جانا مشکل لگتا لیکن پھر بھی جانا پڑتا۔ یونس بھائی ڈگری لے کر جا چکے تھے۔ ایم فل کے سلسلے میں وہ کبھی نظر آ جاتے لیکن ان کے آنے جانے سے سماویہ اور فروا کی دوستی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اپنے روزمرہ کے معمولات کے ساتھ، ماورا کی شادی کی تیاریاں کرتے وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔

اتنی بھاگ دوڑ میں بھی سماویہ اور فروا کو نئے فیشن پر بات کرنے کا موقع با آسانی مل جاتا۔ سماویہ اکثر ہی کمبائن اسٹڈی کے نام پر گھر آتی تو آدھا وقت ماورا کے ساتھ کپڑوں کی ڈیزائننگ میں لگا دیتی۔

ایسے ہی ایک دن اس کی امی نے فون پر فروا کی امی سے بات کر کے گھر آنے کی اجازت لی تھی۔ شام میں وہ گھر آئیں تو اکیلے نہ تھیں بلکہ سماویہ، اس کی چچی اور ابو بھی ساتھ تھے۔ تمام بزرگ ڈرائنگ روم میں خوش گوار ماحول میں محو گفتگو تھے، سماویہ حسب عادت ان کے ساتھ کچن میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ ان کے یوں آنے کے مقصد سے وہ لوگ اتنے انجان بھی نہ تھے۔ سماویہ کی چھیڑ چھاڑ پر فروا نے کوئی خاص ردعمل نہیں دیا تھا۔ بظاہر مسکرا کا جواب دیتی بھی وہ کافی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ ماورا نے اس کے تاثرات دیکھے لیکن فی الوقت کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ابو نے انہیں خوش اسلوبی سے بعد میں جواب دینے کا کہہ دیا تھا۔ فروا کی تعلیم کے حوالے سے انہیں کچھ خدشات تھے لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ جلد از جلد دونوں بیٹیوں کی شادی کر کے حج کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے سوچنے کا وقت لے لیا۔ فروا کا سرد سا انداز ماورا کو یاد تھا۔ اسی لیے اس نے فروا سے اس کی رائے جاننی چاہی۔

"میں تو اس رشتے کے بالکل بھی حق میں نہیں ہوں، باقی جو بھی امی، ابو کا فیصلہ ہو۔"

لیے چپ رہ گئی۔ کھلنڈری سی نظر آتی چھوٹی بہن سے اسے ایسے صاف جواب کی امید نہ تھی۔

"فیصلہ تو ظاہر ہے ابو کا ہی ہوگا لیکن تم سے بھی پوچھیں گے۔ تمہیں کیا اعتراض ہے آخر۔" وہ الجھی تھی۔

امی ان لوگوں کے گھر جا چکی تھیں۔ اس لیے کافی مطمئن تھیں۔ خاندانی کاروبار، شریف لوگ، تعلیم و تہذیب یافتہ لڑکا، انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ابو کا ارادہ کچھ چھان بین کا تھا جس کا نتیجہ اب تک مثبت ہی تھا۔

"کردار، تعلیم، شکل و صورت کس چیز کی کمی ہے؟"

سماویہ سے خوش گوار تعلق کا نتیجہ تھا کہ ماورا خود بخود ان کی وکیل بن گئی۔

"کمی نہیں زیادتی ہے۔ مجھے ایسے لاابالی لڑکے پسند نہیں، پھر اس رشتے سے میری دوستی بھی خراب ہوگی۔" فروا نے ناک چڑھاتے ہوئے جواب دیا اور بے نیازی سے موبائل اٹھا لیا۔ ماورا کا دل جل گیا۔

"ادھر رکھو اسے، میں کچھ بات کر رہی ہوں۔" اس نے موبائل چھین کر ایک طرف پٹخنے کے انداز میں رکھا۔

"دوستی خراب ہونا تو بے بنیاد بات ہے۔ شادی ہو کر سماویہ ملک سے باہر چلی گئی تو یوں بھی کوئی واسطہ نہیں رہنا۔ سچی دوستی ہوئی تو رشتے سے مضبوط ہوگی ورنہ نہیں رہے گی۔ اب لاابالی پن کی وضاحت دو۔" وہ ابھی کے ابھی بات صاف کرنا چاہتی تھی۔

"تمہیں تو جیسے کچھ پتا ہی نہیں، لڑکیوں پر ہوٹنگ کرنا تو بہت اچھا کام ہے نا، جو وہ کرتے رہے ہیں۔"

فروا تنک کر بولی تھی۔ جذباتی تو ہمیشہ سے تھی اب اسے ایک دم غصہ آیا تھا۔

"اس کے علاوہ بات کرو بھئی۔ ایک آدھ دفعہ

ہوتا ہی ہے۔ لڑکے کیا لڑکیاں بھی تفریح میں کر لیتی ہیں کبھی۔ تم تو بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو۔"

ماورا حیران ہوئی تھی۔ وہ ابھی تک اس چھوٹی سی بات کو پکڑ کر بیٹھی تھی۔ لیکن فروا سے اسی حماقت کی امید کی جا سکتی تھی۔ گہری سانس لیتے اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ اس کے انداز پر فروا مزید چڑی۔

"تو غلط کرتے ہیں نا، جو بھی کریں۔ میں مانتی ہوں کہ یونس بھائی نظر باز، چھچھورے یا فلرٹی نہیں تھے۔ سب لڑکیاں آرام سے ان سے مدد لیتیں ہیں، فون پر بھی بات کر لیتیں ہیں لیکن یوں ہوٹنگ کرنے کو جتنا سب نارمل لیتے ہیں مجھے نہیں پسند۔ تمہیں یاد ہے میری کالج کی دوست شہر بانو۔ اس کی فیملی کافی کنزرویٹو ہے۔ مخلوط تعلیم کی وجہ سے انہوں نے اسے یونیورسٹی نہیں آنے دیا۔ سامنے والا کا بیک گراؤنڈ، اس کے مسائل آپ کو نہیں معلوم۔ کسی کو مشکل میں ڈالنا مذاق نہیں ہوتا ماورا۔ اللہ کا شکر ہے مجھے ایسا کوئی مسئلہ نہیں لیکن مجھے غصہ بھی اسی بات کا ہے کہ تم ہو، سماویہ ہو یا کوئی بھی اور، سب اسے برا ہی نہیں سمجھتے۔"

فروا نے تفصیل سے بتایا۔ ماورا سر ہلا رہی تھی۔ سوچ کا ایک نیا در وا ہوا تھا۔ دور طالب علمی میں ہنسی مذاق عام تھا۔ لیکن الگ الگ ماحول سے آنے والے لوگوں کا ایک دوسرے کو جانے بغیر ایک ہی طرح ٹریٹ کرنا درست نہیں تھا۔ خود اس کے ڈپارٹمنٹ میں ایک لڑکے نے اپنی کلاس فیلو کے گھر بغیر پوچھے رشتہ بھجوا دیا تھا۔ اس کا نکاح کزن سے ہو چکا تھا۔ غیر متوقع رشتے پر اسے کتنی ہی وضاحتیں دینی پڑیں کہ یہ اس کی لاعلمی میں آیا ہے اور اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں۔ پھر بھی سب کو بمشکل یقین آیا۔

"بہر حال تم سوچ لو۔ ہر شخص میں کچھ نہ کچھ کمی ہوتی ہے، مکمل کوئی نہیں۔ یہاں تو سب کچھ ہمارے سامنے ہے۔ کوئی بڑی برائی نہیں، کسی انجانی جگہ شادی ہو گئی تو بھی عادت و اطوار کی کوئی گارنٹی نہیں۔"

صاف گوئی سے کہتے اس نے بات سمیٹی۔ زبردستی کرنا بے کار تھا۔ جس کام کو دل نہ مانے، وہ نہ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ فروا نے سر ہلا دیا تھا۔ ماورا نے پوچھا تو اس نے رائے دے دی۔ فیصلہ تو ابو نے کرنا تھا۔

ابو اطمینان سے ان سے میل جول بڑھانے میں لگے تھے۔ ابھی تک واضح جواب نہیں دیا گیا تھا۔ سماویہ کے گھر میں بھی سب ٹھنڈے بیٹھے تھے۔ وہ بھی بیٹی والے تھے، جانتے تھے کہ انجانے لوگوں میں رشتہ کرتے وقت سو باتیں دیکھنی ہوتی ہیں۔

اچھی طرح تسلی کر لینے کے بعد حتمی جواب سے پہلے ابو نے امی کو فروا سے رائے لے کر جواب دینے کا کہہ دیا تھا۔

اس دوران سماویہ کے بارہا پوچھنے پر ماورا نے مناسب الفاظ میں اسے فروا کا نقطہ اعتراض بتا دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ فروا دباؤ کے زیر اثر اپنی دلی مرضی کے خلاف فیصلہ کرے یا جذباتیت میں کوئی غلط فیصلہ کر لے۔ غلط فہمی کا رفع ہو جانا ہی بہتر تھا۔

یونس فروا کی سوچ جان کر سر پکڑ کر رہ گیا۔ ساری زندگی شرافت سے گزاری اور ایک شرارت مہنگی پڑ گئی تھی۔

فروا سے بات کرنے وہ یونیورسٹی آیا تھا۔ تیز دھوپ سے بچنے کی کوشش میں دوپٹا ماتھے سے آگے تک کھینچ کر تیزی سے بولتی وہ سماویہ کے ساتھ کینٹین سے آرہی تھی۔ اللہ جانے کون سا اہم انکشاف ہو رہا تھا کہ سماویہ ہاتھ میں پکڑا رول منہ تک لے جا کر نوالہ لینا بھول گئی تھی۔ اردگرد سے بے خبر وہ آپس میں محو تھیں۔ یونس نے سماویہ کے انہماک کو داد دی تھی۔ جسے معلوم تھا کہ وہ آج آئے گا، پھر بھی میسج چیک کر کے اسے جواب دینے کا وقت نہیں نکالا۔ وہ خود ہی کینٹین کی طرف نہ آجاتا تو ان کی تلاش میں خوب خوار ہوتا۔ سورج کی تپش سے سرخ ہوتے چہرے پر ایک نگاہ کے بعد اس نے دوسری نہ ڈالی تھی۔ پھر بھی دل کو سکون ملا تھا۔

”السلام علیکم۔“

وہ ان کے سامنے آیا۔ فروا کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا رسپانس دے۔ وہ بس دل میں ہی جواب دے کر رہ گئی۔

”وعلیکم السلام بھائی۔“ سماویہ چہکی۔ اسے ایک دم یاد آیا تھا کہ آج یونس بھائی نے فروا سے بات کرنے آنا تھا۔ فروا نے سماویہ کو تو صاف منع کر دیا تھا کہ وہ اس معاملے کو دوستی سے الگ رکھے۔

”وعلیکم السلام۔ کہاں جا رہے ہو؟ کلاس تو نہیں ہے ابھی؟“ یونس نے بات شروع کرنے کے لیے پوچھا تھا۔ ان کا شیڈول اسے اچھی طرح معلوم تھا۔

”نہیں، ہم فارغ ہی ہیں۔ کلاس میں تو بہت وقت ہے۔ ادھر بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔“ فروا کا لاتعلق انداز دیکھ سماویہ نے آفر کی۔

”تم لوگ بات کرو، جب تک میں۔“ فروا بہانہ بنا کر وہاں سے جانے کو تھی، جب یونس نے اس کی بات کاٹی۔

”میں آپ سے ہی بات کرنے آیا ہوں فروا۔ دو منٹ میری بات سن لیں۔“ فروا نے ایک نظر ڈالی تھی۔ بھوری آنکھوں میں آج شرارت نہیں بلکہ آس تھی۔ سماویہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی منتظر نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”سماویہ ٹھیک کہہ رہی ہے، کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔“ اس نے آہستگی سے ایک طرف قدم بڑھائے تھے۔ پھر گردن موڑ کر بت بنی سماویہ کو دیکھا۔

”آؤ نا۔“

تھوڑی دور جا کر درختوں کے سائے میں وہ تینوں زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ سماویہ کی پوری توجہ اپنے کھانے پر تھی۔ جیسے اس سے اہم دنیا میں اور کچھ نہیں۔

اپنی نروس نیس چھپانے کو فروا کاغذ پر پھول بناتے ان میں شیڈز دے رہی تھی۔ سماعت پوری طرح یونس کی طرف مرتکز تھی۔

یونس نے چند لمحے ذہن میں گھومتے الفاظ کو جوڑا اور جملہ ترتیب دیا۔

”تمہیں ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں لڑکیوں کی عزت نہیں کرتا۔“

ٹو دا پوائنٹ ایسا حملہ فروا کا چونکا گیا۔ اس کا چلتا پین رکا۔ تحیر سے نگاہ اٹھا کر دیکھا، کچھ سوچا پھر تصحیح کی۔

”میں نے کب کہا کہ آپ عزت نہیں کرتے لیکن آپ سیریس نہیں لیتے۔ جس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو، اس سے مذاق کرنا اچھی حرکت نہیں۔ یہ ہراساں کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔“ سماویہ کے تاثرات بدلے لیکن خاموش ہی رہی۔

”میں کسی کو ہراساں نہیں کرتا۔“ یونس کو برا لگا تھا۔

”میری آپ کی حدود کا فرق ہے۔ راہ چلتے کوئی سماویہ کے لباس و انداز پر جملے کسے، آپ کو اچھا لگے گا؟“ اس نے تیکھے لہجے میں کہا تھا۔ یونس کا چہرہ سرخ ہوا۔

”تمہیں مذاق سمجھنا بھی نہیں آتا۔“ اس نے تپ کر کہا تھا۔

”آپ کو غلطی تسلیم کرنا بھی نہیں آتی۔“ فروا نے دوبدو جواب دیا تھا۔

سماویہ خاموش تماشائی بنی اس بحث سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ دل تو چاہ رہا تھا بولنے کا لیکن دونوں فریقین نے اپنا جھگڑا بھول کر اس پر ہی الٹ جانا تھا۔

فروا کی بات پر یونس نے لحہ بھر کو آنکھیں بند کی تھیں۔ کیا واقعی وہ غلطی پر اڑا تھا؟ شاید کوئی سماویہ پر کمنٹ کرتا تو اسے کبھی اچھا نہیں لگتا۔ غلطی سے زیادہ برا اس کی توجیہہ پیش کرنا ہوتا ہے۔

اس کے لیے وہ خاص تھی۔ سماویہ کی دوست تھی۔ اس نے اسے شریک حیات کے طور پر منتخب کیا۔ وہ اس کے دل کے نزدیک تھی، تب ہی پہلی بار نادانستہ اور بعد میں دانستہ شرارت کر گیا تھا۔ فروا کے لیے وہ گھر سے باہر ملنے والا اجنبی لڑکا ہی تھا۔ جو کسی بھی لڑکی کو الجھن میں ڈال سکتا۔

”او کے، آئی ایم سوری۔“ اس نے سنجیدگی سے معذرت کی۔ سماویہ کی آنکھیں پھیلیں۔

”اٹس او کے۔“ فروا نے دو لفظی جواب دیا۔

”اس کا کیا مطلب ہوا؟“ بہت دیر سے چپ سماویہ تیزی سے بولی تھی۔

”او کے یعنی آبجیکشن کلڈ، معذرت کر لی تو اعتراض ختم ہو گیا، باقی سب میرا مسئلہ نہیں۔“ فروا نے شانے اچکاتے بے نیازی سے یوں جواب دیا، جیسے سماویہ کو او کے کے معنی سمجھانے ہی بیٹھی ہو۔

ماورا کی بات اسے سمجھ میں آگئی تھی۔ ہم بشری کمزوریوں کا شکار انسان بے عیب لوگ تلاش کرنے کی حماقت کیوں کرتے ہیں۔ جو دل میں تھا، کہہ دیا۔ زندگی کا فیصلہ کرنے کے لیے جو دیدہ و بینا چاہیے تھی۔ وہ والدین سے بڑھ کر کس کے پاس ہوتی ہے۔ ان کے فیصلے غلط ہو بھی جاتے لیکن محبت و خلوص پر شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

”شکر الحمدللہ، پہلی بار سوری کی اہمیت کا احساس ہوا ہے۔“ یونس نے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اٹھا کر آسمان کو دیکھتے شرارت سے شکر ادا کیا تھا۔

”سوری کا مطلب، غلطی کا احساس ہوتا ہے اور احساس ہونے کے بعد غلطی دہرائی نہیں جاتی۔“ فروا نے نرمی سے جتایا تھا۔

”بس کر دے بہن، بعد میں آہستہ آہستہ تربیت کرنا، ایک دن میں سدھار دو گی کیا۔“ سماویہ نے زچ ہو کر کہا تھا۔ فروا اور یونس بے اختیار کھل کر ہنسے تھے۔

”سادہ سے دکھنے والے لوگ بھی بہت کمال ہوتے ہیں، زندگی کو الگ ہی زاویے سے دیکھتے ہیں، یہ جذباتی سی لڑکی اتنی گہرائی میں سوچتی ہے، کون یقین کرے گا۔“

فروا کے روشن، بے ریا چہرے کو دیکھتے سماویہ نے پیار سے سوچا تھا اور خود بھی ان کی ہنسی میں شامل ہو گئی۔

☆☆

نوشین فیاض

پھول کھلنے لگے ہیں راہوں میں

سارا دن بے تحاشا دھوپ برسانے کے بعد سورج اپنی تھکن اتارنے چل دیا تھا۔ اترتی شام اپنے ساتھ ٹھنڈی ہوا کا تحفہ بھی لائی تھی۔ ایسے میں مصباح بار بار بے چینی سے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتی یہاں سے وہاں ٹہلتی پھر رہی تھی۔

''امی دیکھ لیں عمر ابھی تک نہیں آیا۔ آپ کریں اسے فون۔ میں نے فون کیا تو پھر فون پر ہی لڑنے بیٹھ جائے گا۔''

''میری ہوئی تھی اس سے بات۔ کہہ تو رہا تھا جلدی آجائے گا آج۔''

''جلدی کیا دیر سے بھی نہیں آیا۔ اور تھوڑی دیر میں قمر آجائے گا اور آپ کو پتا ہے میرا تھوڑا کام رہتا ہے ویڈیو کا۔ آج ہر حال میں ویڈیو اپ لوڈ کرنی ہے۔''

اس کا یوٹیوب پر کوکنگ چینل تھا جس کے لیے اس نے ویڈیو بنوا تو لی تھی بس کچھ ایڈیٹنگ کا کام رہتا تھا۔ اس کی اپنی ہی فکریں تھیں۔ جب سے عمر نے جاب کی تھی سب سے زیادہ تنگی اسی کو ہو رہی تھی۔ پہلے کہیں بھی جانا ہوتا عمر بمعہ گاڑی میسر ہوتا تھا۔ اب نہ عمیر ملتا تھا اور نہ گاڑی کی سہولت رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے باہر نکلنا پہلے سے بہت کم کر دیا تھا۔ اب بھی اس نے پچھلے ماہ ایک ہینڈ بیگ لیا تھا اور اس میں ایک چھوٹا سا نقص نکل آیا تھا۔ تبدیلی کے لیے آج کل آج کل کرتے پورا ایک ماہ نکل گیا تھا۔ آج بھی اس نے عمر کو جلدی آنے کی تاکید کی تھی مگر نتیجہ صفر۔۔

''آپ ایک بار پھر فون کر کے دیکھیں نا امی پلیز۔''

''پتا بھی ہے کام کے دوران فون کرنے پہ کتنا ناراض ہوتا ہے اور بچہ تو وہ ہے نہیں کہ بار بار یاد دہانی پر بھی بھول گیا ہو اور نہ ہی لاپروا ہے۔ جیسے ہی فارغ ہوگا آجائے گا۔''

مصباح چپ کر گئی تھی۔ وہ جانتی تھی امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

''ایسا کرو تم رکشا لے کر چلی جاؤ وہ آگیا تو اسے لینے بھیج دوں گی۔''

''امی ی ی ی۔۔'' عادت کے برخلاف اس نے بات کاٹی۔ اکیلے جاتے اس کی جان جاتی تھی۔

''کیا امی؟ بڑی ہو جاؤ اب۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں اکیلی دنیا فتح کرنے نکل پڑتی ہیں اور تم سے ایک بازار کا چکر نہیں لگایا جاتا۔''

''دنیا فتح کرنے نکلتی ہیں لیکن کرتی تو نہیں ناں؟ ایسی فضول خواہشوں کے لیے خود کو تھکانے کا فائدہ؟''

''چلو تم فضول خواہشوں کے لیے نہ سہی اس کام کے لیے تو جا ہی سکتی ہو ناں؟ چلو اٹھو شاباش اپنی ذمہ داری خود اٹھانا سیکھو۔''

ناچار اسے اکیلے ہی نکلنا پڑا تھا۔ جدید شاپنگ مال میں داخل ہو کر متانت سے قدم بڑھاتی وہ فرسٹ فلور کی طرف چل دی۔ برقی سیڑھی پر ابھی پہلا قدم ہی دھرا تھا جب ہاتھ میں پکڑے چھوٹے سے پرس میں اس کا فون بج اٹھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دھیان بھٹکا اور وہ بے توازن ہو کر پیچھے آتی معمر خاتون پر جا گری۔ اس سے پہلے کہ وہ اس عورت سمیت زمین بوس ہو جاتی پیچھے کھڑے شخص نے بیک وقت ان دونوں کو سہارا دے کر کھڑا ہونے میں مدد کی۔

''معاف کیجیے گا۔'' وہ حقیقتاً بہت شرمندہ ہوئی تھی۔ ایک نظر اس عورت پر ڈال کر سیڑھی پر پاؤں رکھتے اس نے پرس میں سے فون نکال لیا۔ فون کی اسکرین پر عمر کا نام جگمگا رہا تھا۔

اب ایسی بھی کیا بے نیازی کہ بندہ شکریہ بھی نہ کہے۔ اور یہ اس نے کیا کہا؟ ''معاف کیجیے گا۔'' آج جب بچہ بچہ سوری کو رول رہا تھا وہ ابھی بھی ''معاف کیجیے گا'' کہتی تھی۔ پیچھے کھڑا وہ سوچ رہا تھا۔ شاید ایسی ہی کسی لڑکی کے لیے شاعر نے لکھا ہوگا۔

''ایک تو لہجہ ہے اس قدر شیریں
اور پھر بولتی بھی اردو ہو''

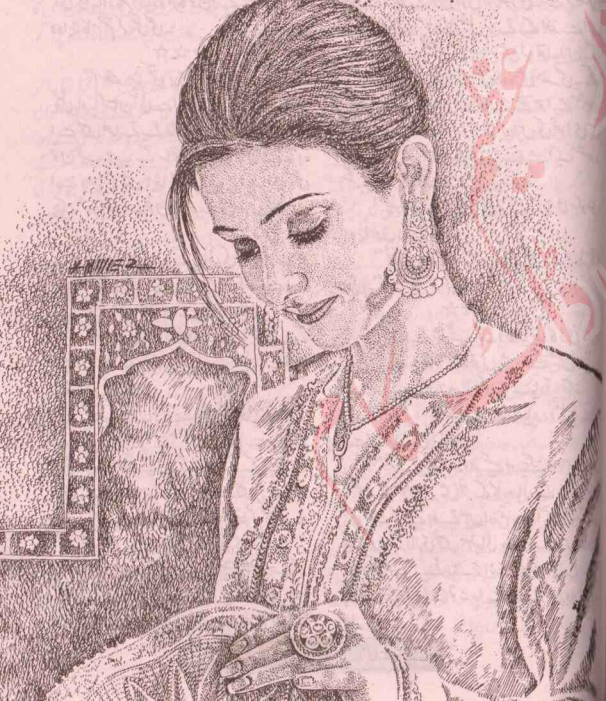

اپنی سوچ پر وہ خود ہی مسکرا دیا۔

"ہاں عمر بولو؟"

"کہاں ہو؟"

"میں خود ہی آ گئی ہوں بیگ تبدیل کروانے۔"

"جانتا ہوں۔ امی سے ہوئی میری بات۔ اچھا میں نا اسی مال میں ہوں، ایک سائن کروانے تھے وہ کروا کر فون کرتا ہوں تب تک تم بھی فری ہو لو واپسی پر اکٹھے گھر چلیں گے۔" مصباح کی جان میں جان آئی تھی۔ اور پھر دوبارہ عمر کا فون آنے سے پہلے پہلے وہ اپنا کام ختم کر چکی تھی۔

☆☆☆

"اسفند بیٹا کتنی بری بات ہے ویسے۔ آیت پہلی بار پاکستان آئی ہے اور تم سے اتنا نہیں ہو سکا کہ اسے کہیں گھمانے لے جاؤ۔ بے چاری بچی سارا دن فون لیپ ٹاپ کے ساتھ بور ہوتی رہتی ہے۔" وہ اپنے دھیان میں بیٹھا لیپ ٹاپ پر ایک ای میل چیک کر رہا تھا جب فون بند کر کے پھپھو اس کی طرف آ گئیں۔

"بس پھپھو آپ کے بھائی کی مہربانی ہے جو اپنے کام میں مجھے اس بری طرح پھنسا رکھا ہے ورنہ میرے تو خود ابھی کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔"

"لو ستائیس کا ہونے والا ہے اور ابھی اس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔" بی جان اپنی بات کا مزا لیتے خود ہی ہنسنے لگیں۔

"جب چھبیس کی آیت ابھی پھپھو کی بچی ہو سکتی ہے تو مجھ پر کیا اعتراض؟" آیت اس سے سال بھر ہی چھوٹی تھی اس لیے عمر کے اندازے کے لیے اسے کسی لمبے چوڑے حساب کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اور بات کہ اس نے خود کو اتنا فٹ رکھا ہوا تھا کہ کہیں سے بھی بائیس تیئس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

اس کی بات پر بی جان پھر ہنسنے لگیں جب کہ پھپھو نے ناگواری سے منہ پھیر لیا تھا۔ انہیں اس طرح آیت کی عمر کے بارے میں بات کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"ٹھیک ہے، کہیں لے کر نہیں جا سکتے لیکن گھر کی چار دیواری میں تو میری انٹرٹینمنٹ کا سامان کر سکتے ہو ناں؟"

"ہوں ضرور بتاؤ کیا کر سکتا ہوں میں؟"

آیت کی بات پر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"مجھے کچھ ڈی وی ڈیز چاہئیں میوزک کی۔ میں بتا دیتی ہوں وہ لا دو۔ جب تک ماموں پاکستان آتے ہیں اور تم فری ہوتے ہو تب تک میں کچھ میوزک انجوائے کرتی ہوں اور تھوڑی بہت پریکٹس کر لیتی ہوں۔" پڑھائی مکمل کرنے کے بعد سے اس نے سنگنگ کو پروفیشن کے طور پر چن لیا تھا۔ اس کے دوستوں کا اپنا ایک بینڈ تھا جس کا وہ بھی حصہ تھی۔ کچھ پلے بیک سونگ بھی اس نے گائے تھے جو اتنے مشہور تو نہیں ہوئے تھے لیکن اتنا تھا کہ اس کی تھوڑی سی پہچان بن گئی تھی جس کے بل پر اب اسے ایک مشہور سنگر کے ساتھ ڈوئٹ کا موقع مل رہا تھا۔

"چلو ڈن۔۔۔ میں کوشش کر کے آج شام کو ہی لا دیتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں تمہیں ابھی ٹیکسٹ کر دیتی ہوں۔"

☆☆☆

"عمر تم نے شاپنگ بیگ رکھ لیا تھا گاڑی میں جو چچی نے دیا تھا؟" شیلفوں میں لگے نفیس برتن ایک بعد ایک دیکھتے مصباح کو اچانک یاد آیا تھا۔

"اوہ نو......" عمر کے بے اختیار ردعمل سے اسے اپنا جواب مل گیا تھا۔

"تم اتنے غیر ذمہ دار کیسے ہو سکتے ہو؟ اپنی عمر دیکھی ہے؟ اس عمر میں لڑکے کاروبار کے ساتھ گھر بھی سیٹ کر چکے ہوتے ہیں اور تم سے ایک شاپنگ بیگ کی ذمہ داری نہیں سنبھالی جا سکی۔ افسوس ہوا ہے دیکھ کر۔" رٹے رٹائے انداز میں مصباح نے چچی کے جملے دہرائے تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ہنس پڑا۔

اصل میں تائی امی نے چچی کو رحمہ کا سوٹ دکھایا تھا جسے حسب عادت چچی زویا کو دکھانے کے لیے اٹھا لائی تھیں۔ فیروز کے لیے چچی کا گھر آفس کے راستے سے ہٹ کر تھا اس لیے وہ اتوار سے پہلے سوٹ لینے نہیں آ سکتا تھا اور ادھر رحمہ جان کو آئی ہوئی تھی۔ ایسے میں ان کا چکر لگ گیا تو چچی نے شاپنگ بیگ انہیں تھما دیا کہ فیروز کے آفس کے راستے میں ان کا گھر پڑنے کی وجہ سے وہ شام کو گھر جاتے ہوئے لے جائے گا۔ اب چونکہ سوٹ انہوں نے عمر کو پکڑایا تھا تو اب زیر عتاب بھی اسی نے آنا تھا۔

"ایسا کرو تم اپنی شاپنگ پوری کرو تب تک میں سوٹ لے کر آتا ہوں۔"

"مجھے گھر جا کر کھانا بنانا ہے اور جتنی دیر میں تم واپس آؤ گے تب تک تو میں گھر جا کر کچھ پکانے کی تیاری کر لوں گی۔"

"اچھا تم یہ گاڑی کی چابی رکھو۔ میں رکشا لے کر چلا جاتا ہوں اگر مجھے دیر ہو گئی تو تم چلی جانا۔" اس کا جواب سنے بغیر گاڑی کی چابی ٹرالی میں پھینک کر وہ ایگزٹ کی طرف بھاگا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ گاڑی لے جانے سے انکار نہ کر دے۔ اب اتنے سارے سامان کے ساتھ وہ رکشے میں دھکے کھاتی اچھی لگے گی بھلا؟ یہی سوچ کر وہ رکا نہیں تھا۔

حسب توقع اس کی خریداری پوری ہونے تک عمر نہیں آیا تھا۔ اب خود گاڑی ڈرائیو کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ بعض معاملات میں وہ حد سے زیادہ ڈرپوک ہو جایا کرتی تھی ان میں سے ایک ڈرائیونگ تھا۔ حد درجہ معمولی رفتار کے ساتھ احتیاط سے گاڑی چلاتے وہ گھر کی طرف جا رہی تھی کہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر پڑا فون بجنے لگا۔ اس نے فون دیکھا۔ عمر کی کال آ رہی تھی۔ شاید اب وہ آ چکا تھا۔ فون اٹھانے کے لیے اس نے ہاتھ بڑھایا اور عین اسی لمحے کوئی اچانک اس کی گاڑی سے آ ٹکرایا۔ اس کا پاؤں فوراً بریک پر جا پڑا۔ اس کا بدترین وہم حقیقت کے قالب میں ڈھل چکا تھا۔ خوف زدہ ہو کر وہ گاڑی سے اتر آئی۔ شام کا ملگجا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس نے ابھی تک گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی ابھی تک آن نہیں کی تھیں۔ سراسر اسی کا قصور تھا۔ وہ وہیں گاڑی کے دروازے سے لگ کر رونے لگی۔ دماغ ایسا ماؤف ہوا تھا کہ اسے گاڑی میں پڑے فون کا خیال تک نہیں آیا تھا۔

عقب سے گاڑی آتی دکھائی دی تو اس کا رونا اور شدت اختیار کر گیا۔ اب کیا ہو گا؟ پولیس آئے گی؟ قتل کے جرم میں مجھے گرفتار کرے گی اور پھر سزا۔ عمر قید یا پھانسی۔ طرح طرح کی سوچیں اس کا دل دہلا رہی تھیں۔ گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی تھی۔

اسفند آفس سے کچھ جلدی نکل آیا تھا۔ احمر سے کہہ کر اس نے آیت کی مطلوبہ ڈی وی ڈیز منگوا لی تھیں اور اب وہی دینے گھر جا رہا تھا کہ اس کے بعد اسے آفس کے کام سے کسی سے ملنے جانا تھا۔ گھر کے راستے میں قدرے سنسان سڑک پر اسے عمر کی گاڑی نظر آئی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس گاڑی کے باہر ایک لڑکی کھڑی تھی جو یقیناً منہ پر دونوں ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔ عمر اس کے ڈیڈی کے آفس میں کام کرتا تھا اور اس کی عمر سے اچھی سلام دعا بھی تھی۔ اسی لیے اس نے گاڑی روک لی تھی۔ احمر کو بتا کر وہ نیچے اترا تو اس کے ساتھ ہی احمر بھی نکل آیا تھا۔

"میں بہت دھیان سے گاڑی چلا رہی تھی۔ پتا نہیں کیسے ایکسیڈنٹ ہو گیا اور یہ مر گیا۔ اب پولیس آئے گی؟ مجھے پھانسی ہو جائے گی لیکن میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا بچی۔" ان کے پاس آنے پر وہ روتے ہوئے کہنے لگی مگر جانے کیا بات تھی کہ ان دونوں کو ہنسی آ رہی تھی۔ اسفند کو اس کی آواز جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ احمر نے آگے بڑھ کر اسے دیکھا جو ابھی بھی گاڑی کے سامنے کروٹ پر گرا ہوا تھا۔

"کچھ نہیں ہوتا آپ فکر مت کریں۔ عمر کہاں پر ہے؟" اسفند کے کہنے پر اسے فون کا خیال آیا جو ابھی بھی بج رہا تھا۔ بجلی کی تیزی سے فون نکال کر اس

نے کال ریسیو کی۔
''عمر مجھ سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اور وہ آدمی مر گیا ہے۔ تم جلدی سے آجاؤ۔'' اس کے رونے میں ایک دم بلا کی تیزی آ گئی تھی۔ اسفند کو یہ جاننے میں بالکل دشواری نہیں ہوئی کہ وہ جو کوئی بھی تھی عمر کی بہت قریبی تھی۔ ''مجھے فون دیں میں بات کرتا ہوں۔'' نرمی سے اس کے ہاتھ سے فون پکڑ کر اسفند نے اپنے کان سے لگا لیا۔ قریب سے دو تین گاڑیاں گزری ضرور تھیں لیکن کسی نے رکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

''زندہ ہے اور غالباً نشے کی زیادتی کی وجہ سے بے ہوش ہوا ہے۔ ورنہ چوٹ تو کوئی دکھائی نہیں دے رہی۔''

یہ وہ آخری بات تھی جو مصباح نے بقائم ہوش و حواس سنی تھی۔ اس کے بعد وہ قریب کھڑے احمر کے پیروں میں جا گری۔ اسفند عمر سے بات ختم کر کے ان کی طرف آ گیا۔ دونوں نے مل کر اسے اسفند کی گاڑی میں ڈالا۔

''عمر کی بہن ہے یہ۔ گھر کا پتا میں نے عمر سے لے لیا ہے۔ ایسا کرو تم اسے گھر چھوڑ آؤ تب تک میں یہ معاملہ دیکھتا ہوں۔''

پانی کے چھینٹے دے کر اسے ہوش میں لانے کے بعد اسفند نے اسے احمر کے ساتھ گھر بھیج دیا اور ڈیڈی کے دوست کو کال کرنے لگا جن کا داماد پولیس میں اعلا درجے کا عہدیدار تھا۔ اس نے ان سے یہی کہا تھا کہ کسی وجہ سے وہ ڈیڈی کے ایمپلائی کی گاڑی لے کر نکلا تھا کہ ایک لڑکا نشے کی حالت میں گاڑی سے آٹکرایا۔ قریب ڈیڑھ سے دو گھنٹے میں وہ پولیس اسٹیشن میں ان کے ساتھ چائے پی کر سارا معاملہ نمٹا کر فارغ ہو چکا تھا۔ عمر کے گھر گاڑی دینے گیا تو اسے کافی حیرت ہوئی کہ احمر ابھی تک وہیں تھا۔ ان کے بے حد اصرار کے باوجود وہ گھر کے اندر نہیں گیا۔ اپنی گاڑی لے کر وہ احمر کے ساتھ وہاں سے نکلا تو اتنا زیادہ وقت ہو چکا تھا کہ مطلوبہ شخص سے ملنے کے لیے اسے اگلے دن کا وقت رکھنا پڑا۔ رہ رہ کر اس کے ذہن میں گھنٹیوں کی طرح میٹھی آواز گونج رہی تھی۔ اس کی باتیں یاد آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

''مصباح بیٹا تمہاری چچی اور زویا آئی ہیں۔ یہ کام وام چھوڑو اور جا کر اپنا حلیہ درست کرو۔ جلدی۔'' چینل کے لیے وہ ایک نئی ڈش تجرباتی طور پر بنا کر ٹرائی کرنے والی تھی اور اب امی کے کہنے پر اس کی طبیعت مکدر ہوئی تھی۔ گوشت کو فریج میں رکھ کر مزید کوئی پھیلاوا سمیٹے بغیر وہ کمرے میں چلی گئی۔ وہ جانتی تھی آج کی دوپہر مشکل ہونے والی ہے۔ جیسے ہر بار چچی کے آنے پر ہوتی ہے۔ انہیں مصباح کے رشتے سے بہت دلچسپی تھی کہ ابھی تک اس کا کہیں طے کیوں نہیں ہوا۔ تر و تازہ ہو کر کپڑے بدل کر وہ ان کے پاس لاؤنج میں آ گئی جہاں امی ان کی تواضع کے لیے لوازمات رکھ چکی تھیں۔ سلام دعا کے بعد وہ امی کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اور بھئی نجمہ کب سنا رہی ہو مصباح کے رشتے کی خوش خبری؟''

چچی کی بات پر مصباح کے ساتھ ساتھ امی کا بھی ناپسندیدہ موضوع شروع ہو چکا تھا۔ مصباح کی بڑھتی عمر سے وہ خود پریشان تھیں مگر اللہ کی رضا کے آگے خاموش تھیں۔

''دیکھیں بھابھی جب اللہ کی مرضی ہوئی۔''

''اللہ کی مرضی کے ساتھ ساتھ تمہارا اپنا بھی قصور ہے۔ کالج یونیورسٹی جا کر بھی اس نے دنیا کے رنگ ڈھنگ نہیں سیکھے۔ اس میں سب اسی کی غلطی نہیں ہے۔ تمہاری مڈل کلاس سوچ کا کیا دھرا ہے۔ لے کے دو سال کوکنگ کلاسز میں برباد کر دیے اور اب یہ کوکنگ چینل کا بکھیڑا کھڑا کر دیا ہے۔ یہی لڑکی کو کوئی سیلف گرومنگ کورس کروایا ہوتا تو کچھ فیشن کا پتا چلتا۔ اب زویا کو دیکھ لو انیس کی بھی نہیں ہوئی تھی جب پہلی منگنی ہوئی تھی۔ وہ تو ان کے نصیب میں ہی [illegible] ورنہ چھ ماہ [illegible] کر رہے اور میں نے پہلے سے بھی شاندار بر ڈھونڈ لیا اپنی بیٹی کے لیے......''

''یہ اور بات کہ آپ کی بیٹی ان کے مقدر میں بھی نہیں لکھی گئی۔'' ان کی بات کاٹ کر اپنی مرضی کا لقمہ جوڑتے عمر بھی ان کی آواز سن کر وہیں چلا آیا تھا۔ وہ آج آفس سے استعفیٰ دے کر جلدی گھر آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر جہاں مصباح نے سکون کی سانس لی تھی وہیں اس کی بات پر چچی اور زویا نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ رشتہ ٹوٹنے والی بات کا تو انہوں نے کسی سے ذکر بھی نہیں کیا تھا اب جانے عمر کو کیسے علم ہو گیا۔

''اور پچیس کی عمر میں منگنی نہ ہونا کوئی بڑی بات نہیں البتہ بائیس کی عمر میں دو دو منگنیاں ٹوٹنا بڑی بات ضرور ہے۔ ایک بات اور مصباح نے کوکنگ میں وقت برباد نہیں کیا کیونکہ کھانا تو ہر گھر میں پکتا ہے اور مصباح۔'' وہ مصباح کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم نے تائی امی کو دکھایا یوٹیوب کی طرف سے ملنے والا گولڈن پلے بٹن؟ بلکہ زویا نے تو دیکھی ہو گی میری اور مصباح کی تھینکس گوئنگ ویڈیو۔ تم ایسا کرو جا کر وہی بریانی بنا کر لاؤ جو اس دن مجھے بنا کر کھلائی تھی۔'' بڑے طریقے سے اس نے مصباح کی جان خلاصی کروائی تھی۔ مصباح کے جانے کے بعد ایک بار پھر وہ چچی کی طرف متوجہ ہوا۔

''کہیں زویا کے نہ ہوئی سسرال جیسا یعنی ہمارے گھر جیسا مڈل کلاس ماحول بھی ہوتا ہے جہاں کپڑے دھونے اور صاف صفائی کے لیے تو نوکر رکھے جا سکتے ہیں لیکن کچن خاتونِ خانہ کے ہی ہاتھ میں ہوتا ہے۔ میری ماں نے صرف بیٹی کو ہی نہیں بیٹے کو بھی مڈل کلاس ذہنیت کے ساتھ پالا ہے۔ مجھے بھی سجائی پلاسٹک کی گڑیوں جیسی لڑکیاں نہیں پسند اور اگر اللہ نے چاہا تو میرے نام سے اس گھر میں آنے والی لڑکی شکل و صورت میں بھلے کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن طریقے سلیقے سے میری ماں اور بہن جیسی ضرور ہوئی۔'' بات مکمل کر کے ایک گہری نظر اس نے جدید فیشن کے مطابق لباس میں بیٹھی زویا پر ڈالی تھی جس نے زویا کو پہلو بدلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ امی کی تو وہ حالت تھی گویا کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ آج تک انہوں نے ان کی اولاد نے کسی کو پلٹ کر جواب نہیں دیا تھا اور آج عمر سارے حساب چکتا کرنے کے درپے تھا۔

''تمہیں کیا سوجھی اچھا بھلا باپ کا چلتا کاروبار چھوڑ کر نوکری کر لی؟'' چچی نے فوراً بات کا رخ موڑا تھا۔

''یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ آپ کو کیا کسی کو بھی نہیں بتا سکتا۔ یہ بس میں اپنے سسرال والوں کو بتاؤں گا۔'' ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے وہ ایک بار پھر انہیں سلگا گیا۔

''عمر کیا بے ہودگی ہے یہ؟'' امی نے اسے گھرکا۔

''ویسے آپ کو پتا ہے زویا کی منگنی بار بار کیوں ٹوٹ رہی ہے؟'' امی کی تنبیہ ہواؤں میں اڑا کر اس نے سنجیدگی سے چچی کی طرف جھک کر کہا۔ جواباً وہ بھی اس کی طرف جھک گئیں البتہ زبان سے انہوں نے کچھ نہیں کہا تھا۔

''آپ نے اس کی منگنی وہاں کی ہی نہیں جہاں اس کی شادی ہونی تھی۔''

''لو...... کر لو بات۔ ہم نے تو شادی کے لیے ہی منگنی کی تھی ہمیں کیا پتا تھا یہاں بھی......'' اپنی بات انہوں نے خود ہی ادھوری چھوڑ دی۔ کیا کہتیں کہ بیٹی کے کرتوت ایسے تھے کہ وہ خود ہاتھ جوڑ کر نا کر گئے ہیں۔

''ویسے اب کی بار اس کی منگنی نہیں نکاح کیجیے گا اور کسی بھی رشتے کو فائنل کرنے سے پہلے مجھ سے بات ضرور کیجیے گا۔ اصل میں ایک دوست کے ابو ہیں جو استخارہ کر کے بتا دیتے ہیں اور اگر کوئی مسئلہ ہو تو حل بھی بتا دیتے ہیں۔ ساری بندشیں ٹوٹ جاتی ہیں اور بالکل صحیح جگہ بات فٹ ہو جاتی ہے۔ اپنی مصباح

کے لیے بھی ان سے بات کرنے والا ہوں۔" اس نے آواز اتنی کم رکھی تھی کہ کہیں امی کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔

"سچ میں بندش ٹوٹ جاتی ہے؟"

"بالکل۔ اب کی بار اس کا جہاں سے رشتہ آئے گا آپ کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا اور وہیں اس کی شادی ہوگی۔ ان شاء اللہ آپ کی نک چڑھی بیٹی خوش بھی رہے گی۔"

"اللہ کرے۔ تمہارے منہ میں گھی شکر۔" انہوں نے صدق دل سے دعا کی تھی کہ بات اپنی بیٹی کی تھی۔ وہ اس کے آنے والے رشتوں پر کتنا بھی اتراتیں سچ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی پریشان تھیں۔ بیٹی وہ کہ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دے۔ نخرے آسمان پر اور جسے اپنے سوا دنیا میں کچھ دکھائی نہ دے اس کے لیے پریشان نہ ہوتیں تو اور کیا کرتیں۔

کھانا کھانے کے بعد برتن سمیٹ کر مصباح کچن میں گئی تو زویا اس کے پیچھے ہی چلی آئی۔ مصباح حیرت سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا ورنہ ان میں کزنز والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

"ویسے یہ جو تم ویڈیوز بنا کر یوٹیوب پر ڈالتی ہو۔ کیا واقعی اس سے کھانا اچھا بنتا ہے؟" اس کے سوال پر مصباح حیران تو ہوئی تھی مگر اتنی نہیں جتنی اس کے آنے سے ہوئی تھی۔

"ہاں بالکل۔ کچھ اسٹیپس ایسے ہوتے ہیں جنہیں اسکپ کیا جا سکتا ہے اور اس سے کھانے کے ذائقے پر کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن میں ہر کام کو ایک منظم طریقے سے کرنے کی عادی ہوں اور کچھ مجھے لگتا ہے کھانا ذائقے کے ساتھ ساتھ دیکھنے میں بھی اچھا لگنا چاہیے۔ باقی ہر ڈش کی ترکیب کے ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے ٹوٹکے بھی میں بتاتی رہتی ہوں۔" اس نے خاصی وضاحت سے جواب دیا تھا جسے زویا نے بڑے دھیان سے سنا تھا۔

☆☆☆

آسمان سرمئی بادلوں کے خیموں سے اٹا پڑا تھا۔ دن کا تیسرا پہر جیسے جادو کے زور سے غائب ہوا تھا اور سہ پہر کے وقت ہی لان میں شام کا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ آیت لان میں بیٹھی موسم سے لطف اندوز ہونے کے ساتھ ساتھ ہیڈ فون لگائے اپنے گانے کی ریہرسل کر رہی تھی۔ یہاں سے واپسی پر اس کے گانے کی ریکارڈنگ تھی۔ اس کا پہلا آفیشل گانا ریکارڈ ہونا تھا وہ بھی ایک مشہور گلوکار کے ساتھ۔ انگلینڈ میں ایک سے مصروف روز و شب سے طبیعت اوب سی گئی تھی اور اپنے پہلے آفیشل گانے کی ریکارڈنگ سے پہلے وہ اس جمود سے نکلنا چاہتی تھی۔ تب ہی تو جب مما نے اسے پاکستان آنے کا کہا تو وہ راضی خوشی ان کے ساتھ آ گئی۔

خوش گوار موسم نے اس کی طبیعت پر ایسا اچھا اثر ڈالا تھا کہ پچھلے کئی گھنٹوں سے وہاں بیٹھے رہنے کے بعد بھی وہ بالکل تر و تازہ تھی۔ ننھی ننھی بوندوں کے قافلے زمین پر اترنے لگے تھے۔ ہلکی پھوار کے ساتھ ٹھنڈی ہوا سے دل قفس میں مقید پنچھی کی طرح مچلا جا رہا تھا۔ ساکن و جامد منظر سے متحرک اور رواں منظر میں ڈھلنے کی خواہش لیے فون جینز کی پاکٹ میں ڈال کر مما کو بتاتی وہ گھر سے باہر نکل آئی۔

تقریباً ہر گھر کے سامنے گھاس کا ایک چھوٹا سا قطعہ ضرور موجود تھا جہاں مختلف انواع و اقسام کے پھول اپنی خوب صورتی اور تازگی سے دل موہ رہے تھے۔ وہ گھر سے رونق دیکھنے نکلی تھی لیکن باہر اتنا پیارا موسم ہونے کے باوجود کوئی خاص چہل پہل نہیں تھی۔ ایک دو جگہ بچے کھیل رہے تھے یا پھر پاس سے اکا دکا گاڑی گزر جاتی اور بس۔ اس کی طرح آوارہ گردی کرنے کوئی دوسرا نہیں نکلا ہوا تھا۔

چلتے چلتے وہ کافی دور نکل آئی تھی۔ یہ کالونی کا داخلی راستہ تھا اور یہاں پر اچھی خاصی رونق دکھائی دے رہی تھی۔ پھلوں کی ریڑھیاں اور مختلف اشیاء کی دکانیں تھیں۔ ایک طرف رکشوں کی قطاریں لگی تھیں۔ وہ بھی عام انسانوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئی۔

ہلکی ہلکی پھوار نے ایک دم تیز بارش کا روپ دھار لیا تھا۔ بھیگنے سے بچنے کے لیے وہ جلدی سے ایک گفٹ شاپ میں گھس گئی۔ لینا تو اسے کچھ تھا نہیں بس وقت گزاری کے لیے وہ ایک کے بعد ایک شیلف کے سامنے سے گزرتی چیزیں دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ مصنوعی پھولوں کے بکے دیکھتی وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ کسی نے ان نقلی پھولوں کی اوٹ سے قدرتی پھول تلاش لیا ہے۔

پندرہ بیس منٹ گزرنے پر بارش ہلکی ہوئی تو وہ گھر جانے کے لیے جلدی سے نکل کھڑی ہوئی کہ کہیں بارش پھر سے تیز نہ ہو جائے۔ بھیگی سڑک پر چلتے اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ راستہ کھو چکی ہے۔ گوگل میپس کی وجہ سے وہ بے فکر تھی اور اسی بے فکری سے اس نے جب جینز کی جیب سے فون نکال کر ہاتھ میں پکڑا تو اسے پتا چلا فون تو بیٹری لو ہونے کی وجہ سے بند ہو چکا تھا۔ اب نہ تو اسے گھر کا راستہ سمجھ میں آ رہا تھا اور نہ ہی اسے کسی کا فون نمبر معلوم تھا۔ حد تو یہ کہ اسے گھر کا پتا بھی معلوم نہیں تھا۔ رات کا اندھیرا دھیرے دھیرے پھیلنے لگا تھا۔ خوف کے سائے اس کا دل دہلانے لگے تھے۔ گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کرتے تیز تیز قدم اٹھاتے وہ ایک سے دوسرے راستے پر چلتی جا رہی تھی۔ انجوائے منٹ کے چکر میں اور گوگل میپس کے آسرے پر اس نے ٹھیک سے راستوں پر دھیان نہیں دیا تھا ورنہ اس وقت اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہاں ہر گھر ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا اور ہر راستہ دوسرے سے مماثل۔ اپنی پریشانی میں اس نے دھیان ہی نہیں دیا کہ کب رائل بلو جینز اور سفید شرٹ والا لڑکا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ کب سے وہ نظروں کے حصار میں تھی۔

"آپ راستہ بھول گئی ہیں؟"

اس کی بات پر آیت کو اندازہ ہوا کہ وہ اچانک سے اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ وہ یقیناً اسے یہاں سے وہاں چکر کاٹتے دیکھتا رہا تھا۔ جواب دیے بغیر وہ جلدی جلدی اسی راستے پر چلنے لگی جو اس کے پیروں کے نیچے ناک کی سیدھ میں جاتا تھا۔ پاکستان کے بارے میں عجیب و غریب خبریں وہ سنتی رہی تھی اور اس کا ایسی کسی خبر کا حصہ بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"میں ذاتی طور پر اس علاقے کو زیادہ نہیں جانتا مگر میرا ایک دوست یہاں رہتا ہے۔ آپ بتائیں آپ نے کہاں جانا ہے اگر میں مدد نہ کر سکا تو اپنے دوست سے پوچھ دوں گا۔"

اسے اس کی پیشکش سمیت نظر انداز کرتے آیت تیزی سے چلتی جا رہی تھی۔ اس کے پیروں میں درد شروع ہو چکا تھا۔

"یہ علاقہ زیادہ گنجان آباد نہیں ہے اور رات ہو رہی ہے۔ زیادہ تاخیر ہم دونوں کو مشکل میں ڈال سکتی ہے۔ آپ مجھ پر اعتبار کر سکتی ہیں۔"

آیت نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ تر و تازہ چہرے پر چمکتی سیاہ آنکھیں جیسے جگنوؤں سے مقابلے پر تھیں۔ اچھا خاصا معقول بندہ تھا۔ ہمیشہ کی طرح آیت نے چند لمحوں میں فیصلہ کر لیا تھا۔

"میں جہاں سے گزر کر آئی ہوں وہاں پر ایک بڑا سا بل بورڈ ہے جس پر موبائل کمپنی کا کوئی اشتہار تھا جس کے قریب......"

"ایک چھوٹی سی بیکری ہے اور ایک بوتیک بھی جو غالباً گھر میں ہی کھولی گئی ہے۔" اس کی بات ٹوک کر اس نے مرضی کا لقمہ دیا۔

آیت نے ابرو اچکا کر ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو ابھی تم اس علاقے کو زیادہ نہیں جانتے۔

"اصل میں میرے دوست کا گھر اس سے قریب ہی ہے اور شاید یہ واحد بل بورڈ ہے اس علاقے میں جسے میں جانتا ہوں۔" مسکراتے ہوئے اس نے وضاحت دی تو آیت بھی مسکرا دی۔ "ویسے اس وقت ہم بالکل مخالف سمت میں چل رہے ہیں۔ اس طرف آئیں۔" کہنے کے ساتھ ہی وہ ایک طرف مڑ گیا تو آیت بھی اس کے پیچھے چل دی۔ باقی کا

راستہ بھی خاموشی میں کٹا۔ آیت کی سوچ کے برعکس اس نے کہیں بھی فری ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے فون پر دو ایک بار بیل ہوئی جسے اس نے کمال بے نیازی سے نظر انداز کر دیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اپنی مطلوبہ جگہ پر تھے۔ بل بورڈ دیکھتے ہی آیت کے قدموں نے رفتار پکڑ لی تھی۔

''یہیں سے آئی تھیں آپ؟''

اثبات میں سر ہلا کر وہ اپنے راستے چل دی جبکہ وہ وہیں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا اور ایک بار پھر سے بجنے والے فون کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چند قدم چلنے کے بعد آیت کو احساس ہوا کہ اس نے اس لڑکے کا شکریہ تو ادا کیا ہی نہیں۔ اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہوتے ہی وہ واپس پلٹی۔

''تم نے کبھی بتایا نہیں تمہاری کالونی میں پریاں بھی راستہ بھول کر آ جاتی ہیں۔'' وہ راستے کے دائیں جانب کھڑا فون پر بات کر رہا تھا اور یقیناً اسی کی بات کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل سکڑ کر پھیلا۔ وہ اس کے سامنے ایسی کوئی بات کرتا تو وہ اسے فلرٹ کہہ سکتی تھی لیکن اب وہ اسے کیا کہے اسے خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ شکریہ ادا کرنے کا ارادہ موخر کر کے وہ اس کی نظر میں آئے بغیر واپس مڑ گئی۔

☆☆☆

آج چھٹی کا دن تھا۔ شہریار کل رات ہی گھر لوٹے تھے اس کے باوجود ناشتے پر سب کے ساتھ موجود تھے۔

''دیکھ لو شیری۔ تمہارا بیٹا اتنا بے مروت ہے کہ لگتا ہی نہیں تمہارا بیٹا ہے۔''

پھپھو کی بات پر اسفند کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہنے والی ہیں اسی لیے مسکرا کر چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

''کیوں بھئی اسفند تم آیت کو ابھی تک کہیں باہر کیوں نہیں لے کر گئے؟'' اماں نے کل رات ہی انہیں بتا دیا تھا کہ اسفند انہیں وقت نہیں دے پا رہا اور آیت تو وہ اکیلے نہیں بھیجنے پر رضامند ہیں نہیں اسی لیے وہ اتنے دنوں سے گھر میں بند ہو کر بیٹھی تھی۔

''کیا آپ کو لگتا ہے مجھے اس بات کا جواب دینا چاہیے؟'' اس کا لہجہ شرارتی ہوا۔

''نہیں بالکل بھی نہیں۔ کل سے میں خود آفس دیکھ لوں گا تم بس میری بیٹی کو پورے شہر کی سیر کروا دو۔'' جواب وہ جانتے تھے تب ہی شگفتگی سے اسے ان ذمہ داریوں سے آزاد کیا جو اسے روکے ہوئے تھیں۔

''جو حکم باس۔ آج ہی شروعات کرتے ہیں۔ کیوں آیت؟ ٹھیک ہے؟''

اسفند کی بات پر آیت کے دل کی کلی کھل گئی۔ وہ تو یوں بھی من موجی قسم کی بندی تھی مگر جب سے پاکستان آئی تھی جیسے قید ہو کر رہ گئی تھی۔

''ہاں بالکل یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔''

''چلو تو پھر شام کو کہیں نکلتے ہیں۔۔ میرے فیورٹ ریسٹورنٹ میں کھانے سے شروعات کرتے ہیں۔''

آسمان سرمئی بادلوں کی ردا اوڑھے بیٹھا تھا۔ ہوا کا نام ونشان تک نہیں تھا اور حبس ایسا کہ خدا کی پناہ۔ ایسے میں آیت کو پبلک پلیس پر لے کر نکلنے کا مطلب تفریح کم اور خواری زیادہ تھا۔ اسی لیے اس نے شام کا پلان رکھا تھا۔ مگر دوپہر کے وقت آنے والی عمر کی کال نے ان کا پلان شام کے بجائے رات پر ڈال دیا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر رات کے کھانے پر بلا رہا تھا مگر وہ چونکہ آیت کو پہلے ہی کہہ چکا تھا اس لیے رات کے کھانے کے بجائے شام کی چائے پر اتفاق ہو گیا تھا۔ اصل میں عمر کے گھر والے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے خاص طور پر اس کی بہن۔ اس دن اسفند نے انہیں موقع ہی کب دیا تھا بھلا۔ وہ تو اب بھی جانے سے انکاری تھا مگر عمر کی امی نے اتنے پیار اور خلوص سے اصرار کیا تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکا اور پھر کچھ اور بھی تھا جو اسے جانے پر اکسا رہا تھا۔ آیت کو ضروری کام کا کہہ کر تیار رہنے کی ہدایت دیتا وہ عمر کی طرف چلا گیا۔

دروازہ کھولنے والے لڑکے کی عمر سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں ہو گی لیکن اس کی چشمہ لگی گول گول آنکھیں جیسے ایکسرے مشین کی طرح اسفند کو اسکین کر رہی تھیں۔

''میں عمر کا چھوٹا بھائی ہوں۔ میرا نام قمر ہے۔'' راہداری میں اس کے ساتھ چلتے اس نے تعارف کی رسم نباہی۔ اسفند کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے جواب میں کیا کہنا چاہیے۔

اس کی معیت میں اسفند ایک ہال نما کمرے میں پہنچا جس کے درمیان میں لگے دبیز پردوں نے ہال کو دو حصوں میں منقسم کر دیا تھا۔

''عمر اب اگر تم نے کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو میں امی کو آواز دے دوں گی۔'' کمرے میں کسی نے چاندی کے سکے اچھال دیے تھے۔ وہی دل کو سکون دیتی میٹھے جھرنے کی آواز۔ بھلا ایسا لب ولہجہ عام کہاں تھا۔

''میں ابھی بھائی کو بلا کر لاتا ہوں۔'' ایک لمحے سے پہلے وہ اسے وہاں چھوڑ کر اس کی آمد کی اطلاع دینے، ہوشیار باش کرنے چلا گیا تھا۔

''امی ی ی ی ی ی ی......'' یقیناً عمر نے کچھ اٹھایا تھا۔ اسفند نے اندازہ لگایا۔

''کوئی چیز اٹھا کر ہاتھ پر مار دیا سر پہ......''

اس دھوری بات کے بعد خاموشی چھا گئی تھی۔ اسفند کھل کر مسکرایا۔ پردے کے پیچھے سے عمر اور قمر آگے پیچھے نکلے تھے۔

''آئم ساری۔'' سلام دعا کے بعد ہاتھوں سے بال سنوارتے اس نے بشاش لہجے میں ایک فارمیلیٹی نباہی۔

''کوئی بات نہیں۔ یہی تو ان رشتوں کا حسن ہے۔ شکر ادا کیا کریں کہ دینے والے نے آپ کو جی بھر کر نوازا ہے۔'' اس کا لہجہ گو سادہ سا تھا لیکن فون میں گم قمر نے اس بات پر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سے فون پر مصروف ہو گیا۔

عمر کی امی اسے اتنے تپاک سے ملی تھیں گویا وہ ان کا کوئی قریبی رشتے دار ہو۔ نہ کوئی تصنع نہ کوئی بناوٹ۔۔ وہ سچ میں ان سے بہت متاثر ہوا تھا۔ بزنس کے علاوہ اسے فنکشنز یا پارٹیز میں جانے کا کوئی زیادہ تجربہ نہیں تھا لیکن یہ بزنس ڈنر وغیرہ سے اس نے ذہن بنا لیا تھا کہ ہر تقریب ایسی ہی فارمل ہوتی ہے، ہر چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جن رشتہ داروں کی طرف جانا ہوتا تھا وہاں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ مگر یہاں کے پر تکلف ماحول کو دیکھ کر اسے صحیح معنوں میں زندگی اور زندہ دلی کا احساس ہوا تھا۔

میز پر دھرے چائے کے لوازمات دیکھ کر اسے حیرت نے گھیر لیا۔ جب چائے پر اتنا اہتمام ہے تو اگر وہ رات کے کھانے کی دعوت قبول کر لیتا تو کیا ہوتا۔ اسی وجہ سے اس نے کھانے سے انکار کیا تھا۔ اب چائے پر ایسا اہتمام تو اس کی سوچ سے بھی باہر تھا۔ جانے کتنی قسم کے کباب تھے، دو تین قسم کے پکوڑے، فرائیڈ چکن اور جانے کیا کیا۔ چار پانچ طرح کی تو بس چٹنیاں ہی تھیں۔

''آپ نے یوں ہی اتنا تکلف کیا۔'' اس نے چائے کے کپ پر ہی اکتفا کیا۔

''ارے نہیں بیٹا تکلف کیسا۔ وہ تو بس مصباح تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہ رہی تھی۔ اس دن وہ اتنی خوف زدہ تھی اور کچھ تم نے ہی موقع نہیں دیا شکریہ ادا کرنے کا تو بس اسی بہانے بلا لیا۔''

''شکریے کی کیا بات ہے آنٹی۔ اس وقت مجھے جو مناسب لگا میں نے وہی کیا۔''

قمر نے ایک بار پھر اس کی بات پر غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

''ارے آپ کچھ لے کیوں نہیں رہے؟'' اسے صرف چائے پیتے دیکھ کر عمر نے ایک ایک کر کے سب کچھ اس کے سامنے پلیٹ میں ڈھیر کرنا شروع کر دیا تھا۔

''میں لڑکیوں کی طرح ایج کانشس تو نہیں

ہوں لیکن اپنی عمر کے لوگ جب آپ جناب کر کے بات کرتے ہیں تو یقین مانو بڑے بزرگوں والی فیلنگز آنا شروع ہو جاتی ہیں۔" اس کے جواب پر عمر کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔

"اصل میں تم مجھے ملے ہی اس دفتر میں ہو جس کے آنر تمہارے پاپا ہیں اور میں ایمپلائی ورنہ اگر مجھے کسی کالج واج میں مل جاتے تو پناہ مانگتے۔" عمر نے اس کے ساتھ اپنی پلیٹ نئے سرے سے بھرنی شروع کر دی تھی۔

"ان دونوں بھوکوں سے ہی کچھ بے تکلفی سیکھ لیتے۔ ایسے بے صبروں کی طرح کھا رہے ہیں جیسے نہ اب سے پہلے کچھ ملا ہے اور نہ اس کے بعد ملے گا۔"

نجمہ خاتون کی بات پر وہ مسکرا کر رہ گیا۔ اسے ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ وہ پہلی بار اس گھر میں آیا ہے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں سے اس گھر کا حصہ رہا ہے۔ ایک بھرپور گھریلو زندگی اس کے اولین خوابوں میں سے تھی اور اس خواب کو حقیقت کی صورت اس نے اس شام اس گھر میں جیا تھا۔ یہ اس کی زندگی کی ایک یادگار شام تھی۔

طعام سے فراغت کے بعد اس نے جانے کی اجازت چاہی۔

"آپی نے شکریہ ادا کرنے کے لیے اتنی محنت کی ہے اور آپ بنا شکریہ وصول کیے جانے کی بات کر رہے ہیں۔ اصل میں صبح سے کچن میں تھیں تو اب فریش ہونے گئی ہیں۔ تب ہی تو ہم نے بھی جی بھر کر انجوائے کر لیا ورنہ وہ تو گھور گھور کر ہی بندہ پگھلا دیتی ہیں۔" اس کے کان کے پاس جھک کر قمر نے سرگوشی میں کہا تھا۔

پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے اس کے سامنے امی سے عزت افزائی کروانے کے بعد قمر کی بھی شرم جھجک دور ہو گئی تھی اور کچھ اسفند کے خوش گوار ردعمل نے اس کا پکے کاروباری شخص والا امیج دھو دیا تھا۔ قمر کی بات پر اسفند کے کانوں میں چاندی کی گھنٹیاں جھنجھنا اٹھیں۔ برسات کی یہ پُرحبس شام واقعی یادگار ہونے والی تھی۔

کچھ دیر میں ہی وہ نکھری نکھری آسمانی رنگ میں ملبوس ایک خواب کی طرح اس کے روبرو تھی۔ ملیح چہرہ میک اپ سے پاک تھا البتہ ہونٹوں پر نیچرل کلر کی لپ اسٹک بہار دکھا رہی تھی۔ ایسا خوب صورت کلام ان ہونٹوں کا ہی ہونا چاہیے تھا مصباح کو بات کرتے دیکھ کر اس نے کتنی بار سوچا تھا۔ ایک خوب صورت شام گزار کر یہاں سے جانے کے بعد اس رات جب وہ آیت کو کھانا کھلانے کے بعد گھر لے کر گیا تو بادل ٹوٹ کر برسا تھا اور اس بارش میں بھیگتے اس نے محبت کا راز دریافت کر لیا تھا۔ محبت ایک وحی کی صورت اس کے دل پر اتری تھی۔ سرشاری کے عالم میں وہ بھیگتا ہی چلا جا رہا تھا۔

کمرے کی کھڑکی سے اس کے انتظار میں بیٹھی بی جان ایک ٹک اس کی بے خودی دیکھ رہی تھیں۔ بچپن سے ہی اسے بارش میں بھیگنا پسند نہیں تھا۔ تو کیا اس تبدیلی کی وجہ آیت تھی؟ آج ہی تو فرحانہ نے ان سے آیت اور اسفند کے رشتے کی بات کی تھی۔ اب اگر وہ اسفند کی بھی خوشی تھی تو پھر دیر کی کوئی وجہ نہیں بنتی تھی۔

☆☆☆

اپنے آفس کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے ہوئے اسے باہر کے موسموں سے دل کے موسم کا تعلق سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس کے اندر اتنا حبس تھا کہ سانس لینا بھی دوبھر ہوا تھا۔ احمر کو فون کیے کافی دیر ہو چکی تھی اور اب وہ کسی بھی لمحے آنے والا تھا۔ ایک وہی تو تھا جس کے سامنے اسفند اپنا دل، اپنا آپ کھول سکتا تھا۔ ابھی دل نے پہلی اڑان بھری تھی، کھلی فضاؤں میں بھیگی خوشبوؤں کا ذائقہ چکھا تھا اور ابھی خوشیوں کی تتلیوں کو بے موت مر جانے کا حکم مل گیا تھا۔

پچھلی رات ڈیڈی نے اسے اپنے کمرے میں بلا کر بی جان کا حکم سنایا تھا۔

"بی جان چاہتی ہیں تمہاری پھپھو کے جانے

سے پہلے تمہارا اور آیت کا رشتہ باضابطہ طور پر طے کر دیا جائے۔ اس کے لیے رنگ تم اور آیت اپنی مرضی لے لو اور نکاح کے لیے اگلی بار نوید بھی فرحانہ اور آیت کے ساتھ آ جائے گا۔"

اسے لگا کوئی بم تھا جو اس کی سماعتوں کے پاس پھٹا تھا۔ اس کے رشتے کی خبر اسے ایسے سنائی جائے گی اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ تب اس نے ایک لمحے میں فیصلہ کر لیا تھا۔

"مگر ڈیڈی میں نے جیون ساتھی کے طور پر کسی اور کو چن لیا ہے۔ میں یہ نکاح نہیں کر سکتا آپ بی جان کو بتا دیں۔"

جواباً انہوں نے گہری سانس بھری تھی۔

"میں کچھ کہنے کے قابل ہوتا تو اس وقت کہتا جب میری اپنی زندگی کا سوال تھا۔" ان کے چہرے پر ماضی کے کسی جگمگاتے لمحے کا عکس اندھیر ہوا تھا۔ "اپنے لیے ہر انسان خود ایک بہترین وکیل ہوتا ہے اس لیے بہتر ہے تم خود بی جان سے بات کرو۔"

اب اسفند کیسے ان سے بات کرتا سو اس کام کے لیے اس نے احمر کو بلایا تھا۔

"بی جان میری اور آیت کی شادی کروانا چاہتی ہیں۔" احمر کو سانس لینے کا موقع دیے بغیر وہ شروع ہو گیا تھا۔

"واؤ۔ میرے یار کے سہرے کے پھول کھلنے والے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خوشی کی خبر اور کیا ہو گی۔" احمر چہک رہا تھا اور اسفند کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس طرح مصباح کے بارے میں بات کرے۔

"تم یقین کر سکتے ہو کہ محض ایک دو ملاقاتوں میں کوئی کسی کے لیے اتنا اہم ہو جائے کہ اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی ختم ہو جائے؟" بات کرتے ہوئے وہ جیسے کسی اور ہی جہان میں پہنچا ہوا تھا۔ احمر نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا اسے بات کی تہ میں پہنچنے میں۔

"میں تو پہلی نظر کی محبت کا شکار ہوں مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟" احمر کی آنکھوں میں کسی خیال نے اتنے دیے جلا دیے تھے کہ ایک لمحے کے لیے اسفند سب بھول گیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے احمر کے لفظوں پر بھی دھیان نہیں دیا تھا۔

"احمر۔ تم ایک بار بی جان تک میری مرضی پہنچا دو کہ میری زندگی کا محور آیت نہیں مصباح ہے تو اس کے بعد میں سب خود سنبھال لوں گا۔"

"مصباح...... یہ وہی لڑکی نہیں......"

"وہی ہے احمر۔ وہی ہے جس کی آواز پر ہی دل نے سارے دروازے کھول دیے تھے۔" احمر کی بات کاٹ کر وہ ایک جذب کی کیفیت میں بولا تھا۔

"تو تو گیا کام سے۔ ویسے پہلے تو نہیں بتایا تم نے کچھ۔ اب سر پہ آ پڑی ہے تو مدد کے لیے بلا لیا۔"

"ابھی ابھی تو خود مجھ پر یہ راز کھلا ہے اور ویسے بھی تم میری مدد کرو گے تو وہ جو اوپر ہے نا؟ وہ خود تمہاری مدد کرے گا۔"

اس کی بات پر احمر نے ایک مکا اس کی کمر پر مارا۔

"یعنی تم سے کوئی امید نہ رکھوں؟"

"اوہ نہیں جگر تیرے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔ بس کبھی بھول کر بھی مانگ مت لینا۔" اسفند کی بات پر وہ دونوں قہقہہ لگاتے ہنس پڑے۔

"وہ ہے کون جس کے خیال نے ہی تجھے انرجی سیور کا اشتہار بنا دیا تھا؟"

اسفند کی ایسی بھونڈی تشبیہ پر احمر نے اب کی بار واقعی بہت زور سے مکا مارا تھا اور ہنسی مذاق میں یہ بات وہیں دفن ہو کر رہ گئی۔

☆☆☆

یہ چھٹی کا دن تھا۔ سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ امی ابو خاندان میں ہونے والی کسی فوتگی میں گئے ہوئے تھے جب کہ عمر قمر اپنے اپنے کمروں میں ٹی وی لگا کر بیٹھے تھے۔ مصباح اپنے کمرے میں بیڈ پر لیپ ٹاپ لیے بیٹھی تھی۔ پورے گھر پر خاموشی کا راج تھا۔ ایسے میں بیل کی غیر متوقع آواز صور اسرافیل محسوس

ہوئی تھی۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد مصباح اٹھ کر دروازہ کھولنے چلی گئی کہ عمر قمر سے ایسی کسی نیکی کی توقع رکھنا ہی فضول تھا۔ دروازے پر کھڑی زویا کو دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے حیران ہوئی تھی۔ دوپہر کو جانے سے پہلے امی کی چچی سے بات ہوئی تھی اور یہ سب اکٹھے ہی جانے کے لیے نکلے تھے۔ یعنی زویا جانتی تھی امی ابو گھر پر نہیں ہیں پھر بھی آگئی تھی۔ اب اس کی مصباح کے ساتھ ایسی کوئی دوستی نہیں تھی کہ وہ اس سے ملنے چلی آئے تو پھر کیا بات تھی۔ دروازہ کھلنے پر ڈرائیور کو جانے کا اشارہ کر کے وہ اس کے ساتھ اندر آگئی تو یہ عقدہ بھی کھل ہی گیا۔

''میں نے یہ کڑاہی گوشت بنایا تھا تمہاری یوٹیوب والی ریسپی سے۔ گھر میں تو کوئی کچھ بتاتا نہیں سوائے اس کے کہ ٹھیک بنا ہے یا ٹھیک نہیں بنا۔ سوچا آج تائی امی تایا ابو بھی گھر پر نہیں ہیں تو تمہیں چیک کروا لوں ورنہ تائی امی کے ہوتے ہوئے تو بہت ڈر لگتا ہے ایسے کچھ لانے سے۔'' بنا جھجکے بیگ میں سے ایک چوکور ٹفن نما ڈبا نکال کر اس کے سامنے رکھتے وہ اسے حیران کر گئی تھی۔ زویا اور کوکنگ۔ ناممکن سی بات لگتی تھی۔

اس سے پہلے کہ مصباح سالن کا ڈبا اس کے سامنے سے پکڑتی کھلے دروازے سے عمر اندر آگیا۔ وہ مصباح سے پوچھنے آیا تھا کہ دروازے پر کون تھا مگر سامنے بیٹھی زویا کو دیکھ کر اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ زویا کو دیکھ کر دم بھر کے لیے مصباح کی طرح وہ بھی حیران تو ہوا تھا۔

''واہ جی واہ۔ آج تو گھر میں ہی مہمانداری ہو گئی میری۔'' ڈبے پر نظر پڑتے ہی اس نے لپک کر اٹھا لیا اور اب ڈھکن کھول کر خوشبو اپنے اندر اتارنے لگا۔

''مصباح میرے لیے دو روٹیاں تو اتار دو ذرا۔ اسی بہانے میں دوپہر کا کھانا بھی کھا لوں گا۔'' ویسے تو وہ روٹی کے بغیر ہی کھانا شروع ہو چکا تھا۔

''مزے کا بنا ہوا ہے۔''

''عمر زویا میرے چکھنے کے لیے لائی ہے۔'' اس کی حرکت پر شرمندہ ہوتی مصباح کی آواز میں اس کے لیے تنبیہہ تھی جسے اس نے کمال لاپروائی سے نظر انداز کر دیا تھا۔

''کیوں تم نے کبھی کڑاہی گوشت نہیں چکھا؟''

''وہ خود بنا کر لائی ہے میری ریسپی سے۔''

''ہیں۔'' اس کی بات پر عمر کی آنکھیں ابل کر باہر آنے کو ہو گئی تھیں۔ اس کی حیرت سے فائدہ اٹھاتے مصباح نے اس کے ہاتھ سے سالن پکڑ لیا تھا۔

''زویا تم نے کب سے کھانا بنانا شروع کر دیا؟ وہ بھی ایسا لاجواب؟''

''بس کوشش کرتی ہوں بنانے کی۔'' زویا کے لہجے میں خوشی چھلک رہی تھی۔ ورنہ عمر جیسے بدلحاظ بندے سے کچھ بعید نہیں تھا کہ ابھی کے ابھی عزت افزائی شروع کر دیتا۔

انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر مصباح باورچی خانے میں چلی گئی تھی تاکہ سالن کو کہیں محفوظ کر سکے جہاں عمر کی رسائی نہ ہو اور ویسے بھی جب سے زویا آئی تھی اس نے پانی کا ایک گلاس تک نہیں دیا تھا اسے۔ پہلے سے بنے جوس کا اسٹائلش جگ ٹرے میں رکھ کر اس کے ساتھ کے دو گلاس لیے وہ واپس ان کے پاس آگئی۔

''میں کہہ رہا تھا آج کا دن ویسے بھی یادگار تو ہے ہی چلو اسے اور یادگار بناتے ہیں۔ کہیں باہر چلتے ہیں۔ تم جا کر تیار ہو جاؤ کچھ شاپنگ وانپنگ کر لینا اور میں زویا کو کوئی انعام وغیرہ دلوا دوں گا۔'' عمر نے ایسے بات کی تھی جیسے یہ سب معمول کی بات ہو ورنہ وہ تینوں جانتے تھے کہ اس سے غیر معمولی بات آج کی تاریخ میں اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ مصباح نے ان کے چہروں پر ایسی تحریر لکھی دیکھی تھی جسے وہ پڑھنے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

دیدار یار کا ارادہ ہے گر
سر کے بل چلے آئیے

اسفند نے ہاتھ میں پکڑا فون کان سے اتار کر ایک نظر دیکھا۔

''احمر طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟''

''سو فیصد ٹھیک ہے۔ بس تم یہ سمجھ لو تمہاری ایک شارٹ ڈیٹ ارینج کروا رہا ہوں۔ میں یہاں امپوریم آیا ہوں اور یہاں پر مصباح بھی ہے۔ اس کا بھائی بھی ایک لڑکی کے ساتھ پھر رہا ہے۔ اب اگر تم چاہووو۔۔۔ بس منٹ لگاؤ۔'' ذومعنی انداز میں بات ختم کر کے اس نے فون کاٹ دیا۔

اسفند گاڑی میں ہی تھا۔ آیت کو شہر کی کچھ تاریخی عمارات دکھانے کے ارادے سے وہ گھر سے نکلا تھا اور اب احمر کے فون نے اس کا ذہن ہی بدل دیا تھا۔

''آیت مجھے احمر سے ملنا ہے بس تھوڑی دیر کے لیے۔ اصل میں وہ امپوریم ہے اور اس نے کچھ کپڑے لینے ہیں۔ میرے بغیر اسے چوز کرنے میں مشکل ہو رہی ہے اس لیے مجھے بلا رہا ہے۔'' اس نے بڑا مناسب بہانہ گھڑا تھا۔

آیت کا احمر سے غائبانہ تعارف تھا۔ سو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ امپوریم میں تھے۔ آیت کو ایک لیڈیز کپڑوں کی دکان میں گھسا کر اسفند نے احمر کا نمبر ملایا۔

''کہاں ہو؟'' اس کا سوال احمر نے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا اور جواباً احمر نے اسے اپنی لوکیشن بتائی۔ اصل میں احمر ایک مناسب فاصلے سے مصباح کا تعاقب کر رہا تھا اگر وہ ادھر ادھر ہو جاتی تو اتنے بڑے شاپنگ مال میں وہ دونوں اسے کیسے ڈھونڈتے۔

''اچھا احمر آیت میرے ساتھ ہے اور میں نے اس سے یہ کہا ہے کہ تم نے کپڑوں کی کچھ شاپنگ کرنی ہے اور وہ بھی میری چوائس سے۔ اس لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ اب تم اس کے سامنے خیال رکھنا۔'' اس کی بتائی گئی لوکیشن کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے اسفند نے اسے بتایا۔

''ہاں یار موسم بھی بدل گیا ہے ابھی تک ایک شرٹ بھی نہیں لی۔ میں خود سوچ رہا تھا شاپنگ کا۔ اب تم اپنی مرضی سے جیسی بھی شرٹس لے کر دو گے میں چپ کر کے رکھ لوں گا۔''

''مطلب پرست انسان موقع دیکھتے ہی فائدہ۔'' بات کرتے کرتے اس کی نظر مصباح پر پڑ گئی تو بات ادھوری چھوڑ کر اس نے فون کاٹ دیا۔

''السلام علیکم۔''

اپنے انتہائی قریب سے سلام کی آواز سن کر مصباح نے مڑ کر دیکھا۔ وہ اسفند تھا۔ ایک خوش گوار اتفاق کی وجہ سے خوش گوار حیرت نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس اتفاق کو باقاعدہ پلان کیا گیا ہے۔

''وعلیکم السلام۔ کیسے ہیں آپ؟''

''میں تو بہت خوش۔ آپ اپنا بتائیں۔''

''میں بھی آپ کے سامنے ہی ہوں جیسی بھی ہوں۔'' اسفند کی طرح اس نے بھی بات کا سیدھا جواب نہیں دیا تھا اور اسفند روشنیوں سے بھرے شاپنگ مال میں اس شام رنگ لڑکی کو دیکھ کر رہ گیا کہ وہ اسے کیا بتاتا وہ کیسی تھی۔ سورج کی پہلی کرن جیسی پاکیزہ اور دل کے بہت قریب۔

''آپ یہاں یہ سب لینے آئے ہیں؟'' مصباح نے شرارت سے آس پاس دیکھ کر کہا کہ یہاں گھریلو استعمال کی وہ چیزیں تھیں جس سے کسی مرد کا دور دور تک کا واسطہ نہیں تھا خاص طور پر جب وہ مرد کنوارا ہو۔

''لینا تو مجھے کچھ بھی نہیں۔ بس وہ احمر نے آپ کو یہاں دیکھا تو مجھے فون کر دیا اور میں نے سوچا میں بھی آپ کو دیکھ لوں۔ اب یہ میری خوش قسمتی کہ مجھے آپ سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع بھی مل گیا۔''

وہ بتا رہا تھا اور مصباح بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہاں کسی مذاق یا جھوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔ کیا وہ اتنی اہم تھی کہ اسے دیکھنے کی خاطر اسفند جیسا مرد محض ایک فون کال پر بھاگا چلا آئے۔ لمحہ بھر میں دل نے خوش فہمیوں کے انبار لگا لیے تھے۔

کچھ پل خاموشی سے سرک گئے۔ عمر اور زویا بھی واپس آگئے تھے کہ مصباح نے انہیں بتا دیا تھا وہ انہیں یہاں ملے گی۔ عمر اسفند سے گرم جوشی سے ملا

تھا۔اس کے پیچھے کھڑی زویا کے گلے میں ایک چین اور اس سے بندھے قول و قرار اب مصباح نے باآسانی دیکھ لیے تھے۔ان کے چہروں پر رقم محبت کی تحریر پڑھنا بھی مصباح کے لیے مشکل نہیں رہا تھا۔کیا یہ محبت کا اعجاز تھا؟ محبت۔۔دل میں میٹھی سی گدگدی ہوئی تھی۔

آیت کو مشرقی طرز کا ایک سوٹ پسند آیا تھا۔اسفند کی رائے لینے باہر نکلی تو وہ اسے کہیں نزدیک دکھائی نہیں دیا۔وہ اسے فون کرنے کا سوچ ہی رہی تھی جب اسے سامنے سے وہی لڑکا آتا دکھائی دیا جس نے اس دن اسے گھر کا راستہ ڈھونڈنے میں مدد کی تھی۔

"پھر سے کھو گئیں؟" اپنی سیاہ آنکھیں اس پر جمائے وہ پوچھ رہا تھا۔

"اوہ نہیں۔کزن کے ساتھ آئی ہوں وہ اپنے دوست کو ملنے گیا ہے بس اسے ہی دیکھ رہی ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔روز روز راستہ بھولنا بھی نہیں چاہیے۔جتنی پیاری آپ ہیں یہ نہ ہو کسی دن بھول کر کسی کے دل کے راستے پر قدم رکھ دیں۔یہ تو ایسی قید ہے کہ ساری عمر بھی گزار دیں تو نکل نہ سکیں گی۔"

نرم لہجے میں کہتے وہ آیت کی دھڑکنوں کا ریشم الجھا رہا تھا۔گہری سانس بھر کر اس نے خود کو سنبھالا۔

"آپ کیا ایسے ہی پھرتے رہتے ہیں کہ کوئی راستہ بھٹکے ہوئے مل جائے اور آپ اس کی مدد کر سکیں؟"

"لازمی تو نہیں کہ مدد راستہ بھٹکے ہوؤں کی ہی کی جائے۔میرا دوست کہتا ہے محبت کے معاملات میں کسی کی مدد کی جائے تو اس کی محبت میں خدا خود اس کی مدد کرتا ہے۔ابھی اسی مرد مجاہد کو اس کی محبت سے ملوانے کے لیے یہاں پھر رہا ہوں۔" اس نے متبسم لہجے میں کہا تو آیت کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔اسفند نہ آجاتا تو وہ اسے ضرور اس کی محبت کے بارے میں پوچھتی۔

"چلیں؟" اس کی بائیں جانب سے آتے اسفند نے پوچھا۔

"ایسے ہی چلیں۔" جواب آیت کے داہنی جانب کھڑے اس لڑکے نے دیا تھا۔

"اوہ یار تم یہاں کھڑے ہو۔" آگے بڑھ کر اسفند اس سے بغلگیر ہو گیا۔آخر اس کی وجہ سے تو آج وہ مصباح سے بات کر کے آرہا تھا۔

"آیت یہ احمر ہے اور احمر یہ آیت۔" اسفند کا کروایا گیا تعارف اتنا رسمی سا تھا کہ دونوں نے کچھ نہیں کہا۔وہ تو شاید اس سے کہیں زیادہ ایک دوسرے کو جاننے لگے تھے۔ان کی خاموشی پر غور کیے بغیر اسفند شکر ادا کر رہا تھا کہ آیت نے یہ نہیں پوچھ لیا کہ اگر احمر یہاں کھڑا تھا تو وہ کہاں سے آرہا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں اپنے پلان کے مطابق شہر کی خاک چھاننے نکلے تو احمر بی جان سے ملنے اسفند کے گھر چلا آیا۔ساری زندگی اپنی حیثیت کے خواب دیکھنے کی مشق کرنے کے باوجود دل اب چاند کا سوالی ہوا تھا۔وہ اسے نہیں جانتا تھا مگر جس نے اسے نا معلوم سے معلوم کیا تھا وہی اس کی مدد کرے گا یہی سوچ کر وہ یہاں چلا آیا تھا۔اب ایک چھوٹی سی امید تھی جس کا سرا پکڑے اس نے اس گھر کی دہلیز پار کی تھی۔

☆☆☆

ایک تو احمر نے بی جان کو اسفند کی زندگی میں ایسی کسی لڑکی کی موجودگی کی اطلاع دے کر پریشان کر دیا تھا جسے اسفند جیون ساتھی کے طور پر منتخب کر چکا تھا اور اب آیت نے واپسی کی ضد پکڑ لی تھی۔انہیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں۔انہیں لگ رہا تھا کہ آیت جو واپس جانے پر بضد ہے اس کے پیچھے بھی ہو نہ ہو یہی وجہ تھی۔کسی حد تک یہ بات سچ ہی تھی۔اصل میں جب فرحانہ نے آیت سے اس کی اور اسفند کی شادی کا ذکر کیا تھا اس وقت وہ اس بات سے لاعلم تھی کہ اسفند کی زندگی میں کوئی لڑکی ہے۔اسفند کے ساتھ شادی کی اس نے بہت سوچ سمجھ کر حامی بھری تھی۔وہ اسے وہ ساری آسانیاں دے سکتا تھا جس کی وہ عادی

تھی۔ایک سلجھے ہوئے ذہن کا حامل شخص جسے وہ بچپن سے جانتی تھی وقت پڑنے پر اس کے ساتھ اس کے ملک بھی شفٹ ہو سکتا تھا۔اسے اور کیا چاہیے تھا لیکن اب بات یہ نہیں تھی۔وہ زبردستی کسی کے سر پر مسلط ہو کر اگلے بندے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے ساتھ بھی کھیل نہیں سکتی تھی۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ مما اور نانو کے جذباتی دباؤ میں آکر اسفند اس رشتے کے لیے راضی ہو کر اس کے لیے مشکلات کھڑی کرے۔اسی لیے وہ جتنی جلدی ہو سکے منظر سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔فرحانہ اس طرح جانے کے حق میں نہیں تھیں۔انہیں لگ رہا تھا کہ شاید آیت بور ہونے لگی ہے اس شہر سے۔تب ہی انہوں نے دوسرے شہر میں مقیم اپنے سسرالی رشتہ داروں کے ہاں جانے کا پروگرام ترتیب دے لیا۔بی جان نے اس بات پر خاموش احتجاج کا راستہ اپنایا تھا۔نہ تو وہ اسفند کے سامنے آرہی تھیں اور نہ ہی کوئی دوا لے رہی تھیں۔اسفند کے لیے بھی یہ صورت حال کافی پریشان کن تھی۔اس نے تو سوچا تھا جب بی جان اس سے بات کریں گی تو وہ انہیں مصباح سے ملنے پر قائل کر لے گا اور مصباح تو ایسی تھی کہ بی جان کو اس کی پسند میں کوئی خامی ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتی۔اب وہ تو اسے چپ کی مار مارنے پر تلی ہوئی تھیں۔

آیت اور فرحانہ پھپھو کو گئے ہوئے دو دن ہو گئے تھے اور اس نے بی جان کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔آج اس کا آفس جانے کا دل نہیں تھا۔ویسے بھی شہریار کے ہوتے اسے آفس کی فکر نہیں ہوتی تھی اسی لیے آج وہ گھر پر تھا۔کچھ یوں بھی وہ چاہتا تھا کہ پھپھو کی واپسی سے پہلے ہی وہ اس معاملے کو سمیٹ لے۔بی جان ناشتے کے لیے بھی باہر نہیں آئیں اور نہ ہی انہوں نے کمرے میں ناشتا کیا تھا اب تو شام ہونے والی تھی۔ان کا انتظار کرتے بالآخر اس کا صبر جواب دینے لگا تو کچن سے گرما گرم سوپ کا پیالہ اٹھا کر دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر وہ ان کے کمرے میں آگیا۔

"السلام علیکم بی جان۔" سوپ کا پیالہ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اس نے کھڑکیوں کے پردے ہٹائے۔اترتی شام کے سچے رنگوں سے بنا منظر کمرا سجا گیا۔بی جان نے اس کے سلام کا جواب نہیں دیا یعنی وہ اس سے ناراض تھیں۔ان کے پیروں کے پاس بیٹھنے سے پہلے اس نے سوپ کا پیالہ پکڑ لیا۔

"ناراض ہیں بی جان؟" اس نے بات کا آغاز کیا۔

"نہیں تو۔" رخ موڑ کر بیٹھے انہوں نے جواب دیا۔اسفند کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔عمر کے اس حصے میں بھی ان کی ناراضی بچکانا سی لگ رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں آپ مجھ سے ناراض ہیں اور وجہ بھی جانتا ہوں۔آپ مصباح کو دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔آپ کی مرضی ہے بی جان میں آپ کو بھی مجبور نہیں کروں گا۔بس اس طرح بھوکے رہ کر مجھے اس طرح سے سزا نہ دیں۔"

انہیں اپنی سماعتوں پر دھوکے کا گمان ہوا تھا۔تب ہی بے ساختہ رخ موڑ کر انہوں نے اس کا چہرہ دیکھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں بس مجھ سے نہیں پیا جاتا روز روز ایک ہی طرح کا پھیکا سوپ۔" انہوں نے بات بنائی۔

"اب کیا کیا جا سکتا ہے۔جس طرح سے آپ کا بی پی ہائی رہتا ہے آپ کو کچھ بھی بنا دیں وہ ایسا ہی پھیکا اور بے ذائقہ ہو گا۔" مسکراتے ہوئے اس نے سوپ کا چمچ ان کی طرف بڑھایا جسے انہوں نے بمشکل حلق میں دھکیلا تھا۔

"فرحانہ سے بات ہوئی؟ کب تک آرہی ہے وہ واپس؟" سوپ پینے کے ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔

"میری آیت سے بات ہوئی تھی اور اس نے تو کچھ نہیں بتایا آنے کے بارے میں۔" سوپ کا ایک اور چمچہ بھر کر اس نے ان کی طرف بڑھایا۔

"آپ جانتی ہیں احمر مڈل کلاس فیملی سے ہے۔مجھے شروع سے اس کے گھر کا ماحول بہت پسند رہا ہے۔اکثر جب شام کو میں ان کی طرف جاتا تو اس کی امی صحن کے ایک کونے میں پڑے چولہے پر

ہانڈی کا مسالا بھون رہی ہوتیں جس کی مہک آج بھی میرے لاشعور میں کہیں محفوظ ہے۔ کچھ دیر میں بھنتے مسالے کی خوشبو کسی سبزی، کسی دال اور کبھی کبھار گوشت کی خوشبو میں تبدیل ہو جاتی۔ اس کے ابو برآمدے میں ٹی وی کے آگے بیٹھے ہوتے۔ ذرا سخت مزاج تھے تب۔ ان کے بچے ان کی نظر بچا کر گھر سے باہر نکلتے تھے لیکن آج مجھے احساس ہوتا ہے کہ شاید میں انہیں پسند تھا کیونکہ احمر جب بھی میرے ساتھ کہیں جاتا تو ان کی اجازت سے اور ان کے سامنے ہی باہر نکلتا تھا۔"

بی جان بڑے انہماک سے اس کی کہانی سن رہی تھیں کہ ایسا شخص جو اپنے معاملات اپنی حد تک رکھنے کا عادی ہو اس کے منہ سے ایسی باتیں زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔

"تب مجھے پتا بھی نہیں تھا کہ لاشعوری طور پر میں اس ماحول سے متاثر ہو رہا ہوں۔ ان جانے میں میں اپنے اور اس کے گھر کے ماحول کا موازنہ کرتا رہتا تھا۔ تب میرے اندر بہت شدید خواہش اٹھتی تھی کہ میرا گھر بھی ایسا ہی ہو۔ شاید اس وقت احمر سے دوستی کی وجہ بھی یہی ہو کہ مجھے اس کے گھر کا ماحول بہت فیسی نیٹ کرتا تھا۔ آج بھی کرتا ہے اور مصباح کو زندگی میں شامل کرنے کی خواہش کے پیچھے بھی شاید یہی وجہ ہو۔ آیت میں کوئی برائی نہیں ہے لیکن میرے تصور میں گھر کا جو خاکہ ہے اس کا بنیادی رنگ ہی آیت کی فطرت میں نہیں ہے۔ گھر گرہستی عورت کو بدل دیتی ہے اگر یہ بات سچ ہوتی تو ماما کے ہوتے ہوئے میں نوکروں کے ہاتھوں میں نہ پلتا اور نہ ہی ہمارے گھر پر ماما سے زیادہ نوکروں کا کنٹرول ہوتا۔ مجھے نہیں یاد کبھی انہوں نے میرے لیے یا ڈیڈی کے لیے کچھ خاص طور سے پکایا ہو یا گھر کو سنوارا ہو۔ مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں مگر میں اپنی باقی کی زندگی ایسی نہیں چاہتا بی جان۔"

وہ بات کر رہا تھا اور بی جان کی نظروں میں گزرے ماہ و سال پھر رہے تھے شہر یار نے جب یونیورسٹی کی لڑکی پسند کی تو انہوں نے اسماء کو شہر یار کے لیے پسند کر کے چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ کیا تھا۔ اپنی طرف سے وہ ایسی لڑکی اپنے بیٹے کے لیے لائی تھیں جو ان دیکھی اس یونیورسٹی کی لڑکی کو ہر طرح سے مات دے کر ان کے بیٹے کے دل پر راج کر سکتی تھی، فیشن ایبل، طرح دار اور ناز و ادا سے بھرپور۔ پھر وہ اس کے لیے کوئی روایتی ساس نہیں بنیں۔ اسماء اپنی مرضی سے سوتی جاگتی۔ اپر کلاس کی دوسری بہت سی عورتوں کی طرح آئے دن پارٹیز اٹینڈ کرتی۔ سوشل ورک اور جانے کیا کیا اسے سارا دن مصروف رکھتا۔ اول تو وہ گھر پر ٹکتی ہی بہت کم تھی اور جس دن وہ گھر ہوتی ملازموں کی شامت آئی رہتی۔ خود اپنے بیٹے کی نشست و برخاست میں اسے سو سو عیب نظر آتے۔ جب تک بی جان کے اپنے بازوؤں میں دم تھا انہوں نے گھر کے معاملات پوری طرح نوکروں کے آسرے پر نہیں چھوڑے تھے لیکن کب تک؟ اسماء نے گھر کی ذمہ داری اٹھائی ہی نہیں۔ انہوں نے ایک آدھ بار سرسری سا کہا تو وہ یہ کہہ کر اٹھ گئی کہ گھر کے ملازم کس کام کی تنخواہ لیتے ہیں۔ آپ بھی اتنی مغز ماری نہ کیا کریں، پرسکون زندگی گزاریں۔ تب اپنی ساری خواہشیں وہ اندر ہی پی گئی تھیں کہ ان کا بیٹا، بہو اور پوتا تین نہیں تو دو وقت کے کھانے پر تو ساتھ ہوں۔ خاتونِ خانہ کا گھر میں کھانا پکانا اتنا بھی اولڈ فیشن نہیں ہوا تھا۔ آج ان کا پوتا انہیں بتا رہا تھا کہ وہ خود اس ماحول سے بیزار رہا ہے۔

"مجھے لگتا ہے مصباح ویسا گھر بنا سکتی ہے جیسا میں چاہتا ہوں کیونکہ ہماری کلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ مختلف ہے۔ مگر کوئی بات نہیں اگر آپ نہیں چاہتیں تو دوبارہ میں اس معاملے میں کبھی کوئی بات نہیں کروں گا۔ آپ چاہیں تو پھپھو سے واپسی پر آیت کے حوالے سے بات کر لیجیے گا۔"

سوپ ختم ہونے تک اس نے بڑے سلیقے سے بات سمیٹی تھی۔ وہ اٹھ کر گیا تو بی جان نے پہلو میں رکھا فون اٹھا کر احمر کا نمبر ملایا۔ اسفند کو سر کے بل بلانے والا بی جان کی کال پر بھاگا چلا آیا تھا۔ بی جان کے پوچھنے پر اس نے جو کچھ اس کے علم میں تھا انہیں بتا دیا تھا۔ بی جان کے لیے تو یہ بات ہی حیران کن تھی کہ اسفند کی باقاعدہ تو کیا بے قاعدہ بھی کوئی لو اسٹوری نہیں تھی بلکہ اس کی تو سرے سے ہی کوئی کہانی نہیں تھی۔ بھلا زندگی کے فیصلے یوں بھی ہوا کرتے ہیں؟ وہ شاید محبت لفظ سے انجان تھیں اسی لیے ایسا سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

موسم میں اچھا خاصا بدلاؤ آ گیا تھا۔ چھوٹا سا لان سارا دن اتنی دیکھ بھال کے بعد بھی پیلے پتوں سے بھرا رہتا جو ذرا سی ہوا کے ساتھ اڑتے ہوئے بعض اوقات گھر کے اندر بھی پہنچ جاتے۔ یہ چھٹی کا دن تھا۔ کھانے کے بعد کشمیری چائے کے انتظار میں عمر ابو اور امی کے ساتھ لان میں بیٹھا تھا۔ مصباح ان کے لیے کچن میں چائے بنا رہی تھی جبکہ قمر ایک دوست کی طرف گیا ہوا تھا۔

"امی۔۔ ابو آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے میں نے۔" ہاتھ میں پکڑا فون اس نے سامنے میز پر رکھ دیا تو ابو نے اخبار سے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ امی بھی اون سلائی چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ "میں کہہ رہا تھا آپ اور امی وقت نکال کر چاچو کی طرف جائیں اور میرے اور زویا کے رشتے کی بات کر کے آئیں۔"

بات تھی کوئی بم جو نجمہ کے کان کے پاس پھوٹا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی سلائی اگر ان کی گود میں گری تھی تو اخبار بھی پرویز صاحب کے ہاتھ سے میز پر منتقل ہوا تھا۔

"میں جانتا ہوں امی آپ مصباح کے بارے میں سوچ رہی ہوں گی تو میں ایک بات واضح کر دوں مجھے اپنے لیے کوئی اتنی جلدی نہیں ہے۔ بس یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم مصباح کے لیے اتنا پریشان ہیں تو زویا بھی اس سے محض سال بھر ہی چھوٹی ہے اور پھر اس کی دو دو منگنیاں ٹوٹی ہیں۔ چاچو چاچی بھی پریشان ہوتے ہوں گے۔ میں بس ان کی پریشانی کا سوچ رہا ہوں۔ آپ ابھی بس منگنی کر دیں تو شادی ان شاءاللہ مصباح کے ساتھ ہی ہو گی۔"

نجمہ کی نظر میں زویا کا سراپا لہرا گیا۔ فیشن انڈسٹری کا جیتا جاگتا نمونہ، پھر اس کے نخرے، اس کی گھر اور گھرداری میں عدم دلچسپی، منہ پر بات دے مارنے والی عادت...... وہ اگر دیورانی کی بیٹی نہ بھی ہوتی تو کم از کم انہوں نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ دماغ اتنا ماؤف ہوا تھا کہ چند لمحے تو وہ کچھ بولنے کے قابل بھی نہیں رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے وہ خوب صورت ہے مگر گھر فقط خوب صورتی سے نہیں چلتے۔ گھر گرہستی ایسی عورتوں کے بس کی بات نہیں ہوتی جن کو آئینے سے ہی فرصت نہ ملے۔" اپنے لہجے کی تلخی چھپانے کی انہوں نے ذرہ برابر بھی کوشش نہیں کی تھی۔

"دل کی نظر کے سامنے زویا نہیں مصباح کو رکھ کر دیکھیں اور مجھے بتائیں کہ اس عمر تک پہنچتے بھی اس کا رشتہ کیوں نہیں ہوا؟ حالانکہ فیشن وہ نہیں کرتی، سادگی، گھرداری کا سلیقہ۔ سب کچھ ہونے کے باوجود؟ میں بتاؤں وجہ؟ وجہ ہمارا معیار ہے امی۔ آپ کو فیشن زدہ لڑکی نہیں چاہیے پھر چاہے وہ موم سے بنی کیوں نہ ہو اور آپ اسے اپنی مرضی کی صورت میں ڈھالنے پر ہی قادر کیوں نہ ہوں جبکہ آپ کے اصول مصباح نے جس طرح گھول کر پی رکھے ہیں مجھے نہیں لگتا آنے والے دور میں وہ ایک انچ بھی بدل سکے گی۔ میں آپ کو یا مصباح کو غلط نہیں کہہ رہا بس یہ کہہ رہا ہوں کہ اسپیس دے کر دیکھیں۔ زویا نرم مٹی کی ہے اسے آپ جیسے ڈھالنا چاہیں گی وہ جلد یا بدیر اسی سانچے میں ڈھل جائے گی۔" وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہہ رہا تھا۔ اس کی ذرا سی توجہ سے زویا دل و جان سے بدلنے لگی تھی۔ "کسی کو آسانی دیں تو وہ آسانی مڑ کر آپ کی طرف ہی آتی ہے۔ یہ میں نہیں کہہ رہا قدرت کا اصول ہے۔"

اس کے آخری جملے پر نجمہ کا دل پگھلا تھا۔

"اپنی چاچی کا تمہیں پتا بھی ہے۔ جتنی بار آتی ہے مجھے مڈل کلاس ذہنیت کا طعنہ دینا نہیں بھولتی۔ ایسے میں اس گھر رشتہ کیوں دینے لگی وہ۔"

"آپ ایک بار جا کر تو دیکھیں۔ اگر وہ ایسا کچھ کہتی ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ یہ معاملہ یہیں ختم کر دیں گے۔" عمر کا اپنا اندازہ تھا کہ دو بار باہر رشتہ کر کے انہیں اچھا سبق مل گیا ہوگا اور اب کی بار وہ اس رشتے کو انکار کر کے کفرانِ نعمت نہیں کریں گی۔

اس کی بات پر نجمہ کا رکا ہوا سانس کچھ بحال ہوا تھا۔ ہوسکتا ہے وہ صرف چچا کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا ہو۔ نماز ادا کرنے کے لیے وہ اٹھ کر گئیں تو اس نے دیکھا ابو بڑے غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں دیکھ رہا ہوں اتنے عقل مند کب سے ہو گئے؟" امی کے برعکس ابو اس بات پر خوش گوار حیرت میں مبتلا تھے۔

"جب آپ کا کام کاروبار سنبھالا تھا اس وقت کیوں نہیں سوچا؟ اور اگر میری عقل پر اتنا ہی شک تھا تو اپنا کاروبار مجھے سونپ کیسے دیا؟"

"اوہ نہیں یار۔ بس سوچ رہا ہوں یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟"

"کیونکہ اپنے وقت میں آپ کو زویا جیسی لڑکی جو نہیں ملی۔" اس نے مسکرا کر داہنی آنکھ دبائی تو ابو بھی ہنس دیے۔

"بے وقوف انسان میں تمہارے اور زویا کے رشتے والی بات کا کہہ رہا ہوں ورنہ اپنے وقت کی بہترین لڑکی سے شادی ہوئی تھی میری۔" ان کی وضاحت پر عمر کھل کر ہنسا تھا جس پر خود وہ بھی ہنس پڑے تھے۔

☆☆☆

عمر نے سوچنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی اسی لیے چھٹی کے روز وہ زویا کے گھر جا پہنچے تھے۔ ان کی آمد کی وجہ جان کر ایک بار تو سب کو سکتہ ہو گیا تھا۔ خود زویا کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے کی تو بات تھی جب امپوریم میں عمر نے اپنی چوڑی ہتھیلی پر رکھی چین اس کی طرف بڑھا کر کہا تھا۔

"اگر تم مجھے اس بات کا یقین دو کہ تم اپنے آپ کو زیادہ نہیں تو تھوڑا میرے اور میرے گھر کے مطابق ڈھال لو گی تو میں تمہیں زبان دیتا ہوں کہ تمہیں مکمل احترام کے ساتھ اپنے گھر کی عزت بنا لوں گا۔"

وہ جانتا تھا خالی خولی محبت سے گھر نہیں بستے اور اسے زویا کے ساتھ گھر بسانا تھا۔ صد شکر کہ زویا کی بھی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی اسی لیے تو ایک لمحے کی بھی دیر کیے بغیر اس نے اس کے ہاتھ سے چین اٹھا کر گلے میں پہن لی تھی۔ پھر بھی اتنی جلدی کی اسے امید نہیں تھی۔

دونوں گھروں کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ماضی میں تعلقات اگر خراب نہیں تو کچھ ایسے خوش گوار بھی نہیں تھے اور سب سے بڑھ کر زویا کے لیے نجمہ کی ناپسندیدگی اور نجمہ کے لیے دیورانی کی ناپسندیدگی۔ کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں تھا۔

زویا کی دو دو منگنیاں ٹوٹنے کے باوجود اب اگر نجمہ زویا کے لیے عمر کا رشتہ لائی تھیں تو یہ ان کا بڑا پن ہی تھا۔ گو کہ اس رشتے پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا پھر بھی رسمی طور پر سوچنے کا وقت مانگا گیا تھا۔ جبکہ ان کے نرم رویوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جواب اثبات میں ہی ہوگا۔

"بھئی مصباح کے کھانوں نے تو ہمیں اپنا گرویدہ کر چھوڑا ہے۔ وہی چیزیں اچھے سے اچھے ریسٹورنٹ سے منگوا کر کھائی ہیں مگر وہ ذائقہ نہیں ملا۔ اب تو زویا نے بھی اس کی ویڈیوز دیکھ دیکھ کر کافی کچھ بنانا سیکھ لیا ہے۔"

نکہت کی بات پر برتن اٹھاتی زویا نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔ سادہ شلوار قمیص میں ملبوس زویا نجمہ کو کافی مختلف مگر اپنی اپنی لگ رہی تھی۔ انہوں نے شاید پہلی بار دونوں بھائیوں کو بھی ایسے بے تکلفی سے سر سے سر جوڑے سیاست و حالاتِ حاضرہ پر تبصرے کرتے دیکھا تھا۔ خود نکہت جو ساری زندگی انہیں مڈل کلاس ذہنیت کے طعنے دیتی آئی تھیں آج گھر گرہستی پر ان سے مشورے طلب کر رہی تھیں۔ کیا بیٹیاں واقعی مجبور کر دیتی ہیں؟ اسی نشست میں نجمہ مصباح کے لیے دعا کرنا نہیں بھولی تھیں۔ واپسی پر پرویز صاحب اگر بھائی کی ذمہ

داری بانٹ لینے پر خوش تھے تو نجمہ بھی آسودہ تھیں۔ وجہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھیں۔ شاید یہ وہ الہام تھا جو بیٹیوں کی ماؤں کے دلوں پر اترتے ہیں۔

حسبِ توقع اثبات میں جواب ملتے ہی زندگی کی جامد جھیل میں جیسے پتھر آ گرا تھا۔ نجمہ منگنی کا ارادہ بنا کر بیٹھی تھیں لیکن نکہت نے دو منگنیوں سے اچھا سبق سیکھ لیا تھا اسی لیے وہ نکاح سے کم پر راضی نہیں ہوئیں اور پھر عمر نے ہی تو ان سے کہا تھا اب کی بار منگنی نہیں نکاح کرنا ہے۔ سب کے اصرار پر نجمہ بھی نکاح پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ رخصتی کو مصباح کی شادی کے ساتھ کرنے کا ارادہ بنایا گیا لیکن اگر رخصتی پہلے بھی ہو جاتی تو نجمہ کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ نکاح کے لیے محض پندرہ دن رکھے گئے تھے اور ان پندرہ دنوں میں کیا ہو سکتا تھا یہ کسے پتا تھا۔

☆☆☆

فرحانہ کو لگا تھا آیت اس شہر سے بور ہو گئی ہے تب ہی وہ اسے لے کر یہاں آئی تھیں مگر یہاں آ کر بھی آیت نے وہی رٹ لگا رکھی تھی۔

"ہم کب واپس جا رہے ہیں مما؟" ایک بار پھر اس کے اس سوال پر فرحانہ کا بی پی ہائی ہونے لگا تھا۔

"آیت تم مجھے سیدھی طرح کیوں نہیں بتا دیتیں کہ مسئلہ کیا ہے؟"

"مما۔ اسفند کسی اور لڑکی میں انوالو ہے اور اس سے شادی میں بھی انٹرسٹڈ ہے۔ ایسے میں میں نہیں چاہتی کہ آپ کے اور نانو کے دباؤ میں آ کر وہ مجھ سے شادی کر کے میری زندگی خراب کرے۔ وہ اگر راضی ہو بھی جائے تو کم از کم اس فرماں برداری کی توقع آپ سے تو نہ رکھیے گا۔ آپ نے مجھے اسفند کا کہا اور میں نے چپ چاپ مان لیا مگر اب نیور۔ میں اب واپس جا کر اپنے کام پر فوکس کرنا چاہتی ہوں۔" کچھ سوچ کر اس نے ہر بات کا خلاصہ کر دیا تھا۔

فرحانہ چپ کی چپ رہ گئی تھیں۔ ان کی بیٹی بلکہ لاڈلی بیٹی ہمیشہ ان چاہی رہے یہ بات وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھیں۔ اسی لیے پہلی بار جلد بازی دکھاتے انہوں نے اسی وقت اپنا ذہن تبدیل کر لیا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر کل صبح ہی تمہاری نانو کی طرف چلتے ہیں اور پہلی میسر فلائٹ پکڑ کر واپس چلیں گے۔" آیت کا ماتھا چوم کر انہوں نے کہا تو آیت کے اندر تک سکون اتر گیا۔ اس کے باوجود کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی اہم بات بھول رہی ہو۔ ایک بے چینی سی تھی جو مما کے واپس جانے پر رضامند ہوتے ہی دل کو جکڑنے لگی تھی۔

☆☆☆

سردیوں کی اوائل راتیں تھیں۔ ٹھنڈی ہوا گوشت سے ہو کر ہڈیوں تک اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ایسے میں اسفند کے اندر ایک الاؤ تھا جو دہک رہا تھا۔ اتنی ٹھنڈی ہوا میں بھی وہ لان میں چہل قدمی کر رہا تھا۔ کان کے ساتھ فون لگا تھا جس کے دوسری طرف احمر تھا جو اسے بی جان کے فون پر اور پھر ملاقات میں ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر رہا تھا۔

آیت کافی دیر سے اسفند کو لان میں ادھر سے ادھر چکر کاٹتے دیکھ رہی تھی۔ وہ آج ہی واپس آئے تھے۔ مما نانو کے کمرے میں تھیں اور انہیں جانے سے پہلے ذہنی طور پر پرسکون کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک رشتہ ہی تو تھا جو نہیں جڑ سکا ورنہ دوسرا تو تھا ہی۔ اب ایک نہ ہوئے رشتے کی خاطر پہلے سے موجود رشتے کو خراب کرنا بے وقوفی ہی ہو سکتی تھی جو وہ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں چلے جانا تھا مگر وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بی جان اس بات کو دل و دماغ پر سوار کر کے اپنی طبیعت خراب کر لیں۔ ویسے بھی جب وہ اپنی خواہش سے دست بردار ہو رہی تھیں تو بی جان کیوں اس بات کی ٹینشن لیتیں۔ واقعی اگر وہ جذباتی بلیک میلنگ کر کے اسفند کو منا لیتیں تو کیا اسفند آیت کو اس کی جگہ دے پاتا؟ اسی لیے وہ پچھلے ایک گھنٹے سے بی جان کے کمرے میں تھیں۔

آیت نے اپنے لیے کافی بنائی اور لان میں چلی آئی جہاں اسفند فون پر بات کر رہا تھا۔ وہ جانتی تھی اسفند کافی نہیں پیتا اور چائے اسے بنانی نہیں آتی تھی

اسی لیے اس کے ہاتھ میں بس ایک ہی مگ تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اسفند نے احمر سے اجازت چاہی۔

”فون بند مت کرنا۔“

”کیوں؟ خیریت؟“ اسفند اس کی فرمائش پر حیران ہوا۔

”بس سن رہا ہوں میری کیا کیا برائی ہوتی ہے۔ فون بند مت کرنا۔“ ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے اس نے سنجیدگی سے پھر فون بند کرنے سے منع کیا تو اسفند نے فون والا ہاتھ ویسے ہی نیچے کرلیا۔

آیت کافی کا مگ لیے لان میں پڑی کرسیوں کی طرف بڑھی تو وہ بھی وہیں چلا آیا۔

”کیا فون پر وہ تھی؟“ کافی کا مگ منہ سے لگاتے آیت نے پوچھا تو وہ حیران ہوا تھا۔ وہ کس کا پوچھ رہی تھی۔

”کون؟“

”تمہارے دوست نے انجانے میں مجھے اس لڑکی کے بارے میں بتا دیا تھا جس سے ملنے تم اس دن مجھے بھی ساتھ امپوریم لے گئے تھے۔“

اسفند کے لیے یہ ایک شاک ہی تو تھا۔ احمر اس کی انتہائی ذاتی بات ایسے کیسے کسی کو بتا سکتا تھا۔ میز پر رکھے فون کو اس نے ایسے گھورا تھا جیسے اس کے سامنے فون نہیں احمر بیٹھا ہو۔

”اصل میں اسے علم نہیں تھا کہ میں تمہاری کزن ہوں۔“ اس نے اسفند کی مشکل آسان کی تھی۔ اسفند نے کچھ بھی کہنے کے بجائے اس معاملے میں خاموشی اختیار کی تھی۔

”اور تمہیں کیا ہوا ہے جو ایک دم سے واپسی کی دھن سوار ہوگئی ہے؟“ اسفند نے پوچھا۔ یہ بات احمر کے لیے نئی تھی۔ وہ جا رہی تھی۔

”ہوا تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ کافی کے مگ کے گرد دونوں ہاتھ لپیٹے ہاتھوں کو گرمائش دیتی وہ گھونٹ گھونٹ کافی پی رہی تھی۔

”جس لڑکی کے بارے میں تم مجھ سے کھل کر بات نہیں کر سکتے اس کے بارے میں تانو کو، ماموں کو کیسے قائل کرو گے؟ وہ بھی اس صورت جب میری شکل میں ان کے پاس آپشن بھی موجود ہو۔ بس اسی لیے سوچا تمہارے لیے کچھ آسانی کردی جائے۔“

”کیا واقعی یہی وجہ ہے؟“ اسفند شرارتاً اسے چھیڑنے لگا۔

”بالکل۔ ایک منٹ۔ کہیں تمہیں یہ تو نہیں لگ رہا کہ میں تم میں انٹرسٹڈ ہوں اور اب ٹوٹے دل کے ساتھ یہاں سے جا رہی ہوں۔ اوہ گوش۔“ کافی کا مگ سامنے رکھ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”جتنی آزادی اور محبت کے مواقع مجھے میسر رہے ہیں کم از کم میری عمر کے سالوں جتنے تو میرے افیئرز ہوتے مگر مسئلہ یہ ہے کہ محبت ہونا اتنا آسان نہیں ہوتا۔“ اس کی آنکھوں میں ایک عکس جھلملایا اور اس نے خود ہی اپنی نفی کردی۔ ”محبت ہونا آسان ہے۔ بہت آسان۔۔۔ جب اسے ہونا ہو لیکن مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی اسفند۔“

اس کی آواز اتنی آہستہ تھی کہ میز پر پڑے فون کے دوسری طرف احمر نے بمشکل سنی تھی۔ اسفند کو مزید بات کا موقع دیے بغیر اس نے فون کاٹ کر پھر سے اسفند کا نمبر ملایا۔ اسفند نے سوچا شاید کال کٹ گئی اس لیے کال وصول کر کے فون پھر سے وہیں رکھ دیا۔ احمر نے پھر فون کاٹ کر نمبر ملایا۔ اسفند سمجھ گیا کہ اب وہ بات کرنا چاہتا ہے۔ کال وصول کر کے فون اس نے کان سے لگایا۔

”آیت کو یہیں بٹھا کر رکھو میں بس ابھی آرہا ہوں۔“

اب کی بار اسفند کو حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اسے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ احمر کو آنے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اپنی بائیک کے ساتھ وہ اس کے گیٹ کے سامنے تھا۔

”بیسٹ آف لک۔“ شرارت سے کندھا تھپتھپا کر اسے لان کی طرف بھیج کر وہ خود اندر چلا گیا۔ آیت اسے دیکھ کر حیران ہوئی۔ اس کی نظر کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف گئی جہاں اس وقت ساڑھے گیارہ کا وقت ہوا تھا اور پھر اس کے عقب میں اسفند

بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

السلام علیکم کہتے وہ عین اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں کہنیاں میز پر رکھے وہ بغور آیت کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ آیت کے کندھوں سے ذرا نیچے آتے سرخی بائل بال بے ترتیبی سے کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ شام میں لگائی گئی لپ اسٹک ہونٹوں سے اگرچہ اتر چکی تھی مگر ہونٹوں کے اندرونی کناروں سے احمر نے پھر بھی رنگ کھوج لیا تھا۔ اس کی چمکتی آنکھوں میں تحیر اور خوش گوار بے یقینی کی تحریر بھلا احمر کیسے نہیں پڑھ سکتا تھا۔

اس کی سیاہ آنکھیں آیت کے چہرے پر اس طرح سے شوق کی داستانیں لکھ رہی تھیں کہ وہ بے اختیار نظر جھکا گئی۔

”ایک لڑکا لڑکی کی خاطر ساری دنیا کے کام، روزگار چھوڑ کر دوسرے ملک جا پہنچے یہ زیادہ رومان پرور ہے یا آدھی رات کو محض ایک خوش فہمی کی بنا پر ہاتھ آنے والی پہلی شرٹ پہن کر اتنی سردی میں بائیک پر ہوا میں اڑتا ہوا اس لڑکی تک اپنے دوست کے گھر جا پہنچے یہ زیادہ رومان پرور ہے؟“ نظریں اس کے چہرے پر جمائے وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا اور آیت جان گئی تھی وہ کس بارے میں بات کر رہا ہے۔ خالی مگ کے کنارے پر انگلی پھیرتی آیت کا ہاتھ کانپا تھا۔

”جب کوئی آپ کے پاس ہو اور آپ اسے اپنے پاس روک نہ سکیں تو پھر اس کے پیچھے دنیا کے دوسرے کونے میں جانا بھی بے کار نہیں کیا؟ آیت......“

ایسے لو دیتے لہجے میں اس نے آیت کو پکارا تھا کہ اسے لگا اس کا وجود قطرہ قطرہ پگھلنے لگا ہے۔ اس نے مگ سے نظر اٹھا کر احمر کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں کی تپش آیت کو پگھلا کر ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کی سعی کر رہی تھی۔ بھلا مغربی معاشرے میں پلی بڑھی آیت کب شرما یا گھبرا سکتی تھی۔ وہ اٹھ کر آہستگی سے چلتے آیت کی پشت پر آ کھڑا ہوا۔

”میرا دل میری حیثیت اور میرے سبق بھلائے اک پری کی خواہش کر بیٹھا ہے اور اس پری کو دینے کے لیے میرے پاس چاہت کے خزانوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔“ اس کے کان کے پاس آکر کہتے اس نے آیت کے چہرے کے سامنے اپنی مٹھی کھولی۔

موتیے کی ادھ کھلی کلیاں آیت کی سانس معطر کر گئی۔ اس نے زندگی کی ہر آسانی ہر آسائش دیکھی تھی۔ اسفند کے ساتھ شادی پر اعتراض بھی اسی لیے نہیں تھا کہ وہ اس وہ سب دے سکتا تھا جس کی وہ عادی ہے مگر محبت۔۔۔ اور ایسی محبت؟ محبت کے بارے میں تو آیت نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ ایک لمحے کی دیری سے اس نے محبت کی کلیوں کے لیے اپنا ہاتھ کھول دیا۔ احمر نے وہ ساری کلیاں اس کی گلابی ہتھیلی پر رکھتے اپنا ہاتھ بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر آہستگی سے اس کے ہاتھ کی پشت چوم لی۔ کھلی ہتھیلی پر کلیاں رکھے آیت نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ احمر اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ فضا میں محبت کے ساز اور موتیے کی خوشبو پھیلی تھی۔

”اینی ون اپ فار دا ٹی؟“

اسفند کی آواز پر آیت نے مٹھی بند کر کے آنکھیں کھول لی تھیں۔ اسفند کو کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے چہرے گئے لمحوں کی چغلی کھا رہے تھے۔

”اب اسفند کا کیا کریں؟“ کہنے والی آیت تھی۔

☆☆☆

جب آیت نے اپنے لیے راستہ چن لیا تھا تو بی جان کیا کہہ سکتی تھیں۔ پھر سب نے مل کر بی جان کو مصباح کی طرف جانے کے لیے قائل کر ہی لیا۔ جس دن وہ مصباح کا رشتہ لے کر گئے اس دن عمر کی شادی میں تیرہ دن باقی تھے۔ نجمہ اور پرویز بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز ہو گئے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ ان کی بیٹی کا نصیب کسی اور کے نصیب کی چابی سے کھلے گا ورنہ وہ بہت پہلے یہ قدم اٹھا لیتے۔ جب رب کی رحمت شاملِ حال تھی تو مزید دیر کرنا کسی طور مناسب نہیں تھا۔ اسی لیے جب بی جان نے عمر کے ساتھ ہی مصباح کی شادی کا مطالبہ کیا تو بلا پس و پیش مان لیا گیا۔ زویا بیٹی بن کر گھر میں آئی تو اگلے

ہی دن گھر کی بیٹی بھی اپنے گھر کی ہوگئی۔ آیت شادی کے فوراً بعد ہی واپس چلی گئی تھی۔ اب اسے پاپا کو لے کر آنا تھا۔ احمر کے ساتھ نئی زندگی کی شروعات اسے دعاؤں کی چھاؤں میں کرنی تھی۔

مصباح کو سب کچھ ایک خواب ہی لگ رہا تھا۔ بھلا عام سی شکل وصورت والی لڑکی کا نصیب ایسا خاص اور پیارا ہوسکتا تھا؟ بالکل ہوسکتا تھا اور اس خواب ناک زندگی کو جیتے اسے ڈیڑھ ماہ ہوگیا تھا۔ اب تو اسے زندگی کی خوب صورتی پر یقین آنے لگا تھا۔

اسفند اور شہریار کے ساتھ بی جان بھی ناشتے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھیں۔ اس کے میٹھے بولوں اور سادہ فطرت نے بی جان اور شہریار کو بھی اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔ ان کی شادی کے بعد سے شہریار کو بھی گھر گھر لگنے لگا تھا اسی لیے ابھی تک کسی ٹور پر نہیں نکلے تھے اور بی جان شکر ادا کرتی تھیں کہ بے ذائقہ کھانوں سے ان کی جان چھوٹ گئی تھی۔ بناتی مصباح بھی ان کے لیے پرہیزی پھیکا کھانا تھی مگر اس کے ہاتھوں میں جانے کیا جادو تھا کہ ہر چیز ذائقے دار لگتی تھی۔

ناشتے کے بعد مصباح برتن سمیٹ کر باورچی خانے میں چلی گئی اور اسفند دفتر کے لیے اپنی چیزیں لینے کے لیے کمرے میں۔ شہریار اور بی جان اسفند کی آواز کا انتظار کررہے تھے۔

''مصباح...... ایک منٹ کمرے میں آؤ ذرا میری چابیاں نہیں مل رہیں۔'' اسفند کی آواز پر بی جان اور شہریار کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ یہ روز کا معمول تھا۔ روز اسفند کی کوئی نہ کوئی چیز لاپتا ہوجاتی جو صرف اور صرف مصباح کو ملتی تھی۔

''آپ باز آجائیں۔ ڈیڈی اور بی جان کو آپ کے ان جھوٹے بہانوں کی اچھے سے خبر ہے۔ اتنی شرمندگی ہوتی ہے مجھے سچی۔'' کمرے میں داخل ہوتے ہی مصباح نے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے چابیاں اٹھا کر اس کے سامنے کیں۔

''چلو اچھی بات ہے کل سے ان کے سامنے ہی مل کر جایا کروں گا۔'' شرارت سے کہتے اس کے ہاتھ سے چابیاں پکڑتے اسفند نے اس کا مہندی سے سجا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔ وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

''اچھا عمر کا فون آیا تھا۔ دوپہر میں تمہیں لینے آئے گا گھر میں کچھ مہمان آرہے ہیں اور زویا کو تمہاری مدد چاہیے۔''

''آپ نے منع کردینا تھا۔ ابھی پچھلے ہفتے تو گئی ہوں۔ بی جان کیا سوچیں گی۔'' امی کی ساری نصیحتیں اس نے گھول کر پی رکھی تھیں۔

''یہی سوچیں گی کہ جس لڑکی نے آتے ہی آدھ درجن نوکروں کی چھٹی کروادی اس کے گھر والوں کو اس کے بغیر رہنے کی عادت ڈالنے میں کتنا وقت لگے گا۔'' اس کے متبسم لہجے پر اس نے سکون کا سانس لیا تھا۔ امی نے عمر کو منع بھی کیا تھا مگر وہ ہر ہفتے کسی نہ کسی بہانے سے اسفند کو فون کرکے اسے بلوا لیتا تھا۔

''بی جان سے میں نے کہہ دیا تھا۔ تم فکر مت کرو اور ویسے بھی میں بزنس مین ہوں بنا فائدے کے کچھ نہیں کرتا۔ جب تم وہاں سے ہوکر آتی ہو تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے ہماری آج ہی شادی ہوئی ہے۔ بی جان کا ڈر نہ ہو تو میں روز جاتے ہوئے ادھر چھوڑ آیا کروں اور واپسی پر سجی سجائی کانچ کی گڑیا جیسی لے آیا کروں۔'' اسفند کی بات پر وہ جھینپ گئی۔ امی کی ہدایات اور زویا کی مہارت اسے واقعی گڑیا بنادیتی تھی۔

''اسفند۔ چابیاں مل گئی ہوں تو آجاؤ۔'' شہریار کی آواز پر اس گال تھپتھپا کر وہ باہر بھاگا۔

''اپنا خیال رکھنا۔''

''الحمدللہ۔'' دن میں کئی بار ادا کیے جانے والا کلمہ بے ساختہ ایک بار پھر اس کے ہونٹوں سے ادا ہوا تھا۔

بیٹیاں رحمت ہوتی ہیں مگر ہمارے خود ساختہ معیار انہیں زحمت بنا چھوڑتے ہیں۔ ورنہ زویا جیسی لڑکیاں بھی گھر بسالیتی ہیں اور مصباح جیسی عام سی شکل وصورت والی لڑکیوں کے مقدر میں بھی لکھنے والے نے محبت لکھ دی ہوتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دنیا کو اپنے معیار کی عینک اتار کر دیکھا جائے۔

☆☆

انوکھی شادی

فہمیدہ فرید خان

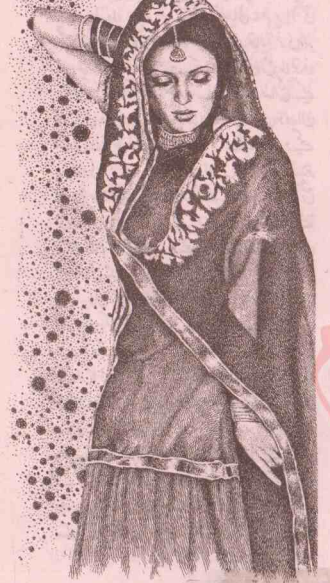

یہ ایک متوسط طبقے کا روشن روشن سا گھر تھا جہاں سفینہ بیگم صبح سے ایک پاؤں پر گھوم رہی تھیں۔ خوشی سے ان کا دوسرا پاؤں زمین پہ ٹک نہیں رہا تھا ورنہ اس کا استعمال بھی کرلیتیں۔ بات ہی خوشی کی تھی۔ آج ان کی اکلوتی بیٹی، دو بھائیوں کی راج دلاری بہن شمع توانہ کو دیکھنے کچھ لوگ آرہے تھے۔ یہ رشتہ ان کی ہمسائی نجمہ فیاض کے توسط سے آیا تھا جو چند سال پہلے گاؤں سے بیاہ کر شہر آئی تھیں۔ لڑکے والوں سے ان کی رشتہ داری بھی تھی۔

''اے نجمہ! وہ لوگ واقعی شمع کو مانگ رہے ہیں؟''

سفینہ بیگم کی حیرت تھی کہ جاتی نہیں تھی۔ وہ بار بار نجمہ فیاض سے پوچھتیں جو زچ ہورہی تھیں مگر ان کو سفینہ بیگم کی کیفیت کا بھرپور ادراک تھا اس لیے تحمل اور برداشت سے ان کی تشفی کروائے جارہی تھیں۔

''جی آپا۔ مجھے تابندہ باجی نے خود فون کیا تھا۔ وہ اپنے بیٹے کی شادی خاندان سے باہر کرنا چاہتی ہیں۔ عرفان بھائی اور صفوان اچھے کھاتے پیتے کاروباری لوگ ہیں۔ درجنوں ملیں چل رہی ہیں ان کی اور چار چار گاڑیاں ہیں۔''

''پھر ایسی کیا آفت آگئی ان پر کہ خاندان سے باہر دوڑ پڑیں۔''

''دراصل خاندان میں صفوان کے جوڑ کی لڑکی نہیں۔''

''اچھا اچھا پر شمع کے لیے کیوں کہہ رہی ہو، ثمرہ کے گھر لے جائیں رشتہ۔'' سفینہ بیگم اپنی پوری تسلی کر لینا چاہتی تھیں۔

''آپا وہ تھوڑا صحت مند خاندان ہے اور ثمرہ کے خیالات آپ کو پتا ہیں، اسے اپنے جیسا اسمارٹ بندہ چاہیے جو رج کے امیر ہو۔ خیر امیر بہت ہیں مگر ساتھ کھانا پینا کھلا ہے اور صحت بھی اسی حساب سے ہے تو انہیں اپنے جیسی لڑکی چاہیے ہوگی ناں۔''

نجمہ کی وضاحت پر سفینہ بیگم کا رہا سہا مخمصہ بھی جاتا رہا۔

دراصل شمع پیدائشی طور پر صحت مند بچی تھی اور اکلوتی ہونے کی وجہ سے دادا دادی، ماں باپ اور

بھائیوں کی لاڈلی تھی۔ ہمارے ہاں زیادہ پیار کھلا پلا کر ہی جتایا جاتا ہے تو س ے وزن کا مسئلہ پیدا ہوا جو سفینہ بیگم کی بروقت حکمت عملی کے باعث زیادہ گمبھیر تو نہ ہوا تاہم وہ لڑکیوں کے مروجہ معیار کی نسبت تھوڑی فربہ تھی۔ جب سے اس کی شادی کا غلغلہ اٹھا تھا سفینہ بیگم اس کا وزن کم کروانے کی تگ و دو میں تھیں جس میں انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی تھی مگر وہ پوری طرح مطمئن نہیں تھیں۔

دوسری طرف اس کا نام سن کر لوگ دانتوں میں انگلیاں داب لیتے۔

"اس جدید دور میں اتنا پرانا نام" لیکن یہ اس کی نانی کا کیا دھرا تھا جو بیٹی کو سسرال پر مسلط کرنے کے مرحلہ وار پروگرام کے تحت ننھیالی نام پر اڑ گئی تھیں۔ مرحومہ کو شمع ڈرامہ انتہائی پسند تھا، آخری عمر میں جا کر ان کو اس محبت کے اظہار کا موقع ملا تو وہ کیوں پیچھے رہتیں۔ انہوں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اپنی دیرینہ خواہش پوری کر ڈالی۔ اس دوران انہوں نے بیٹی کے چہرے کے بگڑتے زاویے دیکھے نہ داماد کی فوں فاں کو خاطر میں لائیں۔ انہوں نے جو تاریخ ساز فیصلہ کیا تھا، اس کے مضر اثرات اب شمع کی زندگی پر نظر آ رہے تھے۔ اس کے اسی فیصد رشتے محض نام کی بدولت لوٹ کر نہ آئے تھے۔ اس صورتحال میں سفینہ بیگم کا پریشان ہونا بنتا تھا۔

رہی شمع تو وہ غوری خاندان کی بے تحاشا امارت کا ذکر سن سن کر بحیرہ مردار میں غوطہ زن ہونے لگی تھی لیکن اسے بروقت دھیان آیا اس شدید کھارے پانی میں کسی جاندار کا ڈوبنا ممکن ہی نہیں سو خوشی سے بے حال وہ خیالوں خیالوں میں بحیرہ مردار کے نمکین پانی پر چل کر اردن سے اسرائیل پہنچ گئی۔ وہ اسرائیلی سرزمین پر قدم دھرنے والی تھی جب اسرائیل کی مسلمان دشمنی نے اس کے تخیل کے پردے پر دستک دی۔ اس نے سرپٹ واپس دوڑ لگائی اور صوفے میں دھنس کر صفوان غوری کے سپنے بننے میں ہی عافیت جانی تھی۔

☆☆☆

سفینہ بیگم باورچی خانے میں شمع سے طشتری میں لوازمات رکھواتے ہوئے اسے ہدایات دے رہی تھیں جب ثمرہ آن ٹپکی۔ وہ دبلی پتلی، دراز قد اور نازک اندام لڑکی تھی۔ سفینہ بیگم کا دل دھڑک گیا۔

"اللہ خیر رکھے۔ یہ اس ناوقت پہ کیوں آ گئی۔ اچھا بھلا ہاتھ آیا رشتہ نکل نہ جائے کہیں۔"

وہ ثمرہ کو ٹالنے کی ترکیب سوچنے لگیں جو ان کی سوچوں سے بے نیاز انہیں بیٹھک میں جانے کا کہہ رہی تھی۔

"خالہ آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ میں شمع کی مدد بھی کروا دوں گی اور اس کو تیار بھی کر دوں گی۔"

مگر سفینہ بیگم کا چہرہ تفکرات سے اٹ چکا تھا۔

"سب سے بڑی پریشانی تو تم ہو سینک سلائی۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔ "خیر اللہ مالک ہے۔"

مگر ثمرہ کے کان کافی پتلے تھے۔

"آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں ذرا سا وزن ہی زیادہ ہے ورنہ اتنے حسین نین نقش ہیں اس کے کہ سب لٹو ہو جائیں گے۔"

سفینہ بیگم نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔ جانے اس نے پوری بات سنی ہی نہیں تھی یا جان کر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ اپنے دل کو سنبھالتیں مہمانوں کے پاس جا بیٹھیں۔ تابندہ غوری کی ٹپوری اردو اور عرفان غوری کی ٹھیٹھ پنجابی نے سفینہ بیگم اور مظہر ٹوانہ کو نئے جال میں الجھا لیا تھا۔ صفوان غوری شمع کے بھائیوں سے محو گفتگو تھا۔ وہ بھی روانی سے پنجابی بول رہا تھا۔ تابندہ غوری شوہر اور بیٹے سے مخاطب ہوتے وقت اردو میں پنجابی کا تڑکا لگا دیتیں۔ سفینہ بیگم اپنی پریشانی بھول کر مسکرانے لگیں۔

☆☆☆

شمع اور ثمرہ طشتری تھامے اندر آئیں تو تابندہ غوری نے اپنے تھل تھل کرتے وجود کو سمیٹ کر دونوں کو چھپی ماری۔

"ایڈی سوہنی کڑی ماشاءاللہ۔"

مذکورہ بالا توصیف جانے کس کی تھی لیکن شمع اسے جی جان سے قبول کر کے شرما گئی تھی۔

فریقین کے مابین ابتدائی گفت و شنید ہو چکی تھی۔ اب وہ باضابطہ طور پر رشتہ لے کر آئے تھے۔ شمع نے سوچا تھا مہمان امیر ہوں گے تو ان میں لازماً نفاست کوٹ کوٹ کر بھری ہو گی لیکن وائے حسرت ماں، باپ اور بیٹا نزاکت سے کوسوں دور، موٹاپے میں ایک دوسرے کی فوٹو کاپی تھے۔ وہ صفوان غوری کو کینہ توز نظروں سے گھورے جا رہی تھی جس کا نام سن کر ذہن میں ایک افسانوی ہیرو کا تصور ابھرا تھا اور اس کے گرانڈیل وجود کو دیکھ کر اس خوب صورت خاکے کا ملیدہ بن گیا تھا۔ ثمرہ جو اس سے قبل کافی پرجوش تھی، جانے کیوں اب ٹھس بیٹھی تھی۔

"لڑکی کو کھانا بنانا آتا ہے؟"

تابندہ غوری کے سوال نے سفینہ بیگم کے ڈوبتے دل کو سہارا دیا۔ ایک یہی کام تو شمع دلجمعی سے کرتی تھی۔ انہوں نے پرامید ہو کر بتایا۔

"ہاں ہاں میری بیٹی کو کھانا بنانے کا بہت شوق ہے۔"

"اور کھانے کا بھی۔"

ثمرہ منمنائی تھی۔ جس پر سفینہ بیگم نے اسے گھور کر دیکھا تھا تاہم کسی کی توجہ ادھر نہیں تھی۔

"بس پھر ٹھیک ہے۔ ہماری حویلی پر اللہ کا خاص فضل ہے اور ہم کفرانِ نعمت بالکل نہیں کرتے۔"

سفینہ بیگم کو ان کی صحت مندی کے تناظر میں اس بیان پر قطعی شبہ نہیں تھا۔

"ساڈا اکو اک پتر ہے۔ ساڈی نوں اس دے کھانڑ پینڑ دا تیان رکھ لیوے ہور سانوں کج نی چاہی دا۔"

یہ خالص دیہاتی و پنجابی فرمان عرفان غوری کا تھا جو اپنی پلیٹ میں کے ٹو بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ سفینہ بیگم نے بغور لبالب پلیٹ کو دیکھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے یہ رشتہ قبول ہے قبول ہے قبول ہے۔"

تابندہ غوری نے لمبی سی ڈکار لے کر ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش کی تو سفینہ بیگم ہڑبڑا گئیں۔ اتنی جلدی وہ کیڑا پسند نہ کرتیں کجا بیٹی کا رشتہ دینا۔ انہوں نے بات سنبھالنا چاہی۔

"مجھے ابھی اپنے اور ان کے بہن بھائیوں سے صلاح مشورہ بھی کرنا ہو گا۔ باقی باتیں اس کے بعد ہوں گی۔"

"آہو جی۔ آپ آرام سے بعد صلاح مشورہ کرتے رہیے گا اس میں کون سا بڑا مسئلہ ہے۔ میں روز روز لاہور نہیں آ سکتی۔ پنڈ میں بہتیرے کام ہوتے مجھے...... کیوں پپوسئی کہاناں میں نے؟"

آخر میں انہوں نے بیٹے کو ٹہوکا دیا۔ پپو شدید ٹڈل تھا۔ اس کی پلیٹ لوازمات سے اٹی پڑی تھی جو وہ لپالپ کھائے جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا باپ بیٹے میں کھانے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ پلیٹ سے نگاہ ہٹانے کی زحمت کیے بغیر اس نے محض اپنا ڈھائی من کا سر ہلا دیا۔ شمع نے خار کھا کر اس پر جھلتی ہوئی نظر ڈالی۔

"میرا اور اس لنگور کا جنم جنم...... اوہ۔ مطلب جنم جنم کا ساتھ جڑنے جا رہا ہے اور اس نے مجھے ایک نظر بھی دیکھنا گوارا نہ کیا۔ اب میں اتنی گئی گزری بھی نہیں، دیکھنا بعد میں گن گن کر بدلے لوں گی۔" اس نے دانت پیس کر ثمرہ کے کان میں سرگوشی انڈیلی مگر وہ گونگے کا گڑ کھا چکی تھی۔ شمع بدمزا ہو کر عرفان غوری کی جانب متوجہ ہو گئی جو مظہر ٹوانہ سے مخاطب تھے۔

"بس پائی جی ہن تسی حویلی دا چکر مارو تے رشتہ منظور کرو۔"

"لو جی۔ اب کون سی قبولیت ہونی۔ ہماری طرف رشتہ پکا ہے۔"

ہونے والی ساسو ماں نے اپنی موٹی بھدی انگلی سے ہیرے کی انگوٹھی نکالی۔

"مگر ہمیں یہ روکھی پھیکی انگوٹھی منظور نہیں۔"

ثمرہ نے بالآخر نادیدہ صدمے سے باہر نکل کر صدائے احتجاج بلند کی۔

"ہائیں مگر کیوں؟؟؟"

ماں بیٹے کی توندیں ایک ساتھ سہم گئیں۔ صفوان غوری کو پلیٹ سے نظریں ہٹانا پڑیں جبکہ عرفان غوری بدستور کھانے میں مشغول تھے، وہ کھانے پینے کے دوران بے جا مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔

"ابا جی کو کھانے سے فرصت نہیں اور یہ لڑکیاں......" صفوان غوری نے کلس کر سوچا لیکن یہ بھول گیا کہ اس کے سامنے بھی لوازمات کی ڈھیری

لگی ہے۔ شومئی قسمت پہلی بار کوئی ایسی لڑکی پسند آئی تھی جس کے گھر والے بھی راضی تھے۔

''انہیں چھوڑیں آپا، مجھے دیں انگوٹھی میں پہنا دوں گی۔'' سفینہ بیگم کی مداخلت سے سب کی جان میں جان آئی۔

☆☆☆

مظہر ٹوانہ بیوی بیٹوں سمیت صفوان غوری کا گھربار دیکھنے گئے اور ان کا رہا سہا مخمصہ بھی جاتا رہا۔ تابندہ غوری نے ان کے کان میں بات ڈال دی۔

''آپا۔ بارات پر میری نندیں، بھابھیاں اور بچیاں آئیں گی۔ ہماری طرف رواج ہے ساس دلہن کی شکل ولیمے کے دن دیکھتی ہے۔''

وہ ان کی اس عجیب و غریب منطق پر انگشت بدنداں رہ گئے تاہم شمع کی شادی بالآخر ہو رہی تھی تو ان چھوٹی چھوٹی باتوں پہ کون فساد ڈالتا۔

شمع نے سنا تو بے نیازی سے شانے اچکا دیے۔ اس کا بنیادی مقصد حیات دلہن بننا تھا۔

بارے تابندہ غوری کی رشتہ دار خواتین کی آوت جاوت شروع ہوئی۔ کبھی ایک ٹولی آ رہی ہے اور کبھی دوسری۔ بہانے بازیوں کی ان کے پاس کمی نہیں تھی۔ کبھی ناپ لینا ہوتا، کبھی پسند کی خریداری اور الا بلا۔ ہر بار ان کے ساتھ کم از کم ایک نیا چہرہ ہوتا۔ شمع کو لگتا وہ ہر دفعہ جا کر کچھ کہتی ہوں گی تبھی وہ بے ٹکٹ کا تماشا دیکھنے آتیں۔ وہ دانتوں میں انگلیاں داب لیتیں اور کھسر پھسر کر کے ہنستی جاتیں۔ جانے کیوں؟

شمع سوچ سوچ کر تھک گئی تو حسب عادت شانے جھٹکے۔

''خیر سانوں کی۔''

☆☆☆

دلہن بن کر اس پر بہت روپ آیا کیونکہ وزن بھی کافی کم کر لیا تھا اس نے۔ ہال میں سب کی ستائشی نظریں اس پر تھیں۔ صفوان غوری بھی اچھا لگ رہا تھا۔ بارات نکلی تو کچی پکی سڑک پر جھٹکے کھاتی، ہچکولے لیتی گاڑی میں بالآخر وہ سسرال پہنچ گئی۔ طویل رسموں کے بعد اسے حجلہ عروسی میں پہنچا دیا گیا۔

صفوان غوری گنگناتا رقص کرتا کمرے میں داخل ہوا۔

''ناچ ناچ صفوا نے جب تک شمع جلے۔''

''جلتی ہے شمع کی جوتی۔''

جیسے فلموں میں صائمہ چھلانگ مار کر کدو یا شاید توری کی بیل سے لٹک جاتی تھی ویسے وہ پلنگ سے اتری اور اپنے حق حلال کے مجازی خدا کا ہاتھ تھام لیا۔

''اج میلہ ویکھن آئیاں کڑیاں لہور دیاں۔''

''اے اے کون ہو تم؟''

''شمع ٹوانہ۔'' اس نے گردن اکڑائی۔

''یہ شمع ڈرم میں ڈھالی گئی ہے کیا؟''

وہ ڈائٹنگ کر کر آدھی رہ گئی تھی اور اس کے دیو ہیکل شوہر طنز فرما رہے تھے جو اسے بری طرح چبھا۔ اس نے چبا چبا کر اسے یاد دلایا۔

''آپ نے شمع ٹوانہ کو ہی قبولا ہے سرتاج۔''

صفوان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ہائیں تو پھر وہ اپسرا کون تھی۔''

شمع کا ماتھا ٹھنکا۔

''کس کا پوچھ رہے ہیں؟''

''وہ جو تمہارے گھر تیلی پتنگ لڑکی تھی۔''

''وہ ہمسائی تھی۔''

اس نے خشک لہجے میں کہہ کر صفوان غوری کے خوابوں کو چکنا چور کر دیا۔

''ڈاکٹر نے کہا تھا اس موٹاپے سے نجات کے لیے خاندان سے باہر شادی کریں۔ حق ہا قسمت کی خرابی دیکھو پھر بھی موٹی بیوی ہی ملی۔''

صفوان غوری نے سرد آہ بھری۔ وہ ہوش و حواس کھو کر پلنگ پر گر چکا تھا۔ رب جانے کل اس کی ساس کا کیا حال ہونا تھا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی ٹوکری اٹھالی اور کاجو چنتے ہوئے گنگنانے لگی۔

''کل جو ہوگا، دیکھ لیں گے کل۔''

☆☆

کشف بلوچ

راہ دشوار سہی

اس کی چڑچڑاہٹ عروج پر تھی۔ آنگن میں گیلے کپڑے ڈالتے ہوئے اسے رسی ڈھیلی لگنے لگی۔ کئی بار دھلے کپڑے اتار کر بالٹی میں پٹخے اور پھر اسٹول پر چڑھ کر رسی کو برگد کے درخت کے تنے سے مضبوطی سے باندھا، مگر جونہی دوبارہ کپڑے رسی پر ڈالے یوں لگا کہ جیسے دوپٹے کے پلو نیچے زمین کو چھو رہے ہوں۔ یہ دیکھ کر وہ حد سے زیادہ بے زار ہوئی اور کوفت کے مارے بالٹی بی جان کے قدموں میں پٹخ کر کچن میں گھس گئی۔

''ٹینشن بھی وائرس جیسی ہوتی ہے۔ دماغ میں گھس جائے تو اس کے سارے فنکشن ناکارہ بنا دیتی ہے۔''

بی جان نے حسنہ کو تاسف سے دیکھا۔ بیٹی کی اداسی اور بے زاری دیکھ کر ان کا دل یاسیت سے بھر گیا۔ ان سے کچھ چھپا نہ تھا۔ مگر ان کے بس میں کہاں کچھ تھا۔

کچن میں آ کر حسنہ کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ سنک میں بوند بوند ٹپکتا پانی اسے الجھن میں مبتلا کر گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر کئی بار ٹونٹی کو بند کیا، پھر کھولا اور بند کیا۔ مگر پھر وہی بوندوں کی ٹپ ٹپ جیسے اس کے اعصاب پر سوار ہونے لگی۔ وہ جھنجھناہٹ میں کچن کے آدھے ادھورے کام کیے باہر نکل آئی۔ مگر ٹپ ٹپ کی آواز کانوں میں جیسے رچ بس گئی تھی۔ گھر کے جس کونے میں ہوتی، یوں لگتا جیسے کہیں آس پاس بوندیں گر رہی ہیں۔

اکثر رات کو ٹونٹی کو اچھی طرح بند کر کے کچن سے نکلتی، مگر کمرے میں آتے ہی یوں لگتا جیسے بوندیں ٹپک رہی ہوں۔ زبردستی نظریں ٹیلی ویژن کی اسکرین پر مرکوز کرتی۔ ریموٹ پر والیوم کے ہندسے بڑھتے جاتے، مگر دھیان پر وہی ٹپ ٹپ قابض رہتی۔ وہ تھک ہار کے کتاب اٹھا لیتی، توجہ کو لفظوں کے پالنے میں ڈال کر بہلاتی، لیکن ناکامی جیسے اس کا منہ چڑانے لگتی۔

''انسان مایوسی میں گھر جائے تو اسے اپنا وجود چیونٹی کی مانند لگتا ہے اور فکریں پہاڑ جیسی۔''

اس کی آدھی رات سوچوں میں گزر جاتی اور نیند روٹھ کر واپس پلٹ جاتی۔ وہ روہانسی ہو کر تکیہ

کانوں پر رکھ لیتی۔ مگر وہی ٹپ ٹپ......

راتیں نیند چاٹ جاتی تھیں تو صبح کا سورج اپنی جیب میں نئی فکریں ڈالے آنگن میں اتر آتا۔

کچن میں منہ چڑاتی خالی پتیلی دیکھ کر حسنہ نے ٹرے میں چائے کے کپ رکھتی بھابھی سے استفسار کیا۔

''بھابھی میں یہاں اریبہ کے فیڈر کا دودھ ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھ گئی تھی۔''

''میں نے اس سے چائے بنالی۔'' خشک لہجہ، مختصر جواب۔

''مگر......'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی بھابھی جیسے اس کے سامنے پھٹ پڑیں۔

''دیکھو حسنہ یہ میرا گھر ہے اور مجھے پتا ہے میں کن مشکلوں سے چلا رہی ہوں۔ تم لوگ کو تو بس بھائی کے پیسے نظر آتے ہیں۔ یہ نظر نہیں آتا کہ وہ دن رات گدھوں کی طرح کماتے ہیں تب جا کر چار پیسے مٹھی میں آتے ہیں۔''

ٹرے میز پر پٹخ کر انہوں نے حسنہ کی طرف غصے سے دیکھا۔ مارے شرمندگی کے اس کا منہ لال ہوگیا۔ وہ بھابھی کی جلی کٹی سن کر بھی خاموش رہی۔ لیکن اتنا کچھ کہہ دینے کے باوجود اس کی بھابھی خاموش نہ ہوئیں۔

''تم شادی شدہ ہو۔ تمہارے شوہر کی تنخواہ بھی کم ہی ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کیسے اس تنخواہ پر پورا مہینہ چلانا پڑتا ہے۔ تم ہی احساس کرلو ورنہ روز روز کہوں گی تو سب کہیں گے کہ میں تمہیں میکے میں آکر بیٹھنے کے طعنے مارتی ہوں۔''

وہ طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے تن فن کرکے کچن سے باہر چلی گئیں اور حسنہ غصے کے گھونٹ پیتی، خالی پتیلی پٹخ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی، جہاں اریبہ نے بھوک کے مارے چیخ چیخ کر اپنا گلا خشک کرلیا تھا۔

''کیا ہوا آپی؟''

ڈرائنگ روم سے نکلتی عائشہ اسے آوازیں دیتی رہ گئی لیکن حسنہ غصے سے لال بھبوکا چہرہ لیے اندر گھس گئی۔ اندر آکر بھی اس کا غصہ کہاں ختم ہوا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ کمرے میں رکھی ہر چیز توڑ کر رکھ دے۔ اپنے ہی گھر میں ایسی ذلت۔ وہ دکھ کے مارے رودی۔

لیکن یہ کمرا اس سے چھوٹی عائشہ کا تھا۔ جہاں آج کل اس نے قبضہ جمایا ہوا تھا۔ کتنی خاموشی سے عائشہ نے اپنا کمرا اس کے حوالے کردیا تھا اور خود بی جان کے کمرے میں سونے لگی اور ایک حسنہ کی بھابھی تھیں جس سے اس کا اور اس کی معصوم بیٹی کا کھایا پیا تک برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ عائشہ کے کمرے میں دیوار پر لگی خوب صورت پینٹنگ سے لے کر فرش پر پڑے کارپٹ تک ہر چیز خوب تر تھی۔ ہر شے میں اس کی بہن کا سلیقہ بول رہا تھا۔

شادی سے پہلے اس کا کمرا بھی تو ایسا ہی خوب صورت تھا۔ وہ کمرا جو اس کے لیے کسی جنت سے کم نہ تھا۔ اس کا رشتہ طے ہوا تو اسے اپنا کمرا چھوڑنے پر کوئی افسوس نہیں ہوا۔ اس نے سوچا تھا کہ وہ سسرال جا کر اس کمرے سے بھی زیادہ پیارا کمرا سجائے گی۔ بلکہ وہ اپنے پورے گھر کو خوب صورتی سے سجائے گی۔

اس کی آنکھوں نے سسرال کے حوالے سے بہت سے سپنے دیکھے تھے اور اس نے ٹھان لی تھی کہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح زندگی نہیں گزارے گی۔ جو بھی حالات ہوئے وہ فیس کرے گی اور سسرالیوں کو اپنی محبت اور خدمت سے دنوں میں اپنا گرویدہ بنالے گی۔

لیکن کبھی کبھی جاگتی آنکھوں کے خواب بھی ادھورے رہ جاتے ہیں۔ آپ لاکھ کوشش کریں۔ کسی کو اپنا بنانے کی۔ اس کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لیے۔ لیکن اگر دوسری طرف سے آپ کو مثبت جواب نہ ملے تو انسان کب تک محبت کے گیت گنگناتا رہے۔

یہ جو انسان ہے ناں اس کا وجود محبت کی مٹی سے گوندھا ہوا ہے۔ یہ محبت ہے جو اس کے وجود کو نکھارتی ہے۔ اسے بڑھنے میں مدد دیتی ہے۔ چاہے اور سراہے جانے کا احساس اسے گھنٹوں سرشار رکھتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ حسنہ کو جب محبت کے جواب میں محبت نہ ملی تو وہ اس ماحول سے بے زار ہونے لگی۔ وہ

گھر کو سجانے کے لیے کوئی چیز لے کر آتی تو بجائے اسے سراہنے کے اس میں کیڑے نکالے جاتے۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کا شوہر اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ وہ اس کے ہر کام کو سراہتا۔ تعریف کرتا مگر اس کی ساس اور امتیاز کی بڑی بہن خوب ناک بھوں چڑھاتیں۔ رفتہ رفتہ اس نے بھی بے رخی دکھائی تو دونوں اور بھڑ گئیں کہ بہو ہمیں کسی خاطر میں نہیں لاتی۔ ہم سے بات کرنے کے بجائے سارا دن کمرے میں گھسی رہتی ہے۔

پھر ایسا ہوا کہ آئے روز گھر میں جھگڑے ہونے لگے اور آخر میں سارا الزام اس کے سر ڈال دیا جاتا۔ امتیاز اگر اس کی حمایت کرتا تو اسے بھی سننی پڑ جاتی۔ مجبوراً وہ بھی اس کا ساتھ چھوڑنے لگا اور آئے روز اسے میکے چھوڑ جاتا۔

اب بھی اسے میکے آئے دوسرا ہفتہ تھا۔ امتیاز نے پلٹ کر اس کی خبر تک نہ لی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی طبیعت میں بے زاری آنے لگی۔ وہ بات بات پر پریشان ہو جاتی۔ کیونکہ یہاں بھی اس کی بھابھی کا راج تھا۔ بھائی بے چارہ تو اس کے شوہر کی طرح بیوی کی حمایت کرتا۔ کیونکہ اسے اپنا گھر عزیز تھا۔ اس کی ماں جنہیں وہ بہن بھائی بی جان کہہ کر پکارتے۔ انہوں نے کبھی بہو کی کسی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ وہ گھر کی ساری ذمہ داری بہو پر ڈال کر بری الذمہ ہوگئی تھیں اور رہ گئی عائشہ تو وہ صبح کالج جاتی تو تین بجے کے قریب گھر واپس آتی۔ گھر کے کاموں کو دونوں نے آپس میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ صبح کے سارے کام بھابھی کرتیں اور شام کے عائشہ۔ مہمان آگئے تو بی جان بھی ساتھ لگ جاتیں۔ ورنہ ساری دن تخت پر بیٹھی تسبیح میں مشغول رہتیں۔

ایسے میں حسنہ کے آجانے سے ان کے گھر کا ماحول دن بدن کشیدہ ہونے لگا۔ اس کی بھابھی کو بن بیاہی نند تو قبول تھی۔ لیکن شادی شدہ ہرگز نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ روز ہی حسنہ اور ان میں تکرار شروع ہو جاتی اور وہ کمرے میں بند ہو جاتی۔

اگرچہ یہ بات درست تھی کہ یہ اس کی بھابھی کا گھر تھا۔ حکومت بھی ان ہی کی چلتی۔ مگر یہ بھی تو اس کے ماں باپ کا گھر تھا۔ وہ سسرال سے نکالے جانے کے بعد کہاں جاتی اور یہ بھی تو سچ تھا کہ اس جھگڑے میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بھی اگر اپنی بھابھی کی طرح پہلے دن سے اپنے سسرالیوں کو مٹھی میں کرلیتی تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ آخر وہ بھی تو کسی کی بہو اور بھابھی تھی۔ اس کا شوہر اس سے خوش تھا۔ وہ بھی چاہتی تو ساس اور نند کو دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکتی۔ مگر اس نے شادی سے پہلے سوچ لیا تھا کہ چاہے اس راہ میں اسے جتنی دشواریاں کیوں نہ آئیں۔ وہ عام بہو کی طرح کبھی نہیں بنے گی۔

اور اب یہی بات اسے سب مشکل لگ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس راستے میں بہت سی رکاوٹیں آتی ہیں۔ لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی حالات سے ہار جائے گی۔ اب بھی اپنی بیٹی کو تھپکیاں دے کر سلاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ امتیاز سے کہہ دے گی کہ اس کے لیے الگ گھر کا انتظام کردے۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اریبہ سو گئی تو وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

محبت کی فصل کاشت کرنے کے لیے زمین کا موزوں ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر زمین میں نفرت کا سیم اور تنقید کا تھور بھر دیا جائے تو آسودگی اور سکھ کے پھول نہیں اگتے۔

وہ یہ سوچ کر ہی اداس ہو گئی کہ اس کے سارے خواب ملیامیٹ کردیے گئے۔

حسنہ سوچتے سوچتے تھک گئی تو سونے کے لیے بیڈ کی طرف بڑھی۔ اسی وقت اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے بڑی بے تابی سے موبائل اٹھایا اور ہیلو کہا۔ مگر اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ امتیاز کے بجائے اس کی دوست ارم کی کال تھی۔ وہ دونوں کلاس فیلو تھیں۔ شادی کے بعد کچھ عرصے کے لیے رابطہ ٹوٹا، مگر پھر کچھ ماہ بعد ہی ان دونوں میں رابطہ پھر سے بحال ہوگیا۔ یہ اس کی واحد سہیلی تھی جس سے وہ اپنے دل کی ہر بات کہہ دیتی۔

آج ارم سے کافی دنوں بعد بات ہو رہی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حسنہ پھر روٹھ کر میکے آئی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے دل کا حال سناتی۔ آگے سے ارم کوئی اور ہی قصہ کھول بیٹھی۔

"حسنہ میں اور میری ساس تمہارے گھر آنا چاہ رہے تھے۔" اس کی بات سن کر حسنہ سوچ میں پڑ گئی۔

"ہاں۔ جب چاہو آ جاؤ۔ اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ بے دلی سے مسکرا دی۔ اتنی اچھی سہیلی سے ملاقات کا سن کر بھی اس کے اندر خوشی کی کوئی کونپل تک نہ پھوٹی۔

"اجازت اس لیے لی کیونکہ ہم ایک خاص مقصد کے لیے آنا چاہ رہے ہیں۔"

اس نے ہچکچاہٹ سے کہا تو حسنہ چونکی۔

"کیسا مقصد؟"

حسنہ کی بات سن کر اس نے ساری بات تفصیلاً بتا دی۔

وہ اپنے دیور کے لیے لڑکی تلاش کر رہی تھی۔ کوئی خاص ڈیمانڈ نہیں تھی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ اس کی بہن عائشہ کے لیے رشتہ لے کر آئیں مگر حسنہ اس کا ارادہ جان کر کچھ اور ہی سوچنے لگی۔

ہاں ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔ حسنہ نے دل میں سوچا اور وہ مطمئن ہو کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ اسے اب صبح کا انتظار تھا۔ اسے یقین تھا کہ آنے والی صبح اس کے لیے بے زار کن ہرگز نہیں تھی۔

☆☆☆

سورج کی اولین کرنوں نے جونہی آنگن میں جھانکا، بی جان نے فون کھڑکا کر حسنہ کے شوہر کو بلوا لیا۔ حسنہ ابھی تک اپنے کمرے میں تھی۔ عائشہ بہنوئی کے لیے چائے بنا کر لے آئی مگر انہوں نے کپ کو چھوا تک نہ تھا۔

"دیکھیے خالہ جان میں تو خود بہت پریشان ہوں، ماں کی طرف داری کرتا ہوں تو بیوی ناراض ہو جاتی ہے اور اگر بیوی کا ساتھ دے دوں تو ماں ناراض ہو جاتی ہے۔ میں تو عجیب مشکل میں پھنس گیا ہوں۔"

وہ بھی الگ پریشان بیٹھا تھا۔ بی جان سر پکڑ کر رہ گئیں۔ سوچا تھا کہ داماد کے پاس اس مسئلے کا حل ہوگا مگر وہ تو خود ان ہی سے مدد مانگنے لگا۔

"اب آپ بتائیں بی جان کہ ایسی صورت میں میں کیا کروں؟" وہ تلخ ہوا۔

"الگ گھر کے لیے میری تنخواہ اجازت نہیں دیتی اور ساتھ رہنے پر روز روز کی چخ چخ۔"

امتیاز نے سر جھکا کر گویا ہار مان لی۔

بڑھی ہوئی شیو، الجھے بال اور ملگجے شلوار قمیص میں ملبوس امتیاز مایوسانہ انداز میں بی جان کے پاس بیٹھا تھا۔

بی جان اس کی بات سن کر سرد آہ بھر کر رہ گئیں۔ قصور امتیاز کا بھی نہیں تھا۔ حالات ہی اسے اس نہج پر لے آئے تھے۔

"میں اپنے گھر جا رہی ہوں بی جان۔"

امتیاز حسنہ کی آواز سن کر بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ اریبہ کو اٹھائے ہوئے حسنہ کے دوسرے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر اس کے زرد چہرے پر بشاشت دوڑ گئی۔ یہ تو انہونی ہی ہو گئی تھی۔

کونے میں کھڑی عائشہ کا چہرہ بہن کا یہ فیصلہ سن کر کھل اٹھا اور بی جان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

☆☆☆

حسنہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو کوئی نیا پن دیکھنے کو نہیں ملا۔ برآمدے کا فرش مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور صوفوں پر گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ کشن قالین پر بکھرے ہوئے تھے اور ٹی وی پر کوئی مارننگ شو چل رہا تھا۔ البتہ آواز مدھم تھی۔ سامنے میز پر چائے کا کپ رکھا تھا۔ امتیاز نے آگے بڑھ کر ٹیلی وژن بند کر دیا۔ تب ہی کچن سے ثمینہ کی تیز جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔

"کیا مصیبت ہے سنک کی چھلنی میں اتنا کچرا ہے کہ پانی بار بار رک جاتا ہے۔ میں نہیں دھو رہی برتن۔" ثمینہ نے نیلی چائے دانی کو سنک کے پاس پٹخا۔

حسنہ کے قدم کچن کی طرف بڑھ گئے۔ ساس اور نند کی باتیں سن کر وہ باہر ہی رک گئی۔ سامنے ہی اسے اپنے جہیز کی چائے دانی ٹوٹی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے پلٹ کر شوہر کو دیکھا اور اس نے سر جھکا لیا۔

"یار ابھی پچھلے ہفتے ہی تو ساری نالیاں صاف کروائی ہیں۔ تم جانتی ہوں۔ وہ غصے کی ذرا تیز ہے۔ تم بس نظر انداز کر دیا کرو۔" نجانے امتیاز نے اسے دلاسا دیا تھا یا پھر خود کو۔ وہ یہ کہہ کر اریبہ کو کندھے سے لگائے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

یک دم حسنہ اداس ہو گئی۔ آج بھی اسے سب کچھ اکیلے ہی کرنا تھا۔ امتیاز ایسا ہی تھا۔ گھر کے باہر اس کا بھرپور ساتھ دیتا لیکن گھر کے اندر خاموشی اختیار کر لیتا۔ حسنہ خود ہی ہمت کر کے اندر داخل ہوتی۔ دونوں کو سلام کیا تو ثمینہ اسے دیکھتے ہی باہر نکل گئی۔ البتہ اس کی ساس نے جواب دے دیا۔ یہ بھی غنیمت تھا۔

اس نے ٹوٹی ہوئی چائے دانی کچرے کی ٹوکری میں پھینک دی۔ اندر چھن سے کچھ اور بھی ٹوٹا تھا۔ حسنہ نے کھڑکی کے پاس رکھے گملے میں اگے پودینے کی پتیوں کو نرمی سے چھوا۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے۔ پھر اچانک ساس نے اس کی امی کی طبیعت کا پوچھا تو اسے خوش گوار حیرت نے گھیر لیا۔ وہ مسکرا کر پلٹی اور ان سے باتیں کرتے ہوئے برتن دھونے لگ گئی۔ اس نے اپنی ساس کو جب یہ بتایا کہ اس کی سہیلی ارم ثمینہ کے لیے اپنے دیور کا رشتہ لانا چاہ رہی ہے۔ تب یہ سن کر اس کی ساس بے حد خوش ہوئیں اور اسے فوراً کہہ دیا کہ کل ہی اپنی سہیلی کو گھر بلا لے۔

حسنہ ساس کی بے تابی دیکھ کر مسکرا دی۔

وہ برتن دھو کر پلٹی تو کچن کی کھڑکی سے لان میں غصے سے ٹہلتی ستائیس سالہ نند پر نظر پڑی۔

جب اس کی سہیلی نے اپنے دیور کا رشتہ اس کی بہن عائشہ کے لیے مانگا تو وہ ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گئی۔ لڑکا آرمی میں تھا۔ دو ہی بھائی تھے۔ نہ کوئی بہن تھی اور نہ والد زندہ تھے۔ بس والدہ کی حیات تھی۔ یہ رشتہ عائشہ کے لیے بالکل موزوں تھا۔ لیکن پھر اس کی نظروں کے سامنے اپنی نند ثمینہ کا بجھا بجھا چہرہ آ گیا۔ عائشہ ابھی پڑھ رہی تھی۔ تب تک اس کے لیے کوئی اور اچھا رشتہ آ جائے گا۔ جبکہ اس کی نند کو تو پڑھائی ختم کیے بھی کئی سال ہو چکے تھے۔

امتیاز بتاتے تھے کہ شروع شروع میں دو چار اچھے رشتے آئے مگر انہوں نے خود ہی منع کر دیا کہ ابھی ثمینہ پڑھ رہی ہے۔ مگر بعد میں اچھے رشتے آنا بند ہو گئے۔

ثمینہ گھر میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گئی اور جب اس سے دو سال چھوٹے بھائی امتیاز کی شادی ہوئی تو وہ اور زیادہ چڑچڑی ہو گئی۔

حسنہ آج صبح یہی فیصلہ کر کے کمرے سے نکلی تھی کہ یہاں میکے میں بھابھی کی سننے کے بجائے اپنے گھر جا کر ساس کی چند کڑوی باتیں ہی سن لے۔ کم از کم وہاں اپنے گھر کا مان تو تھا۔

اپنے گھر کا مان عورت کو بہت بے فکرا کر دیتا ہے۔

آج ثمینہ کی یہ حالت دیکھ کر اسے احساس ہوا۔ ہم عورتیں غصے، کام کی زیادتی، معاشرتی دباؤ اور فکروں کو اپنے اندر پالتی رہتی ہیں، تب ہی ایسی گھٹن زدہ فضا میں کئی نفسیاتی مسائل جنم دیتے ہیں۔ یہ نفسیاتی مسائل پریشر ککر کی سیٹی کی مانند ہمیں مقررہ وقت پر خبردار کر دیتے ہیں مگر ہم اپنی اپنی زندگی میں مگن لوگ، کسی حادثے پر ہی متوجہ ہوتے ہیں۔

حسنہ کو خوشی تھی کہ اس نے ایک اچھا فیصلہ کیا تھا۔

دو کپ چائے ٹرے میں رکھے جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو ہر طرح سے مطمئن تھی۔

"کبھی کبھی راستے کی دشواریاں خوب صورت منزل کی طرف لے جاتی ہیں۔ جہاں پہنچ کر انسان راستے کی ساری تھکان بھول جاتا ہے۔"

امتیاز نے حسنہ کو اپنے قریب کیا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

☆☆

شعلہ عمیر

کرن کرن خوشبو

آیات شفا

ترجمہ:۔
شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔

☆ اور اللہ تعالیٰ شفا دیتا ہے مومنین کے سینے کو (التوبہ......14)

☆ اے لوگوں! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آئی اور دلوں کو صحت، ہدایت اور رحمت ایمان والوں کے لیے (یونس۔57)

☆ اس کے پیٹ سے ایک پینے کی چیز رنگ برنگی نکلتی ہے، جس میں لوگوں کی تندرستی ہے۔ (النحل۔69)

☆ اور قرآن میں ہم ایسی چیز نازل کرتے ہیں جو مومنین کے لیے شفا اور رحمت ہے۔ (بنی اسرائیل۔82)

☆ اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے (الشعراء۔80)

☆ فرمادیجیے آپ کہ مومنین کے لیے ہدایت اور شفا ہے (حٰم السجدہ۔44)

صدقہ کی برکت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو وہ ہچکولے کھاتی تھی۔ پھر اللہ نے پہاڑ کو پیدا کیا اور اسے حکم دیا کہ وہ زمین تھامے رکھے، چنانچہ وہ ٹھہر گئی۔ تب فرشتوں کو پہاڑوں کی مضبوطی پر تعجب ہوا اور کہنے لگے۔ اے اللہ! آپ کی مخلوق میں سے کوئی چیز پہاڑوں سے بھی سخت ہے؟ فرمایا لوہا اس سے بھی سخت ہے۔ پوچھا لوہے سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز ہے؟ فرمایا آگ۔ پوچھا کوئی آگ سے بھی زیادہ سخت؟ فرمایا پانی۔ پوچھا پانی سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز؟ فرمایا ہوا پانی سے زیادہ سخت ہے۔ پوچھا ہوا سے بھی زیادہ سخت کوئی چیز؟ اللہ نے فرمایا ہاں وہ آدمی جو اس طرح صدقہ دے کہ دائیں ہاتھ سے دے تو بائیں ہاتھ کو خبر تک نہ ہو (ترمذی)

☆ عرش کا سایہ نصیب ہونے والے سات قسم کے افراد میں سے ایک وہ بھی ہے جو دائیں ہاتھ سے صدقہ دیتا تو بائیں ہاتھ تک خبر نہ ہوتی ہو۔ (مسلم)

نیت کا اجر

ایک صحابی صاحب نے گھر تعمیر کروایا اور اس میں روشن دان بھی رکھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دعا کی غرض سے ان کے گھر تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ”یہ روشن دان کس لیے رکھے ہیں۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”روشنی اور ہوا کے لیے یہ بنوائے ہیں۔“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”اگر تم روشن دان بنواتے ہوئے یہ نیت کر لیتے کہ یہاں سے اذان کی آواز آئے گی تمہیں نیت کا ثواب مل جاتا ہے روشنی اور ہوا تو ویسے بھی آجاتی ہے۔

اصلی مساوات

سیدنا عمر فاروقی رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں ایک دفعہ مدینہ اور اس کے اردگرد قحط سالی ہوگئی۔ ہوا چلتی تو ہر طرف خاک اڑتی نظر آتی۔ چنانچہ اس سال کو ”عام الرمادہ“ یعنی خاک اڑنے کا سال کہا گیا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ گھی، دودھ اور گوشت اس وقت تک استعمال نہیں کریں گے جب تک لوگ پہلے جیسی زندگی پر نہ لوٹ آئیں۔

ایک دفعہ بازار میں گھی کا ایک ڈبا اور دودھ کا کٹورا بکنے کے لیے آیا۔ کسی خادم نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے لیے یہ چیزیں چالیس درہم میں خریدلیں اور عرض کیا۔

”امیر المومنین! اللہ نے آپ کی قسم پوری فرمادی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زیادہ اجر سے نوازے! ہم نے آپ کے لیے یہ اشیائے خوردنی خریدی ہیں۔ قبول فرمایئے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ تم لے

میرے لیے اتنے مہنگے داموں چیزیں کیوں خریدیں؟ جاؤ انہیں صدقہ کردو۔ میں کھانے میں اسراف ہرگز پسند نہیں کرتا۔ پھر فرمایا: مجھے عوام کے دکھ کا اس وقت تک صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا جب تک خود میں بھی انہی حالات سے نہ گزروں جن حالات سے عوام گزر رہے ہیں۔

پھر ایک موقع ایسا آیا کہ مہنگائی ہوگئی۔ خاص طور پر گھی مہنگا ہوگیا۔ لوگوں کو مہنگائی کا سامنا کرنا پڑا۔ عام لوگوں کے ساتھ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بھی گرانی کا مقابلہ کیا۔

انہوں نے گھی کھانا موقوف کردیا۔ عام خوردنی تیل پر گزارا کرنے لگے۔ اس نتیجے میں ان کا پیٹ خراب ہوگیا۔ ایک دفعہ پیٹ سے گڑگڑ کی آواز آئی تو پیٹ کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”تم گڑگڑ کرو یا خاموش رہو۔“ تم گھی مانگتے ہو گے۔ ”اللہ کی قسم! جب تک میری رعایا کے لوگ گھی نہ کھاسکیں گے تجھے بھی میسر نہیں ہوگا۔“

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ آپ کی بات سن کر وہاں سے نکل آئے۔ آپ روتے جاتے اور کہتے جائے۔ ”اے عمر! تمہارے بعد لوگ برباد ہوجائیں گے۔ (مناقب امیر المومنین لابن الجوزی ص 101) (الطبقات الکبریٰ 218/3)

نمک پارے

☆ رشتے داروں میں اگر کوئی گھر آکر بیٹھ جائے تو امی کے اشارے ہی ختم نہیں ہوتے موبائل چھڑوانے کے۔

☆ یہ بھی پاکستانی لڑکیوں کا ہی ٹیلنٹ ہے کہ گلی میں گزرتے موٹر سائیکلوں کی آواز سے ہی اپنے والے پہچان لیتی ہیں۔

☆ بندہ نصیحت کرے بھی تو کیسے؟ یہاں ہر بندہ کہتا ہے۔ ”تو نہ دس مینوں پتا اے۔“

☆ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے دن بدن انسان امیر ہوتا جاتا ہے چاندی بالوں میں، سونا دانتوں میں موتی آنکھوں میں اور شکر خون میں پائی جاتی ہے۔

☆ لڑکیاں جرابیں پہنتے ہوئے سوچتی ہیں کل اسکن کلر کی پہنی تھیں آج بلیک پہنوں گی اور لڑکے سونگھتے ہیں پھر سوچتے ہیں ابھی دو دن اور چل جائیں گی۔

سعدیہ وحید سعدی......اسلام آباد

حقیقت ہے یہ تو

جب انسان پتے پر رکھ کر کھاتا تھا تو مہمان دیکھ کر ہرا بھرا ہوجاتا تھا سارا خاندان مہمان کا شاندار استقبال کرتا تھا۔ پھر انسان مٹی کے برتن میں کھانے لگا اور رشتوں کو زمین سے جڑ کر نبھانے لگا پھر تانبے اور پیتل کے برتن آگئے تو انسان کا لوگوں سے رابطہ چھ ماہ یا سال بعد ہی چمکنے والا ہوگیا۔ شیشے کے برتن آنے کے بعد رشتے عجیب ہوگئے لوگ ٹوٹنے کے بعد جڑنے تو لگے لیکن شیشے میں پڑی دراڑ کی طرح اور اب تو ڈس پوزیبل نے تمام کا تمام معاملہ ہی ختم کردیا ہے۔ مطلب ہونٹوں تک چاٹ لیے جاتے ہیں ضرورت پوری ہونے کے بعد پاؤں سے کک ماردی جاتی ہے۔ میری بات پھینکنے کے قابل نہیں ہے کیونکہ یہی حقیقت ہے۔

گڑیا راجپوت......جاتری شریف

قابل قدر

☆ کرامت یہ ہے کہ ایسی نیکی تم سے ظاہر ہو، جو اور کسی سے نہ ہو۔

☆ ہم میں سے اکثر خاموشی کے مفہوم کو سمجھتے ہیں لیکن اس بات سے بہت کم آگاہ ہیں کہ خاموشی کب اختیار کی جائے۔

☆ جس کے والدین ادب نہیں سکھاتے، اس کو زمانہ سکھاتا ہے۔

☆ بہت سے لوگ جتنی محنت سے جہنم کماتے ہیں۔ اس سے آدھی محنت میں جنت میں داخل ہوسکتے ہیں۔

ادیبہ......لاٹھیانوالہ

اصل وجہ

وائٹ ہاؤس میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی صدر بش نے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔

"ہیلو مسٹر بش! میں کیکر سنگھ امرتسر ضلع خالصتان سے بات کر رہا ہوں۔ تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم نے تمہارے ملک کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔"

بش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اچھی خبر ہے کیکر سنگھ، لیکن کیا بتاؤ گے کہ تمہارے پاس کتنی فورس ہے؟"

"میرے حساب سے میں، میرے دو بھائی، ہمارا باپو، میرے پنڈ کے لوگ اور کچھ اور سردار کل ملا کر اسّی جوان ہیں۔" کیکر سنگھ نے فون پر جواب دیا۔

"اچھا مسٹر سنگھ!" یہ بتا تمہارے پاس اسلحہ کتنا ہے۔" بش نے پوچھا۔

"اوئے...... ہمارے پاس اسّی کرپانیں ہیں۔ وائے گرو نال ہر کسی کے پاس اپنی دو نالی بندوق ہے اور دس ٹریکٹر، آٹھ ٹرالیاں اور اس کے ساتھ ساتھ ایک بلڈوزر بھی ہے پنڈ والوں کے پاس۔"

"دیکھو مسٹر سنگھ! ہمارے پاس دنیا کے طاقت ترین جنگی جہاز ہیں، مضبوط ترین ٹینکس ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں اسلحہ ہے۔ تم ہمارا مقابلہ کیسے کرو گے۔"

"ویٹ اک منٹ!" سردار خاموش ہوا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ "اوئے کوئی پروا نہیں، ہمارا اعلان جنگ برقرار ہے۔"

"لیکن دیکھو تمہارے پاس صرف اسّی جوان ہیں۔ جبکہ میرے پاس دس لاکھ فوج ہے اور صرف میرے ایک اشارے کی منتظر ہے پھر سوچ لو۔" بش نے کہا۔

"مسٹر بش! میں اپنا اعلان جنگ واپس لیتا ہوں ہمیں آپ سے جنگ نہیں کرنا۔"

"اچھی بات ہے مسٹر سنگھ! میں آپ کے فیصلے کی داد دیتا ہوں لیکن یہ بتاؤ کہ تم نے جنگ سے باز رہنے کا فیصلہ کیسے کیا۔" بش نے استفسار کیا۔

"دراصل بات یہ ہے" سردار نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "کہ ہمارے پنڈ میں دس لاکھ جنگی قیدیوں کو رکھنے کے لیے کوئی جیل نہیں۔"

شکیلہ سہیل حسن...... ملکوال

سونے کی اینٹ

ایک پارسا کو سونے کی اینٹ کہیں سے مل گئی۔ دنیا کی اس دولت نے اس کے نور باطن کی دولت چھین لی اور وہ ساری رات یہی سوچتا رہا کہ اب میں سنگ مرمر کی ایک عالی شان حویلی بنواؤں گا۔ بہت سے نوکر چاکر ہوں گے۔ عمدہ عمدہ کھانے کھاؤں گا اور اعلا درجے کی پوشاک سلواؤں گا۔ غرض تول کے خیال نے اسے دیوانہ بنا دیا۔ نہ کھانا پینا یاد رہا نہ ہی حق ذکر۔ صبح کو اسی خیال میں مست جنگل میں نکل گیا۔ وہاں دیکھا کہ ایک شخص قبر پر مٹی گوندھ رہا ہے کہ اس سے اینٹیں بنائے۔ یہ نظارہ دیکھ کر پارسا کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کو خیال آیا کہ مرنے کے بعد میری قبر کی مٹی سے بھی لوگ اینٹیں بنائیں گے۔ عالی شان مکان، اعلا لباس اور عمدہ کھانے سب کے سب یہیں دھرے رہ جائیں گے اس لیے سونے کی اینٹ سے دل لگانا بے کار ہے۔ ہاں دل لگانا ہے تو اپنے خالق سے لگا۔ یہ سوچ کر اس نے سونے کی اینٹ کہیں پھینک دی اور پھر پہلے کی طرح زہد وقناعت کی زندگی بسر کرنے لگا۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالا

ایمان

اٹلی میں ایک بار ہمارے ہوٹل میں آگ لگ گئی اور ایک بچہ تیسری منزل پر رہ گیا۔ شعلے بڑے خوف ناک قسم کے تھے۔ اس بچے کا باپ نیچے زمین پر کھڑا ہوا بے قرار اور پریشان تھا۔ لڑکے کو کھڑکی میں دیکھ کر باپ نے کہا۔

"چھلانگ مار بیٹا۔"

اس کے لڑکے نے کہا۔ "بابا کیسے چھلانگ ماروں مجھے تم نظر ہی نہیں آ رہے۔" وہاں کی روشنی اس کی آنکھوں چندھیا رہی تھی۔

اس کے باپ نے کہا کہ تو چاہے جہاں بھی چھلانگ مار تیرا باپ نیچے ہے تو مجھے نہیں دیکھ رہا میں تو تجھے دیکھ رہا ہوں۔"

اس طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "تم مجھے نہیں دیکھ رہے میں تو تمہیں دیکھ رہا ہوں۔"

(اشفاق احمد...... زاویہ ۳ شہ رگ کا ڈرائنگ روم)

دعا مصطفیٰ...... خیر پور میرس

بشریٰ محمود

یادوں کے دریچے سے

اس طرح بھی حیات بسر اپنی ہو گئی
محفل میں جا کے ہنس لیے گھر آ کے رو لیے

سر پر آسمان ہے نہ پیروں تلے زمین
اس حال میں بتائیے کب تک کوئی جیے

مجبوریوں کے پاؤں کی زنجیر تم ہوئے
ہم بھی تمہاری یادوں میں پتھر ہو لیے

مارے بدن پہ پیاس کا بادل برس پڑا
آنکھوں سے نکلے آب کو کب تک کوئی پیے

گم ہو گئے نگاہ سے منزل کے سب نشاں
اندھی ہوا سے بجھ گئے امید کے دیے

اقرا سرور، کی ڈائری میں تحریر

سعد اللہ شاہ کی غزل

میں نے سب کچھ ہی کہا ہو جیسے
اس نے کچھ بھی نہ سنا ہو جیسے

چاندنی دھند کی صورت اتری
چاند چپکے سے ملا ہو جیسے

وہم کیسا ہے سجانے مجھ کو
وہ بھی سوچ رہا ہو جیسے

اس کا جانا لگا پتھر جیسا
وہ بھی شیشے پہ گرا ہو جیسے

فائزہ بھٹی، کی ڈائری میں تحریر

علی آفندی کی نظم

جو چیز اچھی ہوتی ہے
وہ اکثر کھو ہی جاتی ہے
کبھی کوئی انگوٹھی
وہ نشانی ہوتی ہے اس کی
مکیں ہوتا ہے جو دل کا
کہیں گم ہو ہی جاتی ہے
کبھی گل دان لاتے ہیں
بڑے ہی چاؤ سے گھر میں
وہ انجانے میں
معمولی سی اک ٹھوکر سے
اکثر ٹوٹ جاتا ہے
بڑے ہی چاؤ سے لے آتے ہیں
کوئی نیا ملبوس اپنے چاہنے والے کا
اس کا کوئی حصہ جل ہی جاتا ہے
جو بیٹا پیارا ہوتا ہے کبھی بچوں میں
اکثر نام لکھواتا ہے اپنا وہ شہیدوں میں
کوئی لکھاری، شاعر یا کوئی بھی
جس سے امیدیں وابستہ ہوتی ہیں
جوانی میں ہی ہم سے روٹھ جاتا ہے
وہی جس کے لیے راتوں کو جاگیں
جو آنکھوں میں بستا ہے
اسے اپنا بنا کر دوجا کوئی لے ہی جاتا ہے
نہ جانے کیسے کیسے خواب
سپنے ٹوٹ جاتے ہیں
تو جاناں
اس قدر پیار کرنا چھوڑ دو مجھ سے
مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے ہر لمحے
جو چیز اچھی ہوتی ہے
وہ اکثر کھو ہی جاتی ہے

ماریہ نذیر، کی ڈائری میں تحریر

حسن نظامی کی غزل

اپنی انا کے واسطے کیا کیا نہیں کیے
رونا تھا جس مقام پہ تم مسکرا دیے

اسس کی باتوں سے یہی لگتا ہے
کوئی اسس سے بھی خفا ہو جیسے

وہ کہ بدبخت نہ لوٹا اب تک
دل کہ ہر سانس فدا ہو جیسے

سعد بیٹھے ہو یہ کیسے آ کر
نہ شکایت، نہ گلہ ہو جیسے

سعدیہ وحید سعدی، کی ڈائری میں تحریر
کلیم عاجز کی غزل

یہ ہنسی خوشی کا موسم یہ بہار کا زمانہ
تیرے واسطے حقیقت میرے واسطے فسانہ

تیری بات سب نے مانی تیرا حال سب نے جانا
میرے دل کی دھڑکنوں سے رہا بے خبر زمانہ

نہ سنبھل سکی تجھ سے تیری زلف تا بہ شانہ
میں ابھی سے دیکھتا ہوں جو دکھائے گا زمانہ

میری خانہ خرابی کا جہاں میں ہے فسانہ
یہ وہ حادثہ تھا جس کو نہ بھلا سکا زمانہ

میں نگاہ باغباں میں کچھ اور ہو گیا ہوں
ابھی چار دن ہوئے ہیں جلا ہے آشیانہ

تجھے اے غم محبت ادھر آ گلے لگا لوں
نہ تیرا کہیں گزر ہے نہ مرا کہیں ٹھکانہ

میں ہوں وہ غریب عاجز کہ گلوں کی انجمن میں
میرے پیرہن کے ٹکڑوں کا بنا ہے شامیانہ

ثمرہ، اقراء، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی غزل

میں نفرتوں کے جہاں میں رہ کر
جدا رہوں گا تو کیا کروں گا

یہ ٹھیک کہتے ہو بے وفا ہوں
وفا کروں گا تو کیا کیا کروں گا؟

بس ایک تو ہی تو رہ گیا ہے
جہاں سارا تو کھو چکا ہوں

تجھے بھی اپنی انا میں آ کر
خفا کروں گا تو کیا کروں گا؟

ہزار سجدے تو کر چکا ہوں
قضا تمہاری محبتوں میں

میں اب دکھاوے کا کوئی سجدہ
ادا کروں گا تو کیا کروں گا

بغیر پانی بھی کوئی مچھلی
بھلا کبھی رہ سکی ہے زندہ

میں تجھ کو کھو کر کسی کا ہو کر
پتا کروں گا تو کیا کروں گا؟

مدیرہ کرن

نامے میرے نام

گڑیا راجپوت...... جاتری شریف

آج بہت عجیب سا دل ہو رہا تھا۔ رونا بھی آرہا تھا۔ سوچا آپ سے ملاقات کرنے آجاؤں (آدھی)۔ میرے سامنے ستمبر، اکتوبر اور جنوری کا کرن پڑا ہے۔ نومبر، دسمبر مسنگ ہو گئے۔ بھائی پھیرو ٹائم پر نہ پہنچوں، تو پر بس پھر...... ”سوری آپی آپ لیٹ ہو گئیں“ سننا پڑتا ہے۔ ایک کرن آتا بہت لیٹ ہے (مہینے کی آخری تاریخوں میں) اور اگر لیٹ ہو جاؤ تو کرن کہتا ہے ڈونٹ ٹچ می...... چلو خیر اب جو سامنے ہیں۔ ان پر تو تبصرہ کیا جاسکتا ہے، خط لگانا نہ لگانا تو آپ کی مرضی ہے۔ رباب ہاشمی تو کچھ خاص نہ لگی لیکن مزنہ وقاص تو سنو چندا کے بعد کافی چھائی ہوئی ہیں اور ایک بات جو میں نے نوٹ کی ہے، مجھے لگتا ہے کہ یہ مغرور ہستی نہیں ہیں اور ان کا محبت سے پکارا جانے والا نام گڑیا ہے۔ ستمبر میں ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ لگا ہی نہیں تھا لیکن اکتوبر اور جنوری کی اقساط بتا رہی ہیں کہ نگہت عبداللہ زیادہ ہی ہواؤں کا رخ پھیرنے والی ہیں۔ باقی تبصرہ بعد میں کروں گی۔ ”شب نم کی سحر“ میں نے پڑھا ہی نہیں۔ مکمل ہو جانے کے بعد پڑھوں گی۔ ”ساگر کنارے“ ام طیفور آپی! آپ کا ناول 2019ء کا سب سے بیسٹ ناول تھا۔ ”شام رنگ سیاہ“ مجھے پسند نہیں آیا کیونکہ اس کی اینڈنگ اچھی نہیں تھی۔ ایمل آپی یہ آپ کا پہلا ناول ہے جو مجھے اچھا نہیں لگا...... ورنہ تو میں دیوانی ہوں آپ کی۔ میری نظریں ہر شمارے میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ بٹ میں تھوڑی سی کنفیوژ ہوں۔ ایمل رضا اور امت الصبور۔ اگر الگ الگ ہیں پھر تو ٹھیک...... اگر ایک ہی ہستی ہیں تو دو نام؟ ویسے میری ایک بار ایمل آپی سے بات ہوئی تھی، بے شک میں آپ کو بونگی ہی لگی ہوں لیکن میں بہت خوش تھی۔ ”سنگ پیا کے رہنا ہے“ انشراح شروع میں بہت عجیب لگی، لیکن اس کی عجیب ترین ساس کے سامنے اچھی لگنے لگی۔ ہاں صائم سے اچھا ضمائر لگا کیونکہ وہ تابعدار بیٹا تھا اور صبرینہ جیسی مخلوق...... اللہ کبھی اس طرح کی مخلوق سے پالا نہ پڑے۔ یہ تو سب پالامیٹ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ انعم خان بیسٹ آف لک۔ اچھی تحریر تھی۔ نظیر فاطمہ کی ”محافظ“ پڑھ تو میری روح ہی کانپ گئی۔ مصباح جیسے لوگوں کو اللہ غرق کرے۔ اس کہانی میں ماجدہ کی ساس اور عقیل اچھے کردار تھے۔ نہال اور شرافت تو درندے نکلے۔ فلک ناز آغا کا ناولٹ ”میری راہیں بس تم تک“ حقیقت سے دور کافی سے زیادہ فرضی لگا (اکتوبر 2019) سب سے پہلے ”ہم بیلا“ پڑھا۔ ایک بار سمجھ میں تو نہ آیا۔ اس لیے دوبارہ پڑھا۔ مریم بہت اچھی لگی۔ اجلیٰ کی ماں کے ساتھ تو بہت برا ہوا لیکن اجی کی قسمت تھوڑے بہت ہیر پھیر کے ساتھ اچھی ہی تھی۔ اللہ پاک اجلیٰ کے ماموں جیسے لوگ تو نہ ہی بنائے۔ ”دادا، دادی اور وہ“ اچھا نہیں لگا اس لیے چھوڑ دیا۔ ”کھجور میں اٹکی“ منعم ملک آپ کی تحریر تو ”پڑھ کر ہنسے اور ہنس کر پڑے“ میرا مطلب ہنس ہنس کر پیٹ دکھنے لگا تو لیٹ گئے۔ میں نے عنوان کھجور میں اٹکی نہیں ”کھجور میں پھنسی“ لکھنا تھا۔ اٹک کے تو بندہ نکل ہی آتا ہے۔ سمیع خان رئیل میں بھی ”زہے نصیب“ ڈرامے کے کردار کی عکاسی کرتا نظر آیا۔ ”آواز کی دنیا“ سے لگاؤ نہیں ہے۔ ”میری بھی سنیے“ فیضان چاچا (سوری) اوور لگا، سو چھوڑ دیا اور اب آتے ہیں جنوری 2020ء کے شمارے کی طرف تو اس میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس میں ”کچن اور آپ“ میں گڑیا راجپوت ہے...... ہاہاہا۔ ”میرے ہم نفس“ ابھی شروع نہیں کیا۔ ”کچھ لمحے ہم پر قرض“ کی پہلی قسط پڑھ لی، ساری سمجھ میں آگئی۔ سو نو سسپنس...... ”یہ سال کیسا رہے گا“ بس ٹھیک ہی تھا۔ ”سموسے کا سالن“ پڑھتے پڑھتے سموسے کا حلوہ بن گیا۔ ہی ہی ہی۔ افسانوں کی لمبی لسٹ تھی۔ خالی ہاتھ سب سے اچھا لگا۔ منیب بٹ چوندا سا مجھے ویسے ہی اچھا نہیں لگتا اور کالر کھڑے ہونے والی بات نے دل ہی ساڑ دیا۔ ”میری بھی سنیے“ فضول تھا۔ ویسے بھی زین افضل کو پہلی بار دیکھا ہے۔ ”مقابل ہے آئینہ“ فائزہ بھٹی سے مل کر اچھا لگا۔ یہ لڑکی مجھے بہت اوپر جاتے دکھائی دے رہی ہے۔ گڈ لک فائزہ۔

☆ گڑیا جی! آپ کا خط تھوڑا نہیں بہت لیٹ ملا لیکن ہم نے شائع کر دیا ہے ایمل رضا اور امت الصبور دو الگ شخصیت ہیں۔

شکیلہ سہیل حسن...... ملکوال

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا جا رہا ہے، وقت کی اس رفتار میں بہت سارے چاہنے والے اگر بچھڑے ہیں تو کچھ مل بھی گئے ہیں۔ کرن کے ساتھ اتنا عرصہ کیسے گزر گیا، پتا ہی نہیں چلا اچھے دوست کی طرح مل کر بیٹھ جائیں تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا۔

اب بات ہو جائے فروری کے شمارے کی تو میں کرن کو ہمیشہ اینڈ سے کھول کر پڑھتی ہوں، تو جیسے ہی کھلا اپنا نام پڑھتے ہی دل کی دھڑکن تیز ہو گئی کہ واقعی یہ میرا نام ہے تو فرسٹ آف آل مدیرہ آنی جی دل کی گہرائیوں سے شکریہ جو پچھلے تین ماہ سے جگہ دے رہے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کو مجھ سے پیار ہو گیا ہے۔ ہے ناں...... ہے ناں۔ پلیز میرا نام پورا لکھا کریں ناں۔ آسیہ جی آپ کی شاعری کمال ہوتی ہے۔

نگہت جی! ''ہوائیں رخ بدل رہی ہیں'' کی اسپیڈ تھوڑی سی تیز کریں ناں۔ حمزہ اور ربیکا کی نیا پار لگائیں۔ شہرینہ اور جہانداد کا بھلا کریں۔ شہرینہ کا دل گداز کریں جہانداد کے لیے۔ خزینہ تیمور کو معاف کردے گی کیونکہ وہ ایک ماں ہے۔ افسانے سارے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ''نامے میرے نام'' میں سب فرینڈز کے تبصرے شان دار تھے۔ ماریہ نذیر، ثناء شہزاد، ماہا تبسم، جیونا، ساجدہ اقراء، مریم یونس سب کا شکریہ پسند کرنے کے لیے۔ اس بار فوزیہ ثمر غائب تھیں، کمی محسوس ہوئی۔ ان کی اور فائزہ بھٹی کی بھی۔ ہماری بہت ساری قاری بہنیں کافی ٹائم سے غائب ہیں۔ انیقہ انا، صائمہ امتیاز، امتیاز گل، سونیا ربانی، شمع مسکان، نشا نورین اور دیگر ایسے ہی ہماری پیاری رائٹر۔ نایاب جیلانی، نبیلہ عزیز، درثمن بلال، سحر ساجد اور کافی ساری پلیز اچھے اچھے ناولوں کے ساتھ آئیں۔ آئی مس یو۔ باقی تمام سلسلے لاجواب تھے۔ جگہ کم ہے تو تبصرہ اگلی بار۔ ہمارا اور کرن کا ساتھ ہمیشہ ایسے ہی رہے۔ سارا کرن ایک ایک لفظ بولتا ہوا دل میں اترتا ہوا تھا۔

☆ شکیلہ جی! آپ کا خط ہمیں دیر سے موصول ہوا۔ بہنیں جو غائب ہیں اس کا جواب تو وہی دیں گی۔ باقی جن رائٹرز کی آپ نے فرمائش کی ہے، ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی فرمائش پوری کرسکیں۔

زرینہ خانم لغاری...... مظفر گڑھ

مارچ کا شمارہ ملا۔ بھئی خوب ٹائٹل گرل کی میچنگ تو کمال کی تھی۔ براؤن کپڑے، براؤن جیولری، براؤن بال۔ زبردست۔ ''حمد ونعت'' سے فیض یاب ہوئے۔ عامر سلیم ماضی کے زبردست گلوکار تھے۔ زینب بشیر کی سی ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' اسپیڈ پکڑ رہا ہے۔ ارسلہ بی بی کا نکاح بھی ہونے جا رہا ہے، میرا خیال ہے ارسلہ صاحبہ کی قسمت میں پچھتاوے ہی پچھتاوے ہوں گے۔ ''یہ آٹھ مارچ'' مردوں کا تو نام بدنام ہے، عورتیں ہی عورتوں کا استحصال کر رہی ہیں۔ بیگمات جو مارچ کرتی ہیں، اپنی نوکرانیوں سے کتوں جیسا سلوک کرتی ہیں۔ سب دکھاوا ہوتا ہے۔ ''زندگی یہ سفر میں ہے'' نمبرون کہانی تھی۔ واقعی بزرگ صحیح کہتے ہیں، کسی کا دل دکھاؤ تو جو آہ نکلتی ہے وہ بددعا بن جاتی ہے۔ ویسے ہدیٰ صاحبہ کو اتنی انا نہیں دکھانی چاہیے تھی۔ لاوارث، یتیم اور بے سہارا لوگوں میں انا ہونی ہی نہیں چاہیے۔ دانیال نے اسے سبز باغ تو نہیں دکھائے تھے، نہ ہی کوئی وعدے وعید کیے تھے پھر اتنا طنطنہ دکھانے کی کیا تک تھی۔ ثریا اور انکل امجد کے سب احسان بھلا دیے۔ ماں کے پاس جا کر رج کے ذلیل ہوئی۔ ''اپنے لوگ'' اپنوں کو اپنائیت دو گے تو لوگ اپنے بنیں گے۔ ''مہوا کا پیڑ'' دردناک کہانی تھی۔ ''میں تم اور محبت'' وہی لڑکیوں کی بے وقوفی والی کہانی، ماں باپ کا گھر چھوڑ کر غیر پر اعتبار کیا پھر وقت گزرا لگ پتا گیا۔ ''کنار خواب جو'' باقی آئندہ دیکھ کر چھوڑ دی۔ ''ثمر'' بہت پیاری چھوٹی سی کہانی تھی۔ محنت کرنے والوں کو خداوند اچھا صلہ دیتا ہے۔ ''دل بے خبر'' پھر وہی آئندہ سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ آپ دونوں قسطیں اکٹھے لگا دیتے، ہم مہینہ انتظار نہ کرتے۔ ''صفائی مہم'' تو ہماری گلیوں کی کہانی تھی، جمعدار آکر نالیوں سے گند نکال کر کنارے پر رکھ دیتے۔ دو تین دن بعد جب سوکھ جاتا ہے تو جھاڑو والا جمعدار دوبارہ نالی میں گرا دیتا ہے۔ مدتوں سے یہ دستور ہے، نہ نالیاں صاف رہتی ہیں نہ ہی گلیاں۔ میری پسندیدہ ترین کہانی۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' لیکن لگتا ہے، ہوائیں رخ بدلتے بدلتے وہیں ساکن ہو گئی ہیں۔ کہانی کو آگے چلائیں۔ ہماری پیاری رائٹر رخ چوہدری مدتوں کے بعد ہمیں شکل دکھا کر پھر کہاں غائب ہو گئی ہیں۔ رخ چوہدری کے آنے کی خوشی میں ہم نے خط لکھنا شروع کیا تھا۔ مدیرہ صاحبہ انہیں ڈھونڈ کے لائیں۔ رخ چوہدری اور ایک اور رائٹر زرنین آرزو ہماری پسندیدہ ترین تھیں اور دونوں کا

انداز تحریر بھی ملتا جلتا تھا، جانے کہاں گم ہو گئی ہیں۔ کئی لکھاری بہنیں اس فانی دنیا سے کوچ کر گئیں، اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ کئی بہنیں اپنے شوہروں کو پیاری ہو گئیں، اللہ تعالیٰ انہیں خوش رکھے۔ اب کتنی بہنیں ٹی وی کو پیاری ہو گئیں، ان سے ہمیں شکوہ ہے۔ اپنے رسالوں کو بالکل بھول گئی ہیں، ان ہی رسالوں نے انہیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا ہے۔ بے وفائی اچھی نہیں ہے۔

☆ زرینہ جی! کہانیوں کو پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ کی فرائش پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

ماریہ نذیر...... بھاگٹانوالہ

امید ہے سب ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ کرن مارچ 2020ء کا کرن ڈائجسٹ 15 مارچ کو ملا۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا خصوصاً جیولری لاجواب لگی۔ ''اداریہ'' واقعی بالکل صحیح کہا مدیرہ جی نے۔ کہانیاں ہر عمر کے لوگوں کو اٹریکٹ کرتی ہیں۔ کرن کی کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ دن دگنی رات چوگنی ترقی دے، آمین۔ اور مدیرہ جی شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے، ہم آپ کے ہیں، آپ ہمارے ہیں اس لیے اپنوں کا شکریہ نہیں کہتے۔ ہمارا ساتھ اور محبت ہمیشہ کرن کے ساتھ رہے گی ان شاء اللہ۔ ''حمد ونعت'' ہمیشہ کی طرح پر اثر۔ خالد اعزاز اور کوثر اکبر آبادی جزاک اللہ۔ ''کچھ باتیں دل کی'' ثناء شہزاد دعاؤں کے لیے جزاک اللہ۔ ارم کمال آپ کے الفاظ کی میں ہمیشہ قدر دان رہوں گی، اتنی دعاؤں کے لیے بہت شکریہ۔ آپ بھی ہمیشہ خوش رہیں، آمین۔ تبسم بشیر کامیابیاں مزید تمہارے قدم چومے، آمین۔ اب جس ترتیب سے کرن پڑھا ہے، اسی ترتیب سے تبصرہ کرتی ہوں۔ ''کچھ موتی چنے ہیں'' ایک عام مسلمان پسند آیا۔ اشفاق احمد میرے بہت پسندیدہ ہیں۔ ''مسکرائی کرنیں'' اچھی لگی۔ ''مجھے یہ شعر پسند ہیں'' فرسٹ پہ اپنا شعر پڑھ کر دو سیر خون بڑھ گیا، ہاہاہا۔ باقی سب کے اشعار بہت اچھے لگے۔ ''کرن کا دستر خوان'' خالد آنی ایسے نہ کیا کریں، وہ کیا ہے کہ آپ کے دستر خوان پہ مزے مزے کے کھانے دیکھ کر منہ میں پانی آ جاتا ہے، ہاہاہا۔ ترسانا بری بات ہے۔ اپنے دستر خوان پہ ہم سب کی دعوت کریں نا پلیز۔ بس میکرونی، رائتہ، قورمہ، بریانی اور میٹھے میں چاکلیٹ کا حلوہ چلے گا۔ باقی جو آپ کی مرضی، ہاہاہا۔ انکار نہیں کروں گی میں۔ ''کچن اور آپ'' صائمہ مشتاق اور ثانیہ مشعل کے جواب اچھے تھے۔ ''بچے پھول ہیں'' واقعی بچے ایسے پھول ہیں جو آپ کی ذرا سی توجہ محبت حفاظت سے سدا مہکتے رہتے ہیں، ویل ڈن۔ ''صحت'' آسٹیوپوروسس کے بارے میں معلومات مفید رہی۔ یہ بھی صدقہ جاریہ ہے، گاؤں میں لوگوں کو آگاہی نہیں ہوتی۔ علامات اور وجوہات بتا کر انسان کسی کی مدد ہی کر دیتا ہے۔ بہت شکریہ ادارہ۔ ''فیشن'' تو ہمیشہ کی طرح نیو تھا، لہنگا کے بارے میں بھی معلومات میں اضافہ ہوا۔ ''فیشل یوگا'' جی ہاں جی۔ بڑھاپے کو کنٹرول کرنے کے لیے ورزش تو کرنی پڑے گی ناں؟ ویسے اتنی اچھی معلومات کے لیے بے حد شکریہ۔ ''نامے میرے نام'' یار لڑکیوں! تم سب کتنا سوہنا سوہنا لکھ دیتی ہو۔ سب کے تبصرے لاجواب تھے۔ فائزہ بھٹی مظہر الحق کو میں نے کہا تھا، کمال ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ کہتا ''اچھا بی بی مجھے پتا ہے لکھا میں نے تو مجھے ہی پتا ہو گا ناں؟ ہاہاہا۔ تبسم بشیر نگارشات پسند کرنے کا شکریہ۔ زرینہ خانم لغاری شعر پسند کرنے کے لیے شکریہ۔ فوزیہ ثمر بٹ جادوئی قلم تو نہیں ہے یار بیس روپے والی نیلی پنسل ہے، ہاہاہا۔ وہ میرے ہاتھ میں آ کے جادوئی بن جاتی ہے، ہاہاہا۔ تمہارا نام بٹر فلائی رکھ دیا میں نے بس۔ ہادی حسین اور فوزیہ عرف بٹر فلائی کو ڈھیر ساری پیاریاں، ہاہاہا۔ اب خوش؟ صفیہ مہر خطوط پسند کرنے کا شکریہ۔ فضہ نور خط اور شعر پسند کرنے کا شکریہ۔ ''یادوں کے دریچے'' میں سب کے انتخابات لاجواب تھے۔ ''کرن کرن خوشبو'' پسندیدہ سلسلہ ہے۔ ''دور حاضر کے اقوال پسند آئے'' اب جناب تبصرے کی طرف آتے ہیں۔ ''صفائی مہم'' اچھا افسانہ تھا۔ نعیمہ ناز کی ہر تحریر لاجواب ہوتی ہے۔ آج کل کی نسل تصاویر اپ لوڈ کرنے کی شوقین ہے اور اسی شوق میں صفائی بھی کرلیں گے۔ ''ثمر'' عطیہ خالد کا افسانہ بھی سبق آموز تھا۔ اللہ تعالیٰ کسی کی بھی محنت اپنے پاس نہیں رکھتا۔ محنت کا صلہ ضرور ملتا ہے، جیسے احمد کو ملا۔ ''یہ آٹھ مارچ'' اس افسانہ کے بارے میں کیا کہے بندہ اب۔ یہ افسانہ تو سبق آموز تھا مگر اس حوالے سے آج کل جو نعرہ عام ہوا ہے وہ منفی ہے۔ عورت ہی عورت کو برباد کر رہی ہے۔ اب بندہ دعا کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ اپنی ہی جنس سے نفرت سی محسوس ہوتی ہے اور واقعی اپنی ہی جنس کے متعلق الفاظ کم

ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت دے، آمین۔ ''اپنے لوگ'' زرقا سکندر جو کچھ آپ نے لکھا بہت اچھا لکھا اور سبق آموز لکھا۔ دولت، روپیہ، پیسہ مل جاتا ہے، سخت محنت اور جدوجہد سے لیکن رشتے ناتے اک دفعہ ختم ہو جائیں، کھو جائیں تو پھر کبھی نہیں ملتے۔ یسریٰ بی بی شکر ہے تمہیں عقل آ گئی اور میری مانو تو آج کے بعد کسی کو حقیر نہ سمجھنا۔ جیسے تم نے سیما کو سمجھا۔ اللہ کی نظر میں سب لوگ افضل ہیں۔ بہر حال شکر ہے تمہیں بروقت عقل شریف آ گئی ہے۔ ''میں، تم اور محبت'' واہ واہ کیا کہنے آپ کے عنبرین ابدال۔ یہ تو سچ ہے محبوبہ اور بیوی میں فرق ہوتا ہے۔ جو دعوے شادی سے پہلے ہوتے ہیں وہ دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور بھاگ کر شادی کرنے والیوں کو ویسے بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ کجا پوری زندگی اس کا خیال رکھا جائے، طعنہ یہ طعنہ دیتا ہے مرد اس کو۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' ارسلہ تمہاری خوشیوں کو نظر نہ لگے کسی کی مگر دھیان رکھنا آہ ضرور لگتی ہے جو فرش سے عرش تک جاتی ہے۔ تم جو کپڑوں جوتوں کے پیچھے مر رہی ہو، کل ان ہی چیزوں کو سامنے رکھ کر سر پکڑ کر روؤ گی۔ نیلوفر اچھا کردار ہے اور سکندر پسندیدہ ہے۔ مہوش جیلانی کو بھی آخر میں پتا چل جائے گا، دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے مگر رشتے ناتے اور سکون نہیں۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت عبداللہ غزنی کو کہاں پھینک دیا اور حمزہ اب ربیکا کے لیے پریشان...... اف اف کیا سین ہے۔ شہرینہ اور جہانداد کی جوڑی بیسٹ ہے۔ ''زندگی یہ سفر میں ہے'' میمونہ صدف کا ناول بہت اچھا رہا۔ سفر ہی زندگی ہے۔ سبق آموز ناول اچھا لگا۔ میمونہ بہت ساری تعریف۔ ''مہوا کا پیڑ'' ایمل رضا کی تحریر ہو اور لاجواب نہ ہو، ہو ہی نہیں سکتا۔ سبق آموز تحریر ہر لحاظ سے موزوں تھی۔ ڈھیر ساری تعریف ایمل آپی آپ کے لیے۔ بہت اچھا لکھتی ہیں آپ۔ فرح بخاری آپ بھی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ ''بن پاکھی'' نے ابھی تک اپنے سحر میں جکڑے ہوا ہے مگر دو تین اقساط اکٹھی پڑھ کر تبصرہ کروں گی۔ ''اے دل بے خبر'' صدف ریحان گیلانی کا ناول بھی مکمل ہونے پر تبصرہ کروں گی۔ کچھ وجوہات کی بنا پہ ٹھیک سے تبصرہ نہ کر سکی جتنا کیا ہے قبول کیجیے گا پلیز۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی۔ دو مکمل ناول کے سوا باقی سارا رسالہ پڑھ لیا ہے۔ کرن کا سالگرہ شمارہ بہت بہت اچھا رہا۔

☆ ماریہ جی! آپ کا بہت شکریہ کہ کچھ مسائل کے باوجود آپ نے ''نامے میرے نام'' کی محفل میں شرکت کی۔

ساجدہ جاوید سند ہلو...... ٹنڈو محمد خان

اس کا غرور میری لگن کے سبب نہیں یارو
کرن خود جانتا ہے نہایت حسین ہے

ہر بار کی طرح اس بار بھی کرن 10 کو ملا۔ ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ سب سے پہلے ''حمد و نعت'' سے فیض یاب ہوئے پھر اپنے پسندیدہ ''نامے میرے نام'' کی طرف آئے۔ یہ کیا اس بار ہمارا خط شامل نہیں ہوا، بہت دکھ ہوا۔ مدیرہ آپی پہلے ہم خاموش قاری تھے، صرف کرن پڑھتے تھے تب بھی کرن کے آنے سے خوشی سے جھوم اٹھتے تھے، جب سے کرن کی محفل میں شامل ہمارا ایک خط ہوا، ہمیں اتنی خوشی ہوئی کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے مگر مارچ کے شمارے نے ہمیں مایوس کر دیا۔ ہمارا خط شائع نہیں ہوا۔ کرن ہمیں 10 کو ملتا ہے ہم 12 سے خط پوسٹ کرتے ہیں کہ لیٹ نہ ہو جائے اور دو دن میں کرن کو پڑھ کے خط لکھتے ہیں۔ اس سے تو بہتر ہے ہم صرف خاموش قاری ہوتے، خط لکھنے کی جرأت نہیں کرتے۔ ایک مہینہ ہمیں ایک سال کی طرح لگتا تھا۔ کرن کے آنے کی اتنی خوشی مناتے ہیں کہ کیا بتائیں۔ جب مارچ کا کرن آیا میرے شوہر نے ہمارے لیے ''سوٹ'' کپڑے بھی لے کر آئے۔ یقین مانیے ہم نے سوٹ کو نہیں پہلے کرن کو دیکھا۔ مگر مایوس ہو گئے اور ہم اپنے شوہر سے لڑ پڑے کہ آپ نے ہمارا خط پوسٹ ہی نہیں کیا ہو گا۔ جب ہم اتنی محبت کرن سے کرتے ہیں تو کرن کو بھی ہمارا خیال ہونا چاہیے۔ خیر ''نامے میرے نام'' میں ہمارا خط نہیں تھا مگر تین جگہ پر اپنا نام جگمگاتا دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ فائزہ ماریہ کے خط میں۔ ماریہ نذیر نے تو اتنی دعائیں دیں، ہمارا تو دامن ہی چھوٹا پڑ گیا۔ شکریہ ماریہ۔ تب ہی تو تم اور فائزہ میری اتنی فیورٹ ہو۔ اب آتے ہیں تبصرے پر۔ ''میرے ہم سفر میرے ہم نوا'' میں ارسلہ کی بے وقوفی پہ غصہ آیا، کیا ہر بار رومی کو امیروں کے عیش کے بارے میں بیان کرتی ہے۔ اسی کا تو مہوش نے فائدہ اٹھایا۔ کسی کو بھی اپنی کمزوری نہیں بتائی جاتی، اب ارسلہ دیکھو تمہارا انجام۔

''مہوا کا پیڑ'' ایمل رضا آپی کا ناول زبردست تھا۔ آپی کوئی بڑا والا ناول آنا چاہیے ہمیں خوش کرنے۔ کیوں دوستو! کیا خیال ہے۔ ''ہوائیں رخ بدل گئیں'' نگہت آپی حمزہ کی شادی جیسے ربیکا سے کر دی، اب دونوں کو سدھار بھی دو۔ حمزہ اب کیوں شہرینہ کے آس پاس گھوم رہا ہے۔ انٹرویو سارے بور لگے۔ ایک بار پھر شاہین آپی سے گزارش ہے کہ پلیز ابرار الحق اور نعت خواں محمد راشد اعظم کا انٹرویو کریں، پلیز۔ ''موتی چنے ہیں'' میں ماریہ نذیر اور زرینہ خانم نے اچھے موتی بکھیرے۔ ''مسکراتی کرنیں'' دعا مصطفےٰ اور تبسم بشیر نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ مدیرہ آپی کیا ہم بھی ''کچن اور آپ'' میں شامل ہو سکتے ہیں۔ ''مجھے یہ شعر پسند ہے'' میں سب کی شاعری دل کو چھو گئی۔

☆ ساجدہ جی! خط ہمیں دیر سے بھی موصول ہو تو اگلے ماہ شائع کر دیتے ہیں۔ آپ کا خط ہمیں موصول ہی نہیں ہوا۔ اس لیے شائع نہیں کر سکے۔ 28 تاریخ تک آپ ہمیں خط بھیج سکتی ہیں۔ ''کچن اور آپ'' قارئین کا سلسلہ ہے، آپ ضرور شرکت کیجیے۔

سعدیہ وحید سعدی...... حاصل پور

اللہ سے دعا گو اور پر امید ہوں کہ آپ سب بخیر و عافیت ہوں گے۔ کافی عرصے بعد تبصرے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ میں نے سوچا شاید آپ ہماری کمی محسوس کر رہی ہوں گی۔ انٹری مارتے ہیں مگر آپ کہاں یاد رکھتی ہیں ہمیں۔ ہر ماہ خط جو نہیں لکھتے ہم، اگر کبھی لکھ دیں تو آپ نے شائع نہیں کرنا ہوتا اور کبھی اگر غلطی سے شائع ہو بھی جائے تو لازمی ہمارا نام بگڑے حشر نشر کے ساتھ ہماری نگاہوں کا منتظر ہوتا ہے اور جو نگارشات اور مراسلات اتنی محبت اور شوہر کی منت سماجت کر کے آپ کو ارسال کرتے ہیں وہ تو باقاعدگی سے کسی اور کے نام سے شائع ہوتے ہیں۔ بس اسی وجہ سے ہم نے ذرا پرہیز کیا اتنا عرصہ۔ مگر بھول چوک سمجھ کر دل بہلا لیا اور بیٹھ گئے آج پھر صفحہ قرطاس پر موتے بکھیرے۔ سب سے پہلے ''حمد اور نعت'' پڑھ کر روح کو منور اور ایمان کو تازہ کیا۔ ''کرن کرن روشنی میں'' نماز کا مسنون طریقہ بھی بتائیے۔ زینب شبیر سے ملاقات اچھی رہی۔ ''آواز کی دنیا'' سے انٹرویو نہیں پڑھا طیب کا۔ پلیز ڈاکٹر فرحت ہاشمی کا تفصیلی انٹرویو کیجیے۔ ناول میں ایک ساتھ ہی پڑھتی ہوں، بھئی اگلی قسط کا انتظار نہیں ہوتا۔ ''پیکر وفا'' اور ''دل بے خبر'' دل کو بھا گیا۔ عندلیب زہرا کا افسانہ بھی اچھا لگا۔ ہر عورت کا مسئلہ ایک ہی ہے ویسے بھی عورت مارچ اگر کرنا ہی تھا تو ان مسائل پر کرنا بنتا تھا مگر سچ ہے بھئی عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ ''مہوا کا پیڑ'' ایمل جی نے کمال لکھا۔ مکافات عمل جو خدیجہ کے ساتھ ایمن کے باپ نے کیا وہی باپ کا بویا کاٹا ایمن نے۔ آج کل کے دور میں ہر عورت ہی مہوا کا پیڑ ہے۔ جتنی مرضی قربانیاں دے دے، مرد نہ راضی ہوا اس سے۔ عورت کی ساری زندگی قربانیاں دیتے ہی گزر جاتی ہے۔ باقی رسالہ ابھی زیر مطالعہ ہے۔

☆ سعدیہ جی! آپ کا نام اگر غلط شائع ہو گیا تو اس کے معذرت خواہ ہیں۔ ''کرن کرن روشنی'' کرن کا سلسلہ نہیں ہے۔

مسکان نور سندھی...... لاڑکانہ

ٹائٹل پسند آیا، ویسے وہ دیکھ کیا رہی تھی۔ اداریہ میں مدیرہ کی باتیں بہت پسند آئیں۔ ''حمد و نعت'' بہت اچھی لگی۔ ''کچھ باتیں دل کی'' سروے پڑھا۔ ثناء شہزاد، ارم کمال، ماریہ نذیر، تبسم بشیر، فوزیہ ثمر بٹ، صفیہ مہر، شہلا گل، اقراء ممتاز، فائزہ بھٹی، ناہید اسماعیل آپ سب کو پڑھتے ہوئے مزا آیا۔ ہمیشہ خوش رہیے پیاری دوستو۔ ثناء شہزاد، ارم کمال، ماریہ نذیر، فائزہ بھٹی آپ نے میرا نام نہ لے کر بھی مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو سچ میں اتنی خوشی ہوئی کہ کیا بتاؤں۔ آپ میری دوستیں بنیں گی۔ ارم کمال تو مجھے پہلے بھی بہت پیاری لگتی تھی پر ان کا قارئین بہنوں کے لیے پیار دیکھ کر اور بھی پیاری لگنے لگی ہے مجھے۔ زینب بشیر کا نام مجھے بہت پسند آیا۔ انٹرویو پسند آیا۔ ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' زبردست کہانی۔ آسیہ مرزا آپی آپ میری اور میری بڑی بہن کی فیورٹ رائٹر ہیں۔ آپ کے لکھنے کا انداز میری بہن کو بہت پسند ہے۔ ''یہ آٹھ مارچ'' ہم عورتیں ہی تو ایک دوسرے پر ظلم کرتی ہیں۔ ''زندگی یہ سفر میں ہے'' پڑھتے ہوئے دل بھر آیا۔ لڑکیاں سچ میں بہت صابر ہوتی ہیں، ہر دکھ برداشت کرتی ہیں۔ ''اپنے لوگ'' شکر ہے یسریٰ کو احساس ندامت ہو ہی گیا اور بات ہو جائے ایمل رضا کی کہانی ''مہوا کا پیڑ'' کی۔ زبردست، کمال کی اسٹوری تھی۔ میں نے جب آپ کا نام پڑھا تو بہت خوشی ہوئی تھی۔ ایسے ہی ہمیں خوش کرتی رہیں آپی جان۔ عنبرین ابدال نے بہت اچھا لکھا۔ ''کنار خواب جو'' فرح آپی اگلی قسط کا انتظار ہے۔ ''ثمر'' صبر کا پھل سچ میں میٹھا ہوتا ہے۔ ''اے دل بے خبر'' یہ بھی جاری

تھی پر بہت اچھی ہے۔ "صفائی مہم" سمجھ میں نہیں آئی، سوری۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" مجھے اور میری بہن کو پسند ہے پر نگہت آپی ناول کو اتنا طویل مت کریں کہ ہماری دلچسپی ختم ہو جائے، پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔ "پیکر وفا" کمال کی اسٹوری تھی۔ میراب کی باتیں مسکرانے پر مجبور کر گئی تھیں۔ ویری گڈ۔ "نامے میرے نام" سب کے خط زبردست تھے۔ "کرن کتاب" بیسٹ لگی۔ پرنٹڈ لہنگا بہت پسند آئے۔ کبھی میکسی کے بھی تصویر دیں پلیز۔ آسٹیوپورسس کے بارے میں پڑھا اور بچوں کے بارے میں پڑھا، بہت اچھی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ "کچن اور آپ" صائمہ مشتاق، ثانیہ مشعل میری دوستوں کے جوابات پسند آئے۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے، مسکراتی کرنیں، کچھ موتی چنے" بہت پسند آئے۔

☆ مسکان جی! "نامے میرے نام" کی محفل میں شرکت کرنے کا بہت شکریہ۔

ثناء شہزاد......کراچی

ٹائٹل ہمیشہ کی طرح بہت پیارا تھا۔ اداریہ پڑھ کر "حمد و نعت" سے روح کو تازگی بخشی اور اس کے بعد ہم پہنچے "کچھ باتیں دل کی" پر وہاں اپنی تمام قاری بہنوں کے جوابات پڑھے جو بہت اچھے لگے۔ سب سے پہلے بات ہو جائے آسیہ مرزا کے ناول "میرے ہم نفس میرے نوا" کی پانچویں قسط پڑھی۔ کہانی شروع سے بہت اچھی چل رہی ہے۔ ابھی تو ماشاء اللہ اسپیڈ بھی اچھی ہے۔ ارسلہ نے سکندر کے ساتھ جو کیا اس کا دل توڑ کر اسے آگے جا کر پتا چلے گا، جب آبص اسے وہ محبت نہیں دے گا جو ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے تب اسے یہ پیسہ بھی برا لگے گا جس کے لیے وہ ہر وقت اپنے اللہ سے شکوہ کرتی رہتی ہے۔ یہ کہانی آگے جا کر اور بھی اچھا رخ اختیار کرے گی، ابھی سے اندازہ ہو رہا ہے۔ عندلیب زہرا کا "یہ آٹھ مارچ" بھی بہت اچھا لگا۔ سب کی الگ الگ کہانی پیش کی۔ میمونہ صدف تو چھا گئیں۔ "زندگی یہ سفر میں ہے" ایک بہت ہی خوب صورت کہانی لگی۔ دانیال نے جو کچھ ہدیٰ کے ساتھ کیا، وہ اس کی اپنی بیٹی کے آگے آیا۔ زرقا سکندر نے "اپنے لوگ" بھی بہت اچھی تحریر لکھی، ایک سبق موجود تھا۔ پیسوں کی وجہ سے ہم اپنے قریبی رشتوں کو خود سے دور کر دیتے ہیں جبکہ یہ رشتے تو زندگی کی خوب صورتی ہوتے ہیں۔ ایمل رضا کا ناولٹ "مہوا کا پیڑ" اپنے نام کی طرح منفرد لگا۔ دادی جان کی کہانی سن کر دلی دکھ ہوا۔ فرح بخاری کا "کنار خواب جو" اور صدف ریحان گیلانی کا "اے دل بے خبر" اگلے ماہ کے لیے چھوڑ دیا کیونکہ ایک مہینے تک پھر انتظار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ "ثمر" عطیہ خالد نے بہت عمدگی سے اتنی اچھی کہانی لکھی۔ احمد کو ثمر مل ہی گئی آخر، یہ بہت اچھا لگا۔ نعیمہ ناز کی "صفائی مہم" بھی اچھی لگی۔ اپنے گھر کو صاف کر کے کچرا کسی اور کے گھر کے سامنے ڈال دینا، لوگوں کا وتیرہ بن گیا ہے۔ "ہوائیں رخ بدل گئیں" نگہت عبداللہ کا آہستہ آہستہ اختتام کی طرف گامزن ہے۔ شہرینہ کو دیکھتے ہیں کس کا بناتی ہیں ہماری رائٹرز۔ ویسے حمزہ کا ہی بنا دیں، ربیکا کے سدھرنے کے چانسز کم ہی ہیں۔ صدف آصف میری موسٹ فیورٹ ہیں جب بھی لکھتی ہیں، بہت ہی اچھا لکھتی ہیں۔ مجھے ان کی کہانیوں کا انتظار رہتا ہے۔ اس مہینے ان کا مکمل ناول "پیکر وفا" اپنے نام کی طرح بہت اچھا لگا۔

"کرن کرن خوشبو، یادوں کے دریچے، مجھے یہ شعر پسند ہیں" تمام سلسلوں میں سب کا انتخاب بہت اچھا تھا۔ لاسٹ میں اپنی قاری بہنوں کو میں نے اپنی طرف سے کچھ کہنا ہے۔ اجازت ہے سب کی...... سب سے پہلے "ماریہ نذیر" سے کہوں گی کہ آپ پی ایچ ڈی ضرور کریں گی، میں نے دل سے آمین کہہ دیا۔ "تبسم" آپ بہت اچھی ہیں۔ آپ نے میرا خاکہ اپنے ذہن میں بالکل ٹھیک بنایا۔ معصوم اور حساس تو ہوں میں اور میں بھی آپ کو ہمیشہ کرن میں جگمگاتا دیکھنا چاہتی ہوں۔ بہت ارمان ہے میرا ابھی آپ سے ملنے کا اور آپ ماہا بے چاری کو تنگ نہ کیا کریں۔ میری طرف سے جنم دن مبارک ہو، لیٹ وش کر رہی ہوں۔ سدا خوش رہو پیاری۔ فوزیہ ثمر مجھے بڑی خواہش ہے آپ سے ملنے کی میں تو آ نہیں سکتی، آپ آ جاؤ کسی روز کراچی مجھ سے ملنے اور ہاں، امبر گل کی شادی ہو گئی ہے۔ میری ان سے بات ہوتی ہے۔ شہلا گل آپ کے ہیئر کٹ کا پڑھ کر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی ہونٹوں پر۔ پیاری اقراء میری بھی خواہش ہے کہ تم سے ملوں۔ ارے فائزہ ڈیئر! آپ ابھی ہی پوچھ لیتیں سب سے جو بھی پوچھنا ہے اور میں آپ سے بھی ملنا چاہتی ہوں۔

☆ ثنا جی! آپ کا خط پڑھ کر ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ ماہنامہ کرن کے توسط سے آپ سب کی جو دوستی قائم ہوئی ہے، سدا قائم رہے، آمین۔

☆☆

بیوٹی باکس

اسمارٹ نیس صرف 7 منٹ میں

عورت کی خوب صورتی کا اندازہ اس کے جمالیاتی حسن سے لگایا جا سکتا ہے جو اس کے سر سے لے کر پاؤں تک پھیلا ہوا ہے۔ اپنے آپ کو خوبصورت اور متناسب رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ روزانہ ورزش کی جائے۔ اگر آپ کے پاس جم جانے کا وقت نہیں ہے تو آپ گھر پر بھی۔ ایسی بہت سی چھوٹی موٹی ورزشیں ہیں جو کر سکتے ہیں۔ اس سے نہ صرف آپ کا وقت اور پیسا بچے گا بلکہ آپ صحت مند اور تندرست بھی رہیں گے۔

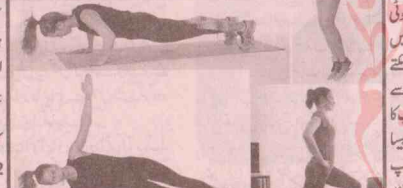

یہاں ہم آپ کو ایسی ورزشوں کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ انہیں کم وقت یعنی سات منٹ میں آزمایا جائے اور ہر ورزش کے دوران صرف دس سیکنڈز کا وقفہ رکھا جائے تو جسم کے خلیات میں ہونے والی کیمیائی تبدیلی کو تقویت ملتی ہے اور کام کرنے کی ہمت بڑھتی ہے لیکن یہ بات واضح کرنی ضروری ہے کہ ان ورزشوں کو چند دنوں آزما کر آپ یہ نہ سوچیں کہ آپ کا وزن چند دنوں میں ہی جادوئی انداز میں کم ہو جائے گا۔ کچھ عرصہ تک مسلسل ان ورزشوں کو آزمایا جائے اور کھانے پینے میں احتیاط کی جائے تو یقیناً وزن گھٹ سکتا ہے لیکن اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ان کو مستقل آزمایا جائے۔

سات منٹ میں کس طرح کی بارہ مختلف ورزشیں کرنی ہیں، ان کے بارے میں کچھ تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

1۔ سب سے پہلی ورزش اچھلنے والی ہے۔ اس طرح اچھلیں کہ ہاتھ انگریز حرف "وی" کے انداز میں کھلے ہوں۔ بالکل اسی طرح دونوں پیر بھی ہاتھوں کی سیدھ میں ہی ہوں اور یوں اردو کی گنتی کا عدد "۸" بن رہا ہو۔

اس ورزش کو دو سے تین مرتبہ بغیر کسی وقفے کے آزمائیں۔

2۔ دیوار کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو جائیں۔ اس طرح کھڑی ہوں کہ دیوار اور آپ کے درمیان کوئی فاصلہ نہ ہو۔ اب دونوں ہاتھوں کو سیدھا کریں اور گھٹنوں کو اس طرح موڑیں کہ لگے آپ کرسی پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ گھٹنے کو 90 ڈگری کے زاویے پر رکھیں۔

3۔ زمین پر پتلا سا میٹ بچھا کر اس طرح سیدھی لیٹ جائیں کہ دونوں ہاتھ اور پاؤں کے پنجے زمین سے لگے ہوئے ہوں، اس طرح کہ باقی پورے جسم کا وزن ہاتھوں اور پیروں پر ہی ہو۔ اب ہاتھوں کو سیدھا کر کے کمر کو اوپر کی جانب لے جائیں اور پھر نیچے لے آئیں۔

4۔ یہ ورزش (Abdominal crunches) کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس کے

لیے فرش پر کمر کے بل لیٹ جائیں۔ سر کے نیچے دونوں ہاتھوں کو رکھیں پھر ہاتھوں اور کمر کے اوپر والے آدھے حصے کو اٹھائیں، پیٹ والا حصہ نہیں اٹھنا چاہیے۔ اس طرح کمر کو زمین سے اٹھاتے ہوئے گھٹنوں کی طرف لانے کی کوشش کریں۔

5۔ اس ورزش کو Chair Step Ups کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس کے لیے اپنے سامنے اسٹول رکھیں۔ پہلے بایاں پاؤں اسٹول پر رکھیں، کچھ لمحوں کے بعد دایاں پاؤں اسٹول پر رکھیں، پھر اسی طرح پہلے دایاں پاؤں زمین پر رکھیں پھر بایاں پاؤں رکھیں۔ دوسری مرتبہ جب ورزش دہرائیں تو پہلے دایاں پاؤں اسٹول پر رکھیں اور پھر بایاں پاؤں رکھیں۔ تیس سیکنڈز تک اس ورزش کو آزماتی رہیں۔

6۔ اٹھک بیٹھک کی سزا تو تعلیمی اداروں میں طلبہ کو دی جاتی رہی ہے۔ اس ورزش کے لیے بھی اسی طرح اٹھیں اور بیٹھیں، بس خیال یہ رکھیں کہ اٹھک بیٹھک کے وقت عموماً کمر کو سیدھا رکھا جاتا ہے، اس میں کمر اور ہاتھوں کو تھوڑا مڑا ہوا یا ترچھا رکھا جائے گا۔

7۔ Tricep Dip نامی اس ورزش کو آزمانے کے لیے کسی بنچ کی ضرورت ہوگی۔ کسی بھی بینچ کی طرف کمر کر کے بیٹھ جائیں، اب دونوں ہاتھوں کو بینچ پر رکھیں، سارا وزن ہتھیلیوں پر آئے گا۔ اب ان ہتھیلیوں پر وزن ڈالتے ہوئے کمر کو زمین سے اٹھائیں، دونوں ٹانگیں بالکل سیدھی زمین پر ہونی چاہئیں۔ جب کمر اٹھائیں گی تو صرف دونوں پاؤں زمین پر ہوں گے، گھٹنے اور کمر تک کا حصہ زمین سے اوپر اٹھا ہوا ہو، دس سیکنڈز اسی طرح رہیں پھر واپس زمین پر بیٹھ جائیں۔ اسے دو سے تین مرتبہ دہرائیں۔

8۔ جس طرح سجدے میں جاتے وقت دونوں ہاتھوں کو زمین پر رکھا جاتا ہے، بالکل اسی طرح دونوں ہاتھوں کو زمین پر رکھیں، پیٹ کے بل زمین پر لیٹیں اور پیروں کی انگلیوں کو زمین پر اس طرح کھڑا رکھیں کہ سارا وزن ان پر ہی ہو۔ صرف کہنی تک ہاتھ اور پیروں کی انگلیاں زمین سے لگی ہوئی ہونی چاہئیں، باقی جسم کو اوپر اٹھائیں اور پھر زمین پر لے آئیں۔

9۔ جس طرح جاگنگ کے لیے دوڑتے ہیں بالکل اسی طرح دوڑیں، تاہم اس دوران کوشش کریں کہ پیروں کو جتنا اوپر تک اٹھا سکتی ہیں، ضرور اٹھائیں۔

10۔ ایک ٹانگ کو زمین پر گھٹنے سے پیروں تک رکھیں، جبکہ دوسری ٹانگ کو اس طرح اٹھائیں کہ گھٹنے کی طرف سے 90 ڈگری کا اینگل بن جائے۔ کمر کو سیدھا رکھیں۔ پہلے ایک ٹانگ کو اوپر اور ایک کو نیچے رکھیں، پھر اسی طرح دوسری کو نیچے اور پہلی والی کو گھٹنوں کی طرف سے موڑ لیں۔ اس طرح دو تین مرتبہ جلدی جلدی اس ورزش کو دہرائیں۔

11۔ جس طرح پش اپس کرتے ہیں، ویسے ہی لیٹ جائیں اور ایک ہاتھ پر وزن دیں، پھر اس ہاتھ پر وزن ڈالتے ہوئے کمر کو پیچھے کی جانب لے جائیں، اس طرح کہ ہاتھ نہ مڑے بلکہ سیدھا ہو جائے۔ پھر دوسرے ہاتھ کے ساتھ بھی اسی ورزش کو دہرائیں۔

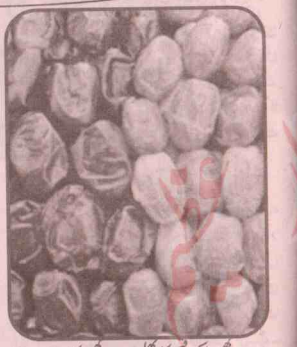

12۔ دائیں طرف کروٹ لے کر زمین پر لیٹ جائیں، اب دائیں ہاتھ کو کہنی تک زمین پر رکھیں، اسی طرح صرف دونوں پاؤں زمین پر ہوں، باقی پورا جسم کو دائیں طرف سے زمین سے اوپر اٹھالیں، اس طرح کے دائیں چہرے اور جسم کا رخ دائیں طرف ہی ہو۔ یوں دائیں ہاتھ پر پورے جسم کا وزن آجائے گا۔ چند سیکنڈز کے بعد بائیں طرف کروٹ لیں اور بائیں ہاتھ پر سارا وزن ڈال کر اسی طرح پورے جسم کو اوپر اٹھائیں۔ تیس سیکنڈز تک اس ورزش کو آزمائیں۔

اوپر بتائے جانے والی ان تمام ورزشوں کو چند سیکنڈز میں دو سے تین مرتبہ دہرانا ہے، ہر ورزش کے بعد صرف دس سیکنڈ کا وقفہ لینا ہے۔ اگر ان ورزشوں کو آزمانے کے لیے پہلے دن بارہ ورزشیں ایک ساتھ آزمانے کی ہمت نہ ہو تو کوئی بات نہیں، آہستہ آہستہ عادت ڈالیں۔ کچھ دنوں میں آپ ورزش کرنے کی عادت ہو جائیں گی تو پھر سات منٹ میں ان بارہ ورزشوں کو بغیر کسی مشکل کے آزما سکیں گی۔ یاد رکھیں کہ سات منٹ میں فٹنس حاصل کرنے کا یہ آزمودہ نسخہ ہے۔

کھجور

کیلوریز سے بھرپور مقوی غذا

کھجور ایک قسم کا پھل ہے۔ کھجور کا درخت دنیا کے اکثر مذاہب میں مقدس مانا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں اس کی اہمیت انتہا یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس گھر میں کھجوریں نہ ہوں وہ گھر ایسا ہے کہ جیسے اس میں کھانا نہ ہو۔" قرآن مجید اور دیگر مقدس کتابوں میں جا بجا کھجور کا ذکر ملتا ہے۔ کھجور کھانا سنت نبوی ہے مگر کیا آپ جانتے ہیں کہ کھجور کھانا صحت کے لیے کتنا فائدہ مند ہے۔ اگر نہیں تو جان لیں۔

☆ فائبر آنتوں کی صحت کے لیے انتہائی ضروری جز اور قبض کی روک تھام کرتا ہے۔ کھجور میں جذب ہونے والا اور جذب نہ ہونے والا فائبر موجود ہوتا ہے جو کہ آنتوں کے نظام کی صفائی میں مدد دیتا ہے اور نظام ہاضمہ کو بہتر کرتا ہے۔ جنہیں قبض کی شکایت ہوتی ہے انہیں چاہیے کہ تین کھجوروں کو رات بھر پانی میں بھگو کر رکھیں اور صبح نہار منہ ان کو کھالیں۔

☆ کھجور کا استعمال کمزور دل کے لیے انتہائی مفید ہے جب کہ تحقیق سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ کھجور سے دل کے دورے سمیت دیگر امراض پر قابو پانے میں مدد ملتی ہے۔ دل کے دورے میں کھجور کی گٹھلی سمیت کوٹ کر دینا جان بچانے کا باعث ہوتا ہے۔ اس لیے شریانوں میں رکاوٹ کے باعث پیدا ہونے والی تمام بیماریوں میں کھجور کی گٹھلی تریاق کا اثر رکھتی ہے۔

☆ کھجور میں موجود میگنیشیم، کاپر اور میگنیس شامل ہوتے ہیں جو ہڈیوں کی مضبوطی اور نشوونما کے لیے بہت اہم ہیں۔ بالخصوص بوڑھے افراد جن کی ہڈیاں عمر کے ساتھ ساتھ کمزور ہونا شروع ہو جاتی ہیں انہیں چاہیے کہ کھجور کا استعمال کریں۔

☆ کھجور جسم میں آئرن کی سطح بڑھاتی ہے جس سے خون کی کمی جلد دور کرنے میں مدد ملتی ہی۔

☆ طبی جریدے جاما انٹرنل میڈیسن میں شائع ہونے والی تحقیق کے مطابق جسم میں وٹامن بی سکس کی مناسب مقدار دماغی کارکردگی میں بہتری اور اچھے امتحانی نتائج کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ کھجور میں وٹامن بی سکس وافر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر جسم میں وٹامن بی سکس کم ہو جائے تو اس کا براہ راست تعلق ڈپریشن سے ہوتا ہے۔

☆ کھجور میں شامل میگنیشیم بلڈ پریشر میں کمی لانے میں بھی مدد دینے والا جز ہے۔ جب کہ اس میں موجود پوٹاشیم بھی جسم کے لیے فائدہ مند ہے جو بلڈ

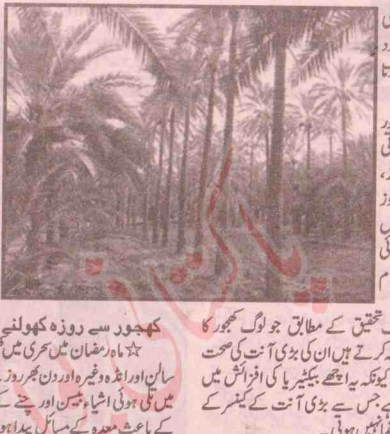

پریشر میں کمی لانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

☆ کھجور کے اندر قدرتی شکر، گلوکوز، فرکٹوز اور سکروز پائے جاتے ہیں جو آپ کو توانائی پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔

جاتا ہے۔

☆ کھجور کے ساتھ کھیرا کھانے سے جسم توانا اور خوب صورت ہو جاتا ہے۔

☆ حاملہ خواتین کی ڈیلیوری میں آسانی کے لیے کھجور کا استعمال بہت مفید ہے۔

☆ ایک تحقیق کے مطابق جو لوگ کھجور کا استعمال روزانہ کرتے ہیں ان کی بڑی آنت کی صحت بہتر ہوتی ہے کیونکہ یہ اچھے بیکٹیریا کی افزائش میں اضافہ کرتی ہے جس سے بڑی آنت کے کینسر کے خلیوں کی نشوونما نہیں ہوتی۔

☆ کھجور میں سلفر موجود ہوتا ہے جو کہ دوسری غذاؤں میں آسانی کے ساتھ نہیں پایا جاتا لہٰذا جو افراد موسمیاتی الرجی کا شکار ہوتے ہیں، انہیں چاہیے کہ وہ کھجور کا استعمال کریں۔ 2002ء میں ہونے والی ایک تحقیق کے مطابق آرگینک سلفر ایسے تمام لوگوں کے لیے انتہائی مفید ہے جنہیں موسمیاتی الرجیز کا سامنا رہتا ہے۔

☆ شدید گرمی کے عالم میں توانائی فوری طور پر بحال کرنا ہو تو کھجور اس کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

☆ پیٹ کے کیڑے مارنے کے لیے نہار منہ اس کا استعمال مفید ہے۔

☆ کھجور کے درخت کی جڑوں کو جلا کر زخموں پر مرہم کی صورت میں لگانے سے زخم بہت جلد ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس سفوف کے منجن سے دانت کا درد جاتا رہتا ہے۔

☆ کھجور خشک کرکے ہمراہ گٹھلی رگڑ کر منجن بنایا

کھجور سے روزہ کھولنے کے فوائد:

☆ ماہ رمضان میں سحری میں کھجلہ، پھینی، پراٹھا، سالن اور انڈہ وغیرہ اور دن بھر روزے کے بعد افطار میں تلی ہوئی اشیاء بیسن اور چنے کے روزانہ استعمال کے باعث معدہ کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن میں قبض، بدہضمی، ایسڈیٹی، گیسٹرک وغیرہ بہت عام ہیں۔ اس سلسلے میں کھجور آپ کی مدد کرسکتی ہے۔ آپ ایک کھجور کے بجائے دو کھجور سے افطار کریں اور سحری میں بھی دو کھجور ضرور کھائیں۔

☆ کھجور آسانی سے ہضم ہو جاتی ہے، اس لیے روزے دار کو معدہ بھاری محسوس نہیں ہوتا۔

☆ پورے دن بھوکے رہنے کے بعد کھجور معدہ کو کھانے کے لیے تیار کرتی ہے۔ اس سے معدہ کے غدود سے سیال مادہ خارج ہوتا ہے۔

☆ کھجور فوری طور پر بھوک مٹاتی ہے لہٰذا انسان روزہ کھولنے کے بعد ایک دم سے بھوک مٹانے کے لیے ضرورت سے زیادہ نہیں کھاتا۔

☆ کھجور السر یعنی معدہ کے زخم کے لیے انتہائی مفید ہے۔ اس لیے رمضان المبارک میں اسے زیادہ سے زیادہ استعمال کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

☆ کھجور میں پائی جانے والی غذائیت دیگر تلی اور چٹ پٹی اشیاء سے زیادہ ہوتی ہے۔

ائیر کنڈیشنر

مزا تو ہے مگر......

جب گرمی کا زور ہو تو انسان کا بس نہیں چلتا کہ کیسے اس کا توڑ کرے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ٹیکنالوجی نے ترقی کی تو پنکھوں اور روم کولر کے بعد ائیر کنڈیشنر لوگوں

کی زندگیوں میں عام ہوتا گیا۔ اب گھر چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اب ہر گھر میں کم از کم ایک اے سی تو لازمی دکھائی دے گا۔ اب تو یہ حال ہے کہ دفتر ہو یا گھر، گاڑی یا پھر کوئی شاپنگ سینٹر۔ ہر جگہ ائیر کنڈیشنر کی سہولت موجود ہے جب ہر جگہ ہی ائیر کنڈیشنر موجود ہوگا تو پھر آپ کو اس کی عادت بھی ضرور پڑ جاتی ہے اور لوڈشیڈنگ کے دوران اس کے بغیر جینا محال ہو جاتا ہے۔ ماہرین کے مطابق باہر کے گرم موسم کے برعکس اندر سرد ماحول میں مسلسل رہنا اگرچہ بہت اچھا محسوس ہوتا ہے لیکن یہ طرز عمل صحت مند ہرگز نہیں۔

گرمیوں میں ائیر کنڈیشنر کی ضرورت سے کسی طور انکار نہیں کیا جاسکتا مگر جیسے ہر چیز میں اعتدال کی ضرورت ہے۔ عام طور پر لوگ ائیر کنڈیشنر کو انتہائی کم درجہ حرارت پر رکھتے ہیں جو ان کی صحت کے لیے قطعاً مفید نہیں۔ تیز گرمی سے اچانک ٹھنڈے ماحول میں جانے سے بہت سے طبی مسائل جنم لیتے ہیں جن کا فوری پتا نہیں چلتا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ مسائل سامنے آتے رہتے ہیں۔

سانس لینے میں دشواری:

اگر ائیر کنڈیشنر مستقل چلایا جارہا ہو مگر اس کے فلٹر صاف نہ کیے جائیں تو ان میں کئی قسم کے جراثیم پروان چڑھنے لگتے ہیں اور پھر یہی جراثیم ائیر کنڈیشنر چلنے کے ساتھ لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں جس سے انہیں سانس کی تکلیف کے ساتھ نمونیا بھی ہوسکتا ہے۔

احتیاط:

سانس کی بیماریوں سے بچنے کے لیے ائیر کنڈیشنر کے فلٹرز کو ہر ہفتے باقاعدگی سے صاف کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان فلٹرز کو ہر سال تبدیل کرلینا ایک بہترین عمل ہے جبکہ اس کے ساتھ کمرے میں موجود قالین اور پردوں کی باقاعدگی سے صفائی بھی اہمیت رکھتی ہے۔

سر اور جسم میں درد:

کمرے میں اگر تازہ ہوا نہ ہو یا تازہ ہوا کا گزر نہ ہو تو مستقل تھکاوٹ کا احساس غالب رہتا ہے اور اکثر جسم میں درد کی شکایت بھی ہے۔ اگر آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو دن کے وقت بھی ائیر کنڈیشنر ماحول سے باہر نہیں نکلتے تو آپ کی حالت زیادہ سنگین ہوسکتی ہے اور آپ اس کیفیت میں مبتلا ہوسکتے ہیں جسے ''سک بلڈنگ سنڈروم'' کہتے ہیں، اس کیفیت میں تھکاوٹ اور کسل مندی کا احساس مستقل موجود رہتا ہے۔ کم تر درجہ حرارت سے پٹھے سکڑ سکتے ہیں، سر درد کی شکایت ہوسکتی ہے اور کمر کا درد

بھی پریشان کرسکتا ہے۔

احتیاط: جس کمرے میں بیٹھیں اس کے ایئر کنڈیشنر کا درجہ حرارت بڑھا دیں تاکہ زیادہ ٹھنڈک نہ لگے۔ اس کے علاوہ ہر گھنٹے بعد ائیر کنڈیشنر والے کمرے سے نکل کر باہر تازہ ہوا میں جائیں تاکہ آپ کے جسم کا درجہ حرارت بھی معتدل رہے۔ اگر کسی کو نزلہ یا زکام ہو رہا ہے تو اسے چاہیے کہ کمرے میں ماسک پہن کر بیٹھے تاکہ ہوا کے ذریعے لگنے والی الرجی کے جراثیم دوسروں تک نہ پہنچیں۔

جلد اور بالوں کا خشک ہونا

چونکہ ائیر کنڈیشنر آس پاس کے ماحول سے تمام نمی چوس لیتا ہے اور اس کی لپیٹ میں آپ کے بال اور جلد بھی آجاتی ہے۔ بال بے رونق اور خشک نظر آتے ہیں جبکہ جلد اپنی لچک کھودیتی ہے اور اس پر آسانی سے جھریاں اور شکنیں نمودار ہونے لگتی ہیں۔

احتیاط:

جلد اور بالوں کو نمی پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ پانی پئیں، اس کے ساتھ مختلف کریم اور کنڈیشنرز کے ذریعے بھی بالوں اور جلد کو مناسب نمی فراہم کی جاسکتی ہے چونکہ اے سی کمرے کی نمی کو کھینچ لیتا ہے۔ اس لیے کمرے میں پانی سے بھرے برتن رکھیں تاکہ وہ اس پانی سے نمی حاصل کرے اور نوبت آپ کی جلد تک نہ جائے۔

جسم کا درجہ حرارت

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ائیر کنڈیشنر کے درجہ حرارت کو 17 سے 22 ڈگری کے درمیان رکھتے ہیں اور جب کمرہ کافی سرد ہوجاتا ہے تو کمبل اوڑھ لیتے ہیں۔ کیا آپ کو پتا ہے کہ انسانی جسم کا درجہ حرارت 35 ڈگری سیلسیس ہے؟ انسانی جسم 23 تا 39 ڈگری درجہ حرارت آسانی سے برداشت کرنے کی سکت کہا جاتا ہے۔ جب آپ ائیر کنڈیشنر کو 17 سے 22 ڈگری کے درمیان چلاتے ہیں تو یہ جسم میں "Hypothermia" کا عمل شروع میں کردیتا ہے جو جسم میں خون کی فراہمی اور روانی کو متاثر کرتا ہے۔ جسم کے کئی حصوں کو طلب کے مطابق خون کی فراہمی نہیں ہوپاتی جو آگے چل کر آرتھرائٹس اور دوسری بیماریوں کا سبب بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ائیر کنڈیشنر میں رہنے سے پسینہ نہیں آتا جس کے باعث جسم سے زہریلے مواد کا اخراج نہیں ہوپاتا اور آگے چل کر جلد کی بیماریوں، کھجلی اور بلڈ پریشر جیسی بیماریوں کی وجہ بنتا ہے۔

ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ ائیر کنڈیشنر بہت نقصان دہ ہے اور اسے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارا مقصد ائیر کنڈیشنر کو مناسب طریقے سے استعمال کرنے کے بارے میں آگاہ کرنا ہے تاکہ آپ کی صحت اس سے متاثر نہ ہو۔ موسم گرما میں ائیر کنڈیشنر کا مناسب طریقے سے استعمال نہایت ضروری ہے۔ اس بات کو یقینی بنائیں کہ باہر اور کمرے کے درجہ حرارت میں آٹھ سے دس ڈگری سے زیادہ فرق نہ ہو۔ کم ڈگری پر ائیر کنڈیشنر چلا کر پھر اس کا درجہ حرارت بڑھانے سے دل کی تسلی کے علاوہ کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ ائیر کنڈیشنر کو چوبیس سے چھبیس ڈگری کے درمیان رکھیں اور ساتھ آہستہ رفتار سے پنکھا چلا دیں۔ اس عمل سے آپ کے جسم کا درجہ حرارت قابو میں رہے گا اور ساتھ بجلی کی بھی بچت ہوگی۔

پھولوں کا سلاد

نیا ذائقہ...... نیا رنگ

سلاد کی تیاری میں اب تک مختلف اقسام کی کچی سبزیاں مثلاً مولی، ٹماٹر، کھیرا، لکڑی پیاز، ہری مرچ، چقندر، شلجم، گاجر، ابلے ہوئے مٹر، کڈنی بینز، لوبیا اور سفید چنے استعمال ہوتے آئے ہیں۔ بعض اوقات ذائقہ بدلنے کے لیے سلاد میں پھلوں کا استعمال بھی کرلیا جاتا ہے مثلاً اسٹرابیریز، خربوزے، زیتون اور دوسرے پھل بھی شامل کیے جاسکتے ہیں مگر ابھی تک پھولوں کو سلاد کے طور پر استعمال کرنے کا رجحان عام نہیں ہوا۔ مغربی ممالک میں پھولوں کی طبی افادیت دیکھتے ہوئے انہیں عام حالت میں کھانے کا مشورہ دیا جارہا ہے۔

ماہرین کہتے ہیں کہ ان پھولوں سے تیار شدہ سلاد کی طبی افادیت بھی مسلمہ ہے۔ ذیل میں ہم چند خوردنی پھول یعنی Edible Flowers کی افادیت رقم کررہے ہیں۔

بنفشہ

یونانی طبیب اسی پھول کو کھانسی، نزلہ، زکام اور یادداشت بہتر بنانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسے ستارہ پھول بھی کہا جاتا ہے۔ گاؤزبان کا ذائقہ کھیرے سے ملتا جلتا ہے۔ یہ سوپ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ گاؤزبان کے بیجوں کا تیل بھی نکالا جاتا ہے جو سوزش کی خرابیوں، سوزش، ایگزیما، دمہ، ماہانہ ایام کی تکالیف اور ہائی بلڈ پریشر کے علاج میں موثر پایا گیا ہے۔

پنیزی

یہ پھول بنفشہ کے قبیلے سے متعلق ہے۔ اس کا مزا گھاس جیسا ہوتا ہے۔ اس پھول میں وٹامن سی اور Carotenoids جراثیم کش سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کھانے کے علاوہ سلاد کو سجاتے ہوئے اچھے بھی لگتے ہیں۔

گیندا

اس پھول کو گل صد برگ بھی کہتے ہیں۔ کھانے میں اس کا مزا کچھ ترش سا ہوتا ہے۔ اس پھول کے کھانے سے چوٹ، خراشوں، رگڑ وغیرہ کے نشان جلد مندمل ہوجاتے ہیں۔ اس میں شامل Bioflavonoids دافع سوزش کے طور پر کام کرتے ہیں اور خون کی بہت باریک نالیاں ان کے استعمال سے مضبوط ہوتی ہیں۔

گلاب

یہ طبیبوں کا مرغوب پھول ہے۔ اس کے عرق سے شربت بھی بنتے ہیں اور گلاب کی پتیوں کو شکر میں حل کرکے گل قند تیار ہوتا ہے۔ یہ کھایا بھی جاتا ہے اور اس سے بیماریوں کا علاج بھی ہوتا ہے۔

طبی جائزوں کے مطابق گلاب کے پھول سے جب پتیاں جھڑ جائیں تو یہ گول بیضوی سرخ پھل کی شکل اختیار کرلیتا ہے جسے Rosehip کہتے ہیں۔ گلاب کے اس پھل کو چبایا جائے تو اس کا ذائقہ ایک مخصوص بیر Craberry جیسا ہوتا ہے۔ جوڑوں کے درد میں پیراسیٹا مول کی گولی سے جتنا افاقہ محسوس ہوتا ہے اس سے تین گنا زیادہ فائدہ گلاب کے اس پھل سے حاصل کیا جاتا ہے۔

کیا آپ کی شادی کامیاب ہے؟

نفسیات کے امریکن پروفیسر ڈاکٹر جان گوٹ مین نے ایک نہایت آسان سا سوال نامہ تیار کیا ہے اور ساتھ دعوا کیا ہے کہ ان کے اس سوال نامے کا نتیجہ 94 فیصد درست ہوتا ہے اور کوئی بھی شادی شدہ جوڑا اس سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ وہ کس قدر کامیاب یا ناکام زندگی گزار رہا ہے؟ آپ سوال پڑھیں اور صرف ہاں یا ناں میں جواب دیں۔ واضح رہے کہ اسے ہم صرف خواتین کے لیے تانیث کے صیغے میں لکھ رہے ہیں تاہم مرد چاہیں تو جملوں کو تذکیر کے صیغے میں بدل کر اپنی ازدواجی زندگی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

حصہ الف۔

1۔ میرا اس بات پر یقین ہے کہ میں صرف اور صرف اپنے شریک زندگی کے لیے بنائی گئی ہوں۔ (ہاں۔ناں)

2۔ مجھے اپنی محبت کا عروج اور شادی کے یادگار لمحات یاد ہیں۔ مجھے یہ بھی یاد ہے جب ہم پہلی مرتبہ ملے تھے اور مجھے وہ وقت بھی یاد ہے جب ہمارے رشتہ کی بات چلی تھی یا مجھے شادی کی پیش کش کی گئی تھی۔ (ہاں۔ناں)

3۔ میں اپنے شوہر میں اب بھی کشش محسوس کرتی ہوں۔ (ہاں۔ناں)

4۔ ہم عام طور پر اپنی معاشرتی اقدار (رہن سہن) اور دیگر روایات کے بارے میں ایک جیسی سوچ رکھتے ہیں۔ (ہاں۔ناں)

5۔ میرا شوہر ہی میرا محبوب (Lover) اور میرا بہترین دوست ہے۔ (ہاں۔ناں)

6۔ میرا گھر ایسی جگہ ہے جہاں مجھے سپورٹ (مدد) ملتی ہے اور دباؤ کم ہوتا ہے۔ (ہاں۔ناں)

7۔ ہم نے گھریلو ذمہ داریاں یا کام کاج انصاف پسندانہ طریقے سے آپس میں تقسیم کر رکھے ہیں۔ (ہاں۔ناں)

8۔ ایسی کچھ چیزیں ہیں جو مجھے اپنے ساتھی میں پسند نہیں لیکن میں ان چیزوں کے ساتھ گزارہ کر رہی ہوں۔ (ہاں۔ناں)

حصہ۔ب

1۔ مجھے لگتا ہے کہ شادی سے مجھے مایوسی، بے اطمینانی اور دوسروں کی خود غرضی ملی ہے۔ (ہاں۔ناں)

2۔ مجھے اپنے ساتھی سے بہت زیادہ شکایات ہیں کیونکہ اس میں بیشتر ایسی باتیں ہیں جن پر سخت تنقید کی جا سکتی ہے۔ (ہاں۔ناں)

3۔ ہماری زندگیاں ایک دوسرے سے بہت الگ الگ ہیں۔ میرے خیال میں "ہم ایک ہیں" والی پوزیشن میں نہیں ہے۔ (ہاں۔ناں)

4۔ ہماری اقدار و روایات اور خیالات (بشمول مذہبی نظریات) ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔ (ہاں۔ناں)

5۔ میرے پاس ایسی کوئی ٹھوس وجہ یا تجربہ نہیں جس کی بنیاد پر میں اپنے شریک زندگی پر بھرپور اعتماد کر سکوں۔ (ہاں۔ناں)

6۔ اکثر اوقات گھر میں داخل ہوتے ہی میرے دباؤ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ (ہاں۔ناں)

7۔ شادی کے بعد مصیبتوں اور پریشانیوں نے مجھے چاروں اطراف سے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ (ہاں۔ناں)

8۔ مجھے اکثر اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ہے اور ایسے لگتا ہے کہ زندگی پر میرا اختیار بہت ہی کم رہ گیا ہے۔ (ہاں۔ناں)

اسکور معلوم کرنے کا طریقہ

دونوں حصوں کے "ہاں" کا ایک، ایک نمبر ہے جبکہ "ناں" کا کوئی نمبر نہیں۔ اب حصہ "الف" کے حاصل کردہ نمبروں میں سے "ب" کے نمبر تفریق کر دیں۔ آپ کا اسکور سامنے آ جائے گا۔ مثلاً آپ نے حصہ "الف" کے چھ سوالوں کا جواب "ہاں" میں دیا ہے "ب" کے تین سوالوں کا جواب "ہاں" میں دیا ہے تو چھ میں سے تین نکال دیں۔ اس طرح آپ کا اسکور تین رہے گا اور اگر حصہ "ب" میں ایک بھی "ہاں" میں جواب نہیں ہے تو آپ کے نمبر وہی ہوں گے جو آپ نے حصہ "الف" میں حاصل کیے ہیں۔

3 سے زائد

اگر تو آپ نے تین یا تین سے زائد نمبر حاصل کیے ہیں تو مبارک ہو، آپ ایک اچھی ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ چھوٹی موٹی پریشانی یا کسی بات پر اختلاف ہو جانا عام سی بات ہے۔ تاہم آپ دونوں کو احساس ہے کہ آپ ایک دوسرے کے لیے کتنے اہم ہیں؟ بلاشبہ آپ کو کب اچھا جوڑا کہا جا سکتا ہے۔

3 سے کم

اگر آپ نے تین سے کم نمبر حاصل کیے ہیں تو یہ بات 94 فیصد دعوے سے کہی جا سکتی ہے کہ آپ کو خود کو پتا ہے کہ آپ کی ازدواجی زندگی کس قسم کی مشکلات کا شکار ہے؟ آپ کے تعلقات زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ آپ لوگ ایک دوسرے کی اچھائیوں کو نہیں سراہتے، یکجہتی اور ہم آہنگی کی بھی کمی ہے۔ ایک دوسرے کو سمجھنے میں اکثر غلطی کر جاتے ہیں۔ اگر آپ نے اس پر قابو پانے کی کوشش نہیں کی تو حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہو سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کو الزام دینے کے بجائے ایک دوسرے کی محبت اور محنت کا اعتراف کیجیے۔

ایس عنبرین آرائیں

س: "کیا آپ سمجھتی ہیں کہ کھانے کے لیے جیا جاتا ہے یا جینے کے لیے کھایا جاتا ہے؟"

ج: "کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کی قدرتی طور پر خوراک زیادہ ہوتی ہے پر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ کھانے کے لیے جیتے ہیں۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جینے کے لیے کھایا جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ دوسرے بھی اس سے اتفاق کریں۔"

س: "گھر کے کام کاج خصوصاً کچن میں آپ کی دلچسپی کس حد تک ہے یا پڑھنے کا شوق آپ کو ان بکھیڑوں سے دور رکھتا ہے؟"

ج: "گھر کے کام کاج اور کچن میں دلچسپی اسی فیصد ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ پڑھنے کے شوق نے کبھی گھر کے کاموں سے دور نہیں رکھا، ہمیشہ پڑھنے کے ٹائم پر پڑھا اور کام کے ٹائم پر کام کیا۔"

س: "ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا کہ کھانا مزے دار ہی پکے۔ کبھی کبھی نتائج برعکس بھی ہوتے ہیں۔ ایسے میں کھانے والوں کے کیا تبصرے ہوتے ہیں؟"

ج: "جی بالکل۔ آپ نے بجا فرمایا۔ کھانا ہمیشہ مزے دار نہیں پکتا۔ ابو کا تبصرہ (کڑیے سالن پھکا بنایا) لڑکی سالن پھیکا بنا ہے۔ امی کا تبصرہ (کڑیے شورا ایداں بنایا جیداں کاواں دے آنسو ہوندے آ) لڑکی شوربا ایسے بنا ہے جیسے کوے کے آنسو ہوتے ہیں۔ بڑی بہن شبینہ کا تبصرہ۔ مرچیں زیادہ ہیں۔ سالن کو اچھی طرح سے بھونا نہیں ہے۔ مجھ سے چھوٹی بہن "م" کا بتصرہ۔ پورا نام نہیں لکھ سکتی اگر اس نے پڑھ لیا تو پھر ہماری اچھی خاصی جنگ ہو جائے گی۔ (مسراں دی دال وچ سارے ہریاں مرچاں دے بی پا کے رکھ ہوئے آ) مسور کی دال میں سارے ہری مرچوں کے بیج ڈال کر رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ باجی صبا اور چھوٹی طیبہ چپ چاپ کھا لیتی ہیں، اللہ ان کا بھلا کرے۔ انہوں نے کبھی میرا دل نہیں دکھایا۔"

س: "کون سی رائٹر کو پڑھتے وقت کھانا دھواں ہوا۔ اس سے متعلق کوئی یادگار واقعہ؟"

ج: "کھانا دھواں تو کبھی نہیں ہوا، ہاں البتہ زوہار یہ ساحر کا ناول "مقید خاک" پڑھتے ہوئے نیند ضرور دھواں ہو گئی تھی۔ اس کے متعلق واقعہ یہ ہی ہے کہ میں نے "مقید خاک" ناول عشاء کے بعد پڑھنا شروع کیا تھا، اس کے بعد مجھے کافی عرصے تک اتنا زیادہ ڈر لگتا رہا تا کہ جب عشاء کے ٹائم وضو کرنے جانا ہوتا تو چھوٹی بہن کی منتیں کر کر کے ساتھ لے کر جاتی تھی۔ ایک دن میرے ساتھ کوئی نہیں جا رہا تھا تو ابو کو لے کر گئی تھی۔ اندھیرے میں مجھے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے مصر کے اہرام میں سے ممی نکل کر آئے گی اور مجھے بھی ممی بنا دے گی۔"

س: "عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "ان" کے دل میں اترنے کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ آپ اس خیال سے کہاں تک اتفاق کرتی ہیں؟"

ج: "میں آپ کی بات سے پچاس فیصد اتفاق کرتی ہوں۔ میں جس کزن کو پسند ہوں، ان کو میں اس

ٹائم سے پسند ہوں جب میں بہت چھوٹی ہوتی تھی۔ جہاں تک بات ہے تجربے کی تو تین ماہ پہلے کی بات ہے جب وہ آئے تھے اور میرے ہاتھ کے چاول، کریلے اور آلو کا شوربا انہوں نے کھایا تھا۔ اس کے بعد ان کا یہ تبصرہ تھا۔ اوئے زی (نک نیم) تو نے کھانا بنانا کہاں سے سیکھا ہے، بہت ٹیسٹی بناتی ہے اور ساتھ میں ایک فرمائش بھی کردی۔ یار چائنیز رائس بنانے سیکھ لے بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ بنا بنا کر کھایا کریں گے (مطلب مستقبل میں)۔"

س: "لوگ آپ سے زیادہ تر کس ڈش کی فرمائش کرتے ہیں، ہمیں اس ڈش کی ترکیب بتائیں؟"

ج: "باجی صبا، ندیم بھائی اور کزن کو میرے ہاتھ کے بنے ہوئے چاول بہت پسند ہیں۔ ویسے تو یہ سب کو ہی بنانے آتے ہیں، چلیں لکھ ہی دیتی ہوں۔

چاول...... ایک کلو۔ بڑی پیاز ایک عدد (کٹی ہوئی)۔ ٹماٹر ایک پلیٹ کٹے ہوئے۔ ہری مرچ پانچ عدد۔ املی ایک چمچہ (پانی میں بھگودیں)۔ سفید زیرہ ایک چمچہ۔ گرم مسالا ایک چمچہ (پسا ہوا)۔ گھی ایک پیالی۔

ترکیب:۔ چاولوں کو دھو کر اچھی طرح پانی میں بھگودیں پکانے سے کم از کم پندرہ یا بیس منٹ پہلے۔ ایک دیگچی میں گھی ڈالیں جب وہ گرم ہو جائے تو اس میں پیاز ڈال کر ہلکی براؤن کرلیں۔ اب اس میں ٹماٹر، ہری مرچ، سفید زیرہ، گرم مسالا، نمک ڈال کر بھون لیں۔ اس کے بعد جتنے چاول ہیں اس سے دو گنا پانی ڈال دیں۔ جب پانی پکنے لگ جائے تو اس میں چاول ڈال دیں اور آنچ ہلکی کردیں، جب پانی خشک ہونے لگے تو املی اور پودینہ ڈال کر دم پر رکھ دیں، تین منٹ کے بعد چیک کرلیں نہ گلیں ہوں تو دو منٹ اور رک جائیں۔ مزے دار سے سادہ چاول تیار ہیں۔

س: "پہلی ڈش کون سی بنائی اور گھر والوں کے کیا تبصرے تھے اس پر؟"

ج: "ویسے تو جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، مجھے تب سے ہی کوکنگ کا بہت شوق ہے۔ اپنے لیے تو کچھ نہ کچھ بناتی ہی رہتی تھی، سب گھر والوں کے لیے جب پہلی ڈش بنائی تب میں تیرہ سال کی تھی۔ شاید سوجی کا حلوہ یا ٹنڈے کا سالن بنایا تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ میں نے پیاز براؤن کر کے اس میں ٹنڈے ڈال دیے، جب باجی صبا نے دیکھا تو کہنے لگیں۔ یہ کیا کیا، اب ایسا کرو اس میں سارے مسالے بھی ڈال دو اور ہلکی آنچ پر پکاؤ۔ اگر نہ گلیں تو وقفے وقفے سے پانی کا چھینٹا لگاتی جانا۔ سالن تو بس ٹھیک ہی بنا تھا، پر گھر والوں نے کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا۔"

س: "کون سی ڈش دیکھ کر گھر کے مردوں کو غصہ آجاتا ہے؟ اور پھر ان کا کیا ردعمل ہوتا ہے؟"

ج: "فی الحال شوہر سے واسطہ نہیں پڑا۔ بھائی اللہ نے کوئی دیا ہی نہیں اور جہاں تک بات ہے ابو کی تو انہیں تو بہت ساری ڈشز پر غصہ آتا ہے۔ مثلاً کسٹرڈ کو دیکھ کر کہتے ہیں، یہ بھی کوئی کھانے والی چیز ہے۔ Lays کو دیکھ کر کہتے ہیں (تماشا بنایا ہو یا کڑیاں نے)۔"

س: "گھر والوں کی پسندیدہ ڈش جسے بنانا آپ کو ناگوار گزرتا ہے؟"

ج: "ایسی تو کوئی ڈش نہیں جو پکانا ناگوار گزرے۔ ہاں کبھی کبھی ایک جیسے کھانے بنا بنا کر تنگ ضرور آجاتی ہوں۔"

س: "ایسے کون سے رشتہ دار ہیں جن کی تواضع کے لیے آپ کو کچن میں جانا ناگوار گزرتا ہے؟"

ج: "رشتے دار یا دوست احباب کوئی بھی آجائیں کچن میں جانا کبھی برا نہیں لگا، کیوں کہ مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ دوپہر میں کبھی اچانک سے مہمان آجائیں تو کچن میں جانا تھوڑا مشکل ضرور لگتا ہے۔ پر ناپسندیدہ نہیں۔"

س: "سسرال میں پہلی چیز کیا بنائی؟"

ج: "فی الحال تو دوسروں کے نکاح کے چھوہارے ہی کھا رہے ہیں۔ سسرال سے تو ابھی تک واسطہ ہی نہیں پڑا۔ دعا کیجیے گا، ہماری بھی سنی جائے۔"

س: "آپ کے خاندان کی اسپیشل ڈش؟"

ج: "خاندان کی تو کوئی اسپیشل ڈش نہیں ہے۔ ہاں البتہ گھر کی اسپیشل ڈشز ہیں۔ ابو کو حلوہ اور سویاں پسند ہیں جو ان کے لیے اسپیشل ہیں اور باقی سب کو چاول پسند ہیں۔ جو سب کے لیے اسپیشل ہیں۔"

کھجور کے لڈو

اشیاء:۔

کھجور	بیس سے پچیس عدد (بیج نکال لیں)
میوہ جات (بادام، پستے، اخروٹ، موگ پھلی، کاجو)	ایک چوتھائی پیالی
خشک کھوپرا (کدوکش کیا ہوا)	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:۔

خشک میوہ جات کو چند منٹ توے پر بھون لیجیے اور پھر ٹھنڈا ہونے کے لیے پلیٹ میں نکال کر رکھ دیں۔ اب گرم توے پر ایک منٹ کھجوریں رکھ کر سینک لیں، یہ نرم ہو جائیں گی۔ کھجور کسی بلینڈر میں ڈال کر پیس لیجیے اور کسی پیالے میں نکال لیں۔ اسی بلینڈر میں اب خشک میوہ جات پیس لیں لیکن انہیں باریک نہیں کریں بلکہ موٹا ہی رکھیں۔ اب خشک میوے اور کھجوریں آپس میں اچھی طرح ملائیں اور درمیان سائز کے لڈو بنالیں۔ اپنی پسند کے مطابق آپ اس مرکب میں کھوپرا بھی شامل کرسکتی ہیں۔ لڈو بن جائیں تو اس کے اوپر خشک کھوپرا لگائیں۔ مزے دار کھجور کا لڈو تیار ہے، افطار پارٹی میں روزہ کھولنے کے لیے اس سے بہتر انتخاب دوسرا نہیں ہوسکتا۔

چکن پوٹیٹو کروکٹس

اجزاء:۔

کارن آئل	دو کھانے کے چمچے
چکن (ابلی ہوئی)	350 گرام
پیاز باریک کٹی ہوئی	ایک عدد
تیل	تلنے کے لیے
لہسن پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ (کٹی ہوئی)	آدھا کھانے کا چمچہ
میدہ	دو کھانے کے چمچے
دودھ	آدھا کپ
آلو (ابلے ہوئے)	آدھا کلو (پیس لیں)
انڈے	دو عدد
مکھن	دو کھانے کے چمچے
ہرا دھنیا (کٹا ہوا)	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ	آدھا کھانے کا چمچہ
چیڈر چیز (کدوکش کیا ہوا)	آدھا کپ
موزریلا چیز (کدوکش کیا ہوا)	آدھا کپ
ڈبل روٹی کا چورا	ایک کپ
میدہ	ایک کپ

ترکیب:۔

پیاز کو کارن آئل میں سنہرا تل لیں۔ پھر اس میں چکن ڈال کر تھوڑی دیر پکائیں۔ لہسن پاؤڈر، لال مرچ اور میدہ ڈال کر دو منٹ بھونیں پھر اس دودھ ڈال کر پکائیں۔ دودھ خشک ہو جائے تو چولہا بند کردیں۔ ایک پیالے میں چکن، آلو، مکھن، نمک، کالی مرچ، ہرا دھنیا، انڈے کی زردیاں چیڈر چیز اور موزریلا اچھی طرح ملالیں اور رولز بنالیں۔ ایک گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ پہلے میدہ پھر انڈہ اور آخر میں ڈبل روٹی کا چورا لگا کے سنہرا ہونے تک تل لیں۔

اچاری چلی بائٹس

اشیاء:۔

پانی	حسب ضرورت
سرکہ	دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	بیس سے پچیس
چکن (اسٹرپ میں کٹی ہوئی)	ڈیڑھ کپ
تیل	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک لہسن کا پیسٹ	آدھا کھانے کا چمچہ
اچاری گوشت مسالا	ڈیڑھ کھانے کا چمچہ
لیموں رس	دو کھانے کے چمچے
چیڈر چیز	دو کھانے کے چمچے
کریم چیز	دو کھانے کے چمچے
موزریلا چیز	ایک چوتھائی کپ
میدہ	ایک کپ
انڈے	دو عدد
ڈبل روٹی کا چورا	ایک کپ

ترکیب:۔

ہری مرچوں کو کٹ لگا کر بیج نکال لیں۔ پھر ایک پیالے میں پانی لیں اور اس میں دو چمچے سرکہ ڈال کر اس میں ہری مرچیں بھگو دیں۔ ایک پین میں تیل گرم کر کے چکن کو بھونیں پھر اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ اور اچار گوشت مسالا ڈال کر لیموں کا رس ملا کر بھون لیں۔ ایک پیالے میں چیڈر، موزریلا چیز کو اچھی طرح ملا لیں۔ اب ہری مرچوں کو پانی سے نکال کر اچھی طرح ٹشو پیپر سے خشک کر لیں۔ پھر ہری مرچ میں پہلے چکن رکھیں اور پھر چیز کے مکسچر سے ہری مرچ کو بھر دیں۔ اسی طرح ساری ہری مرچیں تیار کر لیں۔ پہلے میدہ پھر انڈہ اور آخر میں ڈبل روٹی کا چورا لگا کر سنہرا ہونے تک فرائی کر لیں۔

چکن چیز فنگر

اجزاء:۔

مرغی کا گوشت بغیر ہڈی کے	ایک پاؤ
پپریکا پاؤڈر	ایک چائے کا چمچ
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچ
لہسن	آدھا چائے کا چمچ
نمک	آدھا چائے کا چمچ
اوریگانو	ایک چائے کا چمچ
چیڈر چیز	ایک کپ
انڈہ	دو عدد

ترکیب:۔

مرغی کے گوشت کو اچھی طرح بلینڈ کر کے اس میں سارے اجزا اچھی طرح ملا لیں اور اس کے رولز بنا لیں۔ پھر پہلے میدہ پھر انڈہ اور اور آخر میں ڈبل روٹی کا چورا لگا کر سنہرا ہونے تک تل لیں۔

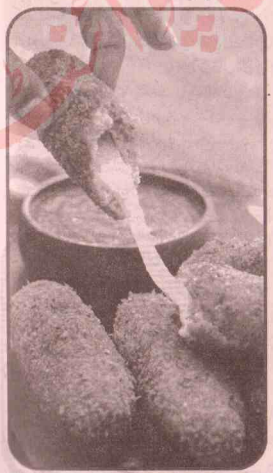

بریڈ پیزا

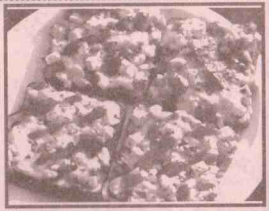

اشیاء:۔

ڈبل روٹی کے سلائس	آٹھ عدد
سبزی یا چکن	ڈیڑھ کپ (ابلی ہوئی)
کالی مرچ (پسی ہوئی)	آدھا چائے کا چمچ
نمک	آدھا کھانے کا چمچ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچ
کیچپ	دو کھانے کے چمچ
مایونیز	دو بڑے چمچے
پنیر (کش کیا ہوا)	ایک کپ

ترکیب:۔

ابلی ہوئی سبزی یا چکن میں کالی مرچ، سویا ساس، کیچپ، مایونیز اچھی طرح ملا لیں۔ سلائس پر فلنگ پھیلا لیں، تمام سلائس اسی طرح تیار کر لیں۔ ان پر کش کیا ہوا پنیر چھڑک دیں۔ پہلے سے گرم اوون میں گریس ٹرے پر رکھ کر دس منٹ کے لیے بیک کر لیں۔ بریڈ پیزا تیار ہے۔

گارلک ٹماٹو چٹنی

اشیاء:۔

لہسن کے جوے	ایک کپ
ٹماٹر	ایک عدد
سرخ مرچیں سوکھی ہوئی	پانچ عدد
املی	آٹھ گرام
کوکنگ آئل	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ضرورت

تڑکہ کے لیے:۔

تیل	ایک چائے کا چمچہ
رائی	آدھا چائے کا چمچہ
کڑی پتا	چند پتے
ہینگ	ایک چٹکی
سرخ مرچ سوکھی ہوئی	ایک عدد

ترکیب:۔

فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے سوکھی ہوئی سرخ مرچیں ڈالیں، لہسن کے جوے بھی ڈال دیں۔ جب وہ سنہری ہو جائیں تو کسی پیالے میں نکال لیں۔ اسی پین میں ٹماٹر اور املی ڈالیں، جب وہ نرم ہو جائے تو اسے بھی نکال لیں۔ اب گرائنڈر میں لہسن، ٹماٹر، املی اور نمک ڈال کر گرائنڈ کر لیں۔ تڑکے کے لیے فرائنگ پین میں تیل ڈالیں، اس میں سوکھی ہوئی سرخ مرچ ڈالیں۔ ساتھ ہی کڑی پتے اور ہینگ بھی ڈال دیں۔ جب وہ کڑکڑانے لگے تو اسے تیار چٹنی کے اوپر ڈال دیں۔

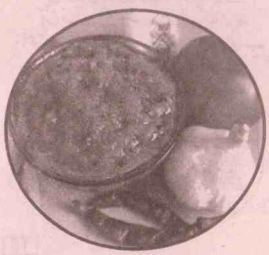

اقرأ سرور ———— ڈی جی خان

ہزار سجدے تو کر چکا ہوں
قضا تمہاری محبتوں میں
یں اب دکھاوے کا کوئی سجدہ
ادا کروں گا تو کیا کروں گا

ام مریم اسد ———— چیچہ وطنی

آپ اب پوچھنے کو آئے ہیں
دل مری جاں مر گیا کب کا

ارم کمال ———— فیصل آباد

کہیں بے کنار سے رتجگے، کہیں زرنگار سے خواب دے
ترا کیا اصول ہے زندگی؟ مجھے کون اس کا حساب دے
جو بچا سکوں تیرے واسطے جو سجا سکے تیرے راستے
مری دسترس میں وہ ستارے رکھ مری مٹھیوں کو گلاب دے

شازیہ گلزار ———— بھکر

مشورے زندگی کے سن لیجیے
ورنہ یہ فیصلے سناتی ہے

تبسم بشیر حسین ———— ڈنگہ

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو
ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

شہلا گل سحر ———— کوہاٹ کینٹ

محبت کرنے والوں کی تجارت بھی انوکھی ہے!
منافع چھوڑ دیتے ہیں خسارے بانٹ لیتے ہیں

ماہ رخ حسین ———— پنجاب

کچھ اور بھی جذبوں کو بے تاب کیا اس نے
آج مہندی لگے ہاتھوں سے آداب کیا اس نے

تاجور حسین ———— پنجاب

ہزاروں نامکمل حسرتوں کے بوجھ تلے
یہ جو دل دھڑکتا ہے کمال کرتا ہے

سیدہ ماہا بشیر ———— ڈنگہ

دریچے سے دیا جا کر ہٹا دو
مت اپنے ساتھ اس کو بھی سزا دو
چھپا کر اب انہیں رکھنے سے کیا حاصل
سب اس کے خط، وہ تصویریں جلا دو

فائزہ بھٹی ———— پتوکی

عرش معلیٰ تک پہنچنے سے پہلے
لوٹ آتی ہیں میری دعائیں اکثر

اقصیٰ ناصر ———— کراچی

بعد موت کے یہ اے داغ سمجھ میں آیا
وہی دانا ہے کہا جس نے نہ مانا دل کا

انعم ———— نامعلوم

میری مسکراہٹ کو حسین کہنے والے
میری آنکھ کی نمی کو بھی سمجھو کبھی

نمرہ، اقرا ———— کراچی

وہ جو گیت تم نے سنا نہیں
میری عمر بھر کا ریاض تھا
میرے درد کی تھی داستاں
جسے تم ہنسی میں اڑا گئے

فضہ نور ———— روہڑی

دل دھڑکتا تھا، تو رونق سی لگی رہتی تھی
اب دھڑکتا ہے تو دھڑکا سا لگا رہتا ہے

گڑیا راجپوت ———— جاتری شریف

میں نے تو فقط اس سے باتیں دو چار کی تھیں
اس پر بھی زمانے نے باتیں ہزار کی تھیں

ماریہ نذیر ———— بھاگٹانوالہ

اب میرے اشک محبت بھی نہیں آپ کو یاد
آپ تو اپنے ہی دامن کی نمی بھول گئے ہیں
اب مجھے کوئی دلائے نہ محبت کا یقین
جو مجھے بھول نہ سکتے تھے وہی بھول گئے ہیں

شکیلہ سہیل ———— ملکوال

باعث تسکین ہیں سردی کی تنہائیاں ہیں
ایک ماچس، چند سگریٹ، چائے اور دکھ

صدف عمران ———— کراچی

تم زمانے سے لڑ نہیں سکتیں
خیر یہ راز آج کھول دیا
دو اجازت! کہ جا رہا ہوں میں
تم نے باتوں میں زہر گھول دیا

انٹرویو

ریاضی میں کمزور دو دوست انٹرویو کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ پہلے کا نمبر آیا تو وہ اندر داخل ہوا۔

آفیسر: "آپ ٹرین سے سفر کر رہے ہوں اور اچانک آپ کو گرمی لگے تو کیا کرو گے؟"

امیدوار: "میں کھڑکی کھول دوں گا۔"

آفیسر: "بہت خوب۔ اب بتاؤ کہ اگر وہ کھڑکی 1.5 اسکوائر میٹر ہے اور ڈبے کا رقبہ 12x90 فٹ ہے اور ٹرین 80 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جنوب کی طرف جا رہی ہے اور ہوا جنوب سے پانچ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے ڈبے میں داخل ہو رہی ہو تو پورا ڈبا ٹھنڈا ہونے میں کتنا وقت درکار ہوگا؟"

امیدوار نے کوشش کی مگر جواب نہ دے سکا اور وہ فیل ہوگیا۔ باہر آکر اس نے وہ سوال اپنے دوست کو بتایا۔ اب اس کی باری آئی۔

آفیسر: "آپ ٹرین میں سفر کر رہے ہوں، اچانک آپ کو گرمی لگے تو کیا کریں گے؟"

امیدوار: "میں اپنا کوٹ اتاروں گا۔"

آفیسر: "پھر بھی آپ کو گرمی لگے تو کیا کرو گے؟"

امیدوار: "میں اپنی شرٹ اتار دوں گا۔"

آفیسر (چڑ کر): "پھر بھی گرمی لگے تو؟"

امیدوار: "میں اپنی بنیان اتار دوں گا۔"

آفیسر (غصہ میں): "اگر پھر بھی گرمی لگے تو؟"

امیدوار: "توں پاویں مینوں قتل کر دے میں کھڑکی نئیں او کھولنی۔"

دعا مصطفیٰ...... میرپور خاص

ایمان داری

کمرہ عدالت میں جج نے خاتون سے پوچھا۔

"آپ نے اسٹور سے کتنے کیلے چرائے؟"

خاتون: "ایک درجن۔"

جج: "فی کیلے کے حساب سے یہ عدالت آپ کو بارہ دن قید کی سزا سناتی۔"

جج کا فیصلہ سنتے ہی ایک شخص کھڑا ہوا اور بولا۔

"جج صاحب یہ میری بیوی ہے۔ جب گھر آئی تو ایک درجن کیلوں کے ساتھ پانچ کلو سفید چنے کا پیکٹ بھی تھا۔"

خوف

بیوی شوہر سے: "نہا کر نکلیں تو آپ سے کچھ پوچھنا ہے کہ آپ کے موبائل کے بارے میں۔"

چار دن ہو گئے شوہر ابھی تک نہا رہا ہے۔

گڑیا راجپوت...... جاتری شریف

مجبوری

ایک آدمی کو اپنے بینک اکاؤنٹ میں تنخواہ منتقل ہونے کا پیغام موصول ہوا۔ اس نے پیغام کھول کر دیکھا تو اس کے اکاؤنٹ میں دو ہزار روپے سے زائد منتقل کیے گئے تھے۔ اس نے کسی کو نہیں بتایا اور وہ پیسے نکال کر استعمال کر لیے۔ اگلے مہینے اس کے اکاؤنٹ میں جو تنخواہ منتقل کی گئی وہ دو ہزار کم تھی۔ اس نے اپنی کمپنی کے اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ سے شکایت، اس کی تنخواہ دو ہزار کم منتقل کی گئی ہے۔

اکاؤنٹس والوں نے جواب دیا۔ "پچھلے مہینے آپ کے اکاؤنٹس میں دو ہزار زیادہ منتقل ہو گئے تھے تب تو آپ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔"

آدمی نے جواب دیا۔ "اب ایک دفعہ میں نے آپ کی غلطی کو نظر انداز کیا۔ آپ بار بار غلطی کریں گے تو مجھے مجبوراً آواز اٹھانی ہی پڑے گی۔"

ثنا شہزاد...... کراچی

باس کون؟

صاحب دفتر میں ترقی پا کر افسر بن گئے تو اگلے دن ہی آفس کے دروازے پر بڑا سا بورڈ آویزاں کر دیا۔ جسے پڑھ کر پورے اسٹاف کی جان ہی نکل گئی۔

"یہاں میں باس ہوں۔ صرف میرا حکم چلے گا۔ ہمیشہ یاد رکھنا اور اپنی اوقات میں رہنا۔"

اگلے دن باس باتھ روم گئے، واپس داخل ہوئے تو میز پر ایک کاغذ پر پیغام لکھا ملا۔

"آپ کے گھر سے آپ کی بیگم کا فون آیا تھا۔ پیغام دیا ہے کہ......

"کچن کے دروازے سے جو بورڈ اتار کے لے گئے ہو، وہ شرافت سے واپس لے آنا۔"

ارم کمال...... فیصل آباد

زندگی اتنی گم صم کیوں ہے؟

کبھی کبھی انسان اپنی ذات سے ہی تنگ آ جاتا ہے تو اپنا آپ وجود کائنات پر بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایسے میں کوئی خوشی، کوئی دکھ متاثر نہیں کرتا۔ آنکھیں خشک سیلاب بن کر ویران ہو جاتی ہیں۔ سوچ کے دریچوں پر جیسے قفل پڑ جاتے ہیں۔ دل کسی پرانے کھنڈر کی طرح ہوتا ہے۔ وقت گویا صحرا کی تپتی ریت پر لا کر کھڑا کرتا ہے۔ انسان کا حال اس ضدی بچے کی طرح ہو جاتا ہے جو پرانے کھلونوں سے کسی طور پر بھی نہیں بہلتا بلکہ نئے کے حصول کے لیے بضد رہتا ہے جو کہ اس کی پہنچ سے دور ہوتی ہے اور ایسے میں ہم جیسے لوگ کئی باتوں کو دفن کر کے آدھی رات کی خاموشی بنا کرتے ہیں۔ لب خاموش رہتے ہیں، آنکھیں اجاڑ ہیں مگر دل بوجھ کا گنبد ہے اور ان سب کے بیچ ایک بنیاد کھ، نئے دن کا آغاز زندگی کس موڑ پہ لا کھڑا کرے؟ کوئی خبر نہیں، جی چاہتا ہے رات کے پچھلے پہر ویران سڑکوں پر زندگی کو ڈھونڈنے نکلوں۔ آسمان والے سے دل کی بات کہوں۔ اپنے اللہ سے پوچھوں کہ زندگی اتنی گم صم کیوں ہے؟ کہیں اپنا پتا کیوں نہیں دیتی۔

(میاں مشتر)

ماریہ نذیر...... بھاگتا نوالہ

منافقت کیوں......!

ہم مشرقی لوگ بہت عجیب ہوتے ہیں۔ داوا، بیٹیوں کی رخصتی کے خیال سے گھنٹوں روتے رہتے ہیں اور ان کے دل کے ارمانوں کی رخصتی پر ایک آنسو نہیں بہاتے۔ ہمیں یہ مان رہتا ہے کہ ہماری اولاد ہمارا سر نیچا نہیں کرتی اور ہم یہ غرور حاصل نہیں کر پاتے کہ ہم نے اولاد کی خوشیوں کو نیچا ہونے نہیں دیا۔ داوا ہمارے سروں پر خاندان کی عزت کی پگڑیاں سجائی جاتی ہیں اور ہمارے دل کے تخت سونے رہ جاتے ہیں اور کوئی ان پر آہ بھی نہیں بھرتا۔ مشرقی عورت ارتقا کا ذریعہ کیوں ہے؟ خود ارتقا کیوں نہیں......؟ یہ سوال میں نے خود سے کئی بار پوچھا اور خود کو یہ بھی بتاتے بتایا کہ مشرقی ایک گنجال خطہ ہے۔ جس کے پیندے میں تعصب ہوتا ہے اور کنارے پر منافقت۔

آپ بھی مشرقی فلسفی نکلے۔ میں نے آپ سے اس کی بات کی اور آپ نے مجھے چپ ہو جانے کے لیے کہا...... یہ چپ کا تالا......اس کی چابی کہاں گم رہتی ہے......کبھی تو اس تالے کو کھلنے کی اجازت دے دیا کریں۔

(سمیرا حمید...... یارم)

گڑیا راجپوت...... جاتری شریف

اصل ضرورت

اس ملک میں اتنی مسجدیں ہو چکی ہیں کہ اگر پورا پاکستان ایک وقت کی نماز کے لیے مسجدوں میں اکٹھا ہو جائے تو بھی بہت سی مسجدیں خالی رہ جائیں گی۔ میں مسجدیں بنانے پر یقین نہیں رکھتا جہاں لوگ بھوک سے خودکشیاں کرتے پھر رہے ہوں، جہاں کچھ خاص طبقوں کی پوری پوری نسل جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہو، وہاں مسجد کی بجائے مدرسے کی ضرورت ہے۔ اسکول کی ضرورت ہے۔ تعلیم اور شعور ہو گا اور رزق کمانے کے مواقع......تو اللہ سے محبت ہو گی ورنہ صرف شکوہ ہی ہو گا۔

(عمیرہ احمد...... پیر کامل)

تبسم بشیر حسین...... ڈنگہ

سچا ہم سفر

جب سے تنہا سفر شروع کیا ہے تو شدت سے احساس ہونے لگا ہے کہ لوگوں کا ہجوم بھی کبھی روح کا ساتھی نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنی اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ کوئی بھی ہماری خاطر اپنے راستے کہاں بدلتا۔ بس ہم اپنے راستے چھوڑ کر ان کے راستوں پہ چل پڑتے ہیں اور انجانے راستوں پر منزلیں کہاں ملتی ہیں، بس گرد راہ ہونا ہی نصیب میں آتا ہے۔ راستے اپنے ہی اچھے، نہ کوئی قافلہ، نہ کسی راہ زن کا ڈر۔ نہ کسی کے ہاتھ چھوڑ جانے کا خوف ہے۔ نہ کسی کی راہ بدل جانے کا اندیشہ......

اب میسر ہے دل کو سہارا اپنا
اب روح سے آشنائی ہے
ٹھیک کہا ہے کسی نے
سچا ہم سفر تنہائی ہے

(مصباح مشتاق......اک سراب ہے سفر میرا)

سعدیہ وحید سعدی......اسلام آباد